خواتین ڈائجسٹ

جون 2018

عید نمبر

Khawateen Digest June 2018

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی **30** تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشاللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آ سکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر ——— آذر ریاض
نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل
مدیرۂ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی
نفسیات ——— عدنان
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

جون 2018
جلد 46 شمارہ 2
قیمت 70 روپے

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
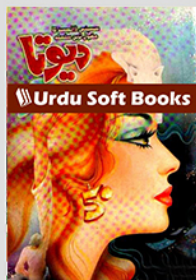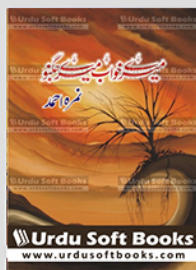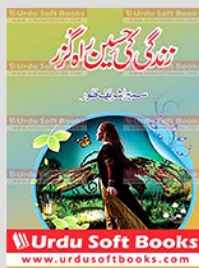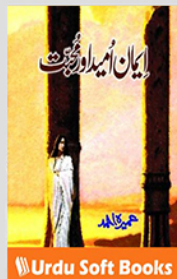
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

subscriptions@khawateendigest.com

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نظمیں غزلیں

نفسیات

بیوٹی بکس

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

جون کا شمارہ عید نمبر لیے حاضر ہیں۔
رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ رمضان المبارک کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو روزوں کی مشقت، عبادت وریاضت پر اعزاز واکرام، انعام عطا کیا جاتا ہے۔ عید الفطر کا دن۔

عید کے لغوی معنی ہیں، خوشی، شادمانی، جشن۔ یہ خوشی منانے کا دن ہے۔ اس دن دنیا بھر کے مسلمان دل کھول کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

ہر مذہب، ہر قوم کے کچھ مخصوص تہوار ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے عقیدے اور روایات کے مطابق خوشیاں مناتے ہیں۔ اہل مدینہ کے بھی خوشیاں منانے کے دو دن مخصوص تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان دونوں کا نعم البدل عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی شکل میں عطا فرمایا ہے۔

عید الفطر ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ یہ اجتماعی خوشیوں کا تہوار ہے جو روایتی انداز میں منایا جاتا ہے۔ عید الفطر کی روایتوں میں ایک خوب صورت روایت عید کے دن گلے مل کر مبارک باد دینا بھی ہے۔ اس خوب صورت روایت کا اصل حسن یہ ہے کہ ہم اپنے دل سے تمام گلے شکوے، ملال مٹا کر محبت کے ساتھ گلے ملیں۔ ہمارے دلوں میں نفرت، کینہ، بغض نہ ہو۔ ہمارا ظاہر ہی اُجلا نہ ہو، باطن بھی صاف وشفاف ہو۔

ہم اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے عبادت کرتے ہیں لیکن اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ اس کے بندوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں پر رحمتیں نازل کرتا ہے جو اس کی مخلوق پر مہربان ہوتے ہیں۔ جو اس کی مخلوق کے لیے محبت، رحم اور ہمدردی کا جذبہ اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اپنے عمل سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس موقع پر اپنے قریبی، اردگرد کے لوگوں کا خیال رکھیے۔ یہی عید کا پیغام ہے۔

قارئین کو ہماری جانب سے دلی عید مبارک۔
ہماری دعا ہے عید کے دن کا سورج آپ کے آنگن میں خوشیوں کا پیام لے کر اُترے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہمیشہ شاد وآباد رکھے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- سمیرا حمید کا مکمل ناول۔ مہر میراں،
- نعیمہ ناز کا مکمل ناول۔ نسخہ ہائے وفا،
- نگہت عبداللہ اور امتہ العزیز شہزاد کے ناولٹ،
- آمنہ ریاض کا ناول۔ دشت جنوں،
- حیا بخاری، عندلیب زہرا، افشین نعیم، قانتہ رابعہ اور شازیہ جمال طارق کے افسانے،
- رنگ عید اور آپ۔ قارئین سے سروے،
- سیرا لیپلک سے ملاقات، ، باتیں زینب احمد سے،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

جہنم میں پہنچانے والا عمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے سے (لڑنے کے لیے) ملتے ہیں تو قاتل اور مقتول (دونوں فریق) جہنم میں جائیں گے۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔
”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قاتل ہے (اس لیے مجرم ہے) مقتول (کے جہنمی ہونے) کی کیا وجہ ہے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔“

فوائد و مسائل:

1- جب کوئی شخص جرم کی پوری کوشش کرے لیکن کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے تو اللہ کے ہاں وہ بھی مجرم ہے۔

2- جو شخص ارتکاب جرم کا عزم رکھتا ہو لیکن ارتکاب سے پہلے رجوع کرلے تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور توبہ کی وجہ سے ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

دونوں جہنمی

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جب دو مسلمانوں میں سے ایک اپنے بھائی پر ہتھیار اٹھاتا ہے تو وہ دونوں جہنم کے کنارے پر ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے ایک اپنے ساتھی کو قتل کر دیتا ہے تو دونوں جہنم میں داخل ہو جاتے ہیں۔“

فوائد و مسائل:

1- جہنم کے کنارے پر ہونے کا مطلب یہ ہے

کہ اس غلطی کی وجہ سے ان دونوں کے جہنمی ہونے کا خطرہ ہوتا ہے لیکن ان کے لیے جہنم سے بچنے کا موقع باقی ہوتا ہے کہ لڑائی سے باز آجائیں۔

2- مومن کا قتل جہنم میں پہنچانے والا عمل ہے، البتہ توبہ یا قصاص سے یہ گناہ معاف ہو سکتا ہے۔

سب سے برا

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”قیامت کے دن اللہ کے ہاں سب سے برے درجے والا شخص وہ ہوگا جس نے (دوسرے کی) دنیا کے لیے اپنی آخرت ضائع کرلی۔“

زبان کو روک کر رکھنا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”عنقریب ایک ایسا فتنہ برپا ہوگا جو عربوں کا صفایا کردے گا۔ اس کے مقتول جہنم میں جائیں گے۔ اس فتنے میں زبان تلوار کے وار سے زیادہ سخت (اور تکلیف دہ) محسوس ہوگی۔“

زبان کا اثر

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”فتنوں سے بچو، ان میں زبان (کی بات) تلوار کے وار کی طرح (اثر انداز ہوتی ہے)“

صاحب اختیار لوگوں سے میل جول میں احتیاط

حضرت علقمہ بن وقاص رحمتہ اللہ سے روایت ہے، ان کے پاس سے ایک آدمی گزرا جو (معاشرے میں) اونچا مقام رکھتا تھا۔

علقمہ رحمتہ اللہ نے اس سے کہا: ”تیرا (مجھ سے) قرابت کا تعلق ہے اور (مجھ پر) تیرا حق ہے۔ (اس لیے نصیحت کے طور پر بات کررہا ہوں۔) میں نے دیکھا ہے کہ تو ان حکمرانوں کے پاس جاتا ہے، اور ان سے، جو اللہ چاہے، بات چیت کرتا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کوئی شخص اللہ کو راضی کرنے والی ایک بات کرتا ہے، وہ نہیں سمجھتا کہ اس کا وہاں تک اثر ہوگا جہاں تک (حقیقت میں) ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ عزوجل اس کے لیے قیامت تک اپنی خوشنودی لکھ دیتا ہے۔ اور ایک آدمی اللہ کی ناراضی والی ایک بات کرتا ہے، وہ نہیں سمجھتا کہ اس کا وہاں تک اثر ہوگا جہاں تک (حقیقت میں) ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ عزوجل اس کے لیے اس دن تک اپنی ناراضی لکھ دیتا ہے جس دن اس سے ملاقات ہو گی۔“

علقمہ رحمتہ اللہ نے کہا: اس لیے دیکھ لیا کر کہ تو کیا کہہ رہا ہے اور کیا کچھ منہ سے نکال رہا ہے، تیرا بھلا ہو۔ مجھے تو بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے سنی ہوئی یہ حدیث کئی باتیں کہنے سے روک دیتی ہے۔

فوائد و مسائل:

1- حکمرانوں سے تعلق رکھنے میں خطرہ ہے کہ ان کے غلط کاموں یا غلط باتوں کی تائید کرنا پڑے گی، اس لیے احتیاط پسند بزرگ حکومتی عہدے داروں سے زیادہ میل جول پسند نہیں فرماتے۔ لیکن اگر کسی ضرورت مند یا مظلوم کی مدد کے لیے یا ان کی کسی غلطی پر تنبیہہ کرنے کے لیے ان کے پاس جائیں تو حرج نہیں۔

2- حکمران اپنے مشیروں سے متاثر ہوتے ہیں، اس لیے انہیں غلط مشورہ دینے والا بہت بڑا مجرم ہے اور ان کے غلط اقدامات میں شریک ہے۔

3- بعض اوقات ظاہری طور پر معمولی سمجھی جانے والی بات بہت دوررس اثرات رکھتی ہے، اس لیے معاشرے میں اہم مقام رکھنے والوں کو بہت احتیاط سے بات کرنا چاہیے۔

4- سیاست دان ہوں یا علماء یا افسران ان کی ذمہ داری بہت نازک ہے۔ اس کا احساس رہنا چاہیے۔

5- علمائے کرام کو چاہیے کہ جب حکومتی عہدے داران سے مشورہ طلب کریں تو انہیں صحیح مشورہ دیں اور جب نصیحت کی درخواست کریں تو انہیں اللہ کی رضا کے لیے ایسی نصیحت کریں جس سے عام مسلمانوں کو فائدہ ہو۔

الفاظ کے انتخاب میں احتیاط

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''آدمی (بعض اوقات) اللہ کی ناراضی والا ایک لفظ کہہ دیتا ہے، وہ اس میں حرج نہیں سمجھتا۔ (لیکن وہ اتنا بڑا گناہ کا لفظ ہوتا ہے کہ) وہ اس کی وجہ سے ستر سال تک جہنم میں گرجاتا ہے۔''

اچھی بات یا خاموشی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔''

فوائد و مسائل:

1- بری بات کہنے سے اجتناب ایمان کا تقاضا ہے۔

2- فضول باتیں کرنے سے اجتناب کرنا اور خاموش رہنا اچھی عادت ہے۔

3- بے فائدہ باتوں میں مشغول رہنے سے ذکر الٰہی اور تلاوت وغیرہ میں مشغول رہنا بہت ہی بہتر ہے۔ اس کی وجہ سے گناہ سے حفاظت ہوتی ہے اور نیکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

زبان، گناہوں کی جڑ

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: میں نے عرض کیا۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے (نصیحت کی) ایک بات فرمادیجیے جس پر میں مضبوطی سے قائم رہوں.........''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کہو: میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر مضبوطی سے قائم رہو۔''

میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو میرے بارے میں سب سے زیادہ کس چیز سے (نقصان پہنچنے کا) خوف ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا، پھر فرمایا: ''اس سے۔''

فوائد و مسائل:

1- ایمان پر قائم رہنا اس لیے ضروری ہے کہ جہنم سے نجات صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے جب انسان کی موت ایمان کی حالت میں آئے۔

2- زبان سے جس قدر زیادہ گناہ سرزد ہوتے ہیں اتنے دوسرے اعضاء سے نہیں ہوتے۔

3- زبان کے گناہ آسانی سے ہوجاتے ہیں۔

4- معاشرے میں زبان کے گناہوں کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی دوسرے گناہوں کو۔

5- زبان کے گناہوں کے اثرات زیادہ شدید ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں اور بہت سے گناہ سرزد ہوتے ہیں، مثلاً: قتل و غارت وغیرہ، اس لیے زبان کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

نیکی کا مقصد

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''میں ایک سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، ایک دن جبکہ ہم چل رہے تھے میں آپ کے قریب ہوگیا۔ میں نے عرض کیا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ! مجھے ایسا عمل بتایئے جو مجھے جنت میں پہنچادے اور جہنم سے دور کر دے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تو نے بڑی عظیم بات پوچھی ہے اور جس کے لیے اللہ آسان کر دے اس کے لیے یہ آسان بھی ہے۔ (جنت میں پہنچانے والا عمل یہ ہے کہ) تو اللہ کی عبادت کرے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، نماز قائم کرے، زکواۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے۔"

پھر فرمایا۔

"کیا میں تجھے نیکی کے دروازے نہ بتاؤں؟ روزہ ڈھال ہے۔ صدقہ گناہ (کی آگ) کو بجھا دیتا ہے، جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ اور آدمی کا رات کے دوران میں نماز (تہجد) پڑھنا۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

ترجمہ "ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے بدلے میں ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کی کون کون سی چیزیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔" (ترجمہ السجدہ۔16)

پھر فرمایا۔

"کیا میں تجھے دین کا سر، اس کا ستون اور اس کی کوہان کی چوٹی نہ بتاؤں جس پر ان سب کا مدار ہے؟"

میں نے کہا: "کیوں نہیں! تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا۔"

"اسے روک کر رکھنا۔"

میں نے کہا۔ "اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم جو باتیں کرتے ہیں کیا ان پر بھی ہمارا مواخذہ ہوگا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"معاذ! تیری ماں تجھے روئے۔ لوگوں کو (جہنم کی) آگ میں چہروں کے بل گھسیٹنے والی چیز ان کی زبانوں کی کاٹی ہوئی فصلوں کے سوا اور کیا ہے؟"

فوائد و مسائل:

1- سب نیکیوں کا مقصد اور گناہوں سے بچنے کی ہر کوشش کا مقصد جنت کا حصول اور جہنم سے نجات ہے، اس لیے یہ بہت عظیم مسئلہ ہے۔

2- نیکی اللہ کی توفیق ہی سے ہوتی ہے اور گناہ سے بچاؤ اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

3- اسلام کے پانچوں ارکان پر کما حقہ عمل کرنے سے جنت ملتی ہے اور جہنم سے نجات ہوتی ہے۔

4- روزہ، صدقہ اور تہجد نیکی کے دروازے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک عمل بہت سی نیکیوں میں معاون بنتا ہے، لہذا نفلی روزے، نفلی صدقات اور تہجد میں سے جو عمل بھی آسانی سے ہو سکے، اسے زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے۔

5- نفلی روزے گناہوں سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

6- صدقے سے گناہ معاف ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں جنت حاصل ہوتی ہے۔

7- نماز تہجد رات کے کسی بھی حصے میں ادا کی جا سکتی ہے، تاہم آدھی رات کے بعد خصوصاً تہائی رات باقی رہنے پر ادا کرنا زیادہ افضل ہے۔

8- زبان کی حفاظت ایک اہم عمل ہے جس کا بڑی نیکیوں سے گہرا تعلق ہے۔ روزے کا فائدہ تب ہی حاصل ہوتا ہے جب جھوٹ، چغلی، غیبت اور گالی گلوچ وغیرہ سے اجتناب کیا جائے۔ صدقے کا ثواب تب ہی ملتا ہے جب احسان نہ جتلایا جائے اور نیکی کا اعلان کر کے ریا کاری کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

9- زبان کے گناہوں کو معمولی سمجھ لیا جاتا ہے، لہذا توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور گناہ اتنے زیادہ جمع ہو جاتے ہیں کہ انسان جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

10-اسلام کا ستون نماز ہے۔

کلام کی پکڑ

ام المومنین ام حبیبہ (بنت ابوسفیان) رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدم کے بیٹے کا ہر کلام اس کے خلاف ہے، اس کے حق میں نہیں، سوائے نیکی کا حکم دینے، برائی سے منع کرنے اور اللہ عزوجل کا ذکر کرنے کے۔"

منافقت

حضرت عبوشعثاء رحمتہ اللہ سے روایت ہے، کسی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا:

ہم امراء (حکمرانوں) کے پاس جاتے ہیں تو ایک بات کہتے ہیں، پھر جب ہم باہر آتے ہیں تو دوسری بات کہتے ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اس چیز کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں منافقت شمار کرتے تھے۔

فوائد و مسائل:

1- مسلمان کا ظاہر اور باطن ایک ہونا چاہیے۔

2- حکمرانوں کے سامنے صحیح صورت حال پیش کرنا اور صحیح رائے دینا ضروری ہے۔ ان کی خوشنودی کے لیے غلط رائے دینا یا ان کے غلط کام کو غلط جانتے ہوئے بھی اس کی تعریف کرنا بہت بڑی اخلاقی کمزوری ہے جس سے حکمران کو بھی نقصان ہوتا ہے اور مسلم عوام کو بھی۔

3- منافقانہ طرز عمل جھوٹ، دھوکے اور خوشامد پر مبنی ہوتا ہے اور یہ سب بری عادتیں ہیں۔

اسلام کی خوبی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ بھی انسان کے اسلام کی خوبی ہے کہ جس معاملے سے اس کا تعلق نہیں اسے چھوڑ دے۔"

بہترین زندگی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگوں کے لیے بہترین زندگی یہ ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے، اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر (میدان جنگ میں) اڑتا پھرتا ہو، جب بھی خوف زدہ کرنے والی یا پریشان کن آواز سنائی دے، وہ اس پر ادھر اڑ جاتا ہے۔ وہ موت یا شہادت کو اس کی جگہوں میں تلاش کرتا پھرتا ہے۔

یا ایک آدمی کسی چوٹی پر یا کسی وادی میں چند بکریاں لے کر رہ رہا ہے، وہ نماز قائم کرتا ہے، زکوۃ ادا کرتا ہے اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت کرتا رہتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ صرف نیکی کے معاملات میں تعلق رکھتا ہے۔"

فوائد و مسائل:

1- جہاد کی زندگی سب سے اعلا زندگی ہے۔

2- مجاہد کا مقصد اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرنا اور کافروں سے مسلمانوں کی سرزمین کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ اسے عہدے، تمغے، انعام یا شہرت کی تمنا نہیں ہوتی۔

3- فتنوں کے زمانے میں اپنا دین بچانے کے لیے عام آبادی سے الگ تھلگ رہائش اختیار کرنا جائز ہے لیکن یہ تنہائی اس طرح کی نہیں ہونی چاہیے جس طرح کی عیسائی راہب یا ہندو جوگی اختیار کرتے ہیں کہ انسانوں سے بالکل کٹ جاتے ہیں، بلکہ اس کا مقصد لوگوں کے برے کاموں میں شریک ہونے سے بچنا ہے، نیکی کے کاموں میں حسب طاقت شریک رہنا چاہیے۔

4- نماز اور زکواۃ سب سے اہم عبادتیں ہیں، ان سے کسی بھی حال میں غفلت جائز نہیں۔

ایک سوال نامہ کا جواب نامہ

انشا جی

آج ہمیں ایک بڑا سا جہازی سائز کا کارڈ ڈاک میں ملا ہے، جس کے ایک طرف تو ہمارا پتا لکھا ہے، مکرمی، معظمی وغیرہ القابات کے ساتھ دوسری طرف کارڈ چھاپنے اور بھیجنے والے کا نام ہے۔

خدمت عوام پارٹی (غیر سیاسی)

اس کے نیچے چند سوالات بھی درج ہیں۔

۱۔ کیا آپ ادارے یا محکمے کا سامان اسٹیشنری وغیرہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے گھر تو نہیں لے جاتے؟

۲۔ کیا آپ اپنے دفتری اوقات کو خوش گپیوں یا دوستوں کی خاطر تواضع میں تو ضائع نہیں کرتے؟

۳۔ کیا آپ دفتر کا کام ختم ہو جانے سے پہلے کھسک تو نہیں جاتے؟

۴۔ کیا آپ اپنے دفتر کا کام جان بوجھ کر تاخیر سے تو نہیں کرتے؟

۵۔ کیا آپ کسی عزیز یا محترمہ کو اپنے سرکاری ٹیلی فون سے مفت کال کرنے کی اجازت تو نہیں دیتے؟

۶۔ کیا آپ اپنے دفتر میں کام کرنے والی خواتین کو اس نگاہ احترام سے دیکھتے ہیں جیسے اپنی خواتین کو؟

۷۔ کیا تنخواہ لیتے وقت آپ کا ضمیر تو کبھی ملامت نہیں کرتا؟

بعض لوگ منفی ذہنیت کے ہوتے ہیں، ہم ان میں سے نہیں ہیں، چنانچہ پہلے پانچ سوالات کی حد تک ہمارا جواب اثبات میں ہے۔ بے شک اپنے ادارے کی اسٹیشنری لے جاتے ہیں لیکن اس پر ذاتی استعمال کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ ایک تو اس لیے کہ زیادہ تر بچوں کے کام آتی ہے یا اس پر دھوبی کا حساب لکھتے ہیں، سو دھوبی کی ذات اور ہماری اپنی ذات میں فرق ہے۔ اگر اس اسٹیشنری سے خطوط لکھتے بھی ہیں تو ہر چند کہ خود لکھتے ہیں لیکن وہ جاتے تو دوسروں کے نام ہیں، دوسرے لوگ ہماری ذات کی تعریف میں کیسے آسکتے ہیں۔

دوسرے سوال میں لفظ ضائع کے استعمال پر ہمیں اعتراض ہے بلکہ ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ خوش گپیوں اور دوستوں کے لطف صحبت سے دماغ تازہ ہوتا ہے اور اگلے روز کام کرنے کے لیے آدمی تازہ دم اور مستعد آتا ہے، اگر اگلے روز بھی وہ احباب آجاتے ہیں تو اس سے اگلے روز جیسے۔

اے ذوق کسی ہم دم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

تیسرے سوال کا جواب تو اثبات ہی میں ہے، لیکن کھسکنے کا لفظ یہاں بے محل ہے۔ ایک سینما میں کوئی صاحب فلم دیکھ رہے تھے، وہ بھی کوئی تعمیری قسم کی، چنانچہ خراٹے لینے لگے۔

پاس والے نے بے زار ہو کر ان کو جگایا اور ملامت کی کہ بھلے مانس خراٹے لے کر دوسروں کی نیند میں خلل کیوں ڈالتا ہے۔ چپکے سے نکل جانے میں بھی کچھ اس قسم کی مصلحت ہے، کوئی دیکھ لے اور پوچھ لے اور باز پرس کرنے لگے تو خود ہی سوچیے اس میں کتنا وقت ضائع ہوگا اور وہ سرکاری وقت ہی ہوگا۔

چوتھے سوال کا جواب بھی ہاں ہے اور حکمت اس میں یہ ہے کہ اگر جھٹ پٹ کام کر دیا جائے تو پھر دفتر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاخیر میں کئی فائدے ہیں، ایک آدمی کا کام کرنے کے لیے پانچ آدمی رکھے جاتے ہیں، ملک میں بے روزگاری کم ہوتی ہے، تاخیر کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کمیشن بیٹھتا ہے۔ اس میں نیا عملہ و ملہ بھرتی ہوتا ہے اس سے بے روزگاری مزید ختم ہوتی ہے۔ پانچویں سوال کے جواب میں ہم کہیں گے، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جب کسی محترمہ کو ہم خود مفت کال کرتے ہیں، اگر وہ خود آ کر مفت کال کر لے تو کیا مضائقہ ہے۔

اب رہا سوال نمبر ۶، دفتر میں کام کرنے والی عورتیں اگر معمولی صورت کی یا مسن ہیں تو اخلاق کے تقاضے سامنے آ جاتے ہیں کہ ان کو مائیں، بہنیں، بیٹیاں سمجھا جائے۔ ویسے آج کل گھر گھاٹ یعنی گھر اور دفتر میں چنداں فرق نہیں رہا۔

مغرب میں تو عام بات ہے کہ اگر کوئی سیکریٹری خوب صورت ہے تو مستقبل قریب میں اپنے افسر کی گھر والی بن جاتی ہے اور گھر اور دفتر کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ ساتویں سوال کا جواب ہے کہ جی نہیں، ملامت نہیں کرتا، کیا مجال ہے کہ کرے۔ البتہ تنخواہ نہ لیں تو ضرور ملامت کرتا ہے۔

یہ سوالات تو ضمنی ہیں، کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز خدمت عوام پارٹی ہے بلکہ اس کا غیر سیاسی ہونا ہے، ویسے......

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

ہم نے بہت سی پارٹیوں اور جماعتوں کا تحریکوں کو غیر سیاسی سے شروع ہو کر سیاست کا پنجہ پکڑتے دیکھا ہے۔ خود اس سوال نامے میں سیاست کے جراثیم بہت ہیں۔ کل ان ہی لوگوں کے پاؤں جم گئے تو جھنڈا لے کر نکل آئیں گے کہ دفتروں میں کاہلی اور بے ایمانی اور عدم کارکردگی دور کرنے کے لیے ہمیں اپنی صفوں کو منظم کرنا چاہیے اور عوام کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اگلے الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے۔

الیکشن کی بات آئے گی تو دائیں بازو اور بائیں بازو اور اسلام اور سوشلزم کا قضیہ ضرور اٹھے گا۔ ہم نے تو اس سوال نامے کے بے سوچے سمجھے جواب دے دیے، قارئین کو احتیاط چاہیے کیونکہ بات سے بات نکلتی ہے اور غیر سیاسی سے سیاسی بنتی ہے۔ سرچشمہ باید گرفتن بہ میل۔

ایک بزرگ بازار میں جا رہے تھے، ایک نوجوان نے انہیں سلام کیا، وہ چپ رہے اور جواب نہ دیا، بزرگ کے ساتھی نے کہا۔

”بھلا آپ نے یہ غیر شرعی حرکت کیوں کی، سلام کا جواب دینا چاہیے تھا؟“

بولے......

”تم نہیں سمجھتے، میں سلام کا جواب دیتا تو وہ اپنا تعارف کراتا اور کہتا، حاجی صاحب! آئیے چائے خانے میں چل کر چائے پیجیے۔ اس کی چائے پی کر اسے چائے پلانا میرا فرض ہو جاتا، اس کی میرے گھر میں آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ میری...... ایک جوان بیٹی ہے میں ایسے اوباش نوجوان کو اپنی بیٹی کا رشتہ ہرگز نہیں دے سکتا۔“

عیدایک خوشیوں بھراتہوار، روزہ داروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا انعام۔
عید کی پرنور، سہانی صبح طلوع ہوتی ہے تو ہر طرف ایک رونق اور خوشی کا سماں ہوتا ہے۔ نئے کپڑے، نئے جوتے، خوشبوؤں سے پورا گھر مہک اٹھتا ہے۔ مرد میٹھی سویاں یا شیر خورما کھا کر عید گاہ کا رخ کرتے ہیں تو خواتین اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ پہلے گھر کی صفائی، پھر خود تیار ہو کر کچن کا رخ کرتی ہیں۔ لڑکیوں اور بچیوں کی سج دھج تو دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ خوشیوں سے دمکتے چہرے، ہار سنگھار، چوڑیاں، مہندی، نت نئے ڈیزائن کے دلکش ملبوسات۔
نماز عید کے بعد مہمانوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔ چہل پہل، رونق، قہقہے، مسکراہٹیں اور عیدی کا لین دین، ساتھ ساتھ کھانے پینے اور خاطر تواضع کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔ کبھی میزبان بن کر، کہیں مہمان بن کر۔ یوں ایک خوشیوں بھرا دن اختتام کو پہنچتا ہے۔
حسب روایت عید نمبر میں قارئین سے سروے بھی شامل ہے، سوالات یہ ہیں۔
(۱) آپ عید کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں اور اس سے آپ کا بجٹ کتنا متاثر ہوتا ہے؟
(۲) عید کا دن کیسے گزارتی ہیں؟ مہمان بن کر، میزبان بن کر یا سو کر؟
آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

ادارہ

ریحانہ اعجاز......ڈیفنس کراچی

سب سے پہلے آپ سب کو بہت بہت عید مبارک۔ عید سروے کے جوابات کچھ یوں ہیں کہ اگر عید پر مہمانوں کی خاطر صرف بازار سے لائی اشیاء سے کی جائے تو یقیناً بجٹ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر گھر میں تھوڑی سی محنت کے بعد دو چار ڈشز بنالی جائیں مثلاً بریانی' شیر خرما اور دہی بڑے تو نہ صرف مہمانوں کی اچھے سے خاطر داری ہو جاتی ہے بلکہ گھر بھر کے لیے الگ سے کھانا بنانے کا جھنجھٹ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ ساتھ کولڈ ڈرنکس تو پھر سارا دن چلتی ہی ہیں۔ میں عموماً کئی سالوں سے یہی کرتی آرہی ہوں۔ آنے جانے والے مہمان بھی بہت خوش ہوتے ہیں اور گھر والے بھی اور الحمدللہ کبھی بھی بجٹ متاثر نہیں ہوا۔

عید کا دن تینوں طرح گزرتا ہے یعنی مہمان بن کر، میزبان بن کر اور سو کر، عید کی نماز کے فوراً بعد ہی مہمان خاص طور پر بچوں کے دوست آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ تین چار بجے قدرے سکون ہو جاتا ہے کہ بچے اور اعجاز اپنے اپنے دوستوں سے ملنے نکل پڑتے ہیں۔ اس وقت میں آرام سے دو گھنٹے سو لیتی ہوں۔ چھ سات بجے کے قریب فریش ہو کر تیار ہوتی ہوں تب بچے اور اعجاز آچکے ہوتے ہیں تو پھر ہم سب مل کر بہن بھائیوں سے عید ملنے نکل جاتے ہیں یوں رات گئے واپسی ہوتی ہے اور عید کا پہلا دن اختتام پذیر ہوتا ہے۔

سحر تبسم سحری...... مغل پورہ

عید کے لیے خصوصی اہتمام وہی جوتے، کپڑے، جیولری اور ہاں اس کے علاوہ گھر کی سیٹنگ صفائی ستھرائی، سب کچھ ٹوٹلی بدل جاتا ہے۔ عید تو تہوار ہی ایسا ہوتا ہے کہ خصوصی اہتمام ضروری ہوتا ہے۔ جہاں تک بجٹ کا سوال ہے تو اس دن بجٹ کو بندہ بھول ہی جائے تو اچھا ہے۔

عید کا دن اور سوکر؟ نہ جی نہ ہمیں تو عید کی رات کو بھی نیند نہیں آتی ہے تو دن کو کیسے آئے گی؟ عیدی جو سب سے ملتی ہوتی ہے۔ مہمان تو آتے رہتے ہیں، اسکولز فرینڈز اور ہمسائے اس کے علاوہ مجھے مہمان سے زیادہ میزبان بننا اچھا لگتا ہے۔ ہم ہر عید پر بیراج ضرور جاتے ہیں بہت مزہ آتا ہے سارا دن تھک کر بھی رات کو نیند نہیں آتی شاید عید کا دن ہوتا ہی ایسا ہے۔

مسرت الطاف احمد...... کراچی

عید کے لیے تیاریاں تو ایک ماہ سے پہلے شروع کی جاتی ہیں اب وہ گھر کی تفصیلی صفائی ہو یا کچن کی، اپنے آپ کو سنوارنے کے لیے بھی رنگا رنگ ملبوسات، دمکتی نازک چوڑیاں، جیولری کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ عید کے کپڑوں کے پیچھے گھنٹوں بازاروں میں خوار ہونا پڑتا ہے۔ جیولری سلیکٹ کرنا بھی میرے جیسے کانشس بندے کے لیے بہت محنت طلب کام ہے۔ مجھے چیزیں بہت مشکل سے پسند آتی ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ شوز سلیکشن ہے۔ کبھی ایک شاپ تو کبھی دوسری شاپس میں جاتے ہوئے ہمارے چہرے کی رونق دیکھنے والی ہوتی ہے لیکن باہر نکلتے ہوئے منہ لٹکا ہوگا۔ خیر بہت تلاش بسیار کے بعد وہ گوہر نایاب تو ہاتھ آہی جاتا ہے لیکن اس کے پیچھے ہمیں بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور کاسمیٹکس کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں وہ تو ہم ہفتوں، مہینوں لیتے ہی رہتے ہیں۔

اب گھر کی صفائی کی طرف آتے ہیں۔ عید کے لیے خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ عید، رمضان یا کوئی بھی تہوار ہو، گھر کی نہ صرف تفصیلی صفائی کی جاتی ہے بلکہ کچن اور گھر کی مختلف چیزیں بھی نئی لی جاتی ہیں۔ امی مجھ سے خصوصی کشن اور گول تکیے کے کور بنواتی ہیں۔ پردے اور قالین بھی چینج کیے جاتے ہیں۔ ہر روم اور ہال کی سٹینگ تبدیل کی جاتی ہے کچن پر تو خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

مسالوں کے نئے ڈبے لیے جاتے ہیں یا ان ہی ڈبوں کو اچھی طرح دھو کر خشک کر کے مسالے ڈالے جاتے ہیں۔ عید یا رمضان کے لیے مسالے اور مختلف اشیاء کی لسٹ بنتی ہے، ادرک لہسن کا پیسٹ بنا کر جار میں محفوظ کر کے فریزر میں رکھا جاتا ہے۔ کالے اور سفید چنوں کو بوائل کر کے فریز کیا جاتا ہے۔ قیمے اور چنے کی دال کے کباب بنا کر فریزر کیے جاتے ہیں۔ توے کی سیاہی کو بھی اچھی طرح دھوتے ہیں کہ اس کی چمک لوٹ آتی ہے۔ فریج کی تفصیلی صفائی کی جاتی ہے غرض کہ کوئی بھی چیز امی کی نظروں سے بچ نہیں پاتی۔

عید کی شاپنگ کے دوران غیر ضروری چیزیں بھی بے دریغ لی جاتی ہیں اور کچن اور گھر کے لیے بہت ساری نئی اشیاء بھی خریدی جاتی ہیں۔ امی اور ابو ضرورت مندوں کے لیے راشن، کچھ نہ کچھ چھوٹی یا بڑی چیزیں یا پیسوں کی صورت میں ہی ضرور رکھ لیتے ہیں۔ عید کی دعوتوں میں مہمانوں کے لیے انواع واقسام کی چیزیں بھی بڑے اہتمام سے بنتی ہیں جس سے بجٹ تو کافی متاثر ہوتا ہے لیکن پروا کسے ہے، عید کی یہ خوب صورت روایتیں اس تہوار کو دلکش بناتی ہیں۔

عید کے پہلے دن میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں کزن، تایا، چاچو سب ابو سے عید ملنے آتے ہیں جب کہ دوسرا دن قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سارا خاندان تایا، چاچو، ابو سب پھوپھیاں، خالہ، ماموں غرض خاندان کا ہر فرد دادا ابو سے عید ملنے جاتے ہیں لیکن اس بار دادا ابو ہم میں نہیں، وہ تو سب سے روٹھ کر ابدی نیند سو گئے۔ یہ عید ہمارے لیے سوگوار ہوگی۔

وہ شفقت بھرا چہرہ، وہ پیارا سا لمس ہمیشہ یاد رہے گا۔

عید کے تیسرے دن نانی اور نانا کی طرف جا کر خوب ہلا گلا کرتے ہیں۔ عید کا دن میرے لیے بہت خوب صورت اور منفرد ہوتا ہے اس دن کو اوروں کی طرح میں سونے کی نذر نہیں کرتی۔ عید تو نام ہے خوشیوں کا، محبتوں اور مسکراہٹوں کا......!

فریدہ گوہر

میری عید کی تیاری یکم شعبان سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ رمضان شریف اور عید کی تیاری کے لیے ساری شاپنگ اسی مہینے کرتی ہوں۔ رمضان شریف میں بازار جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو کسی افطار پارٹی میں بھی نہیں جاتی اور اپنے گھر میں افطاری بہت کم کرواتی ہوں۔ وہ بھی صرف مردوں کے لیے اہتمام کر لیتی ہوں۔ رمضان شریف میں تلاوت قرآن، وظائف کا ورد ہوتا ہے اور شب قدر کی عبادت کی لذت، لیکن عید کی تیاری میں نہیں بھولتی۔ چاند رات میں یہ تیاریاں اپنے پورے عروج پر ہوتی ہیں۔ مہندی لگانا، لگوانا بہت خوب صورت لگتا ہے۔ عید کی صبح جب بچیاں نیند سے بوجھل آنکھیں لیے کچن میں شیر خرما بناتی ماں کے پاس مہندی سے بھرے لال ہاتھ دکھانے آتی ہیں تو عید مسکراتی ہے۔

عید کی صبح بیڈز کی نئی چادریں عید کی خوشیوں کا اعلان کر رہی ہوتی ہیں۔ ایک دن پہلے اہتمام سے کی گئی صفائی آنکھوں کو ٹھنڈک دیتی ہے۔ اس پر گھر کے مختلف کونوں میں تازہ پھولوں پتوں سے سجے اونچے لمبے، چھوٹے بڑے گل دستے عجیب بہار دے رہے ہوتے ہیں۔

بوتل برش کے پودوں کی شاخیں گل دانوں میں خوب سجتی ہیں۔ پندرہ بیس دن یہ شاخیں پانی میں تازہ رہتی ہیں۔ مختلف مشروبات کی بوتلیں یہ شاخیں سجانے کے کام آتی ہیں۔ ان میں ایک گلاب کی شاخ لگا دیں تو ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ منی پلانٹ کے پودوں کی تراش خراش کر کے گھروں کا حسن بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ کام میں بھی کرتی ہوں۔ پام کے پودے برآمدوں اور صحن کی شان بڑھاتے ہیں۔ اس بار جون میں آنے والی عید پر موتیا کے پھولوں کے پودوں کا اہتمام کیا ہے۔ موتیے کے پودوں کے گملے کی ایک شاخ اگر دوسرے گملے کی مٹی میں دبا دی جائے تو چند مہینوں میں یہ شاخ ایک اور پودے میں بدل جائے گی۔ قینچی سے کاٹ کر

اس گملے کو الگ کردیں۔ مفت میں ایک اور گملا تیار ہوجائے گا۔

عید پر میں اپنے جہیز کی کراکری اہتمام سے نکالتی ہوں اور شیر خرما خاص طور پر ان ہی برتنوں میں سرو کرتی ہوں۔ ہر سال اپنے بچوں اور عزیزوں کو اس بارے میں بتاتی بھی ہوں۔ میرے دل میں اپنے والدین کے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا محسوس ہوتا ہے جنھوں نے مجھے شادی پر اتنی پیاری کراکری جہیز میں دی۔

عید کی دوپہر کھانے کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔

جس میں بریانی یا پلاؤ، شامی کباب، کوئی سا ایک سالن روٹی اور دیگر لوازمات ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مہمان اس کھانے میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی موقع پر سب حسب مراتب عیدی دیتے اور لیتے ہیں۔

عید کے کپڑوں کے لیے بھی مجھے کافی کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے پھر بھی بجٹ کا ایک بڑا حصہ اس پر خرچ ہوجاتا ہے۔ اس کے لیے مجھے خود سلائی سیکھنا پڑی۔ خود سینے سے بجٹ پر خاطر خواہ اثر پڑا ہے۔ شعبان کے مہینے میں شاپنگ اور سلائی کرتی ہوں۔ ہر جمعۃ المبارک کے لیے نئے کپڑے اور عید کے لیے نئے کپڑوں کا اہتمام، بس یوں ہوتا ہے کہ کسی شلوار کے ساتھ قمیص اور کسی قمیص کے ساتھ دوپٹا نیا کرکے سوٹ نیا ہوجاتا ہے۔ بچیوں کو کہاں یاد رہتا ہے کہ یہ دوپٹا پانچ سال کے بعد میں نے پیٹی سے نکالا ہے۔ لمبی قمیصوں کو چھوٹا کرنا تو آسان ہے لیکن چھوٹی قمیصوں کو لمبا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے ایکسٹرا کپڑے کی ڈیزائننگ کرکے لگانے یا بس جھالر لگانی پڑتی ہے۔ اس میں دماغ لڑانا پڑتا ہے۔

ہر سال میں بیڈ شیٹ نئی لیتی ہوں تاکہ کمروں میں جدت آئے۔ پرانی بیڈ شیٹس ماسیوں کو دینا نہیں بھولتی۔

کوئی مجھے پھولوں، مٹھائی اور عید کیک کا تحفہ بھجوائے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے کیونکہ میں بھی یہ ہی کچھ اپنے پیاروں کو بھجواتی ہوں۔

عید کے دن میں پہلے میزبان ہوتی ہوں۔ بعد

میں مہمان بنتی ہوں۔ ٹی وی لاؤنج میں خاص سیٹنگ کا اہتمام کرتی ہوں جو عید والے دن مہمانوں سے بھر جاتا ہے۔ دوست احباب رشتہ دار سب ہی جب مل بیٹھتے ہیں تو بہت سے مسائل کا ذکر ہوتا ہے، ان کا حل نکل رہا ہوتا ہے۔ مہندی، پھولوں کی خوشبو، بزرگوں کا پیار ہم جولیوں کی مسکراہٹ، عیدی اور تحائف کا لین دین۔ آنکھوں میں چمک بھر دیتی ہے۔ عید کے تہوار کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔ خوش رہو اور خوشیاں بانٹو، عید کا تہوار سو کر مت گزاریں۔ سوچیں ہم عید کے تہوار کی خوشیاں منانے کے لیے کیسے جدت پیدا کریں۔ کیا آپ میرے

ساتھ عید کا دن گزارنا پسند فرمائیں گی۔ خوشیوں سے بھرپور، بہت رنگین، یادگار دن۔

فرزانہ انصاری عرف گڑیا......کراچی

سب سے پہلے تو آپ سب کو اور تمام قائین کو "عید مبارک"

آپی! یہ پوچھیں عید کی تیاری کے لیے کیا نہیں کرتے؟ گھر اور کچن کی تفصیلی صفائی تو رمضان المبارک کی آمد سے پہلے ہی مکمل کرلی جاتی ہے۔ بس عید سے دو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دن پہلے تھوڑی بہت صفائی کرنی پڑتی ہے۔ ہم بچپن ہی سے عید بہت اہتمام سے مناتے آئے ہیں۔ عید پر نئے کپڑے، چپلیں، جیولری وغیرہ تو ہر کوئی ہی خریدتا ہے اب شادی کے بعد نئے مسالوں کے ڈبے، پردے، تولیے غرض ہر نئی چیز خریدنے کی ٹینشن ہوتی ہے کیوں کہ سب سامان عید پر ہی خریدتے ہیں تو بجٹ بے حد آؤٹ ہوجاتا ہے۔ ایک تو رمضان المبارک میں خرچا زیادہ ہوتا ہے۔ حسب توفیق ضرورت مندوں کی بھی مدد کرتے رہتے ہیں۔ آخری دو دن بہت پریشانی ہوتی ہے تو میرے بڑے بھائی اور خصوصی طور پر ذکر کرنا چاہوں گی اپنے بھتیجے ''دانش'' کا، وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

ہم کبھی بھی چاند رات کو بازار نہیں گئے۔ ہمارے والدین اور بھائیوں کو بالکل پسند نہیں تھا چاند رات پر بازار جانا اس لیے ساری تیاری پہلے ہی مکمل کرلیتے ہیں۔ چاند رات کو بس کپڑے استری کرنا، پردے وغیرہ لگانا، گھر سجانا اور ساتھ ساتھ ٹی وی دیکھنا، عید کے دن مہمانوں کی آمد کے لیے کھانے کی تیاری وغیرہ شامل ہے۔ ہاں چاند رات کو سب کو فون بھی ضرور کرتی ہوں۔ عید کی مبارک باد دینے کے لیے مہندی، فیشل وغیرہ رہ جاتا ہے تو وہ عید کی رات میں کرتے ہیں۔

عید کے دن فجر کی نماز کے بعد سے ہی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ چاند رات کے بعد یہ صبح فجر کے وقت گھر آتے ہیں۔ انہیں چائے وغیرہ دے کر عید کی نماز کی تیاری میں مدد کرواتی ہوں۔ حسن کو اٹھا کر ناشتہ وغیرہ کروا کر نماز کے لیے تیار کرتی ہوں۔ جب یہ نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں تو جلدی سے صفائی کرکے دو رکعت شکرانے کے نماز عید کے ادا کرتی ہوں۔ ہم نے اپنی امی کو بچپن سے ہی دیکھا ہے کہ نہا دھو کر، نئے کپڑے پہن کر آدمیوں کے جاتے ہی نماز عید ادا کرنا۔ وہی عادت ہم میں بھی آئی سب مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرنا۔

جب یہ نماز پڑھ کر آجاتے ہیں تو دستر خوان لگاتی ہوں۔ گھر کا بنا شیر خرما (جو کہ پہچان ہے) مٹھائی، کھجور وغیرہ کھا کر حسن اور یہ باہر چلے جاتے ہیں لوگوں سے ملنے، میں کچن سمیٹ کر ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔ اسی وقت میری نندوں کے (قریب ہی رہتے ہیں) ان کی ممانی کے بچے اور گلی میں سے کافی سارے بچے آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں عیدی دیتی ہوں۔ ان کی خاطر مدارت کرتی ہوں۔ دو بجے یہ سو جاتے ہیں میں دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتی ہوں۔ میری نندوں کی بیٹیاں میرے گھر پر ہی ہوتی ہیں تو کھانا وغیرہ ساتھ کھاتے ہیں۔ کھانے کے بعد وہ اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ میں بھی تھوڑی دیر لیٹ جاتی ہوں۔ دوپہر کے بعد کوئی نہیں آتا، کسی کو آنا ہو تو شام میں ہی آتا ہے۔ یہ تھوڑی سی مزاحیہ بات ہے کہ عید کے دن سارے مہمان بچے ہی ہوتے ہیں جو تین سے چودہ پندرہ سال کی عمر کے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کپڑے اور تیاری دکھانے آتے ہیں اور میں انہیں سراہتی ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

ہم کبھی بھی کسی بھی تہوار یا عید کے پہلے دن کہیں نہیں جاتے۔ امی کی سختی سے تاکید تھی کہ تہوار والے دن گھر میں تالا نہیں لگنا چاہیے۔ کہیں بھی جانا ہو دوسرے دن جاؤ، ہماری بھابیاں بھی عید کے دن کہیں نہیں جاتیں۔ دوسرے دن امی کے ہاں دعوت ہوتی تھی۔ تیسرے دن، میں اپنی نندوں، بھانجی بھتیجوں کو بلالیتی ہوں۔ عید کے دن سونے کی میں تو سخت خلاف ہوں۔ اتنا بڑا دن اللہ کا انعام اور ہم سو کر گزاریں یہ تو ناشکری والی بات ہوئی۔

پانچ بجے یہ اٹھتے ہیں۔ کھانا وغیرہ کھا کر یہ دکان چلے جاتے ہیں۔ حسن اپنی پھوپھیوں کے ہاں چلا جاتا ہے۔ میں فون پر سب سے بات کرتی رہتی ہوں کہ عید کا دن کیسے گزرا۔ رات میں مہندی لگوا کر جلدی سو جاتی ہوں کیوں کہ چاند رات اور عید کی تھکن ہوتی ہے۔

شادی سے پہلے ایک مرتبہ میں ''اخبار جہاں'' پڑھ رہی تھی لیٹ کر، سب گھر والے سو رہے تھے دوپہر میں

گھر میں سناٹا ہو رہا تھا تو نجانے میں بھی سوگئی اور سب سے آخر میں اٹھی، مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا میری بھتیجی کرن" نے کہا۔

"گڑیا باجی چائے بن گئی۔ چائے پی لو۔" تو فٹ سے آنکھ کھل گئی تو اس بات پر سب مذاق بناتے ہیں۔ ایک تو میری نقل اتار رہے ہیں تو سوتی ہی نہیں عید پر اور سوگئی تو اٹھ نہیں رہی)

اس عید پر امی نہیں ہوں گی۔ بہت کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اب کوئی یہ کہنے والا نہیں۔

"تھک گئی تھوڑا لیٹ جا، بس چھوڑ دے کام، تیری تو صفائی ہی ختم نہیں ہوتی۔ حسن کو نہیں مارا کر۔"

بس یہ سب بہت مس کرتی ہوں۔ سب بہن بھائی اپنی اپنی زندگی میں مگن رہتے ہیں۔ ایک مجھ سے بڑی بہن ہیں "بے بی باجی" اور "شکیل بھائی" وہ خیال رکھتے ہیں۔ فون وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ میری بھتیجی "کرن" غریبوں کی مدد کر کے بہت خوش ہوتی ہے۔ وہ بھی خواتین ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہے۔ نمرہ احمد، عمیرہ احمد فرحت اشتیاق کی بہت بڑی فین ہے۔

روبینہ شاہد...... کراچی

عید کے دن کے اہتمام کی بات ہو تو یادوں کی سنہری ڈوری سے بندھے کئی جھلملاتے، رنگ بکھراتے دن ماضی کی سیر کرانے لگتے ہیں جہاں بے فکری ہی بے فکری تھی۔ کیونکہ خوب سے خوب تر اہتمام کرنے کے لیے ہمارے والدین جو موجود ہوتے ہیں۔

بس عید کے دن سجنا، سنورنا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا اور مرضی سے سونا مرضی سے جاگنا۔ بجٹ وجٹ کے بارے میں سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا، پھر بابل کا آنگن چھوڑا اور پیا کے دیس میں قدم رکھا۔ مگر مشکل تو ہم پر حاوی ہونے کا موقع نہ ملا۔ ہم نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر میں خواتین، شعاع، اور کرن کو پایا، کیونکہ ہماری امی حد درجہ پڑھنے کی عادی تھیں۔ سو ہم بہنیں بھی عادی ہوگئے اور تمام قاری بہنیں اس بات سے اتفاق کریں گی بلکہ خطوط میں اظہار کرتی ہیں کہ ان ڈائجسٹوں نے ہمیں صرف دلچسپ

کہانیاں نہیں پڑھائیں بلکہ واضح پیغام دیا کہ ایک لڑکی، ایک خاتون یا ایک عورت کو کہاں کن صفات کی ضرورت ہے۔

خیر عید کا اہتمام اتنا ہی کرتے ہیں کہ بجٹ آؤٹ نہیں ہوتا کیونکہ ہم نے چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا ہی سیکھا ہے۔

مہندی سے رنگے ہاتھ (کیوں اب حنا کی خوشبو نہیں ہوتی) کھنکتی چوڑیاں، بہترین لباس اور میک اپ وجیولری اپنے ہی گھر میں مہمان سا بنا دیتے ہیں۔

پہلے ہم جوائنٹ فیملی میں رہا کرتے تھے تو عید کے دن میزبان ہی ہوتے تھے مگر اب کچھ عرصہ ہوا علیحدہ ہوگئے تو صبح سویرے عید کی نماز کے بعد تیاری شروع ہو جاتی ہے سسرال جانے کی۔ تو اب وہاں میزبان کم مہمان زیادہ ہوتے ہیں۔ سارا دن وہیں گزرتا ہے۔ دوسرے دن سے میکے کی دعوتیں پھر ایک ہفتے بعد ٹھیک اسی دن ہمارے گھر دعوت ہوتی ہے کیونکہ ہماری ساس عید کے چھ نفلی روزے بھی رکھتی ہیں۔ اس لیے اس روز ہم پکے میزبان ہوتے ہیں اور ہمارے گھر بڑی دعوت کا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اہتمام ہوتا ہے باقی کے دن ہم دعوتیں اُڑاتے ہیں اور رمضان کی نیندیں بھی پوری کرتے ہیں۔

سلیمہ وسیم ...... سکھر

عید کے اہتمام کے لیے بجٹ تو متاثر نہیں ہوتا کیونکہ عید کے لیے کوئی خصوصی اہتمام نہیں ہوتا۔ ویسے تو سب رشتہ دار (اہل سکھر) ہمارے گھر ہی جمع ہوتے ہیں کیونکہ عید گاہ ہمارے گھر کے برابر میں ہے تو جو نماز عید پڑھنے آتے ہیں، وہ ہمارے ہاں لازماً آتے ہیں ان کی تواضع کولڈ ڈرنک کے ساتھ کی جاتی ہے۔ شیر خرما بنتا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں چاچو کے پورے گھر والے آتے ہیں تو ناشتہ انڈے اور ڈبل روٹی کا ساتھ مل کر کرتے ہیں اور شیر خرما بھی کھاتے ہیں۔

عید کے دن ہم میزبان بھی بنتے ہیں مہمان بھی اور آخر میں سونے کا شغل کرتے ہیں۔ صبح چھ بجے اٹھتے ہیں۔ امی، میں اور چھوٹی بہن پورے گھر کی صفائی اور دھلائی کرتے ہیں۔ دادی اور امی شیر خرما بناتی ہیں۔ سات بجے تینوں بھائی، ابو اور تایا ابو کو نماز کے لیے جگایا جاتا ہے۔ وہ نہا دھو کر نماز کے لیے نکلتے ہیں تو پھر گھر کی خواتین تیار ہوتی ہیں تاکہ گھر کے مردوں کا بھرپور استقبال کرسکیں۔

جب مہمان آنا شروع ہوتے ہیں تو ان کو کولڈ ڈرنک اور شیر خرما سرو کیا جاتا ہے۔ پھر دس بجے چاچو کے تمام اہل خانہ حاضر ہوتے ہیں تو پھر ہمارا ناشتہ شروع ہوتا ہے۔ ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری اور ساتھ ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور مرد حضرات قبرستان چلے جاتے ہیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم لوگ رشتہ داروں کے ہاں جانے کا پروگرام ترتیب دیتے ہیں اور قیلولہ کرنے کے بعد ہم رشتہ داروں کے ہاں نکلتے ہیں تو رات ہی کو واپسی ہوتی ہے اور پھر ہم ہوتے ہیں اور ہمارا پیارا بستر۔

ارم ربانی ...... سویدرہ تحصیل وزیرآباد

جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ حالات واقعات نے ہماری خوشیوں کو بھی گرہن زدہ کردیا ہے۔ عید کی آمد پر وہ خوشی یا احساس جو کبھی بچپن میں ہوتا تھا۔ آج کے بچوں میں ایسا جذبہ ناپید ہے۔ آج کی عید تو انٹرنیٹ عید ہے۔ ہماری تمہاری سب کی۔ اہتمام کی بات کرتی ہیں۔ میرے گھر میں اہتمام صرف گھر کی صفائی ستھرائی، یا پھر نہا دھو کر نئے کپڑے پہننے تک محدود ہے باقی آپ خود جانتی ہوں گی کہ بریانی، کباب کی ڈشز تو ہمارے معاشرے میں تو تقریباً روزانہ ہی تناول فرمائی جاتی۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ ماں بننے کے بعد ہر احساس بچوں کے حوالے ہی سے معتبر ٹھہرتا ہے۔ میرے گھر میں میرے بچے میرے مہمان ہوتے ہیں اور بچوں کے لیے میں مہمان گرامی۔

رشتے داروں کی میزبانی کا شرف اتنا نصیب ہوتا یا پھر اس دور میں مہمانی، میزبانی کی اقدار تقریباً موقوف ہوتی جارہی ہیں۔ اس لیے کم از کم مجھے تو عید کی خوشی صرف بچوں کے حوالے ہی سے محسوس ہوتی ہے۔ اور یادوں میں اپنا بچپن رینگ رہا ہوتا ہے باپ کا آنگن، ماں کی ممتا، سہیلیوں کا جھرمٹ عید کی چوڑیاں اور سچی خوشی ...... کاش ....

یاسمین کنول ...... پسرور

عید کے لیے خصوصی اہتمام تو کرنا پڑتا ہے۔ پورے ایک سال کے انتظار کے بعد عید الفطر آتی ہے۔ بچوں کے کپڑے، جوتے، جیولری وغیرہ کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے اور بچوں کی رائے لے کر خریداری کرنا ہوتی ہے کیونکہ اصل عید تو بچوں کی ہوتی ہے ناں۔

جہاں تک بجٹ کی بات ہے تو وہ تو ظاہر ہے متاثر ہوتا ہے۔ گیارہ مہینے ایک طرف اور عید کا مہینہ دوسری طرف والی بات ہے۔ اس کے لیے ہر ماہ تھوڑا تھوڑا جمع کر کے علیحدہ رکھا جاتا ہے یا کبھی کبھار کمیٹی ڈالنی پڑتی ہے تاکہ عید کا تہوار اچھا گزرے۔

عید کا دن بڑے اچھے انداز میں گزارتی ہوں۔ لڑکوں کے کپڑے رات کو ہی استری کر کے رکھ دیتی ہوں صبح صبح نہا کر پہنتے ہیں پرفیوم لگاتے ہیں اور شیر خرما کھلا کر مسجد بھیج دیتی ہوں۔ ان کے جانے کے بعد خود بھی نہا کر فریش

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوجاتی ہوں گھر میں نماز عید ادا کرتی ہوں چند لمحوں میں بچے عید مبارک عید مبارک کہتے آجاتے ہیں۔ دعاؤں کے ساتھ عیدی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ لڑکیاں بعد میں سجتی سنورتی ہیں۔

ان کی سہیلیاں ملنے آجاتی ہیں تو ہم میزبان بن جاتے ہیں اور خود کسی دوست کے ہاں چلے جائیں تو مہمان بن جاتے ہیں ایک ہی دن میں مہمانی اور میزبانی ہوجاتی ہے۔ عید کا دن تو خوشی و مسرت سے لبریز ہوتا ہے دن میں نہیں سوتے البتہ رات کو تھک ہار کر خوشی کی نیند سوتے ہیں۔

صبا آصف

عید کے لیے میں بہت خصوصی اہتمام کرتی ہوں گھر کو اگر وائٹ واش کی ضرورت ہے تو وہ، پردوں کی دھلائی، گھر کی خصوصی صفائی ستھرائی، ان سب کاموں کا آغاز رمضان سے پندرہ بیس دن پہلے ہوجاتا ہے۔ آصف اور انس کے کپڑے لانے اور سلوانے، ہنزہ کی تیاری وہ تو اب سسرال سدھاری، اب ہنزہ کی عیدی ٹی سی ایس سے بھجواتی ہوں۔ اس کے کپڑوں کی شاپنگ، میچنگ جیولری، چوڑیاں، علی اور موسیٰ کے کپڑے، موسیٰ کے کھلونے ان سب کاموں کے لیے چھوٹی بہن انیلا کی مدد لیتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ

اسے خوش رکھے (آمین ثم آمین) گھر کو سجانا سنوارنا، گملے پینٹ کرنے، نرسری سے پھولوں والے گملے لانے، ڈرائنگ اور لاؤنج کے لیے آرائشی اشیاء وغیرہ لانے ان سب کاموں میں صاعقہ میرے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ دونوں مل کر پودوں کی نرسری جاتے ہیں۔ خوب صورت پھولوں والے گملے اور پودے لاتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کو سجاتے، نہ کوئی جیلیسی نہ کوئی مقابلہ، ایک دوسرے کو اچھی سے اچھی چیزیں دلوانی، فلاور شاپ سے پھول لینے بانا کا کورس جو کیا ہوا ہے۔ عید کے دن گھر کا گوشہ گوشہ پھولوں سے مہک رہا ہوتا ہے اور باورچی خانہ پکوان کی خوشبو سے، صاعقہ میری چھوٹی بہنوں جیسی ہے اور مجھے اپنی چھوٹی بہنوں شاہین، انیلا کی طرح عزیز ہے۔ گھر کو بہت اچھے سے سجانا سنوارنا سب گئے وقتوں کی باتیں ہیں لیکن میری اور صاعقہ کی دوستی اور اپناپن اسی طرح ہے بلکہ اس میں اور پائیداری آئی ہے۔ میرا بجٹ کم ہی متاثر ہوتا ہے۔ عید کے لیے میری پہلے سے پلاننگ ہوتی ہے اور میں ہر کام بجٹ کے اندر رہ کر کرتی ہوں۔ مجھے چھوٹی بہن انیلا، ابو اور آصف، میمن پارٹی کہتے ہیں (کنجوسی کی وجہ سے) کنجوس تو خیر میں نہیں ہوں، ہاں کفایت شعار کہہ سکتے ہیں۔

عید کا دن نہ پوچھیں کیسے گزارتی ہوں۔ اب سے چار سال پہلے نوجوان بھانجے کی اچانک ڈیتھ ہوگئی تو وہ دن اور آج کا دن ہر خوشی بے معنی ہوگئی ہے بس دل چاہتا ہے عید جلدی سے گزر جائے۔ عید رو کر یا سو کر گزارتی ہوں (نیند کی گولی کھا کر) دل چاہتا ہے نہ عید پر کوئی آئے اور نہ میں کہیں جاؤں کہ محسوس ہو کہ آج "عید" ہے۔ پچھلے سال باجی کے انتقال کے بعد پہلی عید تھی سب اکٹھے ہوئے تھے۔ اس بار ہمارے درمیان میرے پیارے ابو نہیں ہیں۔ باجی کے پانچ مہینے بعد وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔

پہلے میزبان بھی بنتے تھے اور مہمان بھی عید کے دوسرے دن جاتے تھے امی کے گھر دعوت میں، اب تو عرصہ ہوا جانا چھوڑ دیا۔ واپسی میں بہت مسئلہ ہوتا تھا ٹریفک جام کی وجہ سے، اس دفعہ ابو کے بعد پہلی عید ہے۔ برسوں کے بعد عید کے پہلے دن ابو کے گھر جانا ہوگا لیکن وہ نہیں ہوں گے اور یہ سوچ کر ہی دل...... ہمیں مہمان بنانے والے چلے گئے۔ بہت اصرار کرتے تھے۔

بیٹے کب آؤ گی، کیا کھاؤ گی، میں لے آؤں گا۔

بیٹے کے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے تھے۔ کبھی عید کے تیسرے چوتھے دن چلی بھی جاتی تھی۔ اب کون اصرار کرے گا بلائے گا۔

اقراء جٹ...... منچن آباد

سال بعد عید الفطر آتی ہے تو سب ہی خاص اہتمام کرتے ہیں۔ مٹھائی ہوتی ہے سویاں، رات کو ہی شیر خرما بنا کر رکھ دیتی ہوں پھر عید والے دن سارے مہمان آتے ہیں کھانا وغیرہ تو ظاہر ہے بجٹ متاثر ہوتا ہے کافی حد تک میں تو کچن میں گھستی تک نہیں۔ مما ہی سارا دن کام کرتی ہیں۔

عید کا دن، کیا پوچھ لیا۔ کبھی سو کر تو کبھی میزبان بن کر تو کبھی مہمان بن کر۔

زیادہ تر سو کر گزارتی ہوں، یا میزبان بن کر۔ پوری زندگی شاید پچھلے سال عید کے فرسٹ ڈے مہمان بن کر گئی تھی۔ ورنہ گھر پر ہی ہماری عید گزرتی ہے۔ اس دفعہ تو پاپا عمرہ سے آئیں گے عید پر تو بہت مہمان ہوں گے۔ سب کو میری طرف سے عید الفطر مبارک!

فریدہ عبدالرحیم...... کراچی

عید کے لیے اچھی تیاری کی جاتی ہے۔ رمضان سے پہلے بچوں کے لیے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں۔ پھر رمضان میں لڑکیوں کی تیاری زیادہ کرنی ہوتی ہے۔ چوڑیاں، جوتے، مہندی اور پکوان بنائے جاتے ہیں۔ بجٹ بہت متاثر ہوتا ہے مگر عید تو سال میں ایک بار آتی ہے۔

عید کا دن بہت اچھا گزارتی ہوں۔ بہت تیاری کرتی ہوں۔ رات میں پکوان بنا کر رکھ دیتی ہوں۔ صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو جاتی ہوں کیونکہ سسرال والے اور میکے والے صبح صبح آجاتے ہیں۔ ان کی مہمان نوازی کرتی ہوں۔ پھر دوپہر تک ان کے ہاں مہمان بن کر جاتی ہوں۔ ایک ہی دن میں عید کا مزہ لیتی ہوں۔

1۔ ''اصلی نام؟''
''زینب احمد۔''

2۔ ''پیار کا نام؟''
''گھر والے ''جینا'' کہتے ہیں اور فرینڈز ''وکی'' کہتے ہیں۔''

3۔ ''تاریخ پیدائش/شہر؟''
''15 فروری/اسلام آباد۔''

4۔ ''قد/ستارہ؟''
''5 فٹ 4 انچ/ ''

5۔ ''بہن بھائی/آپ کا نمبر؟''
''ہم دو بہنیں ہیں، بہن بڑی ہیں۔''

6۔ ''تعلیم؟''
''فلم، تھیٹر، ٹی وی اور فلم ڈائریکٹر کی تعلیم حاصل کی ہے۔''

باتیں زینب احمد سے

شاہین رشید

7۔ ''شادی؟''
''ابھی نہیں ہوئی، مگر پسند سے کروں گی۔''

8۔ ''شوبز میں آمد؟''
''چودہ سال کی عمر میں اداکاری شروع کر دی۔ اس وقت اسلام آباد میں تھی اور جب تعلیم کے لیے لاہور آئی تو ایک سٹ کام میں بہ حیثیت مہمان کے اپیرنس دی۔ مگر پھر اسے ایک مستقل کردار بنا دیا گیا بس پھر اس کے بعد آفرز آنا شروع ہو گئیں۔''

9۔ ''گھر والوں کا ردِعمل؟''
''گھر والے بہت سپورٹنگ تھے تب ہی تو کچھ کر سکی۔''

10۔ ''وجہ شہرت/ پہلا ڈرامہ؟''
''پہلا ڈرامہ ''لیسو منیجو ہار'' جو کہ اے آر وائی سے ٹیلی کاسٹ ہوا اور وجۂ شہرت ڈرامہ سیریل ''آبرو، دعا اور اب ماں صدقے۔''

11۔ ''پہلی کمائی؟/کہاں خرچ کی؟''
''اسلام آباد میں جب تھی تو ''تھیٹر'' میں کام کیا تھا تو وہ پہلی کمائی تھی۔ اور دوستوں کے ساتھ ٹرپ پر گئی تھی وہاں خرچ ہوئی۔''

12۔ ''شوبز کی بڑی برائی؟''
''میرے نزدیک تو کوئی برائی نہیں ہے۔''

13۔ ''آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟''
''منحصر ہے اس بات پہ کہ جب کام پہ جانا ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں اور نہ جانا ہو تو پھر دس بجے تک اٹھتی ہوں۔''

14۔ ''اٹھتے ہی طلب ہوتی ہے؟''
''کافی پینے کی۔''

15۔ ''دنیا میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟''
''کانشئنس ٹو ورڈز اپوری بڈی۔''
16۔ ''اچھی اور بری نیوز سب سے پہلے کس کو سناتی ہیں؟''
''اپنی امی کو۔''
17۔ ''اپنے آپ میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟''
''کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ پنکچوئل ہو جاؤں اور محنت اور لگاؤ یا لگن بھی۔''
18۔ ''فخر کا کوئی لمحہ؟''
''سچ بتاؤں کہ مجھے فخر محسوس نہیں ہوتا بلکہ میں تو اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہوں، جب بھی کوئی میری تعریف کرتا ہے یا میرا کوئی سیریل ہٹ ہو جاتا ہے۔''
19۔ ''بچپن کی کوئی بری عادت جو آج بھی موجود ہے؟''
''بچپن سے لے کر آج تک مجھے اپنے آپ کو تبدیل کرنے میں وقت لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہی میری بری عادت ہے۔''
20۔ ''طبیعت میں ضد ہے؟''
''نہیں...... اور کوشش کرتی ہوں کہ ضد نہ کروں......اور سامنے والے کی بات مان بھی لیتی ہوں۔''
21۔ ''بھوک میں آپ کی کیفیت؟''
''نڈھال ہو جاتی ہوں۔''
22۔ ''اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو؟''
''تو اٹلی جانا پسند کروں گی۔''
23۔ ''اگر کسی ارب پتی کا بلینک چیک مل جائے تو؟ اماؤنٹ؟''
''ایک ارب لکھوں گی۔''
24۔ ''سیاست میں آئیں تو کس کو فالو کریں گی؟''
''اپنی پارٹی بناؤں گی۔''
25۔ ''ایک نصیحت جو کرنا چاہتی ہوں لڑکیوں کو؟''
''بی اسٹرونگ اینڈ امپاورڈ۔''
26۔ ''جھوٹ کب بولتی ہیں؟''
''جب کسی کا دل رکھنا ہو۔''
27۔ ''گھر آ کر کیا دل چاہتا ہے؟''
''چائے اور صرف چائے۔''
28۔ ''شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟''
''محنت اور لگاؤ یا لگن۔''
29۔ ''کس کے ساتھ رومینٹک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟''
''ابھی تک تو سب ہی اچھے رہے ہیں۔''
30۔ ''کھیل سے آپ کا لگاؤ اور کون سا کھیل پسند ہے؟''
''کچھ خاص نہیں، لیکن کرکٹ اور فٹ بال بھی کبھی شوق سے دیکھ لیتی ہوں۔''
31۔ ''زندگی سے کیا سیکھا؟''
''یہی کہ نہ وقت سے پہلے کچھ ملتا ہے اور نہ ہی قسمت سے زیادہ کچھ مل سکتا ہے۔''
32۔ ''اپنے آپ کو کس عمر کا تصور کرتی ہیں؟''
''جو میں ہوں یعنی 28 سال کی ہوں میں۔''
33۔ ''عشق اور محبت میں فرق؟ آپ کو ہوا؟''
''عشق صرف خدا سے ہوتا ہے اور محبت انسانوں کے لیے ہوتی ہے......ہاں...... مجھے خدا سے عشق ہے اور اچھے انسانوں سے محبت ہے۔''
34۔ ''پہلی بار کیمرہ کا سامنا ہوا تو...... کیفیت؟''
''بہت نروس بھی تھی بہت ایکسائیٹڈ بھی تھی۔ لیکن ڈائریکٹر اور ''کو ایکٹرز'' بہت اچھے تھے تو پہلی بار میں ہی ٹیک اوکے ہو گیا۔''
35۔ ''کبھی ہجوم میں تنہا محسوس کیا اپنے آپ کو؟''
''جی اکثر۔''

36۔ ”دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟“
”اسٹیج پہ جانے سے پہلے۔“
37۔ ”گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟“
”امی سے۔“
38۔ ”مارننگ شو کی میزبانی ملے تو؟“
”ابھی نہیں کرنا چاہتی۔“
39۔ ”اپنی بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟“
”کچھ زیادہ ہی سیریس لے لیتی ہوں۔“
40۔ ”لالی ووڈ، ہالی ووڈ یا بالی ووڈ کہاں کام کی خواہش ہے؟“
”ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کرنے کی خواہش ہے۔“
41۔ ”اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچاتی ہیں؟“
”زیرو فیصد۔“
42۔ ”ایک محبت جو بھول نہیں سکتیں؟“
”ابھی تک تو کوئی محبت نہیں ہے۔“
43۔ ”کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟“
”اسلام آباد۔“
44۔ ”کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟“
”کوئی نہیں......نیند مجھے بہت پیاری ہے۔“
45۔ ”گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟“
”امی کے کمرے میں۔“
46۔ ”کبھی کرائسس میں وقت گزرا؟“
”بہت بار۔“
47۔ ”بی پی ہائی ہو جاتا ہے جب؟“
”جب اسٹریس لے لیتی ہوں۔“
48۔ ”آپ کے پرس کی تلاشی لیں تو؟“
”این آئی سی کا کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، کلب کارڈ، ڈیبٹ کارڈ اور بہت سارے سکے۔“
49۔ ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“
”ہر کوئی کرتی۔“

50۔ ”کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟“
”سلاد۔“
51۔ ”کھانا کھانا پسند ہے؟ ڈائننگ ٹیبل۔ اپنا بیڈ۔ چٹائی؟“
”ڈائننگ ٹیبل پہ۔“
52۔ ”سوشل میڈیا سے دلچسپی؟“
”کوئی خاص نہیں۔“
53۔ ”وقت کی پابندی کرتی ہیں؟“
”کوئی خاص نہیں۔ کاش ۔ کر سکتی۔“
54۔ ”کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتی ہیں؟“
”پاپا کے ہاتھ کی بریانی۔“
55۔ ”کوئی ایسی تاریخ جو بھول نہیں سکتیں؟“
”نہیں......کوئی نہیں۔“
56۔ ”دوسرے ملک میں جا کر کیا بات نوٹ کرتی ہیں؟“
”آزادی۔“
57۔ ”اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟“
”سوچنا پڑے گا......مگر میرا خیال ہے کہ میرا زیادہ خرچ ٹریولنگ پہ ہی ہوتا ہے۔“
58۔ ”کوکنگ سے آپ کو لگاؤ؟“
”کوکنگ سے زیادہ مجھے بیکنگ سے لگاؤ ہے۔“
59۔ ”ایک کردار جو کرنا چاہتی ہیں؟“
”طوائف کا رول کرنا چاہتی ہوں۔“
60 ”ایک کردار جو مقبول ہوا؟“
”مار [illegible] قے میں ”ماں“ کا کردار۔“
62۔ [illegible] کردار جو کر کے پچھتائیں؟“
”کوئی [illegible] ں۔“
63۔ ”آپ کی فیوچر پلاننگ؟“
”کام، کام اور صرف کام۔“
64۔ ”عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟“

"دونوں۔"

65۔ "ایک خواب جو بار بار دیکھتی ہیں؟"

"ٹریولنگ ٹو نیو پلین۔"

66۔ "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"لاہور۔"

67۔ "آئینہ دیکھ کر سوچتی ہیں؟"

"خوش ہوتی ہوں اپنے آپ کو دیکھ کر۔"

68۔ "شادی میں گفٹ دینا اچھا لگتا ہے یا کیش؟ اور پسندیدہ رسم؟"

"پسندیدہ رسم "ڈھولکی" اور کیش دینا اچھا لگتا ہے۔"

69۔ "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"پاپا کے ہاتھ کا۔"

70۔ "بدلہ لیتی ہیں؟"

"دل چاہتا ہے، مگر پھر اللہ پہ چھوڑ دیتی ہوں۔"

71۔ "کب فریش ہوتی ہیں؟"

"صبح کی کافی کے بعد۔"

72۔ "اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے؟"

"اپنے تجربے سے سیکھتی ہوں۔"

73۔ "دنیا میں اللہ کا بہترین تحفہ؟"

"میری فیملی۔"

74۔ "لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟"

"سیلفی کی۔"

75۔ "آپ کی کوئی انوکھی خواہش؟"

"بارش میں ڈانس کروں ساڑھی پہن کر۔"

76۔ "فلم؟ ماڈلنگ کی؟"

"نہیں ابھی تک نہیں کی۔"

77۔ "بچپن کا کون سا کھلونا آپ کے پاس محفوظ ہے؟"

"ٹیڈی بیئر۔"

78۔ "آپ کو فوبیا ہے؟"

"جی...... بہت ساری چیزوں کا۔"

79۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"جی ...... کیونکہ دل تو گدھے پہ بھی آ سکتا ہے۔"

80۔ "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"جی......بالکل۔"

81 "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"دل کی۔"

82۔ "غصے میں پہلا لفظ کیا نکلتا ہے؟"

"انٹرویو میں نہ ہی بتاؤں تو بہتر ہے (ہاہاہا)۔"

83۔ "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے یا؟"

"بہت وقت لگتا ہے۔"

84۔ "سونے سے پہلے ایک کام جو ضرور کرتی ہیں؟"

"نائیٹ کریم لگاتی ہوں۔"

85۔ "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"قسمت سے۔"

86۔ "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب کام نہ ہو۔"

87۔ "مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"

"بہت برے۔"

88۔ "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"موبائل، والٹ، پرفیوم اور لپ اسٹک۔"

89۔ "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟"

"ڈر لگتا ہے برے حالات سے، مگر پھر بھی ہر وقت دعائیں کرتی رہتی ہوں۔"

۔ "اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"

"تو کوئی مسئلہ نہیں۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

آئے کت کے ڈراموں نے اسامہ کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس نے خود کو الماری میں بند کر لیا جہاں وہ دم گھٹنے سے مر گیا۔ آئے کت نے اسے بچانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اسامہ کی موت نے پاشا کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے ساری سچائی کبیر کو اور کبیر نے معاویہ کو بتادی۔ آئے کت نے منصوبہ کے تحت معاویہ کو احساس جرم میں مبتلا کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ اپنی جھوٹی پریگنینسی اور مس کیرج کے ڈرامے سے اس نے معاویہ کی ہمدردی جیت لی۔ معاویہ کو پاشا جھوٹا لگنے لگا۔ اور اس نے محض آخری کال کرنے کی بنا پر شیرازی کو اسامہ کی موت کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ معاویہ نے آئے کت کا چیک اپ کروایا جس سے اس کا جھوٹ سامنے آ گیا وہ ماں بن ہی نہیں سکتی تھی مگر اس سے پہلے ہی آئے کت معاویہ کا رشتہ ٹھکرا کر ترکی چلی گئی تھی۔

اٹھائیسویں قسط

معاویہ پر یہ اطلاع پہاڑ بن کر ٹوٹی تھی۔
اتنا بڑا دھوکا۔۔۔
اس کا دل و دماغ جلنے لگا۔ وہ جو کہیں دل ہی دل میں اس کی جانب راغب ہو رہا تھا، انتقام کی آگ میں دیوانہ ہو گیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

وہ جانتا تھا کہ اردشیر ازی کبھی بھی اس معاملے میں اس کا ساتھ نہیں دیں گے اور اکیلا وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔
کچھ عرصہ پہلے انتقام کے لیے کی گئی ساری پلاننگ اس کے دل و دماغ میں تازہ ہوتی چلی گئی تھی۔ اس نے دوبارہ سارے پلان پر کام کیا۔ اس کی نوک پلک سنواری۔ اور پھر بڑی شان کے ساتھ اس پلاننگ پر عمل کرنے میں جُت گیا۔
وقت گزرتا گیا۔ دن پر دن گزرے اور راتیں چاند کے بڑھنے اور گھٹنے کے ساتھ آتی جاتی رہیں۔
وہ رات بھر سکون سے سوتا۔ یونیورسٹی جاتا۔ دوستوں سے ملتا۔ ویک اینڈ پارٹیز اور آؤٹنگز میں وقت گزارتا۔ بابا کہتے تو کبھی آفس بھی چلا جاتا۔ ہفتے میں دو بار طالب ماموں اور صاعقہ ممانی کو فون کرتا اور دیر تک ان سے باتیں کرتا رہتا۔
ان ہی سے آئے کت کے بارے میں بھی معلوم ہو جاتا۔ ان چند مہینوں میں وہ دو بار پاکستان کا چکر لگا چکی تھی اور وسامہ کے بوڑھے ماں باپ سے مل کر گئی تھی۔
معاویہ کے دل کا ایک کونہ وسامہ کے نام سے آباد تھا۔ بالکل ایسے جیسے قبرستان میں ایک قبر آباد ہو جاتی ہے۔ آپ جب جب اس کونے کا رخ کریں دل روتا ہے۔ آہیں اور سسکیاں جان کو آنے لگتی ہیں۔
جبکہ دوسرے کونے میں ارادے کی شمع روشن تھی۔ انتقام کا جذبہ اس شمع کی لو سے ایک کرن ادھار لے کر پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے خیالات پر عجیب سی بے چینی کا شکار ہو جاتا تھا لیکن پھر اسے وسامہ کی موت کا بدلہ لینے کا خود سے کیا ہوا عہد یاد آنے لگتا اور اس کا ارادہ مزید پختگی اختیار کر لیتا تھا۔
یہ تو نہیں تھا کہ اسے آئے کت سے کوئی افلاطونی محبت ہو گئی تھی۔ بس اُنسیت ہی ہوئی تھی۔ جواب ہر گزرتے دن کے ساتھ نفرت کی صورت بڑھتی رہی تھی۔ وہ ہر رات اسے یاد کرتے ہوئے سوتا اور صبح جاگنے پر پہلا خیال اسی کا آتا تھا۔ وہ کسی بھی حال میں اب کی بار اسے بخشنے کو تیار نہیں تھا۔
نفرت بھی محبت جیسی ہی ہوتی ہے۔ نفرت کا آغاز بھی اکثر ایسے ہی واقعات سے ہوتا ہے جو پہلے پہل چونکا دیتے ہیں اور پھر نفرت کا شکنجہ گلے میں ڈال کر اپنے ساتھ دوڑائے پھرتے ہیں اور وہ تو ہمیشہ سے جذباتی رہا تھا۔ محبت میں بھی شدت پسند اور نفرت بھی انتہا کی کرنے والا۔
دو تین بار اس نے آئے کت کو خود سے بھی کال کی تھی۔ کوئی بہت دوستانہ انداز میں باتیں نہیں کرتے تھے وہ بس ایسے جیسے دو واقف کار کچھ عرصہ بعد آپس میں بات چیت کر لیتے ہیں تو ایسے ہی ان کے درمیان باتیں ہوتیں اور پھر وہ فون بند کر دیتے۔
آئے کت کے لیے یہ بہت اطمینان کا مقام تھا۔ وہ وسامہ کے ماں باپ سے رابطے میں تھی اور دو تین بار معاویہ سے بھی بات کر چکی تھی۔ ان سب باتوں کا مطلب یہ تھا کہ اس کی سچائی ابھی تک کھل کر ان لوگوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔
بہت سوچ بچار کے بعد اب وہ پاکستان دوبارہ جانے کا ارادہ باندھ رہی تھی۔
جب اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی معاویہ اس کی سچائی نہیں جان پایا تھا تو اب امید کی جا سکتی تھی کہ مستقبل میں بھی وہ اس بارے میں کچھ نہیں جان سکے گا۔ تو پھر آخر ایک بار اور کوشش کرنے میں برائی ہی کیا تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت تو وہ دیکھ ہی چکی تھی۔ ضرورت تھی تو بس ایک بار اور معاویہ کے سامنے آنے کی۔
سوان کی ملاقات کچھ مہینوں بعد ہی ممکن ہو سکی تھی۔
اور یہ ملاقات ان دونوں کی اپنی اپنی پلاننگ کا حصہ تھی۔

صاعقہ ممانی کے چھوٹے بھائی کے بیٹے اور بیٹی کی شادی تھی۔ وسامہ نے اسے اپنے خاندان میں ایسے جگہ دلائی تھی کہ معاویہ جیسے ان ہی کا حصہ رہا ہو۔ درحقیقت وسامہ نے معاویہ کے ساتھ صرف اپنے ماں باپ ہی نہیں ہر وہ رشتہ ہر وہ چیز شیئر کی تھی جس سے اسے کسی بھی طرح کی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

تو خیر بلال اور اس کی بہن شازمہ کی شادی تھی اور انہوں نے بطور خاص معاویہ کو انوائیٹ کیا تھا۔ معاویہ نے باتوں باتوں میں بلال کو احساس دلایا کہ انہیں آئے کت کو وسامہ کی بیوہ کی حیثیت سے ہی سہی مگر شادی میں شرکت کی دعوت ضرور دینی چاہیے۔

معاویہ کی بات بلال کے دل کو لگی۔ آئے کت کو خصوصی دعوت نامہ دیا گیا اور کچھ نخرے دکھانے کے بعد وہ شادی میں شرکت کے لیے راضی ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ پاکستان آ گئی تھی۔

معاویہ کو اس نے مہندی والی رات ہی وہاں دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک ویسا ہی تھا۔ شاندار......

ہمیشہ کی طرح اس پر سے نظر ہٹانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

اور پھر وہ ہوا جو آئے کت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔۔۔ ایک ذرا سی تلخ بات پر معاویہ نے پورے اطمینان سے اپنی اور اس کی شادی کے بارے میں اعلان کیا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ایسا تو اس نے سوچا تک نہیں تھا۔ اسے اپنی قسمت پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی احساس ہوتا کہ یہ سب معاویہ کی سوچی سمجھی چال ہے تو وہ شاید پاکستان بھی نہ آتی۔

آگے کہانی تیزی سے بڑھی تھی۔

معاویہ نے سب سے پہلے ماموں، ممانی کو اپنے حق میں راضی کیا تھا۔ اب مسئلہ آئے کت اور اردشیر ازی کا تھا۔ جن کے غصے کا معاویہ نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ اردشیر ازی معاویہ کی سوچ سے واقف نہ تھے۔ انہوں نے غصے میں آئے کت کو فون کر کے برا بھلا کہا اور اسے معاویہ سے دور رہنے کی ہدایت کی۔

آئے کت کو معاملہ ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ اردشیر ازی کی طاقت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ان سے دشمنی مول لیتی تو وہ اس کا سارا کچا چٹھا کھول کر سامنے لے آتے۔ اس کے پاس دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ اردشیر ازی سے کچھ پیسہ مانگتی اور ہمیشہ کے لیے یہاں سے فرار ہو جاتی یا پھر وہ معاویہ کو اس بارے میں بتا کر تمام تر ہمدردی پہلے ہی اپنے ساتھ کر لیتی۔

وہ مشکل پسند تھی سو اس نے دوسرا راستہ چننے کا فیصلہ کیا۔ اس نے معاویہ کو کال کی تھی۔

''تمہارے بابا کا فون آیا تھا۔ وہ چاہتے ہیں میں تم سے شادی کرنے سے انکار کر دوں۔'' فون پر آئے کت نے اسے بڑے خراب موڈ کے ساتھ بتایا تھا۔

''بابا کی بات ماننے کی غلطی مت کرنا کیونکہ تمہارے لیے میں انہیں چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہوں لیکن ان کے لیے تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔'' جتنا آئے کت کا موڈ خراب تھا، اتنا ہی معاویہ نے اطمینان سے کہا تھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے معاویہ! یہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کیسی عجیب باتیں کرنے لگے ہو تم۔'' اس نے بڑی حیرانی سے کہا تھا۔

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا تھا۔ ''محبت ہو گئی ہے تم سے۔ اور اس محبت نے دیوانہ بنا دیا ہے مجھے۔'' اس نے جال بُننا شروع کر دیا۔

''ہوش میں آ جاؤ تو بہتر رہے گا۔۔۔ ایسا نہ ہو، یہ دیوانگی تمہیں لے ڈوبے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

''وہ محبت ہی کیا جو انسان کے ہوش سلامت رہنے دے۔'' اس نے لگاوٹ سے کہا تھا۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔تمہیں مجھ سے کوئی محبت وحبت نہیں ہے۔۔۔تم صرف وسامہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا چاہتے ہو۔''

''اب کیا محبت کا یقین دلانے کے لیے مجھے سر کے بل کھڑا ہونا پڑے گا۔''اس نے معصومیت سے سوال کیا تھا۔آئے کت کو ہنسی آ گئی۔

''معاویہ! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔۔۔۔لیکن۔۔۔میں وسامہ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔'' اس نے اپنے لہجے میں معذرت کا احساس پیدا کیا تھا۔

''وہ اس دنیا سے جا چکا ہے،اسے اس بات سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوگی کہ تم اس کی جدائی میں سنیاس لیتی ہو یا نہیں......ہاں......اگر تم خوش رہو،ایک نئی زندگی شروع کرو تو یقیناً اس کی روح کو خوشی حاصل ہوگی۔''

''روح کو؟'' آئے کت ٹھٹک سی گئی تھی۔

''ہاں۔۔۔روح کو۔۔۔آئے کت! مجھے ابھی خیال آیا۔۔۔کیا پتا،وسامہ کی روح بھی فلک بوس میں پھرتی ہو۔۔۔'' معاویہ کی آواز میں کاٹ تھی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' آئے کت نے جھرجھری لے کر کہا۔

''ہاں ناں۔۔۔تم خود سوچو۔۔۔اگر آیو تمتی کی روح وہاں بھٹک سکتی ہے تو کیا پتا۔۔۔۔''اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

آئے کت نے گہری سانس بھر کر کہا۔''جب تمہارا مذاق کا موڈ نہ ہو تب مجھے فون کرنا۔۔۔۔جب شادی کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو تیاریاں بھی تو کرنا ہوں گی۔''اس نے فون بند کر دیا۔اس ٹاپک کو ٹال دینا ہی بہتر تھا۔ویسے بھی وہ اپنی رضامندی معاویہ تک پہنچانا چاہتی تھی اور وہ یہ کام کامیابی کے ساتھ کر چکی تھی۔

دوسری جانب معاویہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔بالآخر وہ اسے رضامند کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔وہ تیزی سے کامیابی کی جانب بڑھ رہا تھا۔اب مسئلہ صرف اردشیرازی کا تھا۔جب انہوں نے دیکھا کہ معاویہ کسی طور ان کی بات ماننے کو راضی نہیں تو انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔

معاویہ کے کہے کے مطابق شادی کا انتظام فلک بوس میں کیا گیا تھا۔

اور جلد ہی وہ سب بشام آ گئے تھے۔

☆☆☆

یہ معاویہ اردشیرازی اور آئے کت کی مہندی سے دو دن پہلے کی بات ہے۔

بہار کا موسم تھا۔ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔موسم اتنا خوب صورت تھا کہ بیزار سے بیزار انسان کو بھی وہاں بیٹھ کر موسم سے لطف اندوز ہونے پر مجبور کر دے۔

مگر پاشا بغیر رکے چلتا چلا جا رہا تھا۔

سست قدم،جھکا سر،بیزار انداز اور چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں۔

اس کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

سب سے پہلے تو اس کا یہ احساس جرم ختم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ وسامہ طالب کے ساتھ غلط کرتا رہا ہے۔اصل دکھ تو اسے یہ تھا کہ آئے کت نے اسے بے وقوف بنایا تھا۔وہ عمر کے جس حصے میں تھا وہاں اپنے سے زیادہ عقل مند کوئی نہیں لگتا۔اس کے لیے یہ قبول کرنا بہت مشکل تھا کہ کوئی لڑکی اسے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کر چکی تھی۔

دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس کا باپ اس کی شادی کے لیے راضی نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ کسی ہندو لڑکی کے عشق میں مبتلا ہے۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ اس کی محبوبہ ہندو نہیں ہے بلکہ اس کا گناہ اس سے بھی بڑا ہے۔ وہ بابا کبیر کے دشمنوں کی بیٹی تھی اور ان کے یہاں دشمنوں میں شادی کرنے سے بہتر موت کو سمجھا جاتا تھا۔ وہ یقیناً پاشا کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس مصیبت سے کیسے نکلے۔

آئے کت نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ معاویہ اردشیرازی اس کے باپ سے بات کرتا تو وہ ضرور راضی ہو جاتے لیکن آئے کت کی اصلیت سامنے آنے کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ معاویہ سے اس سلسلے میں کوئی مدد مانگتا۔ آئے کت سے تو بات کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

فلک بوس کے مالکان واپس آ گئے تھے۔ معاویہ اردشیرازی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور یہ جاننے کے بعد کہ دلہن اور کوئی نہیں بلکہ وسامہ طالب کی بیوہ آئے کت ہے، وہ فلک بوس سے نکل آیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ معاویہ اور آئے کت کا سامنا کرتا۔

اس نے معاویہ کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔ اس کے سامنے آئے کت کی سچائی بیان کی تھی۔ اس کے ہاتھوں مار بھی کھائی تھی۔ اس کے لیے یہ حیرت کا مقام تھا کہ سب جاننے کے بعد بھی معاویہ شیرازی، آئے کت کو نا صرف معاف کر چکا تھا بلکہ اس سے شادی بھی کر رہا تھا۔

"تو کیا معاویہ اردشیرازی بھی اس کھیل میں برابر کا شریک تھا؟" اس نے دکھ سے سوچا تھا۔

"کیا اس سارے معاملے میں وسامہ کے بعد صرف مجھے ہی پاگل بنایا گیا تھا۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ تو پھر تو میں بھی وسامہ طالب کی موت بلکہ قتل میں برابر کا شریک ہوں۔"

اس کا احساس جرم کچھ مزید بڑھ گیا تھا۔

وہ چلتا چلتا جنگل میں اس گول پتھر کے پاس جا پہنچا جہاں وہ شہر بانو سے ملتا تھا۔ پتھر سے ٹیک لگائے وہ نڈھال سا زمین پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچوں کا جال بچھا تھا۔

شہر بانو اس سے سخت خفا تھی اور اس کے پاس خفا ہونے کی ایک نہیں کئی وجوہات تھیں۔ اعتراضات کی ایک پوری لسٹ تھی جو وہ سنانا شروع کرتی تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

سب سے پہلے تو اسے پاشا کے بزدلوں کی طرح شہر بھاگ جانے پر اعتراض تھا۔ اسے پاشا کام چور لگنے لگا تھا جو اپنے باپ دادا کی طرح بشام میں رہ کر محنت کر کے کما نہیں سکتا تھا۔ وہ یہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی کہ اسے شہر بھیجنے کا فیصلہ اس کا اپنا نہیں بلکہ اس کے باپ کا فیصلہ تھا۔

اسے اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ پاشا کا باپ فلک بوس کے مالکوں کی چاکری کرتا ہے۔

اس کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ پاشا ابھی تک اپنے باپ کو ان کی شادی کے لیے نہیں منا پایا تھا۔ بقول اس کے، اس کے بہت سے رشتے آ رہے تھے اور اس کا باپ جلد ہی اس بارے میں کوئی فیصلہ کر لے گا۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور ان کے خاندان میں لڑکی کو اس عمر میں بیاہ دینا ہی مناسب سمجھا جاتا تھا۔

پاشا کے ساتھ اس کا رویہ بہت کٹھور تھا۔ وہ اس سے بات نہیں کرتی تھی اور اگر بات کرتی تھی تو اس کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے پاشا اسے اس کام پر زبردستی مجبور کر رہا ہے۔ اس کے چہرے کے بے زار کن تاثرات اس کا دل دکھاتے تھے۔ اس سارے معاملے میں آخر اس کا قصور ہی کیا تھا۔ وہ تو اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا۔

شاید پاشا اس بات کا کچھ خاص نوٹس بھی نہ لیتا لیکن......

اسے کل ہی اس کے دوست نے باتوں باتوں میں اطلاع دی تھی کہ اس نے شہر بانو کو وادی کے ایک اور لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے۔ بقول اس کے، اس لڑکے نے شہر بانو کے گھر شادی کا پیغام بھی دیا ہے اور اس کا باپ اس رشتے کے لیے راضی نظر آتا ہے۔
پاشا کا دل اس اطلاع کے بعد سے جل رہا تھا۔ بہت مشکل سے وہ شہر بانو کو اس بات پر راضی کر پایا تھا کہ وہ ایک بار جنگل میں آ کر اس سے ملے تا کہ اس مسئلے کا کوئی بہتر حل نکالا جا سکے۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر پھر اس کی منتوں پر وہ اس سے ملنے آنے کو راضی ہو گئی تھی۔
پاشا نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس کا باپ اب بھی اس شادی کے لیے راضی نہ ہوا تو وہ شہر بانو کو یہاں سے بھگا کر ساتھ لے جائے گا۔ وہ شہر میں اپنی ایک نئی دنیا بسائیں گے اور کبھی مڑ کر بشام کا رخ نہ کریں گے۔
الغرض...... شیخ چلی کی ٹوکری میں انڈوں کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔
سورج مغرب کی جانب اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔
شام تیزی سے رات کی جانب بڑھ رہی تھی۔ فلک بوس دور سے بھی روشنیوں میں جگمگاتا ہوا صاف دکھائی دیتا تھا اور پاشا اب تک گول پتھر سے ٹیک لگائے، شہر بانو کا منتظر تھا۔

☆☆☆

تو ہوا کچھ یوں تھا کہ اسے دو گھنٹے انتظار کروانے کے بعد بالآخر شہر بانو وہاں آ گئی تھی اور آتے ساتھ ہی اس نے اگلے ہفتے اپنی منگنی کی اطلاع دی تھی۔ پاشا کے لیے یہ اطلاع کسی بم بلاسٹ سے کم نہیں تھی۔ شہر بانو اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ یقیناً وہ اپنے باپ کے دباؤ میں آ کر ایسا کر رہی تھی۔
بے چاری شہر بانو۔۔۔
''تم بالکل فکر مت کرو بانو۔۔۔ میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' اس نے بانو کے ہاتھ تھام کر تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا مگر اگلے ہی لمحے شہر بانو نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے تھے۔
''سب ٹھیک ہو جائے گا بانو'' وہ بے بس سا کہہ رہا تھا۔ ''میں...... میں سب ٹھیک کر دوں گا۔''
''اچھا'' شہر بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ میں اب بھی مان لیتی ہوں تمہاری بات۔ تم سب ٹھیک کرو گے پاشا! تو آؤ میرے ساتھ۔ میرے باپ کے پاس چلو اور مانگ لو میرا ہاتھ اس سے۔''
''یار! ایسے کیسے......؟ مجھے کچھ وقت دو۔ میں بابا کو منا لوں گا۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔
''یہ بات تو تم مجھے ایک سال سے کہہ رہے ہو پاشا! کوئی نئی بات کہو جس پر میں یقین بھی کر سکوں۔''
''مجھ پر بھروسا تو کرو شہر بانو! ایسے ظاہر مت کرو جیسے تم مجھے جانتی نہیں ہو۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا بھی نہیں رہا؟ میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شہر بانو! میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔'' پاشا نے اپنی بات پر زور دے کر کہا تھا۔
''کیا کرو گے تم؟'' اس نے تلخی سے پوچھا تھا۔
''میں نے سب سوچ لیا ہے اگر بابا نہ مانے تو...... میں...... نہیں...... ہم...... ہاں ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ ہم شہر جائیں گے...... کراچی...... ہاں ہم کراچی چلے جائیں گے۔ وہ بہت بڑا شہر ہے۔ اور یہاں سے بہت دور ہے...... تم میرا ساتھ دو گی نا؟ میرے ساتھ چلو گی نا؟'' پاشا نے بڑے مان سے پوچھا تھا۔
اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سرد نگاہوں سے چپ چاپ اس کی شکل تکتی رہی تھی۔
''ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے بانو! ہمیں کوئی نہیں ڈھونڈ پائے گا۔ نہ میرے ماں باپ...... نہ تمہارے...... ہم...... ہم خود کو کیوں اس دشمنی پر قربان کریں۔ یہ آگ ہماری لگائی ہوئی نہیں ہے تو ہم اپنا آپ کیوں جلائیں؟ مجھ پر یقین کرو۔ میں تمہیں خوش رکھوں گا۔ میں تم سے کیا ہر وعدہ نبھاؤں گا۔ تم بس مجھے ایک

موقع دو...... میرے ساتھ چلو۔"

"یہ ممکن نہیں۔" شہر بانو نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"مگر کیوں؟" وہ کراہ کر بولا۔ "میں محنت کروں گا۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں وعدہ کرتا ہوں بانو!"

"مرد بنو پاشا خان! تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ان وعدوں پر یقین کر کے اپنے باپ کا سر شرم سے جھکاؤں اور تمہارے ساتھ بھاگ چلوں...... تف ہے تم پر۔" شہر بانو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چلا تھا

"زبان سنبھالو شہر بانو!" وہ غرایا۔

"اور تم اپنی سوچ سنبھالو۔۔۔ وعدے تو تم جانے کب سے کر رہے ہو پاشا۔۔۔! میں ساری زندگی تمہارے وعدوں کی نذر نہیں کر سکتی۔" اس کے لہجے کی قطعیت پاشا کو حواس باختہ کر گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب شہر بانو بول رہی تھی۔

"مجھے ایک موقع تو دو۔۔۔ میں ثابت کر دوں گا کہ میں تمہیں دھوکا نہیں دے رہا۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"سال بھر سے یہی سنتی آرہی ہوں میں۔۔۔ کہ تم سب ٹھیک کر لو گے۔۔۔ کیا ٹھیک کر پائے تم؟ اپنے باپ تک کو تو اس رشتے پر راضی نہیں کر پائے اب تک۔۔۔ راضی کرنا تو دور تم تو اسے یہ بھی نہیں بتا پائے کہ جس لڑکی کو تم چاہتے ہو صغیر علی کی بیٹی ہے۔۔۔ باتیں کرتے ہو سب ٹھیک کرنے کی۔۔۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے پتا ہے۔۔۔" پاشا کو اس کا انداز برا لگا تھا۔ "مجھے پتا ہے میں تمہاری بہت سی امیدیں پوری نہیں کر سکا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے ایسے چھوڑ دو۔۔۔ بانو! میں جانتا ہوں، تمہیں بھی تمہارے گھر والے مجبور کر رہے ہوں گے ورنہ تم کبھی میرے ساتھ ایسا نہ کرتیں۔۔۔ مگر۔۔۔" پاشا دل گیر لہجے میں بولتا جا رہا تھا جب شہر بانو نے اس کی بات کاٹی۔

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرے گھر والے میرے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر رہے۔" اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

پاشا مزید کچھ بول نہیں سکا۔ اس کے الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ ہمت کر کے بولا تھا۔ "تو یہ سب۔۔۔ تم۔۔۔ تمہاری۔۔۔ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے؟"

"دیکھو پاشا۔۔۔! اب کچھ باقی نہیں رہا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ تمہیں اس بات کو سمجھنا ہوگا۔۔۔"

"میں کیا سمجھوں شہر بانو؟" وہ دبی دبی آواز میں چیخا۔ "میں یہ سمجھوں کہ اس سب میں تمہاری مرضی شامل ہے؟ یا میں یہ سمجھوں کہ تم مجھے پاگل بنا رہی تھیں۔ جب تمہیں مجھ سے بہتر کوئی مل گیا تو اب تم چاہتی ہو کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں اور سب بھلا دوں۔"

"ہاں۔ میں یہی چاہتی ہوں۔ تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھو...... مجھے پروا نہیں مگر ایک بات اچھے سے جان لو پاشا خان کہ تم ایک بزدل انسان ہو۔ تم میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے کہ کبھی اپنے باپ کے سامنے سچ بول سکو۔ کبھی اسے میرے بارے میں بتا سکو۔ تم صرف باتیں کر سکتے ہو اور وہ تو تم ایک سال سے کر ہی رہے ہو۔۔۔" وہ سانس لینے کو رکی۔ پاشا پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب بہتر ہوگا پاشا! کہ مجھ سے دور رہو۔ میرے بابا تمہارے بارے میں جان چکے ہیں۔ اور تم اچھے سے جانتے ہو کہ اگر تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"کیا تم یہ سب اسی لیے کر رہی ہو کیونکہ تمہیں ڈر ہے کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے؟" پاشا کے دل میں پر خوش فہمی نے سر اٹھایا۔

"نہیں...... یہ میں اس لیے کر رہی ہوں کیونکہ میں اپنی زندگی ایک بزدل انسان کے لیے ضائع نہیں کر سکتی۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔

اپنی بات مکمل ہوتے ہی وہ تیزی سے واپس جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔

"شہر بانو۔۔۔ شہر بانو۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔ خدارا رک جاؤ۔۔۔ مجھے ایک موقع دو۔۔۔" وہ بھی اس کے پیچھے لپکا تھا لیکن شہر بانو رکی تھی نہ ہی اس نے اس کی بات کا کوئی جواب دیا تھا۔

"شہر بانو۔۔۔" اس نے چیخ کر پکارا تھا لیکن اس کی آواز سننے کے لیے اب وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

☆☆☆

تیزی سے رات میں ڈھلتا دن اب اتنی روشنی نہیں رکھتا تھا کہ نظریں دور تک دیکھ پاتیں۔

وہاں سناٹا تھا، خاموشی تھی اور تیزی سے پھیلتا اندھیرا تھا اور یہ سب تو وہاں کے باسیوں کا مقدر تھا۔

کچھ ایسا ہی سناٹا اور خاموشی شہر بانو سے بات کرنے کے بعد اس کے دل پر بھی چھا گیا تھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر سامنے کی جانب دیکھا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اس سے آگے دور تک پھیلی ہوئی قبریں۔۔۔ یہ بشام کا قبرستان تھا۔۔۔ اور اس درخت کے نیچے بھی ایک قبر تھی۔ جس کے پاس کوئی بیٹھا تھا۔

پاشا نے کم ہوتی روشنی میں غور سے دیکھا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ معاویہ اردشیرازی، وسامہ طالب کی قبر کے پاس بیٹھا تھا۔ پاشا کے دل میں نفرت سی پھیل گئی۔ وہ تو انجانے میں مارا گیا تھا لیکن معاویہ اردشیرازی سب جانتے بوجھتے وسامہ طالب کو دھوکا دے رہا تھا۔

وہ ست رفتاری سے چپ چاپ معاویہ کے پیچھے ایک پتھر پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے معاویہ کی پشت کو تک رہا تھا۔ کچھ دیر میں اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

وہ دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیر رہا تھا جب اس نے معاویہ کی آواز سنی۔

"جس تھالی میں کھایا ہو، اسی میں سوراخ کرنے کے بعد قبر پر فاتحہ پڑھ لینے سے معافی نہیں ملتی پاشا خان۔۔۔" اس کے لہجے کی تلخی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ آواز آنسوؤں کے بوجھ سے لرزاں تھی۔

پاشا نے اس کے الفاظ بغور سنے اور پھر سر جھٹک کر کہا۔

"تو کیا سگے بھائیوں سے بڑھ کر محبت کرنے والے دوست نما کزن کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہوئے قبر پر آنسو بہا لینے سے پیشگی معافی مل جاتی ہے معاویہ صاحب؟"

پاشا کی آواز معاویہ سے بھی زیادہ سرد تھی۔

وہ اس وقت جذباتی طور پر اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا کہ بولنے سے پہلے سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس قسم کی بات سننے کے بعد معاویہ اردشیرازی کیسے بھڑک اٹھے گا۔ وہ انجام سے لاپروا اپنی بات مکمل کر گیا تھا۔

معاویہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا، پھر زمین کا سہارا لے کر اٹھا اور اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ کھل کر کہو۔۔۔" معاویہ نے سرد آواز میں پوچھا تھا۔

"میں کیا کہنا چاہوں گا صاحب۔۔۔! میں نے تو بس آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

معاویہ خاموشی سے اس کی شکل تکتا رہا۔
"میں نے اپنے بھائی کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔"
"میں نے کب کہا صاحب! کہ آپ نے اپنے بھائی کو دھوکا دیا ہے۔" پاشا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بول رہا تھا۔
"میں بچہ نہیں ہوں پاشا خان کہ تمہاری باتوں کا مطلب اور تمہارے لہجے کی بغاوت کو سمجھ نہ سکوں۔ اچھے سے جانتا ہوں کہ تم کیا جتا رہے ہو۔" معاویہ نے رخ بدلتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ فاصلے پر رکھے دوسرے پتھر پر جا کر ایسے بیٹھ گیا تھا کہ پاشا کی جانب اس کی پشت تھی۔
پاشا نے جواب دینے کی بھی زحمت نہیں کی اور دوسری جانب دیکھنے لگا۔
"کیوں کیا پاشا تم نے یہ سب؟ مجھے نہیں تو وسامہ کو ہی سچ بتا دیا ہوتا تو شاید آج وہ زندہ ہوتا۔ شاید وہ اتنی تکلیف دہ موت کو گلے نہ لگاتا۔" معاویہ کی آواز میں نمی در آئی۔
پاشا نے افسردگی سے اس کی پشت کو دیکھا۔
"میں نے تو جو کچھ کیا' وہ لاعلمی میں کیا تھا معاویہ صاحب۔۔۔! مگر معذرت کے ساتھ آپ تو سب کچھ جان بوجھ کر کر رہے ہیں۔ یا شاید آپ اس سارے معاملے میں آئے کت بی بی کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔"
"اپنی حد میں رہو پاشا۔۔۔!" معاویہ غرایا۔
"اگر آپ سچ بولنے کو حد سے گزرنا کہتے ہیں تو معذرت چاہتا ہوں۔" وہ سرد لہجے میں جواب دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "مگر آپ اس سارے معاملے میں صرف مجھے قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ میں تو بے خبری میں مارا گیا۔ جو سچ تھا میں، آپ کو بتا چکا ہوں۔ اب آپ کی مرضی یقین کریں یا نہ کریں۔"
معاویہ نے سر موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور پھر نرمی سے بولا۔ "تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو پاشا۔۔۔! جو کچھ ہوا میں اس میں حصہ دار نہیں تھا۔ میں بھی اتنا ہی بے خبر تھا جتنے تم۔۔۔ میں۔۔۔ میں تو بس وسامہ کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ اس لیے ان سب حقائق پر بھی آنکھیں بند کر لیں جن پر سچ جانا جا سکتا تھا۔۔۔ ایسا سچ جو میرے بھائی کو تکلیف دیتا۔۔۔"
"صاحب! میں بھی بے خبر ہی تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آئے کت بی بی مدد کا وعدہ کر کے مجھ سے کیسے گناہ کروائے گی۔" اس کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔
"کیسی مدد؟" معاویہ چونک کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔
"انہوں نے کہا تھا کہ بابا کو میری شادی کے لیے راضی کریں گی۔۔۔ اور انہوں نے وسامہ صاحب کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کہیں کہ میں ان کی مدد کو راضی ہو گیا۔"
معاویہ کی آنکھوں سے گویا خون چھلک اٹھا تھا۔
"میرا بھائی نفسیاتی مریض نہیں تھا۔ ہاں آئے کت نے اسے ضرور پاگل کر دیا تھا۔"
پاشا نے اثبات میں سر ہلایا۔
"پاشا خان! اس معاملے میں تو میں بھی تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔" معاویہ نے کہا تھا۔
"اس کی اب ضرورت نہیں ہے صاحب! اس لڑکی کی اگلے ہفتے منگنی ہے۔ میری محبت پہلے ہی میرے بابا کی دشمنی کی نذر ہو چکی ہے۔" پاشا نے سپاٹ سے انداز میں کہا تھا۔
معاویہ نے چند لمحے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا مگر مزید تفصیلات نہیں پوچھی تھیں۔
"اپنی محبت کو چھوڑنا تو بزدلی ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

''مجھ پر بزدلی کا ہی الزام ہے اور اس سب میں شہر بانو کی مرضی شامل ہے سو اب بزدل بننے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔''

''جب آپ کو آپ کی چیز صبر سے بھی نہ ملے پاشا خان! تو اسے چھین لینا چاہیے۔'' معاویہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے نئی راہ دکھائی تھی۔

پاشا نا سمجھی سے اس کی شکل تکنے لگا۔

''اگر اسے حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی محبت کی تذلیل کا بدلہ تو لو۔ ثابت کرو کہ تم بزدل نہیں ہو۔''

''میں اسے معاف کر چکا ہوں صاحب!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''بالکل ویسے جیسے آپ آئے کت بی بی کو معاف کر چکے ہیں۔''

''تم سے کس نے کہا کہ میں آئے کت کو معاف کر چکا ہوں؟'' معاویہ کے چہرے پر پراسرار سے مسکراہٹ سمٹ آئی تھی۔

''چلو پاشا! ایک ڈیل کر لیتے ہیں۔ تم آئے کت سے بدلہ لینے میں میری مدد کرو اور میں شہر بانو سے بدلہ لینے میں تمہاری مدد کروں گا۔ ویسے بھی تمہارا کچھ حساب کتاب تو آئے کت کی جانب بھی نکلتا ہے۔''

پھر وہاں سے گزرتی ہواؤں، سرو قد درختوں اور میں نے بھی دیکھا۔۔۔ معاویہ، پاشا کے برابر کھڑا آہستہ آواز میں اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ شادی کے انتظامات کا جائزہ لیتے ہوئے کبیر بابا کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

''آپ کیسے ہیں بابا کبیر؟''

''میں ٹھیک ہوں چھوٹے صاحب! آپ کیسے ہیں؟''

''میں جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں۔۔۔ آپ کے چہرے پر خوشی نظر نہیں آ رہی مجھے۔'' سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے معاویہ نے شکوہ کناں انداز میں کہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ان کی بات پر بھروسا نہ کر کے اس نے ان کا دل دکھایا تھا۔

''کیا میں یہ سمجھوں میری شادی کی خبر نے خوش نہیں کیا آپ کو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے چھوٹے صاحب!'' بابا کبیر نے ہڑبڑا کر کہا تھا۔ ''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یہ سن کر کہ آپ آئے کت بی بی سے شادی کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر ضرور دے گا۔ وادی میں سب کہہ رہے ہیں، آپ بھائی کی بیوہ سے شادی کر کے بہت بڑی نیکی کما رہے ہیں۔''

''اپنی نیک دلی کی دھاک جمانے کے لیے میں یہ شادی نہیں کر رہا۔'' وہ قدرے چڑ کر بولا تھا پھر جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بات ہی پلٹ دی۔ ''اچھا...... چھوڑیں اس بات کو۔۔۔ مجھے پتا چلا پاشا بھی آیا ہوا ہے؟ کہاں ہے، دکھائی نہیں دیا اب تک۔'' اس نے بابا کبیر کے بیٹے کے متعلق پوچھا تو بابا قدرے چڑ چڑے لہجے میں بولے۔

''یہیں کہیں ہو گا یا نیچے وادی میں چلا گیا ہو گا۔ پڑھائی چھوڑ کر بشام آ گیا ہے۔ کہتا ہے شادی کرو میری ورنہ واپس نہیں جاؤں گا۔''

معاویہ نے اس بات پر محظوظ ہوتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا تھا۔ ''تو کروا دیں اس کی شادی۔ اس میں کون سی انوکھی بات ہے۔''

اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی معاویہ کو آئے کت دکھائی دی تھی اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کے

پیچھے چل پڑا تھا۔

وہ تیز تیز چلتی آگے جا رہی تھی۔ معاویہ نے دبے قدموں اسے جا لیا۔ پہلے داہنے کندھے کو پیچھے سے چھوا وہ پلٹی تو معاویہ ذرا سا اوٹ میں ہو گیا پھر داہنے کندھے کو چھوا۔ آئے کت پوری کی پوری گھوم گئی تو معاویہ نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

"تم ہمیشہ مجھے پہچان لیتی ہو۔"

آئے کت مسکرائی۔ "ابھی بھی نہیں پہچانوں گی تو کب پہچانوں گی۔ ویسے تم سے پہلے تمہارے پرفیوم کی خوش بو مجھ تک تک پہنچ جاتی ہے۔"

"پرفیوم چینج کر لوں گا اور پھر تمہاری محبت کا امتحان لوں گا۔" وہ چڑا رہا تھا

آئے کت نے مسکراہٹ لبوں کے کناروں میں دبا کر اسے دیکھا۔ "لیکن میں نے یہ کب کہا مجھے تم سے محبت ہے؟"

"تم نہ کہو...... بے شک نہ کہو لیکن میں ساری دنیا کو بتا دینا چاہتا ہوں مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔ نہیں محبت نہیں عشق ہے۔" وہ بازو پھیلا کر چہرہ اوپر اٹھا کر آہستہ آہستہ ایسے گول گول گھومنے لگا جیسے کوئی مجذوب ہو۔ عشق میں دیوانہ۔

"نہیں، یہ عشق بھی نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔ عشق سے آگے اگر کوئی اور منزل ہے تو میں اس منزل تک پہنچ گیا ہوں۔ میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو مجھے تمہارا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میں آنکھیں کھولتا ہوں تو میرا ذہن تمہارے خیالات سے نکل نہیں پاتا۔ ان چند مہینوں میں میں نے تمہیں اتنا سوچا ہے آئے کت۔۔۔! کہ میں، میں نہیں رہا شاید تم ہو گیا ہوں۔"

بازو پھیلائے گول گول حرکت کرتا وہ اتنے جذب سے بول رہا تھا کہ آئے کت ہکا بکا ہی رہ گئی۔

اتنی محبت، اتنی چاہت۔۔۔

اتنی نفرت، ایسی شدت۔۔۔

"لیکن معاویہ۔۔۔!" وہ سہم کر بولی۔ محبت کی اس بلندی نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ جنہیں محبت دیر سے ملتی ہے، وہ وہمی بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ "میں نے واقعی کبھی نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔؟" وہ رکا اور ایک دم سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "تمہاری آنکھوں سے جھلکتی ہے میری محبت۔۔۔ تمہارے چہرے پر لکھا ہے کہ میرے عشق نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔۔۔ تمہاری پیشانی پر بس ایک ہی تحریر ہے کہ معاویہ شیرازی میرے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور ایسے مان و یقین بھرے میں لہجے میں بولتا وہ کوئی دیوانہ سا محسوس ہوتا تھا۔ آئے کت کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ محبت نے اسے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔

"کچھ زیادہ ہی شاعرانہ موڈ نہیں ہو رہا جناب کا؟" اپنی لرزتی پلکوں سے جھلکتے اعتراف کا راز چھپانے کے لیے اس نے چہرہ ہی دوسری طرف موڑ لیا تھا۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی سے ایسا طنز جھلکتا تھا جو آئے کت کے گمان سے دور تھا۔

ایسے ہی ہنستا ہوا وہ برآمدے کی گرل پر کہنیاں ٹکا کر نیچے وادی میں جھانکنے لگا۔

آئے کت نے بھی اس عمل میں اس کا ساتھ دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" معاویہ کو تکتے ہوئے ــــ اس نے پوچھا تھا۔

"میں سوچ رہا تھا۔ اچھی شادی ہو رہی ہے ہماری۔۔۔ میں تو تمہاری شکل دیکھنے کو ہی ترس گیا ہوں۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''شادی ہو جانے دو۔۔۔بس پھر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے ہی وقت گزرا کرے گا۔'' وہ شرارت سے گویا ہوئی۔

''سوچتا ہوں، تم میری دلہن بن کر کیسی لگو گی؟''

''ویسی ہی جیسی سب دلہنیں لگتی ہیں۔''

''نہیں۔۔۔تم عام دلہن نہیں ہو۔۔۔تم بہت خاص ہو۔۔۔''

معاً آئے کت چونک کر دائیں طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دل سہم گیا اور یہ ہراس اس کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگا۔

''کیا ہوا؟'' معاویہ نے اس کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے لگا میں نے وہاں کسی کو دیکھا ہے؟'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

''لیکن وہاں پر تو کوئی بھی نہیں ہے آئے کت۔۔۔!'' معاویہ نے پرسکون سے انداز میں اس طرف دیکھا جس طرف آئے کت نے اشارہ کیا تھا۔

''نہیں معاویہ۔۔۔! مجھے دھوکا نہیں ہو سکتا۔۔۔وہاں پر ابھی کوئی تھا اور چھپ کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔'' اس کی آواز میں ان دیکھا سا ڈر تھا۔

''ہو سکتا ہے آیو تمتی ہماری شادی میں شرکت کرنے پہنچ گئی ہو۔'' معاویہ نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

''پلیز معاویہ! بی سیریس۔'' وہ چڑ کر بولی۔ معاویہ پھر سے ہنسنے لگا۔

''تمہارا وہم ہو گا یار۔۔۔! لیکن تمہیں یقین نہیں ہے تو چلو۔۔۔ہم خود جا کر دیکھ لیتے ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس طرف چلنے لگا جس طرف آئے کت کو کسی کی موجودگی کا گمان ہوا تھا۔

''نہیں۔۔۔نہیں رہنے دو۔'' آئے کت نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''میرا وہم ہی ہو گا۔'' اس کی آواز اور لہجہ گو کہ اس کی بات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

آئے کت بوکھلا سی گئی تھی۔ ٹاپک بدلنے کے لیے وہ معاویہ کو ـــــ اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ وہ اسے اپنی شادی کا جوڑا دکھانا چاہتی تھی۔ وہ بے تحاشا خوش تھی اور فی الحال کسی ایسی بات کا ذکر نہیں چاہتی تھی جس کا تعلق اس کی پچھلی زندگی سے ہو۔

وہ معاویہ کا ہاتھ پکڑ کر جاتے ہوئے مڑ مڑ کر راہداری کے کونے کی طرف دیکھتی رہی۔ جہاں ابھی بھی ایک ہیولہ اسے حرکت کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور آئے کت کی الجھن بڑھا رہا تھا۔

جب وہ دونوں وہاں سے جا چکے تو دور راہ داری کے کونے سے ایک سایہ باہر نکلا تھا۔ اس نے اپنے لبادے کے کنارے کو چہرے پر سے سرکا دیا تھا۔ وہ پاشا تھا۔ وہ چند لمحے اسی سمت میں دیکھتا رہا جدھر آئے کت اور معاویہ گئے تھے اور پھر مخالف سمت میں چل دیا۔

☆☆☆

مہندی کی رات فلک بوس میں ستاروں کے جھرمٹ کی رات تھی۔

رسم شروع ہوئی اور دیر تک ان پر روپے وارے جاتے رہے۔ انہیں مہندی اور ابٹن میں شرابور کر دیا گیا۔ اتنی خوشی اور رنگوں کے بیچ معاً آئے کت کی نظریں اٹھیں اور وہ دھک سے رہ گئی۔ بہت اوپر، فلک بوس کی چھت کے کنارے مصنوعی روشنی کی کرنوں سے دور ایک تن تنہا ہیولہ نجانے کب سے کھڑا ان دونوں کی خوشیوں کو اپنی نظر بد سے نگلنے کو تیار کھڑا تھا۔

☆☆☆

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سب کی نظروں سے چھپ چھپا کر وہ اپنے کالے لبادے کو چھوٹے سے بیگ میں رکھے فلک بوس کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ اب اسے کسی ایسے کونے کا انتخاب کرنا تھا جہاں سے وہ آسانی سے آئے کت کی نظروں میں آ سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے معاویہ کے کہنے کے مطابق اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ وہ کسی اور کی نظروں میں نہ آتا۔ جلد ہی وہ ایک ایسا کونا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ فلک بوس کی آرائش کے لیے لگائی گئی لائٹس کی روشنی سے ہٹ کر دولہا دلہن کے لیے بنائے گئے اسٹیج کے دائیں جانب ایک کارنر تھا جہاں روشنی نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

پاشا نے اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد بیگ سے اپنا لبادہ نکال کر اوڑھا اور اس کارنر میں جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے وہاں تب تک رہنا تھا جب تک وہ آئے کت کی نظروں میں نہ آ جاتا۔

اور اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

کچھ ہی دیر میں آئے کت نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

وہاں اندھیرا تھا لیکن وہ کامیاب رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ آئے کت اپنا چہرہ موڑ لیتی، پاشا نے اسے چونک کر اپنی جانب دیکھتا پایا تھا۔ اتنی دور سے بھی اس کے چہرے پر پھیلا ہوا خوف وہ محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو مطمئن ہوتے محسوس کیا تھا۔

☆☆☆

"معاویہ!" آئے کت نے بے ساختہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

معاویہ نے اسے دیکھا آئے کت کا چہرہ ابٹن سے بھی زیادہ زرد دکھائی دیتا تھا اس نے آئے کت کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ دور چھت پر کھڑا پاشا اس وقت کسی کو بھی ڈرا سکتا تھا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آسیب جیسی کوئی چیز یہاں پر ہے ہی نہیں۔۔۔ کوئی ضرور ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے۔"

آئے کت کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کا خون بالکل خشک ہو رہا تھا۔

"لیکن اس بار ہمارا وہم نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں نے اسے دیکھا ہے۔" معاویہ نے مصنوعی فکرمندی سے کہا۔

"نظروں کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ بعض دفعہ آنکھوں دیکھی چیزیں بھی سچ نہیں ہوتیں۔" وہ بری طرح چڑ گئی۔ "یہ تو میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آسیب اور بدروح جیسا کچھ نہیں ہے فلک بوس میں۔ یہ وسامہ کا ذہن تھا جس نے من گھڑت کہانیاں بنالی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون ہے جو ہمیں آسیب کا جھانسہ دے کر بے وقوف بنا رہا ہے۔"

وہ اتنے پریقین لہجے میں کہہ رہی تھی کہ کچھ دیر کے لیے معاویہ اس کا چہرہ ہی دیکھتا رہ گیا۔ اس کا خون کھول رہا تھا آئے کت کے انداز پر۔ مگر اس نے کہا بھی تو بس اتنا۔

"مجھے لگتا ہے ہم نے پھر غلطی کر دی۔ شادی کرنے کے لیے ہمیں فلک بوس آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"نہیں، فلک بوس آنا ہماری غلطی نہیں ہے۔ ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم اپنے دشمن کو ایک بار پھر کھلا چھوڑ رہے ہیں۔" آئے کت نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" معاویہ نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مطلب یہ کہ میں نے بھی وسامہ کے ساتھ فلک بوس میں دو سال گزارے ہیں۔ ان دو سالوں میں وہ آسیب مجھے کبھی دکھائی نہیں دیا نہ ہی میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ وہ وسامہ کا وہم تھا اور کچھ نہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ آسیب ہے ہی نہیں۔ تو فلک بوس میں ایسا کون ہے جو ہمیں آسیب بن کر ڈرانا

چاہتا ہے۔"
وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا ہے اور وہ ان تمام پہلوؤں پر غور کر رہی ہے جو ممکنات میں سے تھے۔ آسیب کی موجودگی اس کے اندر ڈر کو جنم دے سکتی تھی لیکن دشمن کا احساس پریشانی کا سبب بن رہا تھا۔
معاویہ کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا خوبصورت چہرہ نوچ لے۔
"آسیب اسی صورت میں ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے جب ہم پر اس کا کوئی قرض واجب الادا ہو۔ تم خود سوچو جو عورت ایک سو سال پہلے مر چکی ہے بالفرض اگر اس کی روح فلک بوس میں بھٹکتی بھی پھرتی ہے تو وسامہ نے اس کا کیا بگاڑا تھا کہ اپنا بدلہ پورا کرنے کے لیے اس نے وسامہ جیسے اچھے انسان کو ہی مار دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈرا سکتی تھی۔ جسمانی طور پر چوٹ پہنچا سکتی تھی لیکن قتل کیوں کرے گی، وہ اس کا؟ تم مانو یا نہ مانو۔ کوئی نہ کوئی ایسا ہے جو ہم سب کو مارنا چاہتا ہے اور وہی ہمیں اس آسیب کا نام لے کر اس کا سایہ دکھا کر ڈرا رہا ہے۔"
وہ پریشان تھی اور پریشانی میں بولتی ہی جا رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی باتیں اس کے اپنے پچھلے بیانات کی نفی کر رہی تھیں۔ معاویہ اسے دیکھتا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آئے کت کو کیا کہے۔
"اتنے گیسٹس انوائیٹڈ ہیں یہاں۔ مجھے فکر ہے، وہ آسیب مہمانوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔" معاویہ نے پھر وہی ذکر چھیڑا۔
"پھر وہی بات۔ تم کیوں آسیب آسیب بولتے جا رہے ہو؟" پریشانی میں وہ تڑپ کر بولی تھی۔
"کیونکہ اسی آسیب نے میرے بھائی کی جان لی ہے۔" معاویہ اس سے زیادہ تڑپ کر بولا۔
"اور میں نہیں چاہتا وہ آسیب یہاں مزید کسی کو کوئی نقصان پہنچائے۔"
"اگر تم میری بات مانو گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ یقین کرو میری بات کا۔" وہ یقین سے بولی تھی۔
"کیا چاہتی ہو تم۔ کیا کروں میں۔" وہ ذرا حیران ہو کر بولا تھا۔
"مجھے چھت پر جانے دو۔" اس نے ایک دم سے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ "وہ سایہ جو ہم نے چھت پر دیکھا۔ جب تک میں اس کا پتا نہ چلا لوں۔ سکون سے نہیں بیٹھوں گی۔" اپنے لہنگے کو دونوں طرف سے انگلیوں سے ذرا سا اٹھاتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی لیکن اگلا قدم اٹھنے سے پہلے معاویہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔
"پاگل پن مت کرو۔ میں تمہیں اوپر جانے نہیں دوں گا۔" وہ قطعیت سے بولا تھا
"پاگل پن میں نہیں تم کر رہے ہو۔ ڈر کر بیٹھے رہیں گے تو وہ جو کوئی بھی ہے اسے اور شہ ملے گی۔"
"اور وسامہ کے بعد اگر اس نے تمہیں بھی کوئی نقصان پہنچایا تو؟" اس نے جان بوجھ کر جملے کے آخر میں ایک سوالیہ نشان چھوڑ دیا تھا۔
"میں تو زندہ ہو کر بھی مرے ہوؤں سے بدتر ہو جاؤں گا آئے کت! اسے کھونے کے بعد اب تمہیں بھی گنوا دینے کا حوصلہ نہیں ہے میرے اندر۔" وہ بہت منت اور بے چارگی سے بول رہا تھا۔
"دنیا میں چند ہی لوگ ہیں جن سے میں نے محبت کی ہے اور وہی چند لوگ میری زندگی میں باقی نہیں رہے۔ پہلے ماں، پھر وسامہ اور اب تم بھی۔" اسے ہر حال میں اسے اوپر جانے سے روکنا تھا۔
وہ جذباتیت کی انتہا پر تھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ آئے کت کا دل ویسے ہی پگھلا جیسے تب پگھلا تھا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔
"مجھے کچھ نہیں ہوگا معاویہ! میری بات کا یقین کرو۔" ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے منت سے کہا

لیکن اتنی ہی شدت سے معاویہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''ہرگز نہیں۔ لیکن اگر تمہیں شک ہے تو ہم گارڈز کو بلا کر فلک بوس کی تلاشی کروا لیتے ہیں۔ اگر وہ واقعی کوئی آسیب نہیں جیتا جاگتا انسان ہے تو اتنی ٹائیٹ سیکیورٹی میں چھپ کر بھی نہیں رہ سکتا۔ ابھی سب پتا چل جائے گا۔''

انہوں نے سیکیورٹی انچارج کو بلوا کر سارے فلک بوس کو چھان مارا۔ ایک ایک کمرہ، ایک ایک راہ داری اور ایک ایک خفیہ راستہ تک دیکھ لیا، یہاں تک کہ تہہ خانہ بھی نہیں چھوڑا لیکن کوئی ہوتا تو ملتا۔ پاشا تو آئے کت کو اپنی جھلک دکھاتے ہی اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔
سیکیورٹی چیکنگ کے بعد۔ آئے کت کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کا دل معاویہ کی پلاننگ کے عین مطابق عجیب طرح سے پریشان ہو گیا تھا تو دوسری طرف معاویہ کے ذہن و دل میں شکوک اور خدشات جنم لے رہے تھے۔ شادی کی رسومات کو ابھی کئی دن تک چلنا تھا لیکن معاویہ کے اصرار پر نکاح کی رسم اگلے ہی دن طے کر لی گئی۔ ہر ایک نے اس سے اس عجلت کا سبب پوچھا لیکن وہ محبت کا بہانہ بنا کر ٹالتا رہا۔ آئے کت سمجھی تھی کہ وہ کسی بدمزگی کے خدشے کے تحت یہ جلدی مچا رہا تھا اور نکاح کے فوراً بعد فلک بوس سے نکل جانا چاہتا تھا جب کہ سچ تو یہ تھا کہ معاویہ کا دل اس ڈرامہ سے اکتا چکا تھا۔ وہ جلد از جلد آئے کت کو وہاں پہنچانا چاہتا تھا جہاں اس کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی۔

☆☆☆

''گڈ ورک پاشا۔۔۔'' معاویہ نے مسکراتے ہوئے پاشا کا کندھا تھپتھپایا تھا۔
پاشا صرف مسکرا کر رہ گیا۔
معاویہ مہندی کی رسم ہونے کے بعد رات گئے پاشا کے ساتھ اس تہہ خانے میں موجود تھا جہاں وسامہ نے اپنی زندگی کی بازی ہاری تھی۔ پاشا تہہ خانے کے دروازے کے لاک بدل رہا تھا جبکہ معاویہ ہاتھ میں ٹارچ پکڑے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔
''تمہارے بابا کو اندازہ تو نہیں ہوا؟'' معاویہ نے پوچھا تھا۔ ''یا کسی اور نے تو تمہیں چھت کی طرف جاتے نہیں دیکھا؟''
''نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں جس راستے سے اوپر گیا تھا اور پھر واپس آیا تھا، وہاں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔۔۔ سو کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔''
''بہت اچھے۔ مجھے خوشی ہے پاشا کہ تم نے ایک صحیح فیصلہ لیا۔ مجھے یقین ہے کہ اب وسامہ کے ساتھ ساتھ آیومتی کی روح کو بھی سکون مل جائے گا۔'' معاویہ نے کہا تو پاشا خفیف سا ہنس دیا۔

☆☆☆

اگلے دن نکاح سے کچھ دیر پہلے وہ آئے کت سے ملنے اس کے کمرے میں گیا۔ بیوٹیشن اور اس کی مددگار لڑکیاں اسے سجانے سنوارنے میں مصروف تھیں۔ آئے کت تیار ہو چکی تھی۔
''ہم آپ کو دلہن سے ملنے نہیں دیں گے۔'' بیوٹیشن نے اسے دیکھ کر دروازے پر ہی شوخی سے کہا تھا۔
''کہتے ہیں اگر دولہا نکاح سے پہلے دلہن کو دیکھے تو اس پر روپ نہیں آتا۔'' ایک دوسری لڑکی نے شوخی سے کہا تھا۔
معاویہ کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''روپ چاہیے ہی کسے۔'' اس نے دل میں سوچا تھا۔
اس نے دروازے میں ہی کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔ دور سنگھار میز کے سامنے آئے کت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس

کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ ذرا سا گردن اور چہرے کو موڑے معاویہ کی باتوں پر کان لگانے کی کوشش کر رہی تھی اس کوشش میں اس کے چہرے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ اونچے جوڑے کی وجہ سے صراحی دار گردن کا خم کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔

''میں ایسی کسی بات پر یقین نہیں رکھتا۔'' اس نے مسکراہٹ چھپا کر ذرا سنجیدگی سے کہا۔ ''آگے سے ہٹیں اور مجھے اندر آنے دیں۔''

وہ سب فوراً محتاط ہو کر سامنے سے ہٹیں اور معاویہ اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے ان سب کو باہر جانے کا حکم دیا تو وہ آگے پیچھے باہر نکل گئیں۔ معاویہ آئے کت کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

بولنے کا ارادہ تھا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی ہر لفظ بھول گیا۔ اس کی بات آئے کت کے حسن کی نذر ہو گئی۔

''اس حسین چہرے کے پیچھے کیسا گھناؤنا چہرہ چھپا ہے، یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔'' وہ خود سے بہ زبان خاموشی کہہ رہا تھا۔

اس کا شاہی لباس، اس کے زیورات اور اس کی آرائش۔ کیا چیز تھی جو اس پر اس کے وجود کا حصہ نہ معلوم ہوتی ہو۔

آئے کت نے اس کو بت بنے خود کو دیکھتے پایا تو اس کی آنکھوں میں چمکتی ستائش کو حق کی طرح وصول کرتے ہوئے مسکرائی اور سنگھار میز کے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

گو کہ اس کے سوال میں سوال نہیں۔ پورا ایک جواب پنہاں تھا، وہ جانتی تھی وہ اس وقت دنیا کی سب سے خوبصورت دلہن لگ رہی ہے۔ اس کے حسن کو کسی کے لفظوں کی ضرورت نہیں۔ محبوب کی آنکھیں جب ستائش کے رنگوں سے بھر جاتی ہیں تو محبت کا دل لفظوں کی قید سے آزاد ہو کر دھڑکنے لگتا ہے۔

''میں نے دنیا میں اس سے خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا۔ تم اب تک کہاں تھیں؟'' وہ جیسے اس کے حسن کے سحر میں گم صم سا بول رہا تھا۔

''یہیں تھی، لیکن تمہیں کبھی دکھائی ہی نہیں دی۔'' وہ شرمیلی مسکراہٹ لبوں میں دبا کر بولی۔

وہ ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

آئے کت نے حیران ہو کر اسے دیکھا تو بولا۔

''کاش! تم مجھے پہلے دکھائی دے گئی ہوتیں آئے کت! کاش......!''

وہ نہ اس کی ہنسی کا مطلب سمجھی نہ بات کا۔

''مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی معاویہ!''

''میں ٹھیک ہوں۔ بس پریشان ہو گیا ہوں۔ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ کہیں تمہیں بھی مجھ سے چھین نہ لے۔''

''ہمیں ایک دوسرے سے کوئی نہیں چھین سکتا اب۔ اپنے اپنے حصے کے دکھ اپنے اپنے حصے کی مجبوریوں کا بوجھ اٹھا چکے ہیں ہم۔ اب ہم اپنی زندگی جئیں گے۔ اپنی خوشیوں سے جھولیاں بھریں گے۔'' وہ پُریقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''ہاں۔ ایسا ہی ہوگا۔'' وہ گہری سانس بھر کر اس کی طرف پلٹا۔

''میں نے اپنی محبت کا حصار باندھ دیا ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔'' وہ مسکرایا۔ ذرا سا جھکا اس کے سر پر بوسہ دیا اور پھر تیزی سے اس کے منہ پر اپنی ہتھیلی جما دی۔

آئے کت نے تڑپ کر اس کے بازو کو کلائی سے تھام کر پیچھے ہٹانا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکی تھی۔
معاویہ نے دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں کو سر کے پچھلے حصے سے مضبوطی سے تھام لیا تھا۔
وہ تڑپ رہی تھی مگر خود کو چھڑانے میں ناکام رہی تھی۔
معاویہ کے ہاتھ میں موجود رومال اس کی ناک کو دبائے ہوئے تھا۔ جلد ہی آئے کت کی مزاحمت دم توڑ گئی تھی اور وہ معاویہ کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔
معاویہ نے اس کے بے سدھ وجود کو بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا تھا۔
وہ چند لمحے نفرت سے آئے کت کو تکتا رہا تھا اور پھر تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔
کمرے سے باہر نکلتے ہی معاویہ نے راہداری کا جائزہ لیا تھا۔ رہداری سنسان پڑی تھی۔ یقیناً آئے کت کو تیار کرنے والی لڑکیاں یقیناً نیچے جا چکی تھیں۔
معاویہ آگے جا کر دائیں جانب مڑا تھا۔ اس دوسری راہداری میں پاشا موجود تھا۔
معاویہ نے ہاتھ سے پاشا کو اشارہ کیا اور خود اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔
کمرے میں آ کر وہ خود بھی تیار ہونے لگا۔ دنیا دکھاوے کو اسے اب سب سے خوب صورت دلہن کے لیے سب سے جاذب نظر دولہا بننا تھا۔ سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ تیار ہوتا رہا۔
وہ اسّی فیصد اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ باقی بیس فیصد کامیابی کا انحصار پاشا پر تھا۔

☆☆☆

معاویہ کے اشارہ کرتے ہی پاشا لمبے لمبے ڈگ بھرتا آئے کت کے کمرے میں آ گیا تھا۔
اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔
ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر وہ کمرے میں موجود الماری کی جانب بڑھا تھا۔ الماری کے اوپر کے حصے میں سے اس نے کھینچ کر ایک لحاف نکالا تھا۔ لحاف کو زمین پر پھیلا کر وہ آئے کت کے بے ہوش وجود کی طرف بڑھا تھا۔
اگلے چند ہی لمحوں میں وہ آئے کت کے جسم کو اس لحاف میں لپیٹ چکا تھا۔ لحاف کو کندھے پر لادتے ہوئے وہ کمرے میں موجود دوسرے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ چابی اس کے پاس موجود تھی۔ تیزی سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہو گیا۔
یہ ایک اسٹور نما کمرہ تھا۔ مگر بے ترتیبی نہیں تھی۔ دروازے کو دوبارہ لاک کر کے، وہ اس کمرے کی الماری کی طرف آیا تھا۔ معاویہ ہی کے انداز میں اس نے لحاف میں لپٹی آئے کت کو زمین پر پٹخا تھا اور پھر کمرے میں موجود الماری کے پٹ کھول کر وہ اس میں داخل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آئے کت کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس الماری سے نکلنے والے خفیہ راستے سے ہو کر وہ چھپتا چھپاتا آئے کت کو اسی تہ خانے میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں وسامہ نے دم توڑا تھا۔
آئے کت کے مدہوش وجود کو لحاف سے آزاد کر کے کرسی پر بٹھاتے ہوئے وہ سیدھا ہو کر اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

بشام کے سینے پر دل کی طرح دھڑکتے فلک بوس کا قصہ مختصر۔
جس وقت پاشا فلک بوس سے نکلا، وہی وقت تھا جب نکاح خواں گواہان کی معیت میں نکاح نامے پر سائن کروانے دلہن کے کمرے میں پہنچے۔

کمرہ خالی تھا اور دلہن کسی ہیولے کی طرح غائب ہو چکی تھی۔
اور یوں دنیا کی نظر میں معاویہ اردشیرازی اور آئے کت کی محبت کی کہانی ادھوری رہ گئی تھی۔صرف معاویہ جانتا تھا کہ محبت کی کہانی ادھوری نہیں رہی تھی بلکہ وہ اپنے بھائی کی محبت میں سرخرو ہو چکا تھا۔
بشام کی جاہل، کمزور عقیدہ عورتوں کی بات درست ثابت ہو گئی اور فلک بوس کا آسیب ایک اور محبت کو نگل گیا تھا۔
وہ کبھی نہیں جان سکے تھے کہ آسیب نہیں یہ انسان ہوتے ہیں جو دوسروں کی زندگی میں آسیب بن جاتے ہیں۔

☆☆☆

''کیسی ہو شہر بانو!''
شہر بانو جو اپنے آپ میں مگن سست روی سے قدم اٹھاتی وہاں سے گزر رہی تھی، بری طرح ڈر کر پلٹی تھی۔وہ پاشا تھا جو ہاتھ میں کچھ اٹھائے جانے کب سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ایک ہی جست میں وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔
شہر بانو بھی آج اپنی سہیلیوں کے ساتھ، اپنے باپ کی اجازت کے بغیر فلک بوس آئی تھی۔فلک بوس آنے کی دو وجوہات تھیں۔
اول وہاں ملنے والا کھانا جو اردشیرازی نے اپنے بیٹے کی شادی کی خوشی میں بشام واسیوں کے لیے مفت میں دیا تھا۔
دوسری وجہ معاویہ شیرازی کی ہونے والی دلہن، جسے پہلے بھی ان لوگوں نے دیکھ رکھا تھا مگر اس کی دوستوں نے بتایا تھا کہ اپنی مہندی پر وہ اپنے نام کا عکس محسوس ہوتی تھی۔۔۔
سو وہ کھانے اور دلہن دیکھنے کے شوق میں اپنے باپ سے چھپ کر وہاں آ گئی تھی۔کبیر خان کی وجہ سے اس کے باپ نے ان کے فلک بوس آنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔
خیر کھانا تو اس نے کھا لیا تھا اور دلہن کو بھی چپکے سے کمرے میں دیکھ کر آ چکی تھی۔اب رات بھی گہری ہو رہی تھی۔اس سے زیادہ وہ وہاں رکنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی سو اپنی سہیلیوں کے بغیر ہی وادی کی جانب چل پڑی تھی۔تھی تو یہ بھی خطرے والی بات لیکن باپ کا غصہ فی الوقت اس کے حواسوں پر طاری تھا۔
''آئے کت بی بی کا شادی کا جوڑا کتنا خوبصورت تھا۔کاش ایسا جوڑا میں بھی اپنی شادی پر پہن سکتی۔'' اس نے حسرت سے سوچا تھا۔
وہ جو اپنے ہی خیالوں میں مگن چل رہی تھی اور اسے لگا تھا کہ وہ جنگل کو تنہا ہی عبور کر رہی تھی، پاشا کی آواز پر بری طرح ڈر گئی۔
پاشا ایک کالے رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھا جس کے ساتھ ایک ٹوپی تھی جو اس نے سر پر لے رکھی تھی۔
اسے خوف زدہ دیکھ کر پاشا نے ہنستے ہوئے سر سے ٹوپی کو اتار دیا تھا۔
پاشا کو سامنے دیکھ کر خوف سے زرد پڑتا چہرہ، غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔اسے چند لمحے لگے تھے اپنے حواس بحال کرنے میں۔
''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ ڈرا کر رکھ دیا۔'' وہ نفرت سے بولی تھی۔''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ میرا پیچھا کر رہے تھے۔جاہل انسان۔''
آخری دو الفاظ اس نے بڑبڑا کر ادا کیے تھے۔

''ہاں میں پیچھا کر رہا تھا۔'' پاشا نے اس کے آخری الفاظ سن لینے کے باوجود نظر انداز کر دیے تھے۔ ''تم سے کچھ بات کرنا تھی اور تمہیں کچھ دینا بھی تھا۔'' وہ مسکرایا تھا۔

کچھ دینا تھا کے الفاظ پر شہر بانو کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

''کیا بات کرنی تھی اور کیا دینا تھا۔۔۔؟'' اس کا لہجہ خود ہی نرم پڑ گیا تھا۔

''یہ دینا تھا۔'' پاشا نے ہاتھ میں پکڑی گٹھڑی اس کے قدموں میں پھینک دی تھی۔

شہر بانو نے حیرت سے اس گٹھڑی کو دیکھا جس میں سے سنہری رنگ کا کچھ کپڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نیچے جھکی اور گٹھڑی کو کھول کر دیکھا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔ وہ شادی کا جوڑا تھا اور اگر وہ غلط نہیں تھی تو یہ تو آئے کت کی شادی کا جوڑا تھا جسے اس نے کچھ دیر پہلے زیب تن کر رکھا تھا۔

''یہ۔۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔۔۔ یہ تو آئے کت بی بی کا ہے نا؟'' وہ ہکلا کر بولی تھی۔

''بالکل ان ہی کا ہے اور تمہارا ابھی ہو سکتا ہے بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ میں تمہیں دے دوں۔ اگر تم ابھی میرے ساتھ چل کر نکاح کر لو تو۔'' پاشا نے سکون سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

شہر بانو آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟'' اس کا خوف مکمل طور پر ختم ہو چکا تھا سو اس کی جگہ غصے نے لے لی۔

''میرا دماغ تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہے بانو! ابھی یہاں اس لیے آیا ہوں تاکہ تمہارا دماغ بھی ٹھیک کر دوں۔'' وہ سپاٹ سے انداز میں بولا تھا۔

شہر بانو نے ان لفظوں کو غور سے سنا تھا اور لحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹک گئی تھی۔ پاشا کا انداز نارمل نہیں تھا۔

''کک۔۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بے دھیانی میں گٹھڑی کو سینے سے لگائے زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''مطلب صاف ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' پاشا نے عام سے انداز میں کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈالا تھا۔ ''اور میں چاہتا ہوں کہ تم ابھی میرے ساتھ چلو تاکہ ہمارا نکاح ہو سکے۔۔۔ شادی کا لباس تمہارے ہاتھ میں ہی ہے۔ اب تم بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟''

''تم پاگل ہو چکے ہو پاشا! کیسے گھٹیا آدمی ہو تم جو ایک لڑکی کو غلط راہ پر لگانا چاہتے ہو۔'' وہ نفرت سے بولی تھی۔

''تم صحیح کہتی ہو۔ پاگل تو میں تھا۔ جو تم جیسی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔۔۔ میں گھٹیا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم خود کیا ہو شہر بانو! جو اس گھٹیا آدمی سے چھپ چھپ کر ملتی رہیں۔ اپنے باپ کو دھوکا دیتی رہیں اور خدا معلوم کہ میرے علاوہ تم کس کس کے ساتھ یہ کھیل کھیلتی رہی ہو۔''

''بکواس بند کرو۔'' شہر بانو سے سچ برداشت نہ ہوا تو چلا اٹھی۔ ''میرا باپ تم لوگوں کے بارے میں ٹھیک کہتا ہے۔ تم اور تمہارا باپ گلی کے کتوں سے بھی بدتر ہیں۔ جن کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا کہ جانے کب کاٹ لیں۔''

پاشا کا چہرہ اپنے اور اپنے باپ کے لیے گالی سن کر سرخ پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ہاتھ باہر نکالا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ شہر بانو ایک لمحے کے لیے سانس لینا بھول گئی تھی۔

''چلو پھر آج میں تمہارے کہے لفظ سچ کر کے دکھاتا ہوں۔''

پاشا نے اپنی بات مکمل کرتے ہی خنجر کا دستہ اس کے سر پر دے مارا تھا مگر وار میں اتنی طاقت نہ تھی۔ دوسری طرف شہر بانو محتاط ہو چکی تھی۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن مکمل طور پر کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

دستہ اس کی کنپٹی سے ٹکرایا تھا۔
وہ ایک جھٹکے سے مڑی اور مخالف سمت میں بھاگ پڑی۔ پاشا اس کے پیچھے آرہا ہے یا نہیں، اس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
کاتک کی دھند نے بشام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اونچے قد آور درخت تن کر لیکن ایسے ساکت کھڑے تھے جیسے گہری نیند میں ہوں۔ کبھی کبھی ہوا کا کوئی جھونکا آتا اور پہاڑ کے سینے پر سانپ کی طرح بل در بل بچھی ہوئی پگڈنڈیوں پر گرب بہ پائی سے چلتا خودرو جنگلی گھاس میں تحلیل ہو جاتا۔
تو وہ پگڈنڈیاں جن پر ہوا کا جھونکا بھی رات کا احترام کرتے ہوئے احتیاط سے چلتا تھا ان ہی پگڈنڈیوں پر شہر بانو خوف کے احساس سے بدحال دوڑتی جارہی تھی۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ سنہرے لبادے کی گٹھڑی کو اس نے بدحواسی میں ابھی تک سینے سے لگا رکھا تھا اور اس طرح بھاگ رہی تھی جیسے فلک بوس کا بھوت اس کے تعاقب میں ہو۔
بھاگتے بھاگتے اس نے دیکھا نیچے، بہت دور، وادی دھند کے باعث اس کی بصارت سے اوجھل ہو چکی تھی۔ پھر اس نے پیچھے دیکھا۔ اس سے بہت دور فلک بوس اپنے پورے طمطراق سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ آرائشی قمقمے جن سے پوری عمارت کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا ابھی بجھائے نہیں گئے تھے۔ لیکن سناٹا پوری عمارت کو نگل چکا تھا۔
معاً ایک حقیقت اس کے سر پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ وہ جتنی دیر سے بھاگ رہی تھی۔ اب تک اسے فلک بوس کی حدود سے مکمل طور پر باہر نکل جانا چاہیے تھا لیکن بھاگتے بھاگتے ان ہی راستوں پر آگئی تھی جن کو اس کے بھاگتے ہوئے قدموں نے کچھ دیر پہلے عبور کیا تھا۔ اور یہ تیسری بار ہوا تھا۔ کس قدر احمق تھی وہ جو سوچ رہی تھی کہ فلک بوس سے دور چلی جائے گی۔ جس عمارت کے اسرار نے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اس عمارت سے زندگی بیدار ہونے کے باوجود رات کے اس پہر اس کی حدود سے نکلنا آسان نہیں تھا۔
اپنی بے وقوفی کا احساس ہوتے ہی خوف کی شدید ترین لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ ذرا سا دھیان بٹا اور وہ منہ کے بل گری۔ لبوں سے کراہ برآمد ہوئی لیکن پہاڑوں کے سناٹوں میں آوازیں گونجتی ہیں سو اس نے تکلیف کی شدت کے باوجود آواز کو دبا لیا۔ ہاتھوں میں دبوچی ہوئی سنہری گٹھڑی چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لپک کر اپنی قیمتی متاع اٹھاتی فلک بوس سے پرے کہیں دور کسی جنگلی بھیڑیے نے رونا شروع کیا اور سناٹے اور دھند کے پردے میں شگاف پڑ گیا۔
اسی وقت درخت کی اوٹ سے پاشا برآمد ہوا۔ اسے دیکھ کر شہر بانو کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایک بھی لفظ زبان سے نکال پاتی پاشا نے اپنی اوٹ سے ہاتھ باہر نکال کر بلند کیا۔ ہاتھ میں تیز دھار خنجر تھا۔ فلک بوس کے آرائشی قمقموں کی ایک لہر خنجر کی دھار سے ٹکرائی۔ خنجر ہوا میں لہرایا اور لڑکی کے عین دل کے مقام پر گر گیا۔ اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل کر بشام کے سناٹے کو چیرتی چلی گئی۔
عین اس وقت جب بشام اس چیخ سے لرز رہا تھا ٹھیک اسی وقت فلک بوس کی آرائشی بتیاں ہمیشہ کے لیے بجھا دی گئی تھیں۔
دوسری جانب ایک وار کے بعد پاشا کے ہاتھ رکے نہیں تھے۔ وہ بے دردی سے شہر بانو کے چہرے پر وار کر کے اسے بگاڑتا چلا گیا تھا اور شاید وہ ابھی بھی نہ رکتا اگر کوئی اسے پیچھے سے پکڑ کر کھینچ نہ لیتا۔ پاشا یکدم ہوش میں آیا تھا۔
وہ بابا کبیر تھے جو پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے پڑی لاش اور کچھ فاصلے پر موجود گٹھڑی کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"جس روز آئے کت فلک بوس سے لاپتا ہوئی، ٹھیک اسی روز فلک بوس کی روشنیاں ہمیشہ کے لیے گل کر دی گئی تھیں۔ وہ عمارت ایسی سنسان اور رونق کی رمق سے عاری ہوئی کہ دوبارہ بشام والوں نے فلک بوس میں کسی زندہ انسان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

اسی رات جب فلک بوس کی روشنیاں غم کے بوجھ سے گل کی جارہی تھیں۔ آسمان کھل کر رو رہا تھا بشام کے بھیگتے جنگل کی سفاکی میں شہر بانو کی لاش ملی جسے بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک تیز دھار خنجر اس کے سینے میں دل کے مقام پر تین انچ تک گڑا ہوا تھا اور شہ رگ کے پاس گہرا گھاؤ تھا۔ صرف یہی نہیں اس کا چہرہ بے دردی سے خنجر کے پے در پے وار کر کے بری طرح مسخ کر دیا گیا تھا۔ اس کی پہچان مشکل ہوتی اگر اس کے تن پر وہ عروسی لباس نہ ہوتا جو معاویہ نے آئے کت کے ساتھ جا کر بطور خاص اس دن کے لئے منتخب کیا تھا۔

آئے کت کی اس پراسرار گمشدگی نے کئی مفروضوں کو جنم دیا تھا۔ بشام کے ناخواندہ اور ضعیف العقیدہ لوگ ایک ہی بات پر بضد تھے کہ آئے کت کو میں (آیو شمتی) اٹھا لے گئی۔ لیکن جنگل سے ملنے والے شواہد آئے کت کی موت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ایک عام قیاس یہ تھا کہ آئے کت کو میں نے اپنے اثر میں کر کے فلک بوس سے نکالا ہوگا اور جنگل کے ہولناک سناٹے میں موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔

وادی کے کچھ بچے اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے ڈھلتی ہوئی شام کے ملگجے اجالے میں ایک ہیولے کو ایک بڑی چادر میں لپٹے اور ایک گٹھڑی نما چیز دبوچے تیزی سے جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو وادی کی پگڈنڈیوں پر اس وجود کے قدموں کا کھوج بھی لگایا جا سکتا تھا لیکن افسوس۔ صد افسوس۔ بارش نے ہر نشان مٹا دیا تھا۔ یوں تمام تر الزام میرے سر آ گیا اور انسان ہمیشہ کی طرح بچ کر نکل گئے۔

معاویہ نے بابا کبیر اور اس کی بیوی کو اس معاملے میں چپ کروانے کے لیے ان کے بیٹے کی غلطیوں کو استعمال کیا۔ اس نے پاشا کو کسی اور ملک بھجوا دیا اور کبیر خان اور اس کی بیوی جس کا کچھ عرصہ بعد انتقال ہو گیا تھا، انہیں فلک بوس کی حفاظت یا شاید میری حفاظت کے لیے ہمیشہ کے لیے یہاں ہی روک لیا گیا۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ خاموش ہو گئی تھی۔

اس کے خاموش ہونے پر وہ تینوں ہی چونک کر جیسے کسی ٹرانس سے آزاد ہوئے تھے۔

کیف جو فلور کشن پر صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس نے جیسے تھک کر اپنی ٹانگیں پھیلا لیں۔

منفرا صوفے پر سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور آہستہ سے کھڑکی کا پردہ کھسکا دیا۔

رات کا اندھیرا آہستہ دن کی روشنی سے مل رہا تھا۔ ملگجی سی روشنی جس میں فلک بوس کا گیٹ بھی نمایاں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، وہ سفید پوش سامنے سر جھکائے کرسی پر بیٹھی تھی۔

سب سے زیادہ جھٹکا اس کہانی سے منفرا کو لگا تھا۔ ان ساڑھے تین سالوں میں وہ یہ جان ہی نہیں سکی تھی کہ معاویہ کے ماضی میں بہت سے سچ اس کے سامنے آہی نہیں سکے۔ معاویہ اسے جو کچھ بتاتا رہا، وہ آنکھیں بند کر کے یقین کرتی رہی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ معاویہ اپنی کہانی کو کس حد تک توڑ موڑ کر اس تک پہنچا رہا ہے۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ کل رات کیا ہوا تھا۔

خوش نصیب اور وہ، کیف کی تلاش میں نکلے تھے اور خوش نصیب کے کہنے کے مطابق وہ انہیں اسی کمرے سے ملا تھا جس کی نشان دہی خوش نصیب نے کی تھی مگر وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔ وہ سفید پوش اس کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ جس وقت وہ دونوں کیف کے برابر آکر بیٹھی تھیں، کیف نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''کیف! بچے کمرے میں اکیلے ہیں۔ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' منفرا نے سرگوشی میں کہا تھا۔

''جو نقصان پہنچا سکتی تھی، وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔'' کیف زہر خند لہجے میں بولا تھا۔

مگر منفرا کے اصرار پر وہ لوگ اس سفید پوش کو لے کر کمرے میں آ گئے تھے۔ اسے وہاں آنے کے لیے کیف نے راضی کیا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ سفید پوش کیف کی بات سن بھی رہی تھی۔

ان لوگوں نے اس سے اس کے اپنے بارے میں پوچھا تھا لیکن وہ انہیں معاویہ، وسامہ اور آئے کت کی کہانی سنانے لگی تھی اور وہ تینوں اس کہانی میں اتنا مگن ہوئے تھے کہ کچھ اور پوچھ ہی نہیں سکے تھے۔

کیف رات جب اس کمرے میں پہنچا تھا تو یہ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس نے کیف کو یہ بتا کر کہ وہ آیوشمتی ہے، ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ کیف حیرانگی سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

''تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔۔۔ مگر میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔۔۔'' اس نے کیف کو دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا تھا۔

''مگر میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔۔۔'' کیف نے اسے بتایا تھا تو وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔۔۔

''یہ ممکن نہیں۔'' وہ پھنکاری۔ ''میں ایک بدروح ہوں اور تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، نہ مجھے چھو سکتے ہو۔''

کیف نے آگے بڑھ کر آہستہ سے اس کے کندھے کو چھوا تھا۔ اسے حواس باختہ کرنے کے لیے یہ کام کافی تھا۔

وہ جھٹکے سے مڑی تھی اور اس نے کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

کیف نے اسے روکا نہیں تھا بلکہ وہ حیران پریشان وہاں کھڑا تھا کیونکہ وہ دروازے سے نہیں۔۔۔ بلکہ دیوار میں خود کو ٹکرا کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کیف نے اپنی حیرانی کو پرے دھکیل کر آگے بڑھ کر اسے زبردستی اس کام سے روکا تھا۔ بہت مشکل سے وہ اسے یقین دلا پایا تھا کہ وہ اس کا دشمن نہیں ہے نہ ہی کسی بری نیت سے یہاں آیا ہے۔

کیف نے اسے کرسی پر بٹھایا تھا اور اسے اپنے بارے میں بتانے کو کہا تھا۔ وہ اس وعدے پر کیف کو اپنے بارے میں بتانے کو راضی ہوئی تھی کہ کیف اس کے بعد یہاں سے چلا جائے گا اور جس وقت وہ اپنے بارے میں بتانا شروع ہوئی، خوش نصیب اور منفرا وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس نے ان کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا نہ ہی ان کے وہاں آنے پر کوئی اعتراض کیا تھا بلکہ کیف کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ منفرا کے کمرے میں بھی آ گئی تھی۔

آخر فلک بوس اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ وہاں جہاں چاہے جا سکتی تھی۔

سب سے بڑھ کر وہاں وہ چھوٹے بچے تھے جن کی معصوم آوازیں اسے اپنی طرف کھینچتی تھیں۔

کمرے میں آتے ہی وہ ان کے جھولے کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی اور ان دونوں کو بغور دیکھنے لگی تھی۔

پیچھے کھڑی منفرا کا دل اس کے وہاں کھڑے ہونے پر ڈوب ڈوب جاتا تھا لیکن اس نے آیوشمتی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس وہ چوکنی سی وہاں کھڑی رہی تھی۔ اس کے بعد وہ خود ہی وہاں سے ہٹ کر کرسی پر آ بیٹھی تھی اور ان لوگوں کو کہانی سنانے لگی تھی۔

سفید لبادہ جس پر مٹی کے نشان لگے تھے۔ لمبے براؤن بال جن میں کہیں کہیں سفیدی نمایاں ہوتی تھی جو کمر سے نیچے تک جاتے تھے اور بکھر کر اس کے پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ اپنی گود میں رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ بار بار آپس میں ملنے لگتی۔ اس کے ہاتھ کے ناخن بے حد لمبے تھے جن میں میل پھنسی ہوئی تھی۔ یہی حال اس کے پاؤں کے ناخنوں کا تھا۔ اس کے چہرے اور گردن کا زیادہ تر حصہ اس کے بالوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ جو حصہ نظر آتا تھا اس سے اندازہ تھا کہ اس کا رنگ بے حد سفید تھا۔۔۔ لیکن جیسے کسی مردہ کا چہرہ

وہ ڈراؤنی تھی۔ بے حد ڈراؤنی۔
خوش نصیب جو کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی، جھرجھری لے کر رہ گئی تھی اور فوراً نظریں پھیر لیں۔
کمرے کی خاموشی کو وسامہ کے رونے کی آواز نے توڑا تھا۔ وہ نیند سے جاگ گیا تھا اور اب بھوک سے رو رہا تھا۔
ان لوگوں نے آیو شمتی کو چونکتے دیکھا۔ وہ تیزی سے اٹھی تھی اور جھولے کی طرف بڑھی تھی۔۔۔
وہ غور سے وسامہ کو روتے دیکھ رہی تھی۔
''وسامہ۔۔۔'' وہ درد بھری آواز میں آہستہ سے بولی۔ لہجے میں دکھ نمایاں تھا۔
وسامہ ایک نئے چہرے کو دیکھ کر اور شدت سے رونے لگا۔ منفرا کھڑکی سے ہٹ کر جھولے کے پاس آ گئی۔
''میں اسے چپ کرواتی ہوں۔۔۔'' اس نے وسامہ کو اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔
''تم نے ہمیں سب کے بارے میں بتا دیا۔۔۔ جنگل میں جو لاش ملی، وہ شہر بانو کی تھی۔ تو پھر...... آئے کت۔ اس کا کیا ہوا؟'' خوش نصیب نے جھجک کر خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا تھا۔
آیو شمتی نے مڑ کر خوش نصیب کی جانب دیکھا۔
خوش نصیب نے خوف زدہ ہو کر کیف کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
''میں نہیں جانتی۔ میں نے اس کے بعد اسے کبھی نہیں دیکھا۔'' وہ سرگوشی میں بولتے ہوئے دوبارہ کرسی پر آ بیٹھی تھی۔ نظریں ابھی تک وسامہ کے ننھے وجود پر جمی تھیں۔
منفرا ست روی سے خوش نصیب کے برابر آ بیٹھی۔
''میں بتاؤں، آئے کت کہاں ہے؟'' منفرا نے پوچھا تھا۔
خوش نصیب نے حیرت کر اس کی جانب دیکھا۔
''آپ جانتی ہیں؟''
منفرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کیا تھا اور بولی تھی۔
''یہ ہے آئے کت! ہمارے سامنے بیٹھی ہے۔''
خوش نصیب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ ہونق نظر آ رہی تھی۔
کیف کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بھی یہ بات جان چکا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔
اور وہ......آیو شمتی یا آئے کت...... وہ جو بھی تھی۔ اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

حیا بخاری

تم آؤ کہ میری عید ہو

''خدا حقیقی ہو یا مجازی، روٹھے تو فوراً جھک جانا چاہیے۔ دونوں پناہ میں لے لیتے ہیں۔'' بچوں کو تھپکی دے کر سلاتی منال کا اماں کی بات پہ منہ بن گیا۔

''حقیقی خدا بڑے سے بڑا قصور تک معاف کر دیتا ہے اماں! مگر یہ مجازی خدا...... اپنے لیے تم سے سمندر کی امید رکھیں گے۔ ان کے سارے عیب اندر ڈالتی جاؤ۔ مگر تمہاری تھوڑی سی غلطی پہ ماتھے پہ نقش کر کے پھریں گے۔'' وہ کس قدر ناراض تھی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا۔

''ہاں تو کیوں نہ پھریں، غلطی بھی تو چھوٹی ہو نا۔'' اماں بھی غصے سے بولیں۔

''پھر غلطی بھی تو تمہاری تھی۔ نہ جان پہچان...... نام، نمبر، گھر کا پتا سب ایک انجان کو لکھوا دیا۔''

''انجان کہاں تھی اماں۔'' اس کے لہجے میں ایک دم تاسف بولنے لگا۔

''پورے ایک سال سے وہ فیس بک پر میری اتنی اچھی دوست رہی تھی۔ سب کچھ بتا دیا تھا اس نے اپنے بارے میں۔ آواز تک سنائی تھی مگر......''

''مگر کیا...... بن گئی نہ آخر میں آصفہ سے آصف۔'' اماں نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو اس میں میری تو غلطی نہیں تھی نا...... میں نے تو اسے اپنی طرح ہی سمجھا تھا اماں......'' اس کی آواز بھرآنے لگی۔

''پھر بھی غلطی تو تھی نا تیری......'' اماں کا دل اسے روتا دیکھ کر فوراً نرم پڑا۔

''ہاں تو اتنی چھوٹی سی غلطی پہ اتنا سناتے وہ مجھے۔'' وہ آنسو بہاتی بچوں کے قریب ہی لیٹ گئی۔ اماں کو اب اس کا چہرہ نظر نہیں آ سکتا تھا۔

''اس نے تو پھر بھی سنایا ہے...... کوئی اور مرد ہوتا نا تو ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر کر دیتا۔ اور یہ جو تو غلطی کر کے الٹا اکڑ کر بچوں کا ہاتھ تھام کے ادھر لے آئی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو تین لفظ بول کے یہ بچے بھی چھین کے لے جاتا...... یہ تو ارمان کی اچھائی ہے۔ جو چپ کر کے بیٹھا ہے۔ ورنہ اب تک سارے خاندان میں واویلا مچ چکا ہوتا۔'' اماں کے لہجے میں دوبارہ غصہ بھرنے لگا۔ اس کے بہتے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی۔

''مان لے میری بات...... رمضان کا ہی فائدہ اٹھا لے۔ اس مہینے کی برکت سے معاف کر دے گا وہ تجھے۔ ایک تو غلطی اوپر سے ہٹ دھرمی...... عورت کو بھلا کبھی راس آئی ہے۔'' وہ پھر مشورہ دینے لگیں۔

''سونے دیں اماں! نیند آ رہی ہے۔'' اس نے بات ختم کر دی۔ اماں بھی بڑبڑاتے ہوئے چپ ہو گئی تھیں۔ وہ دکھ سے سوچنے لگی تھی۔

ٹھیک ہے غلطی کی تھی لیکن وہ بھی منا سکتے تھے۔ اب اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

ارمان اور منال کا کپل خاندان بھر کا آئیڈیل کپل تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ پھر گول مٹول سے بیٹا بیٹی، ماں باپ کی طرح خوب صورت، ان کی تو زندگی مکمل ہو گئی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ارمان پولیس میں اچھے عہدے پہ فائز تھا۔ دن کے علاوہ بھی اچانک رات کو بھی اسے ڈیوٹی پہ رہنا پڑ جاتا تو منال ہلکان ہو جاتی۔ وہ دن کو بھلے باہر رہتا، لیکن رات کو اگر وہ گھر نہ آتا تو وہ ساری رات بے چین رہتی۔ کروٹیں بدلتی رہتی۔ عجیب سے خوف دل کو ہراساں کیے رکھتے۔

ان ہی راتوں میں سے ایک رات یوں ہی فیس بک استعمال کرتے ہوئے اس کی بات آصفہ نامی لڑکی سے ہوئی۔ وہ اسی کے شہر کی تھی۔ بے چاری حالات کی ماری تھی۔ پہلے دن ہی اس کی درد بھری کہانی سن کر اس کے دل میں آصفہ کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دونوں تقریباً روز ہی فیس بک پر بات کرنے لگی تھیں۔ رفتہ رفتہ دونوں کو ایک دوسرے کی عادت سی ہونے لگی۔ منال نے بھی اسے اپنے متعلق سب بتا دیا تھا۔ سوائے ارمان کی جاب کے، ارمان نے اسے پہلے ہی ہدایت کر دی تھی کہ فیس بک پر اکثر اکاؤنٹس جعلی ہوتے ہیں اور چاہے ہر بات شیئر کر دے لیکن اس کی جاب اور پرسنلز شیئر نہ کرے۔ تبھی ـــــ ذرا سا محتاط ہو کے اس نے اپنا شوہر ٹیچر بتایا تھا۔ ارمان اب بھی اگر رات کو گھر سے باہر ہوتا لیکن اب منال کو اس قدر بے چینی نہیں ہوتی تھی۔ آصفہ کی دوستانہ طبیعت اسے بہلائے رکھتی تھی۔ آصفہ نے اپنی ویڈیو بھی اس کے ساتھ شیئر کی تھی۔ اور کئی دفعہ آڈیو پیغامات بھی بھیجے تھے۔ وہ بار بار اس سے بھی مطالبہ کرتی تھی لیکن نہ جانے کیوں منال کا دل مطمئن ہی نہ ہوتا، وہ سہولت سے انکار کر دیتی۔ ان کی دوستی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ وہ اب اس کا ہنسی مذاق ارمان سے بھی شیئر کر لیتی تھی۔

''ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں چلتا محتاط رہا کرو۔'' کف لنکس بند کرتا وہ آفس کے لیے نکل رہا تھا۔

''لوگ ایسے ہی باتیں بناتے ہیں اب میں بھی تو ہوں...... سب سچ ہی بتایا ہے اسے۔'' وہ اسے لنچ باکس تھماتے ہوئے بولی تھی۔

''اب ہر کوئی تمہارے جیسا تو نہیں ہوتا نا...... خالص اور سچا۔'' وہ محبت سے اس کی پیشانی پہ مہر ثبت کرتا اسے سرشاری بخش گیا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تاکید کی۔ وہ مسکرایا۔

لیکن اس روز ارمان کے جانے کے بعد اس نے آصفہ کے بے حد اصرار پہ اپنا نمبر اور ایڈریس دے دیا تھا۔ آصفہ نے دوپہر تک آنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھی اور منال اس سے بھی زیادہ...... اس نے خوب اہتمام کیا۔ ہوش اس کے تب اڑے جب باہر کھڑے گارڈ نے فون پر اسے اطلاع دی تھی۔

''میم، کوئی آصف صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں آپ کے کافی پرانے دوست ہیں۔ اندر بھیج دوں۔'' اور منال کے تو پسینے چھوٹ

گئے۔ اس نے فوراً اسے پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے منع کیا تھا۔ یہ گارڈ ارمان نے خاص طور پہ ان کی حفاظت کے لیے رکھے تھے۔ گارڈ نے بی بی کے منع کرتے ہی اس شخص کے علم میں لائے بغیر اپنے ساتھیوں کو خبر دی تھی اور اسے گرفتار کرنے کے بعد انہوں نے فوراً ارمان کو خبر دے دی تھی۔ پولیس افسر کو سامنے دیکھ کے آصف نے فیس بک تعلق کا بتاتے ہوئے سارا الزام منال پہ دھر دیا تھا۔ ارمان فوراً گھر پہنچا تھا اور اسے آصفہ کے ساتھ کی گئی چیٹ دکھانے کا کہا۔ منال نے فوراً اسے دکھا دی تھی۔ ارمان کا تو سر گھوم گیا تھا۔ اس نے نہ صرف پوری فیملی کی تفصیل اسے دی تھی۔ بلکہ باتوں باتوں میں اسے وہ اپنے بارے میں بھی کافی تفصیل بتا چکی تھی کہ وہ اور اس کے شوہر کس قدر حسین ہیں۔ تبھی وہ آصفہ خود پہ قابو نہ رکھ پائی تھی اور اپنے حقیقی روپ آصف میں آ گئی تھی۔

"حد ہوتی ہے بے قوفی کی بھی منال...... سوچ بھی نہیں سکتی ہو تم کتنا بڑا تماشا بن سکتا ہے فیملی میں۔ کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہر کوئی انگلیاں اٹھائے گا تمہارے کردار پہ۔" وہ اسے جھاڑ پلاتے ہوئے بولا تھا۔

"کوئی تو بعد میں اٹھائے گا۔ آپ نے تو بات کر دی نا۔" اس کے روتے لہجے پہ وہ شاکڈ رہ گیا تھا۔ اس کے لہجے میں ندامت تک نہیں تھی۔ بلکہ الٹا وہ ناراض ہو رہی تھی۔

"تو اتنی بڑی بے وقوفی کے بعد تم کیا امید کرتی ہو مجھ سے۔ میں تمہیں پھولوں کا ہار پہناؤں۔ اپنے منہ سے سارے شہر اور فیملی میں تمہارے کارنامے کا ڈھنڈورا پیٹوں۔" وہ مزید تپ گیا تھا۔

"اب اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی یہ کہ آپ یوں ڈھول پیٹنا شروع کر دیں۔" وہ دوبدو مقابلے پہ آ گئی۔ ارمان کچھ دیر تو شاکڈ رہ گیا۔

"چھوٹی سی بات...... اگر گارڈ نہ ہوتے یا اسے بنا پوچھے اندر آنے دیتے تو...... خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔"

"ہو جاتا تو اچھا تھا۔ خوامخواہ آپ کی یہ چیخ و پکار تو نہ سننی پڑتی۔" اس نے بدتمیزی کی حد کر دی۔

"غیر مرد کو گھر بلا کر الٹا اکڑ بھی تم رہی ہو۔"

ارمان کے ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا۔

"ارمان۔" وہ زور سے چلائی تھی۔

"چلاؤ مت اور خبردار جو تم نے دوبارہ زیادہ سوشل ہونے کی کوشش بھی کی ہو۔ ورنہ میں مزید سختی سے پیش آؤں گا یاد رکھنا۔" اس کی بے وقوفی نے ارمان کو خوف زدہ سا کر دیا تھا۔ وہ اس کے معاملے میں مزید کوتاہی نہیں برت سکتا تھا۔ وہ لڑکا آصف مشہور گینگ کا سرغنہ تھا۔ جو اسی طرح معصوم لڑکیوں کو ورغلا کر پھر بلیک میل کیا کرتے تھے۔ وہ کئی دنوں سے اس گروپ کے پیچھے تھا۔ جو بدقسمتی سے خود اس کے گھر تک پہنچ گیا تھا۔

"کیوں...... کیوں کریں گے سختی۔" وہ مزید بدتمیز ہوئی۔

"آپ نہیں کرتے یوز یہ واٹس ایپ، فیس بک......" ارمان ایک نظر اس پر ڈال کر رہ گیا۔

"اور ویسے بھی مجھے اس شخص کے ساتھ اب رہنا بھی نہیں جو میرے کردار پر انگلی اٹھائے۔" وہ الماری سے کپڑے نکال کر بیگ تیار کرنے لگی۔

"تم پاگل ہو گئی ہو منال...... اب کیا سارے خاندان میں تماشا بناؤ گی۔" وہ تو ہک دک رہ گیا تھا۔ لیکن منال نے اس کی ایک نہ سنی تھی۔ بچوں کو لے کر اسی وقت ڈرائیور کے ساتھ امی کے گھر چل پڑی۔ ارمان نے اس کے جاتے ہی اس کا بیڈ پہ پڑا سیل فون دیوار پہ دے مارا تھا۔

☆☆☆

وہ اماں کے گھر یوں اچانک اتنا سارا سامان لیے پہنچی تو سب کی پیشانیوں سے فکر جھلکنے لگی۔ اس کے بھائی زیادہ امیر نہ تھے۔ ارمان کی فیملی زیادہ امیر تھی۔ وہ ارمان کی اپنی پسند تھی اور ارمان نے ہمیشہ اس کی فیملی کی بھی عزت کی تھی۔ ہر موقع پر ڈھیروں ڈھیر تحائف لاتا اور منال کو بھی تاکید کرتا کہ جب بھی

ادھر چکر لگائے ضرور سب کے لیے کچھ لے کر جائے۔ لیکن آج وہ اپنا بوجھ اٹھا کے لائی تھی۔ کسی کے لیے کوئی تحفہ نہ لاسکی تھی۔

اس نے سب کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا تھا کہ ارمان کچھ دن کے لیے شہر سے باہر جارہے ہیں۔ مجھے اکیلے چھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور یہاں بھیج دیا۔ ڈرائیور ساتھ تھا سو سب بے فکر ہوگئے۔

لیکن ایک ماہ ہوگیا تھا۔ ارمان نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی تھی۔ البتہ اماں کو فون کرکے ساری بات بتادی تھی اور انہیں تسلی بھی دی تھی کہ اس کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ چند دن لگیں گے۔ لیکن اب منال کا سنبھلنا، سمجھنا بے حد ضروری تھا۔ اماں تو مطمئن تھیں اور اسے ارمان سے بات ہوجانے کا بتا کر بار بار غلطی ماننے اور معافی مانگنے کا درس بھی دیتی تھیں۔ لیکن بھابیاں...... ان کے دلوں پہ جیسے سل آگئی تھی۔ ہزاروں روپے کے مہنگے تحفے وصول کرتے جن کی باچھیں کھل کھل جاتی تھیں۔ ایک ماہ میں ہی ان کے چہروں کی شکنوں میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا۔

''ہوا کیا ہے جو یہ یوں سرمنہ لپیٹ کے یہاں آپڑی ہے۔'' بڑی بھابی تلخ ہوکر کہتیں۔

''حد ہوتی ہے، میاں گھر پہ اکیلا، اتنا خوب صورت گھر، اتنے اچھے میاں کو اکیلے چھوڑ کر تو یہاں پنجے گاڑ کے بیٹھ گئی ہے۔'' چھوٹی بھابی نے غصہ اپنے سات سالہ بیٹے پہ نکالا۔ خواہ مخواہ ہی دو جھانپڑ رسید کر دیے۔ وہ منہ بسورنے لگا۔

''ایک تو اپنے (اخراجات) رمضان کی تیاری اور ادھر یہ محترمہ دو دو بچوں سمیت بوریا بستر یہاں ڈال کے بیٹھ گئی ہے۔'' وہ بڑبڑائیں۔ روٹی ڈالتی منال کی آنکھیں جلنے لگیں۔

''اب تو عید کی تیاری میں بھی گنجائش رکھنا۔'' بڑی نے اور زخم کریدے۔

''اماں اور بھائیوں کی ہی ڈھیل ہے۔ مزاج ہی نہیں ملتے۔'' روٹی ہاٹ پاٹ میں رکھتی وہ اماں کے کمرے میں آگئی۔ جو کچن کے ساتھ ہی تھا۔ جا نماز پہ بیٹھی اماں کی آنکھیں نم تھیں۔ اس کے کمرے میں آتے ہی بول اٹھی۔

''ہر کوئی ارمان کی طرح بڑے دل کا نہیں ہوتا، جو اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کی ضرورت بھی بنا کہے پوری کردے۔'' منال کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

''کبھی تمہیں کچھ نہیں کہا۔ کتنا خیال رکھتا ہے تمہارا، تمہارے بچوں کا۔ تمہارے بھائی کے بچوں کا...... لیکن ہر کسی کا ظرف اتنا بڑا نہیں ہوتا منال...... انہیں سگی بیٹی، بہن اور ماں بھی بوجھ لگتے ہیں۔'' وہ جواب میں ہمیشہ کی طرح کچھ تیز نہیں بولی تھی۔ خاموشی سے بچوں کے پاس لیٹ گئی۔ اماں پھر سے تسبیح میں مشغول ہوگئی تھیں۔ وہ خود بھی یہی تو چاہتی تھیں کہ منال چپ رہ کر سوچے، سمجھے......

☆☆☆

اس دفعہ رمضان کافی ٹھنڈا رہا تھا۔ دن کے پچھلے پہر تیز ہوائیں اور ہلکی سی رم جھم کافی خوشگوار کر دیتی تھی موسم کو۔ لیکن اس کا دل تو اداسی سے ڈوبنے لگا تھا۔ ارمان نے اتنے عرصے میں ایک بار بھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بچوں کا دودھ اور دوسری ضروریات بھی اماں پوری کررہی تھیں۔ بھابیوں کے دل کو کچھ سکون ملا۔ عید جوں جوں قریب آرہی تھی۔ اداسی بڑھتی جارہی تھی۔

''اور اگر وہ واقعی نہ آیا تو......'' کھڑکی سے باہر برستی بارش کو تکتی وہ اداسی سے سوچ گئی۔

''تو کیا ساری عمر میں اور بچے دوسروں کی باتیں سنتے گزاریں گے۔'' اسے ملال سا گھیرنے لگا۔

''غلطی تو واقعی میری تھی۔'' بھیگتی بارش میں اس کے آنسو بھی شامل ہونے لگے۔ ندامت یک لخت اسے گھیرنے لگی تھی۔

''میری اتنی اچھی لائف گزر رہی تھی۔ سب لوگ مثالیں دیتے تھے۔ جب بھی یہاں ارمان کے ساتھ آتی تھی، بھابیاں کتنی آؤ بھگت کرتی تھیں۔ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں۔ اور جب سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ارمان خفا ہوا ہے، دو کوڑی کی عزت نہیں رہی تھی اس گھر میں، بھابیاں تو ایک طرف دونوں بھائیوں کے چہروں پہ بارہ بج رہے تھے۔ اپنے بچوں کے لیے چیز لے کے آتے تو اس کے پھول جیسے بچے بس دیکھتے رہ جاتے، دونوں بھابیاں کمروں کی طرف لے جاتیں بچوں کو۔

"اللہ معافی، اتنا نوازا اللہ نے پر بچوں میں اس قدر ندیدہ پن۔" بڑی بھابی تنفر سے کہتیں اور وہ ضبط سے لب کاٹ کے رہ جاتی۔

"صرف کسی کے حق میں تین بول، بول دینے سے کتنے رشتے پرائے ہو جاتے ہیں۔" آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"قبولیت کے وہ تین بول، بولنے سے کتنے پرائے رشتے اپنے بھی تو ہو جاتے ہیں۔" دل نے اداسی سے سرگوشی کی تھی......اور جیسے ساری گتھیاں سلجھتی چلی گئی تھیں۔ وہ صرف اسی ایک اپنے رشتے کو سوچنے لگی تھی۔

☆☆☆

آج آخری روزہ تھا۔ اور اس کا موڈ بری طرح خراب تھا۔ کل شام بھائی بھابیوں کو لے کر شاپنگ کے لیے گئے تھے۔ سب نے اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے قیمتی چیزیں، کپڑے لیے تھے۔ اس کے بچوں کے لیے بھی کپڑے لائے تھے۔ لیکن جس طرح ارمان لاتا تھا، اس سے وہ کئی گنا ہلکے تھے، سستے اور غیر معیاری اس نے پھر بھی دل کی خوشی سے قبول کیے تھے اور کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"ارمان بھائی تو ہمارے بچوں کے لیے اپنے بچوں کی طرح ہی چیز لاتے تھے ہمیشہ...... یہ اگر واپس چلی گئی تو کہیں وہ سلسلہ بند ہی نہ کروا دے۔" چھوٹی بھابی نے اس کے کمرے سے نکلتے ہی فکر مند لہجے میں کہا تھا۔

"تمہیں اس کے مزاج لگتے ہیں کہ یہ واپس جائے گی۔" بڑی بھابی نے تلخی سے جواب دیا۔ اس کے قدم خود بخود رک سے گئے۔" دو ماہ ہو گئے ہیں ایک دفعہ بھی ارمان نے خبر نہ لی۔"

"مجھے تو لگتا ہے یہ بلا اب ہمیشہ سر پہ رہنے والی ہے۔ سو ابھی سے اس ہلکے سستے مال کی عادت ڈالیں گے تو عادت خراب نہیں ہوگی اس کی۔ پھر اپنے بچے بھی تو ہیں۔ اب ان سے اچھا کسی غیر کی اولاد کو تو نہیں پہنا سکتے۔" انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔ وہ دکھ بھرا دل لیے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☆☆☆

ارمان آیا تھا......سب اسے دیکھ کے خوش اور منال شاکڈ رہ گئی تھی۔ چاند دیکھنے کے بعد اس نے یہی تو حسرت کی تھی۔

"ترسی ہوئی نظریں دید کریں......
تم آؤ تو ہم بھی عید کریں......"

اور وہ افطاری کے کچھ دیر بعد ہی وہاں تھا......ہمیشہ کی طرح بھلے اس دفعہ منال اس کے ساتھ نہ تھی۔ لیکن اسے یاد تھا۔ چاند رات منال ہمیشہ وہیں گزارنا پسند کرتی تھی۔ وہ اس کی اور بچوں کی ساری شاپنگ بھی کر کے آیا تھا۔ دونوں بھائیوں کے بچوں کے لیے کپڑے اور کھلونے لایا تھا اور بھائی بھابیوں کے لیے بھی بالکل ویسے گفٹ جیسے اکثر وہ لیا کرتی تھی۔

بھابیوں کی تو باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ سارا سامان سمیٹتے ان کی نگاہیں منال کے لیے لائے سامان پہ بھی جمی ہوئی تھیں اور ہر بار کی طرح خاموشی سے اپنے کپڑے ان کو دے دینے والی منال نے اس دفعہ بڑے حق سے ان کے ہاتھوں سے اپنا سامان لے لیا تھا۔

"میں تمہیں ہی دینے آ رہی تھی۔" اپنے (کم)رے میں جاتی بڑی بھابی نے خجالت بھرے لہجے (می)ں کہا تھا۔

"جی بھابی......بس میں نے سوچا اپنی چیز لینے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ باقیوں کا خیال بعد میں......کیوں؟" اس نے ان ہی کے لہجے میں سوال کیا۔ وہ کھسیا کے رہ گئیں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

☆☆☆

اس نے اماں سے کہا تھا۔ ارمان سے کہہ دیں کہ وہ ان کے ساتھ جائے گی' ارمان کو تو اس کے اسی فیصلے کا انتظار تھا۔ وہ بچوں کو لے کر باہر گاڑی میں آ گیا۔

وہ تیار ہو کے نکلی تو بھائی بھابیاں ایک مرتبہ پھر نظریں بچھائے کھڑے تھے۔ اماں کے چہرے پہ البتہ دعا گو مسکراہٹ تھی۔ ہر لالچ سے پاک......

''عید ہمارے ساتھ ہی کر لیتیں تم......اتنی جلدی جا رہی ہو۔'' بڑی بھابی نے کمال اداکاری سے اس کو گلے لگاتے شکوے بھرے کلمے ادا کیے۔

''نہیں بھابی......ان دنوں میں اتنا تو میں جان گئی ہوں، ہر کسی کا ظرف ارمان کی طرح بڑا نہیں ہوتا اور اصل مقام سے ہٹ جانا صرف گراوٹ دیتا ہے اور کچھ نہیں' میرا سب کچھ ارمان اور وہی گھر ہیں۔ آتی جاتی رہوں گی، آخر اماں ہیں میری اس گھر میں۔'' اس نے ساری مروّت لحاظ ایک طرف رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اور اماں سے گلے ملنے لگی۔

''میں نے کہا تھا نا بھابی نقصان ہمارا ہی زیادہ ہوگا۔'' چھوٹی بھابی نے جیٹھانی کے کان میں تاسف سے کہا۔ وہ بڑبڑا کے رہ گئیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے گھر کی دہلیز پار کی تھی......کیونکہ صرف عید نہیں زندگی کی خوشیاں بھی اس کی منتظر تھیں۔

☆☆☆

وہ گاڑی کی طرف آئی تو دونوں بچے ارمان سے کھیلتے کھیلتے سو چکے تھے۔ وہ انہیں پچھلی نشست پر لٹاتا باہر آ گیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے اس کے لیے اگلا دروازہ کھولا۔ وہ ہچکچاتی بیٹھ گئی۔ عجیب سی ندامت گھیرے جا رہی تھی۔

''آئی ایم ساری ارمان......'' گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی اس نے نم لہجے میں سرگوشی سی کی تھی۔ ارمان خاموش رہا تھا۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی۔ ان کے گھر سے کچھ دور ایک نہر آتی تھی۔ جس پہ بنے چھوٹے سے پل پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ راستہ کم کم ہی لوگ استعمال کیا کرتے تھے، آج ارمان نے وہی راستہ چنا تھا اور پل کے قریب گاڑی روک کے نیچے اتر آیا تھا۔ اس کی سائیڈ کا دروازہ کھول کے ــــ خیالوں میں گم آنسو بہاتی منال کا ہاتھ تھام کے وہ اسے نیچے اتار لایا۔ وہ حیران سی اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیے نیچے اتر آئی۔ دور آسمان پہ آتش بازی کی رنگ برنگی روشنی ہر طرف اجالا سا بکھیر رہی تھی۔

''تمہارے بغیر میری عید ہو سکتی ہے؟'' وہ اسے اپنے سامنے لاتا مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''اس دفعہ تو پکا ارادہ تھا آپ کا۔'' وہ بکھرے لہجے میں بولی۔

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا گیا۔

''بس میں یہ چاہتا تھا کہ تمہیں احساس ہو' ہر رشتہ اپنا نہیں ہوتا نہ ہی قابل بھروسہ ہوتا ہے۔ یوں اتنی آسانی سے ہر کسی پہ اعتماد نہیں کرتے۔''

''کسی غیر پہ اعتبار نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں منال، خاص کر لڑکیوں کے لیے۔ لیکن کسی غیر پہ اعتماد کرنا کبھی کبھی ان کی ساری زندگی اجاڑ سکتا ہے۔''

''جیسے ایک بالکل اجنبی رشتے کے لیے ہمارے رشتے میں اتنی بڑی خلیج آتے آتے رہ گئی۔'' وہ اسے پیار سے سمجھا رہا تھا اور آج وہ سن رہی تھی۔ پورے دل کے ساتھ۔

''اگر اس لڑکے کو لے کر میں اسی وقت جذباتی ہو جاتا، تم دونوں کو لے کر کچھ غلط سوچ لیتا، تو سوچو حقیقت پوچھنے کی ــ نوبت ہی نہ آتی۔ برباد ہو جاتے ہم دونوں......بس صرف اسی لیے تمہیں کہہ رہا ہوں......جو رشتے خدا نے دیے ہیں انہیں بخوبی نبھالو۔ یہی کافی ہے۔'' وہ اس کا کان کھینچتا شریر ہوا تھا۔

''میری توبہ جو اب بھی ان فضولیات میں پڑوں۔ اب بس میں، آپ اور بچے۔'' اس نے بھی فوراً دونوں ہاتھ کانوں کو لگاتے ہوئے کہا تھا۔ ارمان کا قہقہہ جاندار تھا......اور اسے دیکھ کے منال بھی مسکرا دی تھی۔

وہ آ گیا تھا۔ اس کی عید ہو گئی تھی۔

☆

عندلیب زہرا

ماہ رمضان اپنی تمام تر برکات کے ساتھ رحمٰن منزل میں قدم رکھ چکا تھا۔ سب مکین اس کے ثمرات سمیٹنے کے لیے کوشاں تھے۔ سو بام و در پر اس ماہ کے اثرات واضح محسوس ہوتے تھے۔

نوجوان پارٹی نے موسیقی، فلمیں، انٹرنیٹ، ہلا گلا سب سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ بچے بھی اس بار روزہ رکھنے کے لیے بضد تھے۔ سحری سے افطاری تک ایک انوکھی فضا محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں مضطرب تھی تو عفی۔

اس کی بے چینی پہلے عشرے سے شروع ہوئی اور اب اضطراب میں بدل چکی تھی۔

''یہ مہینہ دعاؤں اور بخشش کا ہے اور تم ...... دھیان کدھر ہے؟'' امی بار بار جھڑکتیں۔

''عبادت کر تو رہی ہوں۔'' وہ بڑبڑا کر رہ جاتی۔

''لیکن دھیان تمہارا کہیں اور ہوتا ہے۔'' امی بھی اس کی عدم توجہی محسوس کرتیں۔ (امی جو ہوئیں)

''آخر آنٹی میری عیدی کب لائیں گی؟'' اس نے بھی اپنی شرم وحیا بالائے طاق رکھتے ہوئے بالآخر پوچھ لیا۔

''تو تمہاری بے چینی اس لیے ہے۔'' (امی کی گھوری)

''سب فرینڈز بار بار پوچھ رہی ہیں......'' اس نے دکھ سے اطلاع دی۔

امی سر جھٹک کر پکوڑوں کا آمیزہ تیار کرنے لگیں۔

عیدی کے انتظار سے تنگ آکر عفی نے اپنا دھیان حقیقتاً عبادت میں لگالیا۔ آخری عشرے میں تو عبادات مزید بڑھ جاتی ہیں سو وہ بھی دنیاوی خواہشات بھلائے تسبیحات' تلاوت اور نوافل میں مشغول رہتی۔

اٹھائیسویں روزے کو اس کے سسرال والوں نے آنے کا عندیہ دیا کہ عفی کی عیدی تیار ہے۔ سو اس کی بھی اٹکی سانسیں بحال ہوئیں۔ کیونکہ منگنی کی تصویریں دیکھنے اور مٹھائی کھانے کے بعد سب سہیلیاں بارہا عیدی کے متعلق استفسار کرچکی تھیں۔

عیدی کی ہر چیز عمدہ اور نفیس تھی۔ خاص طور پر فضیلہ نے جو پرفیوم اور جیولری سیٹ بھیجا تھا۔ اور سب بڑا سرپرائز اس کی شادی کی تاریخ کا طے ہونا تھا۔ جو سب سے بڑوں کی رضامندی سے طے پائی تھی۔

سب کاموں سے فراغت کے بعد عفی خوشی خوشی اپنی عیدی دیکھ رہی تھی۔

''آپی! تم خواہ مخواہ اداس تھیں۔ یہ چیزیں تو مما پپا بھی دلا دیتے ...... اور یہ چوڑیاں......'' گڈو نے ایک سیٹ اٹھا کر دیکھا۔ ''ایسے سیٹ تو میں تمہیں لادیتا ...... اور یہ پرفیوم ...... یہ تو ماموں دبئی سے بھیج دیتے......''

''یہ میری سسرال سے آئی ہیں اور اس خوشی، مان اور فخر کو تم نہیں سمجھ سکتے ...... جو ایک لڑکی محسوس کرسکتی ہے۔'' اس نے گڈو کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں تھام کر پیار کیا۔

''سسرال سے یا ہونے والے مجازی خدا کی طرف سے؟'' فصیحہ نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے اس کی بات پر شرارت سے تبصرہ کیا۔ اور پرفیوم اسپرے عفی پر کر دیا۔ کمرے میں چار سو خوشبو پھیل گئی۔

سنہری چوڑیوں کی جھلملاہٹ اس کی آنکھوں میں چمک کر کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

ہلال عید کا سفر جاری تھا۔

☆☆☆

وقت اپنی عمر کی بارہ منزلیں طے کر چکا تھا۔

زندگی کے پیچ و خم کو طے کرتی ہوئی عارفہ اب ایک بردبار متحمل مزاج خاتون خانہ تھی۔ جس کی زندگی کا مرکز محور شوہر اور بچے تھے۔ ہر لمحے ان کے آرام کے لیے کوشاں بنا کسی تھکن کے' سب کے آرام کا خیال رکھتی۔

لیکن ایک عادت جس پر وہ اب تک قابو نہیں پا سکی تھی وہ عادت تھی انتظار...... میکے سے آئی سوغاتوں کا انتظار...... میکے والوں کی آمد اسے کئی دن تک سرشار کیے رکھتی ...... اور رمضان میں یہ انتظار شدت اختیار کر لیتا۔

شروع میں امی ابو عیدی کے ساتھ لدے پھندے آتے اور ان کی وفات کے بعد بھائی نے یہ روایت حتی المقدور قائم رکھی تھی۔ والدین جیسا جوش وخروش تو نہ ہوتا لیکن سسرال میں بھائی کی آمد عارفہ کے دل کو کئی گنا بڑھا دیتی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بہت غریب گھرانے میں بیاہی گئی تھی اور ضروریات کے لیے میکے کو دیکھتی۔ عارفہ کا شوہر بزنس مین تھا۔ کامیاب اور خوشحال۔ لیکن یہ دل......

☆☆☆

اس بار بھی رمضان کی آمد پر وہ پورے اہتمام سے تیاریاں کر رہی تھی۔ افطاری، سحری کا اہتمام...... ہانیہ کی روزہ کشائی...... نند نندوئی کی افطاری، شاپنگ، عبادات سب کچھ ساتھ ساتھ چل رہا تھا لیکن دل میں انتظار ہلکی ہلکی چٹکیاں لے رہا تھا۔

پہلا...... دوسرا...... اور اب تیسرا عشرہ۔

بھائی کی آمد کا انتظار...... لگتا تھا اس بار انتظار ہی رہے گا۔

''بہو! اس بار تمہارے میکے سے کوئی نہیں آیا......'' ساس سسر کئی بار استفسار کر چکے تھے۔

''آپ کے بھائی بھابی تو خیریت سے ہیں ناں......'' نند پوچھتی۔

''آپ خود فون کر لیں۔'' لاابالی دیور نے مشورہ دیا۔

لیکن اس کی انا نے گوارا نہ کیا۔ نجانے کیوں؟

"آپی نے بتایا تھا کہ بھائی کا کاروبار آج کل بہت نقصان میں جارہا ہے اور وہ پریشان ہیں۔" لیکن دل میں یکدم شکوے، گلے جمع ہوگئے تھے۔

"کیا تھا جوفون ہی کر کے مان رکھ لیتے۔"

"تم ان کو افطار پر مدعو کرلو......" حسیب نے مشورہ دیا۔

"نہیں بس ......عید پر سلام کرنے جاؤں گی۔" اس نے آنسو پیتے ہوئے بہانہ بنایا۔

"ارے وہ تمہیں افطاری پر بلالیں ناں۔" ساس نے فوراً مشورہ دیا۔

عارفہ خاموشی سے کام کیے جاتی اور بھائی کی صحت اور کاروبار کے لیے دعا گو رہتی

"مما! ہر سال ماموں، مامی اتنے گفٹس لاتے ہیں۔ اس بار آپ انہیں کچھ دے دیں......" گڑیا نے ماں کی اداسی دیکھ کر جھٹ مشورہ دیا۔

"بیٹا! تمہارے پاپا مجھے کئی گنا مہنگی شاپنگ کرواتے ہیں۔ بس......" وہ اپنی کیفیات، چھ سال کی گڑیا کو سمجھا نہ پائی۔ انتیسویں روزے کو وہ جلدی جلدی کام سمیٹ رہی تھی۔

"چاند آج نظر آجائے گا۔" سب کا متفقہ خیال تھا۔

"عارفہ!" وہ کچن میں افطاری کے آخری مراحل میں مصروف تھی۔ جب مانوس سی خوشبو پر اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

"بھائی! بھابھی۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔

"میں سارا مہینہ آپ سب کا انتظار کرتی رہی۔ مجھے لگا آپ مجھے بھول گئے ہیں اور میرا...... میرا میکہ ختم ہوگیا۔" اس نے آنسوؤں کی برسات میں کہا۔

"میں مشکلات میں گھرا تھا۔ کاروباری نقصان...... پھر صحت کی خرابی......دوسرے شہر سے آنا بڑا مشکل تھا۔ بس یہ دن بڑے سخت تھے۔" افطاری کے بعد سب آرام سے بیٹھے تھے اور عارفہ کے بھائی کی گفتگو سن رہے تھے۔

"کل سبیکا نے یاد کروایا کہ عارفہ اور حمنہ عیدی کی منتظر ہوں گی...... میں نے سوچا کہ اس بار معذرت کرلوں لیکن سبیکا نے کہا......" انہوں نے محبت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

"میں نے کہا کہ عارفہ اور حمنہ کو قیمتی چیزوں سے زیادہ اس مان اور محبت کے احساس کا انتظار ہے جو بھائی کی آمد انہیں دے گی۔" سبیکا نے بات مکمل کی۔

سو میں نے اور سبیکا نے اس بار تم لوگوں کے لیے بس ہلکی پھلکی شاپنگ کی ہے۔" بھائی کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

کچھ دیر بیٹھ کے وہ لوگ چلے گئے۔ عارفہ کی خوشی دیدنی تھی۔

"مما! آپ ان چیزوں کے لیے اداس تھیں۔" شیری حیران تھا۔

"عورت کی زندگی میں میکے سے وابستہ چیزوں کا جو مان ہوتا ہے اس میں اس کی خوشی اور فخر ہے جس کا کوئی مول نہیں بیٹا۔" عارفہ طمانیت سے بولی۔

ہلال عید کی چمک دگنی ہوئی جارہی تھی۔

☆☆☆

ہانیہ کو اپنی نانو اور نانا ایک مثالی جوڑا لگتے تھے۔ ستر سے اوپر نانا نانی، اپنی اولاد اور پھران کی اولاد کی خوشیاں دیکھ رہے تھے۔ اس عمر میں صحت اور اپنے کام خود سرانجام دینا رب کی رحمت ہی تو تھی۔

ہلکے سرمئی سے بالوں اور سرخ وسفید رنگت والے بارعب نانا...... اور سفید بالوں اور پروقار مسکراہٹ والی نانو...... جو اس عمر میں بھی چاق وچوبند تھیں۔ نانو، نانا کا ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتی تھیں۔ اور تو اور بہوؤں کے کئی کام بھی کردیتیں۔ سبزی بنادی۔ میٹھا تیار کردیا۔ آٹا گوندھ دیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''کام نہ کروں تو بیمار پڑ جاؤں۔'' کوئی استفسار کرتا تو یہی جواب دیتیں۔

نانا کو زردہ اور پھلکے امی کے ہاتھ کے پسند تھے اور صبح کی چائے بھی وہ انہی کے ہاتھ کی پسند کرتے۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میرا بڑھاپا بھی آپ جیسا ہو......'' ہانیہ اکثر محبت سے نانو کا ہاتھ تھام کر کہتی۔

رمضان کی آمد کے ساتھ ان سب کی ذمہ داریاں بڑھ جاتیں۔ نانا اور نانو درس کا اہتمام کرواتے۔ افطاری کا مینیو ترتیب دیتے۔ ملازموں اور مستحق افراد کو اپنے ہاتھ سے زکوۃ، فطرانہ اور صدقہ دیتے۔ یہ برسوں سے ان کا دستور تھا۔

آخری عشرے میں نانا سب کو پیشگی عیدی دے دیتے۔ ''سب اپنی پسند کی چیزیں خود خریدیں۔ اب اس عمر میں' میں کہاں دھکے کھاؤں گا۔''

خود کو نوجوان کہنے والے نانا اچانک خود پر بڑھاپا طاری کر لیتے۔ لیکن نانو کا گفٹ وہ خود پسند کر کے لاتے اور چاند نظر آتے ہی انہیں دے دیتے۔ ہانیہ یہ لمحات بڑے انجوائے کرتی۔ نانا خوب صورت ریپر میں لپٹا گفٹ دیتے اور نانو دھیمی مسکراہٹ سے وہ گفٹ وصول کر کے سب کے سامنے کھولتیں۔ ہانیہ کو یہ پل بڑے پیارے لگتے۔

نانو کو بھی پورے رمضان اس دن کا انتظار رہتا۔ اس برس نانا کی طبیعت کچھ ناساز تھی، سو زیادہ وقت آرام کرتے، افطاری میں بھی موجود نہ ہوتے۔ سب کو پہلے ہی عیدی دے دی۔

''میرے لیے آپ کی محبت اور سلامتی ہی اصل تحفہ اور عیدی ہے۔'' نانو نے اداسی سے کہا۔

☆☆☆

رمضان...... رحمت، مغفرت اور دوزخ سے نجات کے مراحل طے کرتا بخیر وخوبی گزر رہا تھا۔

افطاری کی میز پر سب براجمان تھے۔
کھجور ہاتھ میں تھامے
زیر لب دعائیں پڑھتے
اللہ اکبر کی صدا کے منتظر......
اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ ہی روزہ افطار ہو گیا۔ اب سب چاند کے منتظر تھے۔ جب فضا پٹاخوں کی آواز سے گونج اٹھی۔

''عید کا چاند مبارک ہو......'' ہر طرف سے مبارک باد کی صدائیں آنے لگیں۔

''انتیس روزوں والی عید کا مزا ہی الگ ہے۔''

فرحان اور حمدان دونوں کو گرمیوں کے روزے بہت مشکل لگتے تھے سو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ سب خواتین جلدی جلدی کام سمیٹ رہی تھیں۔

اچانک نانا کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور نانا آہستہ آہستہ باہر آئے۔ بیٹوں نے لپک کر صوفے پر بٹھایا۔ ان کے ہاتھ میں گفٹ تھا۔

''سب کو عیدی دے دی تھی۔ تمہاری ماں کی عیدی رہ گئی تھی سو......'' انہوں نے ہانیہ کو دیکھا۔ نانو کی آنکھوں میں آنسو تھے اور واضح خوشی تھی۔

''ہانیہ نے اپنی شاپنگ کے ساتھ ساتھ میری مشکل بھی آسان کر دی......'' نانو نے ریپر کھولا تو خوب صورت نفیس سوٹ تھا۔ نانو کے لب مسکرا رہے تھے۔ ''نانو! میں آپ کے چہرے پر ہر سال والی مسکراہٹ دیکھنا چاہتی تھی۔'' ہانیہ نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''آپ کو نانا کے گفٹس اتنی خوشی کیوں دیتے ہیں؟'' فضا نے اچانک سوال کیا......

''آپ خود بھی شاپنگ کرتی ہیں اور مما پاپا بھی گفٹس لاتے ہیں۔'' عدلیہ نے مہندی لگاتے لگاتے سر اٹھا کر پوچھا۔

''اس تحفے سے جڑا مان اور فخر...... جو کسی بھی عورت کا قیمتی اثاثہ ہے۔ یہ وہ خوشی دیتے ہیں جو دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز بھی نہیں دے سکتی۔'' نانو نے پیار سے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

باہر ہلال عید جگمگا رہا تھا اور ہر سو مسکراہٹیں بکھیر رہا تھا۔

☆

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نگہت عبداللہ

کھانا گرم کرتے ہوئے اس کی نظریں بار بار کچن کی کھڑکی سے ابو کو دیکھ رہی تھیں جو جانے کس سوچ میں بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلی تفکر کی لکیروں نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ جلدی سے کھانا نکالا اور ٹرے میں رکھ کر بڑی عجلت میں کچن سے نکل آئی۔ پھر ٹرے ابو کے سامنے رکھ کر خود بیٹھتے ہی پوچھنے لگی۔

''کیا سوچ رہے ہیں ابو؟''

''ہیں......'' انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر سانس کھینچ کر کہنے لگے۔ ''سوچ رہا تھا بہت دنوں

ناولٹ

سے اسماء بہن کا فون نہیں آیا۔ اللہ کرے سب خیر خیریت ہو۔"

"خیریت ہی ہوگی ابو، آپ یوں ہی پریشان نہ ہوجایا کریں۔ چلیں کھانا کھائیں۔" اس نے لاپروائی سے کہہ کر ان کی توجہ کھانے کی طرف دلائی تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئے پھر کھانا کھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"تمہارے پاس بھی فون نہیں آیا؟"

"نہیں ابو، مصروف ہوں گی اسماء خالہ، ویسے بہت زیادہ دن تو نہیں ہوئے، میرا مطلب ہے پچھلے ہفتے ہی تو اسماء خالہ کا فون آیا تھا۔ آپ کو یاد نہیں۔" اس نے کہا تو ابو سوچتے ہوئے بولے۔

"اچھا، پچھلے ہفتے آیا تھا۔"

"جی اور اگر آپ کو ان کی طرف سے کوئی پریشانی ہو رہی ہے تو آپ انہیں فون کرلیں۔"

"ہاں یہ تم نے ٹھیک کہا۔ سمجھ دار ہوگئی ہے میری بیٹی، مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ اگر اسماء بہن کا فون نہیں آیا تو میں اسے فون کرلوں۔" ابو محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"حالانکہ ابھی آپ اتنے بوڑھے نہیں ہوئے۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"بوڑھا تو بیٹا میں اسی دن ہوگیا تھا جب تمہاری ماں کو قبر میں اتارا تھا۔"

"بس ابو، اب آپ آہیں نہ بھرنا شروع کردیجیے گا، میرا اس وقت رونے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے فوراً ٹوک کر کہا تو ابو اسے دیکھنے لگے۔ "سوری ابو، مجھے امی بالکل یاد نہیں ہیں۔ میرے لیے سب کچھ آپ ہیں اور میں بس آپ کو غم زدہ نہیں دیکھ سکتی۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

"اچھا چائے ملے گی کہ نہیں۔" ابو نے اس کا دھیان ہٹانے میں دیر نہیں کی۔

"کیوں نہیں ملے گی۔ میں ابھی بناتی ہوں۔ آپ کھانا تو ختم کریں۔"

"بس کھالیا بیٹا۔ برتن اٹھالو۔" ابو رومال سے ہاتھ صاف کرنے لگے۔ تو وہ ٹرے اٹھا کر کچن میں آگئی اور پانچ منٹ میں چائے بنا کر ابو کے پاس لے آئی۔ ابو موبائل فون کان سے لگائے اسماء خالہ سے بات کر رہے تھے۔

"بس اسماء بہن مجھے وقت کا پتا نہیں چلتا۔ ابھی تمہارے ہاں دن ہے کہ رات۔"

"اچھا اچھا، صائم کیسا ہے۔" وہ صائم کا سن کر غیر محسوس طریقے سے ابو کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ پتا نہیں اسماء خالہ کیا بتا رہی تھیں۔ ابو نے خوش ہوکر مبارکباد دی پھر کہنے لگے۔

"ہاں رملہ کا بھی یہی سال ہے، بی اے کرلے گی۔"

"بس اسماء بہن میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی میں اسے رخصت کردوں۔"

"اچھی بات ہے۔ بچوں کو دعائیں دینا۔ اللہ حافظ۔" ابو نے موبائل رکھ کر اپنے سامنے رکھی چائے کو دیکھا پھر اس کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہوئے پکار لیا۔

"رملہ۔"

"جی ابو......" وہ قدرے رک کر عقب سے سامنے آگئی۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا، اسماء بہن کے ہاں سب ٹھیک ہیں۔" ابو نے بس اسی قدر بتایا تو وہ جو صائم کے بارے میں سننا چاہتی تھی، مایوس ہوکر بولی تھی۔

"چلیں آپ کو اطمینان ہوگیا۔ اب آپ چائے پی کر آرام کریں۔"

"تم کہاں جارہی ہو؟"

"کہاں جاؤں گی ابو، صبح کے لیے آٹا گوندھ کر رکھوں گی پھر سوؤں گی۔" وہ کہہ کر کچن میں آگئی جلدی جلدی آٹا گوندھ کر رکھا پھر کمرے میں جاتے جاتے رک کر پوچھنے لگی۔

"اور کوئی کام تو نہیں ہے ابو؟"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"بس بیٹا! جاؤ سو جاؤ۔"

"آپ کیوں نہیں سو رہے؟"

"سو جاؤں گا میری ماں، سو جاؤں گا۔"

ابو نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے کمرے میں آ گئی۔
اور لیٹتے ہی تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکال کر چیک کرنے لگی کہ شاید صائم نے کوئی ٹیکسٹ بھیجا ہو۔ حالانکہ صائم کبھی کبھار ہی اسے کوئی میسج کرتا تھا پھر بھی وہ روزانہ سب سے پہلے یہ ہی چیک کرتی تھی۔ ابھی بھی مایوس ہو کر اس نے سیل فون آف کر دیا۔ لیکن اسے سوچنے سے باز نہیں رہ سکی۔

یوں بھی اس کی زندگی میں اور تھا ہی کون۔ دو سال پہلے تک تو صرف ابو ہی تھے۔ جب اسماء خالہ صائم کے ساتھ امریکا سے آئی تھیں۔ اس وقت وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ اسماء خالہ کچھ دن ان کے ہاں رہیں اور پھر جاتے جاتے انہوں نے اسے ابو سے صائم کے لیے مانگ لیا تھا۔ ابو کو اس رشتے پر اعتراض نہیں تھا بس بیٹی کے اتنی دور جانے کے خیال سے پس و پیش کر رہے تھے۔ جس پر اسماء خالہ نے کہا تھا کہ اب دوریاں کوئی معنی نہیں رکھتیں بہت آسانیاں ہو گئی ہیں اور انہوں نے ابو کو منا کر ہی دم لیا تھا۔

پھر یہ طے پایا تھا کہ جب وہ بی اے کر لے گی تب اسماء خالہ اسے بیاہ کر لے جائیں گی۔ یوں کم عمری میں ہی اس کی سوچوں کو کنارا مل گیا تھا۔ صائم اسے اچھا لگا تھا۔ نہ بہت سنجیدہ نہ زیادہ شوخ۔ اس کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہناتے ہوئے بس ایک سرگوشی اس کی سماعت میں محفوظ کر گیا تھا۔

"اب تم میری ہو۔"

اور وہ اب تک اپنی سماعت پر اسی سرگوشی کی دستک سنتی تھی۔ دو سال ہو گئے تھے۔ اسماء خالہ پھر نہیں آئیں لیکن فون پر مستقل رابطے میں تھیں۔ ابو سے اس کے بارے میں پوچھتی رہتیں پھر یہ ضرور کہتیں کہ وہ بس اس کے بی اے کرنے کے انتظار میں ہیں۔ ابو بھی اب مطمئن تھے جبکہ وہ کبھی خوش ہوتی کبھی اداس اور پریشان۔ پریشان اس خیال سے ہوتی کہ اس کے ابو اکیلے رہ جائیں گے اور وہ جلدی ان کے پاس آ بھی نہیں سکے گی۔ اس وقت بھی وہ یہی سب سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔

☆☆☆

صبح وہ معمول کے مطابق اذان کی آواز کے ساتھ ہی اٹھ گئی۔ نماز کے بعد تھوڑی تلاوت کی پھر کچن کا رخ کیا۔ پہلے چائے بنا کر ابو کو دی۔ اس کے بعد ناشتا بنا کر کالج کے لیے تیار ہونے لگی۔ وہ ابو کے ساتھ ہی ناشتا کرتی پھر ان کے ساتھ ہی نکلتی تھی۔ پڑوس کی عبیرہ کو بھی آواز دے لیتی تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیتی۔

عبیرہ اور وہ بچپن کی ساتھی تھیں۔ اسکول اور پھر کالج بھی ساتھ ہی آتی جاتی تھیں۔ وہ کیونکہ اکیلی تھی اس لیے کبھی عبیرہ کو اپنے پاس بلا لیتی اور کبھی خود اس کے ہاں چلی جاتی۔ دونوں گھروں کی ایک ہی دیوار تھی۔ عبیرہ کے گھر والے اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ عبیرہ کی طرح وہ بھی اس کی بڑی بہن کو عقیلہ آپا اور بھائی کو بڑے بھیا کہتی تھی۔

عقیلہ آپا کی منگنی ہو چکی تھی اور عید کے بعد شادی طے پائی تھی تو ان دونوں کے پاس اب بس یہی موضوع ہوتا تھا۔ دونوں خاصی پُرجوش تھیں۔ گو کہ ابھی عید آنے میں دو مہینے تھے لیکن ان کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

اس وقت دونوں کالج سے لوٹیں تو عبیرہ اسے کھینچتے ہوئے اپنے ہاں لے آئی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔

کیونکہ ابو تو شام میں آتے تھے۔ اس لیے دوپہر کا وقت وہ ادھر یا عبیرہ اس کے گھر آ جاتی تھی۔ دونوں باتونی تھیں اس لیے عقیلہ آپا نے پہلے ہی ہری جھنڈی دکھا دی۔

"میرا اس وقت سونے کا پروگرام ہے لہٰذا تم دونوں ڈرائنگ روم میں چلی جاؤ۔"

"کیا ہے آپا! کھانا تو کھا لینے دیں۔" عبیرہ نے بیگ رکھ کر چادر اتارتے ہوئے کہا۔

"کھانا بھی وہیں کھا لینا۔ چلو۔" عقیلہ آپا انگلی سے نکلنے کا اشارہ کرنے لگیں تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے عقیلہ آپا! پھر اس کمرے پر ہمارا قبضہ ہوگا۔"

"ہاں پھر دیکھیے گا......" عبیرہ بات پوری نہیں کرسکتی کیونکہ عقیلہ آپا نے دونوں کو باہر دھکیل کر دروازہ بند کرلیا تھا۔

"چلو پہلے کھانا کھالیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

"ہاں تم گرم کرو میں خالہ جان کو سلام کرلوں۔" وہ کہہ کر امینہ خالہ کے پاس آگئی۔ اور سلام کرکے ان ہی کے پاس بیٹھ گئی۔

"خوش رہو، عبیرہ کہاں ہے؟" امینہ خالہ نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"کچن میں گئی ہے۔" وہ جوتے اتار کر آرام سے بیٹھ گئی تو عبیرہ بھی کھانا وہیں لے آئی اور بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"آپ نے کھانا کھالیا امی؟"

"ہاں بیٹا۔ تمہیں پتا تو ہے میں ظہر کے بعد کھالیتی ہوں۔" امینہ خالہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

دونوں نے آرام سے کھانا کھایا پھر ڈرائنگ روم میں آئیں تو عبیرہ اسے اپنی شاپنگ دکھانے لگی۔ ان سلے سوٹ تھے جن پر دونوں کافی دیر مغز ماری کرتی رہیں یعنی کیا ڈیزائن ہونا چاہیے کون سی بیل لگنی چاہیے۔ ٹراؤزر یا چوڑی دار پاجامہ وغیرہ وغیرہ، ساتھ ساتھ عبیرہ اسے بھی مشورہ دیتی جارہی تھی کہ تم ایسے سوٹ سلوانا۔ اسی میں دوپہر ڈھل گئی تو اسے خیال آیا کہ رات کا کھانا بھی بنانا ہے تب بھاگم بھاگ گھر آئی۔

ابو مغرب کے بعد کھانا کھاتے تھے۔ اس لیے اس نے پہلے سالن چڑھایا پھر اوپری کاموں میں لگ گئی۔ کیونکہ اکیلی تھی۔ یعنی درمیان میں اس کے نام کی پکار نہیں پڑتی تھی اس لیے سب کام سکون سے اور جلدی ہوجاتے تھے۔ ابھی بھی وہ فارغ ہوکر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے لیٹی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"عبیرہ کی بچی کو چین نہیں ہے۔" وہ جھنجلا کر اٹھی اور جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ابو تھے۔

"آج آپ جلدی آگئے ابو۔" وہ سامنے سے ہٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں بس اچانک خیال آیا کہ میری بیٹیا اکیلی ہوگی تو میں چلا آیا۔" ابو اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے کہنے لگے۔

"یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے ابو! میں تو روز اکیلی ہوتی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کیا کریں مجھے عادت ہوگئی ہے اکیلے رہنے کی۔"

"جانتا ہوں پھر بھی میرا دھیان تمہاری طرف ہی رہتا ہے۔" ابو کہتے ہوئے لیٹ گئے تو وہ ان کے جوتے اتار کر پوچھنے لگی۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے؟"

"نہیں بیٹا پہلے ہی گھبراہٹ ہورہی ہے۔"

"گرمی بھی تو اتنی پڑرہی ہے۔ میں لیموں پانی لاتی ہوں۔" وہ پانچ منٹ میں لیموں پانی بنا کر لے آئی اور ابو کو آنکھیں بند کیے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"ابو آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔"

"ٹھیک ہوں بیٹا ٹھیک ہوں۔" ابو اٹھ بیٹھے تو اس نے جلدی سے گلاس بھر کر انہیں تھما دیا۔

"بیٹھ جاؤ اور لو، پہلے تم پیو۔" ابو نے گلاس اس کی طرف بڑھایا، جسے نظر انداز کرکے اس نے جگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور جا کر دوسرا گلاس لے آئی۔

"تھوڑی دیر آرام کرلیں پھر نہا لیجیے گا، فریش ہوجائیں گے۔" اس نے کہتے ہوئے اپنا گلاس بھرا پھر ان کے سامنے بیٹھ کر پینے لگی۔

"تمہاری دادی مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ

گرمیوں میں کیری کا شربت ضرور پینا چاہیے۔ بندہ لو سے محفوظ رہتا ہے۔" ابو کی بات سن کر وہ فوراً بولی۔

"جی مجھے یاد ہے، دادی بناتی بھی تھیں۔"

"تم کیوں نہیں بناتیں؟"

"آپ کہیں گے تو بنادوں گی۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر وہاں سے اٹھ آئی۔ اس خیال سے کہ ابو آرام کرلیں اور شاید وہ سو گئے تھے جب ہی رات میں کتنی دیر صحن میں ٹہلتے رہے پھر اس کے پاس چلے آئے۔ وہ صبح ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھی۔

"کیا بات ہے ابو! آپ کو نیند نہیں آرہی۔" وہ انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"نہیں، بے وقت جو سو گیا تھا۔" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئے تو اس نے نوٹس سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیے پھر انہیں دیکھ کر بولی۔

"کل میں کیری کا شربت بنادوں گی۔" ابو جانے کس سوچ میں تھے۔ اس کی بات سنی ضرور لیکن مسکرائے نہیں۔ جبکہ وہ قہقہے کی توقع کررہی تھی جب ہی چونک کر پوچھنے لگی۔

"کیا سوچ رہے ہیں ابو؟"

"کچھ نہیں بیٹا! بس وہ اسماء بہن کا فون نہیں آیا۔" ابو نے کہا تو وہ حیرت سے اچھلی۔

"کیا ہوگیا ہے ابو۔ ابھی کل ہی تو اسماء خالہ کا فون آیا تھا۔"

یاد آنے پر بھی اس سے پوچھا۔ "اچھا کیا بات ہوئی تھی۔"

"مجھے کیا پتا آپ سے بات ہوئی تھی ان کی۔" وہ زچ ہوئی تھی۔ ابو خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے تو اس نے پوچھ لیا۔

"اسماء خالہ نے آنے کو کہا ہے؟"

"پتا نہیں شاید کہہ تو رہی تھیں۔ خیر تم سو جاؤ اب، صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے اور دیکھو دروازہ اچھی طرح بند کرلیا کرو۔" ابو کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر اس کا سر تھپک کر چلے گئے۔

"ابو بھی بس زبردستی خود پر بڑھاپا طاری کررہے ہیں۔ اسماء خالہ آجائیں تو میں ان سے کہوں گی پہلے ابو کی شادی کریں۔" خود سے بولتے ہوئے اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا پھر بتی بجھا کر لیٹی تو یاد کیے ہوئے فارمولے دہراتے دہراتے سو گئی۔

صبح خود سے اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ ابو نے آکر اسے اٹھایا تو فجر کا وقت نکلا جارہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی وضو کرکے نماز پڑھی پھر بقیہ کام بھی جلدی سے نمٹا کر کالج کے لیے تیار ہوگئی۔ اس نے رات ہی ٹیسٹ کی تیاری کرلی تھی جبکہ عبیرہ پریشان تھی۔

"مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ ایسا کرتے ہیں کلاس گول کرجاتے ہیں۔" عبیرہ نے کہا تو وہ بگڑ گئی۔

"پاگل ہوگئی ہو۔ میں صرف ٹیسٹ کی وجہ سے آئی ہوں ورنہ آج میرا کالج آنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔"

"کبھی کبھی دل کی بھی مان لیا کرو۔" عبیرہ کہہ کر لائبریری کی طرف جانے لگی تو وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر بولی۔

"وہاں کہاں جارہی ہو۔"

"تم کلاس اٹینڈ کرکے لائبریری آجانا وہیں ملوں گی۔" عبیرہ اپنا ہاتھ چھڑا کر چل پڑی تو وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

پھر مجبوراً کلاس کے بعد اسے لائبریری جانا پڑا۔ کیونکہ گھر تو دونوں کو ساتھ ہی جانا تھا۔

"اے۔" عبیرہ اسے دروازے سے داخل ہوتے دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگی تو وہ بری سی شکل بناتے ہوئے اس کے سامنے آن بیٹھی۔

"کیسا ہوا ٹیسٹ؟" عبیرہ نے چھیڑنے کی غرض سے پوچھا اس نے جواب دینے کے بجائے بیگ میں سے اپنا سیل فون نکال لیا۔

''کسے فون کررہی ہو؟'' عیرہ چپ نہیں رہ سکتی تھی۔
''کسی کو نہیں، ٹیسٹ کے دوران شاید کال آرہی تھی وہی چیک کررہی ہوں۔'' اس نے اسکرین آن کرتے ہوئے جواب دیا پھر کال چیک کرکے حیرت سے بولی۔
''ابو کی کال تھی اور پتا نہیں کب سے کال کررہے تھے۔ پانچ کالیں آئی ہوئی ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کال بیک کا بٹن پش کرکے سیل فون کان سے لگایا تو پاور آف کا ٹیپ بجنے لگا۔
''کیا ہوا؟'' عیرہ اس کی الجھن دیکھ رہی تھی۔
''ابو کا سیل آف ہے۔ چلو جلدی چلو، شاید ابو گھر آچکے ہیں۔ بھوک لگی ہوگی انہیں۔'' اس کی عجلت دیکھتے ہوئے عیرہ فوراً اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔
جانے راستہ اتنا طویل کیسے ہوگیا تھا۔ وین سے اترتے ہی وہ جتنا تیز چل رہی تھی اپنی گلی کا موڑ مڑتے ہی اس کے قدم اتنے ہی سست پڑگئے۔
اپنے گھر کے دروازے پر محلے والوں کو جمع دیکھ کر اس نے عیرہ کا بازو تھاما اس کے بعد اسے نہیں پتا کہ گھر تک کیسے آئی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ امینہ خالہ دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف آرہی تھیں۔ اس کی نظریں خون میں لت پت ابو کے چہرے پر ساکت ہوگئی تھیں۔ کس نے اسے سینے سے لگایا۔ کون کون اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ جب ابو کو آخری سفر پر لے جانے کے لیے اٹھایا گیا تب زوردار چیخ کے ساتھ وہ اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔

☆☆☆

امینہ خالہ اس کے ساتھ سورہی تھیں اور اس کی تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ ہمیشہ فجر کی اذان کے ساتھ وہ اٹھ جاتی تھی اور اب اس وقت اس کی آنکھ لگی تھی۔ دوپہر میں امینہ خالہ نے اسے اٹھایا تو وہ ان کے گلے لگ کر یوں روئی کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ عیرہ عقب سے اس کے کندھے تھام کر سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی کہ اچانک اس کا موبائل بجنے لگا۔ عیرہ نے موبائل اٹھاکر دیکھا پھر اس سے بولی۔
''رملہ! دیکھو امریکہ سے کال آرہی ہے۔ شاید تمہاری خالہ ہیں۔'' اس نے جھپٹ کر موبائل کان سے لگایا ضرور لیکن کچھ بول نہیں ہوسکی۔ بس روئے گئی۔ ادھر اسے اسماء خالہ تسلی دینے کے ساتھ جلدی آنے کا کہہ رہی تھیں۔ پھر لائن کٹ گئی تو وہ عیرہ کو دیکھ کر بس اسی قدر کہہ سکی۔
''خالہ کو؟''
''میں نے تمہارے سیل سے نمبر لے کر بڑے بھیا سے فون کروایا تھا۔'' عیرہ نے سمجھ کر بتایا پھر اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔
''چلو اٹھو، منہ ہاتھ دھولو پھر کچھ کھالو۔''
''ہاں بیٹا! تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔'' امینہ خالہ اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو اور چہرہ صاف کرنے لگیں۔ ساتھ عیرہ کو کھانا لانے کا اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔
پھر امینہ خالہ نے بہت پیار سے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا اس کے بعد چائے بھی پلائی تو وہ کچھ بولنے کے قابل ہوئی۔
''ابو کو کیا ہوا تھا خالہ؟''
''ایکسیڈنٹ، لوگ بتارہے تھے آفس کے کسی کام سے نکلے تھے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اسے خراش تک نہیں آئی اور وہ تمہارے ابو کو فوراً ہاسپٹل لے گیا لیکن۔'' امینہ خالہ خاموش ہوگئیں تو اس نے ٹھوڑی گھٹنے پر رکھ لی۔
''ابو مجھے کال کررہے تھے۔ بار بار۔'' ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ تب ہی دروازے پر دستک ہونے لگی۔ امینہ خالہ کے اشارے پر عیرہ اٹھ کر چلی گئی۔ پھر واپس آکر کہنے لگی۔

''کوئی عبدالکریم صاحب ہیں۔ کہہ رہے ہیں انکل کے آفس سے آئے ہیں اور رملہ بیٹا سے ملنا ہے۔''

''بٹھاؤ انہیں بلکہ ادھر ہی لے آؤ۔'' امینہ خالہ نے جلدی سے چادر اٹھا کر اوڑھ لی پھر اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''اس وقت کوئی مرد بھی گھر پر نہیں ہے۔ بیٹا تم ہمت سے کام لو۔''

''السلام علیکم!'' آنے والے نے دروازے میں رک کر سلام کیا تو وہ نظریں اٹھا کر دیکھنے لگی۔ دبلے پتلے سفید کھچڑی داڑھی والے عبدالکریم اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

عبیرہ نے کرسی اس کے بیڈ کے قریب کھینچ دی تو وہ آکر بیٹھ گئے۔ پہلے نظریں جھکیں پھر سر بھی جھک گیا۔ یہ بہ زبان خاموش، تعزیت کا اظہار تھا۔ کتنی دیر بعد انہوں نے سر اونچا کیا اور جھکی نظروں سے امینہ خالہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

''بی بی، آپ رملہ بٹیا کی کون ہیں؟''

''یہ میری خالہ ہیں۔'' ان سے پہلے رملہ بول پڑی۔

''اسما خالہ؟'' عبدالکریم کے چہرے پر حیرت ابھری تو رملہ بھی حیران ہوئی۔

''آپ اسماء خالہ کو جانتے ہیں؟'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا پھر سوالیہ نظروں سے امینہ خالہ کو دیکھا تو وہ سمجھ کر بولی تھیں۔

''میرا یہ ساتھ والا گھر ہے۔''

''مجھے یہ ہی معلوم کرنا تھا یعنی آپ امینہ بہن ہیں۔'' انہوں نے کہا تو امینہ خالہ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''آپ تو سب کو جانتے ہیں وہ بھی نام سے۔ کون ہیں آپ؟''

''میں ایک معمولی آدمی ہوں امینہ بہن اور سچ پوچھیں تو میں کسی کو نہیں جانتا۔ خیر میں آپ کو الجھانا نہیں چاہتا۔ اصل بات یہ ہے کہ رملہ بٹیا کے والد صاحب اپنے آخری وقت میں ان کی ذمہ داری ہمیں سونپ گئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کے بعد ہم امینہ بہن سے مل کر اور انہیں بتا کر رملہ بٹیا کو اپنے گھر لے جائیں اور جب امریکہ سے ان کی اسماء خالہ آجائیں تو ہم رملہ بٹیا کو ان کے ساتھ جانے دیں۔'' عبدالکریم خاموش ہو گئے تو رملہ امینہ خالہ کو دیکھنے لگی۔ جو ساری بات سن کر سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

''آپ کیا کہتی ہیں امینہ بہن۔'' کافی انتظار کے بعد عبدالکریم نے انہیں مخاطب کیا تو انہوں نے چونک کر یوں نفی میں سر ہلایا جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو پھر کہنے لگیں۔

''میں کیا کہوں جب بھائی صاحب خود ہی سب طے کر گئے ہیں لیکن۔'' وہ رملہ کو دیکھنے لگیں جو گم صم بیٹھی تھی۔

''لیکن آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔'' عبدالکریم کے ٹوکنے پر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''جی میں یہ کہہ رہی تھی کہ ابھی کچھ دن رملہ کو یہیں رہنے دیں ذرا سنبھل جائے پھر آپ لے جایئے گا۔ کیونکہ ایک دم اجنبی ماحول میں جا کر اس کا دکھ بجائے کم ہونے کے سوا ہو جائے گا۔ جبکہ یہاں اگر ہم اس کے اپنے نہیں تو اپنوں سے کم بھی نہیں۔''

''آپ اپنوں سے بڑھ کر ہیں خالہ!'' وہ ان کی گود میں سر رکھ کر سسک پڑی تو وہ آہستہ آہستہ اس کا سر تھپکنے لگیں۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں بی بی، ابھی اسے آپ کی ضرورت ہے۔ مجھے اجازت دیجیے میں پھر آجاؤں گا۔'' عبدالکریم اٹھ کھڑے ہوئے پھر سلام کر کے باہر نکل گئے۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی خالہ! یہیں رہوں گی۔'' اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

☆☆☆

وہ واقعی اپنے گھر سے کہیں نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اکیلی بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ تین دن امینہ خالہ اس

کے پاس رہیں پھر اپنے گھر لے لگئیں۔ دن میں جب نجیرہ کالج سے آجاتی تو وہ اس کے ساتھ اپنے گھر جاتی اور شام میں پھر اس کے گھر، جبکہ اسماء خالہ روزانہ اسے فون کرتی تھیں۔ ان کی شوگر بہت ہائی ہوگئی تھی اس لیے فی الحال وہ اتنا لمبا سفر نہیں کرسکتی تھیں۔ البتہ صائم کا انہوں نے بتایا کہ وہ اسے لینے آئے گا۔ اور پتا نہیں کب آئے گا۔ اسماء خالہ کوئی دن تاریخ نہیں بتا رہی تھیں۔ اس لیے دوسرے ہفتے جب عبدالکریم اسے لینے آئے تو اس نے بیگ میں چند جوڑے کپڑے رکھے اور امینہ خالہ کو بتا کر ان کے ساتھ چل پڑی۔ گوکہ امینہ خالہ کے ہاں سب اس کا خیال کررہے تھے اور اسے بھی غیریت محسوس نہیں ہوتی تھی اور اگر جو صائم کا آنا طے ہوجاتا کہ وہ دو ہفتے بعد آئے گا یا دو مہینے بعد تو شاید وہ عبدالکریم کو منع کردیتی لیکن جب یہ طے ہی نہیں ہورہا تھا تو وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی دن امینہ خالہ یا گھر کے کسی اور فرد کی زبان پر یہ سوال آجائے کہ صائم کب آئے گا؟ پھر ابو نے بھی کچھ سوچ کر ہی اس کی ذمہ داری عبدالکریم کو سونپی ہوگی۔ یہی سب سوچ کر وہ ان کے ساتھ چل پڑی تھی لیکن اندر سے خائف بھی تھی۔

رکشہ جانے کن راستوں سے گزر کر کس مقام پر رکا تھا۔ وہ ہر طرف سے بے نیاز دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرنے کے ساتھ اللہ سے عافیت مانگتی رہی تھی۔ جب عبدالکریم نے اسے اترنے کو کہا تب چونک کر رکشہ سے اترتے ہی سڑک کے دونوں اطراف خوبصورت بنگلے دیکھ کر وہ حیرت میں ڈوب گئی۔

"آؤ بیٹا!" عبدالکریم نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیتے ہوئے کہا تو وہ یوں ہی سراسیمہ سی ان کے پیچھے چلتی چلی گئی۔ گیٹ سے آگے روش جس کے ایک طرف خوب صورت لان دوسری طرف پرشکوہ عمارت، چند سیڑھیاں اوپر کوریڈور اس سے گزر کر ایک دروازے سے اندر داخل ہوئی تو اسٹائلش فرنیچر سے آراستہ کشادہ لاؤنج میں عبدالکریم رک گئے۔

"بیٹھو بیٹا......" انہوں نے کہا تو وہ غائب دماغی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔

"جب تک تمہاری خالہ نہیں آجاتیں تم یہاں آرام سے رہو۔ کوئی تکلف مت کرنا۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ بیٹھو میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں یا کھانا کھاؤ گی؟"

"نہیں......" اس کا سر نفی میں ہلتا چلا گیا۔

"اچھا ٹھنڈا پانی تو پیو گی۔" وہ کہتے ہوئے چلے گئے تو اپنے پیچھے نشست دیکھ کر وہ ڈھے سی گئی۔ ادھر ادھر یہاں وہاں کہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا پھر بھی ہر شے سے زندگی کے آثار جھلک رہے تھے۔ خاموشی بھی بولتی ہوئی لگ رہی تھی۔ شاید وہ کسی طلسم کدہ میں آگئی تھی۔

"لو بیٹا پانی پی لو۔ پھر ہم تمہیں کمرہ دکھادیں۔" عبدالکریم نے پانی کا گلاس اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔

"آپ کیوں لائے مجھے بتاتے میں پانی لے آتی۔"

"ارے بیٹا! ہم تم سے کام کروائیں گے تو شہیر میاں ہمیں نکال باہر کریں گے۔ پہلے ہی ہمیں سبق رٹواتے رٹواتے ان کا پارہ چڑھ گیا تھا۔" انہوں نے کہا تو وہ الجھ کر پوچھنے لگی۔

"کیسا سبق؟"

"وہی جو ہم تمہارے گھر جاکر بولے تھے۔ وہ کیا کہ ہاں آپ کے والد نے آپ کی ذمہ داری ہمیں سونپی ہے۔ پھر وہ اسما بہن اور امینہ بہن کا نام ہم ادھر ادھر کر جاتے تھے تو شہیر میاں غصہ ہوتے تھے۔" وہ اپنے تئیں تفصیل سے بتائے جارہے تھے اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا مزید سر بھی چکرانے لگا تھا۔

"بس کریں بابا......" اس نے سر پکڑتے ہوئے ٹوکا تو وہ پریشان ہوگئے۔

"کیا ہوا بیٹا؟"

"کچھ نہیں۔ آپ بس مجھے واپس چھوڑ آئیں۔ امینہ خالہ کے پاس" وہ رونے لگی۔

"ارے بٹیا رو نہیں۔ ہمارا دل بہت کمزور ہے۔ شہیر میاں آجائیں پھر ان سے پوچھ کر ہم تمہیں چھوڑ آئیں گے۔ لو پانی پیو۔"

انہوں نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا تو چند گھونٹ لے کر وہ شاکی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"ہم تو ملازم ہیں بیٹا۔" وہ اپنی صفائی پیش کرتے اور جانے کیا کیا بولتے ہوئے اسے بیڈ روم میں لے آئے۔ اے سی کھولا پھر اسے آرام کرنے کا کہہ کر جاتے ہوئے دروازہ بند کرتے گئے تو کمرہ مزید تاریک ہو گیا۔

"یا اللہ، یہ میں کہاں آ گئی۔" ابو اسماء خالہ" وہ بیڈ پر بیٹھ کر پھر رونے لگی اور یوں ہی روتے روتے آنکھ لگ گئی لیکن زیادہ دیر نہیں سو سکی ہڑبڑا کر اٹھی اور گھبرا کر کمرے سے نکلی تو سامنے ایک عورت کو دیکھ کر قدرے ڈھارس بندھی تھی۔ وہ عورت مخالف سمت کے دروازے میں داخل ہو رہی تھی وہ تیزی سے اس کے پیچھے چلی آئی۔ ڈائننگ روم اور اس سے آگے کچن تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عورت پچھلے دروازے کی طرف بڑھتی اس نے پکار لیا۔

"سنیں۔" عورت فوراً پلٹی تھی اور اسے دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"ابھی تو میں تمہیں دیکھ کر آ رہی ہوں۔ تم سو رہی تھیں۔"

"نہیں، بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔"

"اچھا بیٹھو، میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔" اس نے پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ وہ کھانا کھائے گی کہ نہیں جب ہی وہ بھی خاموشی سے وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ جب اس نے کھانا گرم کرکے اس کے سامنے رکھا تب پوچھنے لگی۔

"آپ کون ہیں؟"

"رافیہ......" صرف نام بتانے پر اکتفا کیا گیا تو اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

"اور وہ کریم بابا؟"

"وہ میرے سسر ہیں۔ سودا لینے گئے ہیں ابھی آجائیں گے۔" اس نے بتاتے ہوئے فریج سے پانی کی بوتل نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تو وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی کیونکہ مزید کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ وہ کون سا کسی کو جانتی تھی۔

"اور کچھ لینا ہے؟" رافیہ نے پوچھا تو وہ چونک کر بولی۔

"نہیں، آپ بیٹھ جائیں۔"

"میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں......" رافیہ کہہ کر پچھلے دروازے سے نکل گئی تو اس نے کھانے کے ساتھ اسٹائلش کچن کا جائزہ بھی لے ڈالا۔ پھر وہاں سے اٹھ گئی۔ ڈائننگ سے نکل کر لاؤنج میں آتے ہی اسے رکنا پڑا اور ادھر بیرونی دروازے سے اندر آتے ہوئے شہیر حسن کے قدم بھی اسے دیکھ کر تھم گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہ کرے کہاں جائے۔ قدم واپس موڑنا چاہتی تھی کہ وہ پوچھنے لگا۔

"آپ رملہ ہیں؟"

"جی......"

"آئیے یہاں بیٹھیں۔" وہ کہہ کر صوفوں کی طرف بڑھا اور جب وہ آکر بیٹھ گئی تب بیٹھتے ہی کہنے لگا۔

"میرا نام شہیر حسن ہے۔ آپ کے فادر میری فرم میں کام کرتے تھے۔ ان کے ایکسیڈنٹ کا سن کر میں فوراً ان کے پاس ہاسپٹل پہنچا تھا۔ ان کی حالت نازک تھی لیکن وہ بات کر رہے تھے انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا اور کہا کہ یہاں یعنی پاکستان میں آپ کا ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔" وہ خاموش ہو کر اپنی جیبوں پر ہاتھ مارنے لگا پھر ایک جیب سے موبائل نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کے فادر کا سیل فون ہے۔" اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر موبائل لے لیا تو کہنے لگا۔

''آپ کے فادر جو جو نام لیتے جا رہے تھے میں اس میں سیف کرتا گیا کہ کہیں بھول نہ جاؤں۔ باقی ساری باتیں آپ کو کریم بابا نے بتادی ہوں گی تو اب میں یہی کہوں گا کہ خدائی کاموں میں کسی کو دخل نہیں۔ آپ صبر اور ہمت سے کام لیں۔ یہاں ان شاء اللہ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ جب تک آپ کی خالہ نہیں آجاتیں آپ کہیں اور جانے کا سوچیے گا بھی نہیں کیونکہ میں نے آپ کے فادر سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک آپ کی خالہ نہیں آجاتیں میں آپ کو تحفظ دوں گا۔'' اس نے ہاتھوں اور کندھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر بات ختم ہونے کا اشارہ دیا تو وہ بلاارادہ بولی۔

''خالہ تو نہیں آئیں گی۔'' شہید حسن نے دیکھا تو جز بز ہو کر کہنے لگی۔

''میرا مطلب ہے، ابھی نہیں آسکتیں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، ڈاکٹر نے لمبے سفر سے انہیں منع کیا ہے۔''

''نو پرابلم۔ جب بھی آئیں۔'' وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا پھر جیسے اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگا۔

''آپ شاید کالج جاتی ہیں؟''

''اب تو نہیں جاتی۔''

''کیوں ...... جانا چاہیے، سال ضائع مت کریں۔'' اس نے کہا تو وہ مایوسی سے بولی۔

''یہاں سے کیسے جاؤں گی۔''

''ڈرائیور چھوڑ آئے گا اور لے بھی آئے گا۔ اس کی فکر نہ کریں اور اگر بکس وغیرہ لے آئی ہیں تو ٹھیک ورنہ کل کریم بابا کے ساتھ جا کر لے آئیے گا۔ اوکے۔''

وہ کیا کہتی خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

وہی بات کہ مرنے والے کے ساتھ کوئی مرا نہیں جاتا۔ خواہ عزیز از جان ہی کیوں نہ ہو۔ وقت کے ساتھ دل درد آشنا ہو کر ٹھہر سا جاتا ہے۔ اس کی بھی بس جگہ بدلی تھی، باقی وہی روٹین شروع ہوگئی تھی۔ دو ہفتے ہوگئے تھے اسے یہاں آئے ہوئے۔

صبح کالج جاتی تو وہاں عبیرہ کے ساتھ دکھ سکھ کی باتیں ہو جاتیں۔ دوپہر میں واپس آتی تو کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتی پھر کریم بابا کے ساتھ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ وہ لاکھ منع کرتے لیکن اسے فارغ بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ جب ہی ضد کر کے رات کا کھانا بھی بنانے لگی تھی اور رات کے کھانے پر ہی اس کی شہیر حسن سے ملاقات ہوتی۔ وہ خاص طور پر کھانے کی میز پر اسے بلاتا تھا۔ شروع میں وہ بہت جھجکتی تھی پھر آہستہ آہستہ عادی ہوگئی۔ کیونکہ وہ عام طور سے اس سے معمول کے جملے بولتا تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں۔''

''کوئی پرابلم تو نہیں۔''

''اسٹڈی کیسی جا رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔'' وہ بھی مختصر جواب دیتی۔ البتہ کریم بابا بہت بولتے تھے اور وہ ان سے مانوس بھی ہوگئی تھی جب ہی اپنی ساری باتیں ان سے کرتی بالکل اسی طرح جیسے ابو سے کرتی تھی۔

اس وقت وہ کھانا بنانے کے ساتھ کریم بابا کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

''کریم بابا! باس کے کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہیں کیا؟'' وہ شہیر حسن کو باس کہتی تھی کیونکہ اس کے ابو کے باس یہی تھے

''کیوں نہیں۔ ماشاء اللہ سب ہیں۔'' انہوں نے کہا تو وہ فوراً بولی۔

''کہاں ہیں۔ میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ میرا مطلب ماں باپ، بہن بھائی۔''

''ماں باپ تو بیٹا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دو بڑی بہنیں ہیں، وہ بدیس سدھار گئیں۔ ماں باپ کی زندگی میں نو سال پہلے آئی تھیں اور اب تو تین سال ہوگئے۔ شہیر میاں ہی جا کر مل آتے ہیں وہ بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد نہیں آئیں۔'' آخر میں کریم بابا آہ بھر کر بولے۔ ''سچ ہے میکہ ماں باپ کے

دم سے ہی آباد رہتا ہے۔"
"تو باس کیوں نہیں شادی کر لیتے۔ یہ گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔" اس نے کہا تو کریم بابا مایوسی بولے۔
"کون سمجھائے شہیر میاں کو، بس ایک غم دل کو لگائے بیٹھے ہیں۔"
"کیسا غم؟" وہ چولہا دھیما کر کے ان کے پاس آبیٹھی۔
"کیا بتائیں بیٹا! دکھ تو ہمیں بھی ہے۔ بیگم صاحبہ نے کتنے چاؤ سے منگنی کی تھی شہیر میاں کی لیکن انہیں سہرا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ چھ مہینے بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔"
"پھر؟" اس نے بے صبری دکھائی۔
"پھر کیا، شادی بھی ہو جاتی اگر لڑکی والے صبر کرتے۔ بیگم صاحبہ کے غم میں شہیر میاں مہینوں سنبھل نہیں سکے جس سے کاروبار بھی تقریباً ٹھپ ہو گیا اور اس بات کو لے کر لڑکی والوں نے رشتہ توڑ دیا کہ اب ان کے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں۔"
"اف۔" اسے دکھ تو نہیں افسوس ہوا تھا۔
"ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔"
"ایسے بہت لوگ ہیں بیٹا جن کا دین ایمان صرف پیسہ ہے۔ آج شرافت کوئی نہیں دیکھتا سب پیسے پہ مرتے ہیں۔ خیر شہیر میاں کو اللہ نے پھر نواز دیا۔"
"تو اب کیا مسئلہ ہے۔ اب شادی کیوں نہیں کرتے؟" وہ گویا اپنی طرف سے اس لڑکی پر لعنت بھیج چکی تھی۔
"پتا نہیں بیٹا! ہمیں تو لگتا ہے شہیر میاں اس لڑکی کو بھول نہیں پائے۔" کریم بابا نے کہا تو وہ انہیں دیکھنے لگی جبکہ ذہن میں محبت کی داستان بننے لگی تھی۔
"اب میں سمجھی باس کو اس لڑکی سے محبت تھی۔" وہ ٹیبل پر ہاتھ مار کر بولی۔
"ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں۔" کریم بابا نے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے جو لڑکی پیسے کی وجہ سے ان سے ناتا توڑ گئی، اس کی محبت کو دل میں بسائے رکھنا سراسر حماقت ہے۔ ہے ناں۔" اس نے تائید بھی چاہی تو کریم بابا سر ہلانے لگے۔
اور اس روز رات کے کھانے پر وہ بار بار کن اکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ بے حد وجیہہ شخص تھا۔ اگر وہ اتنا لیے دیے نہ رہتا تو اس وقت وہ اس لڑکی کی جھوٹی محبت کے جال سے نکلنے پر طویل لیکچر دیتی۔ لیکن وہ تو بلاوجہ اس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ اسے متوجہ کرنے کی جسارت کر گئی۔
"سالن میں نمک تیز ہے۔"
"جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" شہیر حسن نے چونک کر پوچھا۔
"سالن میں نمک تیز ہے آپ کو نہیں لگا۔"
اس کے استفسار پر شہیر حسن نے ذرا سے کندھے اچکائے پھر بے نیازی سے کھانا کھا کر اٹھ گیا تو وہ اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔
"عجیب آدمی ہے لیکن ہے اچھا۔ اسے سمجھانا پڑے گا۔ بے چارہ خوامخواہ جوگ لیے بیٹھا ہے۔"
جب سونے لیٹی تو اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن چھٹی تھی اور چھٹی کے دن وہ دیر سے اٹھتی تھی۔ ابھی بھی وہ نو بجنے کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک اس کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ پتا نہیں کس پر ناراض ہو رہا تھا۔ وہ بہر حال اپنی جگہ خائف ہو گئی تھی۔ گو کہ پانچ منٹ بعد خاموشی چھا گئی تھی پھر بھی وہ گھنٹے بھر بعد کمرے سے نکلی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی کچن میں آگئی۔
"آج دیر سے اٹھیں بیٹا!" کریم بابا نے اسے دیکھ کر کہا تو وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔
"نہیں بابا! اٹھ تو جلدی گئی تھی۔ بس وہ باس

غصہ کررہے تھے ناں تو میں ڈر گئی۔"
"ارے وہ تم پر تھوڑی غصہ ہورہے تھے۔"
"پھر کس پر ہورہے تھے؟" وہ جاننا چاہتی تھی ورنہ یہ تو اسے بھی پتا تھا کہ غصہ اس پر نہیں تھا۔
"غصہ تو بیٹا رافیہ پر تھا۔ نکالا ہم پر۔ رافیہ ان کے کمرے کی صفائی کرتی ہے ناں تو پیپر ادھر اُدھر کردیتی ہے، اس پر غصہ ہوتے ہیں۔ کتنی بار ہم رافیہ کو سمجھا چکے ہیں کہ پیپروں کو ہاتھ مت لگایا کرو۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔" کریم بابا تفصیل بتانے کھڑے ہوگئے۔
"چلیں آپ رافیہ کو منع کردیں کل سے باس کے کمرے کی صفائی میں کروں گی۔" اس نے چولہے پر چائے کا پانی رکھتے ہوئے کہا تو کریم بابا فوراً بولے۔
"نا بیٹا۔ شہیر میاں بہت ناراض ہوں گے۔"
"ناراض تو تب ہوں گے جب انہیں پتا چلے گا، انہیں بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ اپنا ناشتا بنانے میں مصروف بول رہی تھی کہ شہیر کریم بابا کو پکارتے ہوئے کچن میں داخل ہوتے ہی رک کر اسے دیکھنے لگا تو کریم بابا بوکھلا گئے۔
"میاں! ہم منع کرتے ہیں انہیں۔"
"جی کریم بابا منع کرتے ہیں مجھے۔" وہ فوراً ان کی تائید کرکے کہنے لگی۔ "لیکن میں کیا کروں۔ مجھے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ یوں بھی مجھے گھر کے کاموں کی عادت ہے۔ فارغ بیٹھوں گی تو بیمار پڑ جاؤں گی، آپ چائے پئیں گے؟"
اس کی آخری بات پر شہیر حسن نے چونک کر کریم بابا کو دیکھا تو جیسے ان کی زبان سے پھسل گیا۔
"آپ سے پوچھ رہی ہیں میاں!" اس کی موجودگی میں وہ دانت بھی نہیں پیس سکا اور رواداری میں کہنا پڑا۔
"جی۔" اس نے جلدی سے مگ میں چائے ڈال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
"تھینک یو۔" وہ مگ لیتے ہی فوراً کچن سے نکل گیا۔

☆☆☆

اس نے دیکھ لیا تھا کہ شہیر حسن براہ راست اسے کچھ نہیں کہے گا اس لیے وہ آرام سے سارے کام کرنے لگی تھی۔ کبھی لان میں پودوں کو پانی دے رہی ہوتی۔ کبھی اپنی نگرانی میں گیراج دھلوا رہی ہوتی۔ کبھی رافیہ کو ساتھ ملا کر کچن کے سارے برتن باہر نکالتی اور کیبنٹ کی صفائی کروا کر نئے سرے سے سیٹنگ کرتی اور روزانہ خصوصاً ڈسٹنگ وغیرہ کے لیے جب شہیر حسن کے کمرے میں داخل ہوتی تو اسے لگتا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آگئی ہو کیونکہ دروازہ کھولتے ہی مسحور کن خوشبو اس کا استقبال کرتی تھی۔
شاید وہ ہمیشہ سے ایک ہی پرفیوم استعمال کرتا آرہا تھا کہ ہر شے میں اس کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ اس کے کمرے سے نکلنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر اسی حصار میں رہتی تھی۔
بہرحال اسے یہاں رہتے ہوئے دو مہینے ہوگئے تھے۔ اس دوران اسماء خالہ مستقل اس سے رابطے میں تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن ضرور اسے فون کرتیں۔ اپنے نہ آسکنے کا انہیں بھی بہت ملال تھا اور صائم کے بارے میں اب وہ کہتی تھیں کہ اس کی نئی جاب ہے اس لیے فوراً چھٹی نہیں مل سکتی۔ پھر بھی وہ کوشش کررہا ہے، تم دعا کرو، اور وہ دعا ہی تو کرتی تھی۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔
اس وقت وہ چائے بناتے ہوئے صائم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دو ہفتے پہلے اس سے بات ہوئی تھی۔ خاصا فکرمند تھا۔
"میں جانتا ہوں، تمہارے لیے وقت کاٹنا مشکل ہورہا ہے لیکن یقین کرو میں تم سے زیادہ پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے فوراً تم تک پہنچ جاؤں۔"
"میں بھی یہی چاہتی ہوں صائم! آپ آجائیں۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

''فکر مت کرو، میں مستقل اسی کوشش میں لگا ہوں، ان شاء اللہ جلدی آؤں گا، اپنا خیال رکھنا۔''

''کیا خیال رکھوں اپنا۔'' اس نے دل گرفتگی سے سوچا پھر کپ میں چائے ڈال کر دیکھا۔ کریم بابا پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے، اس نے ٹرے اٹھائی اور کچن سے نکل کر لاؤنج میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کریم بابا کہیں نظر نہیں آئے تو ناچار وہ خود ہی شہیر حسن کے کمرے تک آ گئی۔ ٹرے ایک ہاتھ سے پکڑ کر دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی تھی کہ اندر سے کریم بابا کی آواز آئی۔

''رملہ بیٹا! بہت اچھی ہیں شہیر میاں، ہم تو یہی کہیں گے آپ انہیں کہیں نہ جانے دیں۔ اپنے پاس رہنے دیں ہمیشہ کے لیے، ہمارا مطلب ہے شادی کر لیں ان سے۔''

''یا اللہ!'' اس کے ایک ہاتھ سے ٹرے گرتے گرتے بچی۔ فوراً دوسرے ہاتھ سے ٹرے سنبھال کر الٹے قدموں پیچھے ہٹی اور پھر پلٹ کر تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ گو کہ کریم بابا اپنی خواہش کا اظہار کر رہے تھے اس میں اس کا کوئی دخل نہیں تھا، نہ ہی وہ ایسا گمان کر سکتی تھی جب ہی تو اس نے شہیر حسن کا جواب سننے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ پھر خود پر قابو پانے کے بعد بھی اس نے یہ نہیں سوچا کہ جانے شہیر حسین نے کیا کہا ہوگا۔ اس کے برعکس اسے اپنی پوزیشن آکورڈ لگنے لگی تھی۔

''مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی پھر اسی وقت ٹائم دیکھ کر اسماء خالہ کو کال ملائی اور ان کی آواز سنتے ہی کہنے لگی۔

''خالہ! میں کب تک کسی دوسرے کے گھر رہ سکتی ہوں، اب مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ پلیز آ جائیں ورنہ میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔''

''جب اکیلی ہو گئی ہوں تو اکیلے رہ بھی لوں گی۔''

''آپ خود سوچیں، اگلا مہینہ رمضان المبارک کا ہے پھر عید۔ تو صائم عید کے بعد آئیں گے، پکی بات ہے ناں۔''

''نہیں، یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے، بس مجھے خود اچھا نہیں لگ رہا۔''

''ٹھیک ہے خالہ!'' وہ سیل فون رکھ کر جانے کیا کیا سوچنے لگی اور اگلے روز رات کے کھانے پر وہ خود شہیر حسن کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

''سر، رات میری اسماء خالہ سے بات ہوئی ہے، وہ بتا رہی تھیں کہ عید کے بعد صائم آئے گا۔''

''صائم؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اسماء خالہ کا بیٹا ہے اور میرا منگیتر بھی۔'' وہ بتا کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

شہیر حسن نے ہاتھ میں پکڑا چمچ بہت آہستگی سے میز پر رکھا تھا اور پھر غالباً اٹھنا چاہتا تھا کہ وہ پھر بولنے لگی۔

جب میں فرسٹ ایئر میں تھی تب اسماء خالہ اور ان کے ساتھ صائم بھی آیا تھا۔ اسی وقت ہماری منگنی ہوئی تھی اور شادی میرے گریجویشن کے بعد طے پائی تھی۔'' اسے خود نہیں پتا تھا کہ وہ یہ وضاحتیں کیوں دے رہی ہے۔ اسے باور کروا رہی ہے یا خود کو......

جبکہ وہ دم سادھے سن رہا تھا۔

کل رات اور آج کی رات میں صدیاں حائل ہو گئی تھیں۔

یہ نہیں تھا کہ کریم بابا نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اس نے تو کبھی دو گھڑی رک کر اس لڑکی کو دیکھا بھی نہیں تھا پھر جانے کیوں اس نے کریم بابا کو ٹوکنے سے گریز کیا تھا۔ یہ اب سمجھ میں آ رہا تھا جب وہ دور بہت دور جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

رمضان المبارک کی آمد آمد تھی۔ جانے اس ماہ مبارک میں اس گھر کے کیا معمولات تھے۔ سوچتے ہوئے اسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ ابو کے ساتھ سحری اور افطاری پھر فرائض کے ساتھ نفلی

عبادات۔ پتا نہیں یہاں وہ کر پائے گی کہ نہیں۔
''کاش صائم رمضان سے پہلے آ سکتا۔'' وہ سوچتے ہوئے دن گننے لگی تھی کہ کریم بابا پوچھنے لگے۔
''کیا سوچتی ہو بیٹا!''
''کچھ نہیں بابا۔'' اس کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہوئی تھی۔
''اچھا دیکھو۔'' کریم بابا نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس کے سامنے رکھ کر کہنے لگے۔ ''رمضان میں کہیں آنا جانا مشکل ہوجاتا ہے اس لیے ہم کہیں گے، تم اپنی خریداری ابھی کرلو۔''
''خریداری؟'' وہ فوراً لفافے میں جھانک کر پوچھنے لگی۔ ''یہ پیسے کہاں سے آئے؟''
''شہیر میاں نے دیے ہیں تمہارے لیے۔'' انہوں نے بتایا تو وہ بدک گئی۔
''سوری بابا! میں مزید کسی احسان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ مجھے کوئی خریداری نہیں کرنی' آپ یہ پیسے انہیں واپس کردیں۔''
''لیکن بیٹا!''
''بس بابا! میں نے کہہ دیا ناں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ سختی سے کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ عجیب بے بسی کا سامنا تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔
''ابو نے بھی پتا نہیں کیا سوچ کر انہیں، اگر ابو کو یہ پتا ہوتا کہ اسماء خالہ اور صائم فوراً نہیں آ پائیں گے تو وہ کبھی بھی میری ذمہ داری کسی اور کو نہ سونپتے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔
''لیکن اب مجھے تو پتا چل گیا ناں، تو میں یہاں کیوں بیٹھی ہوں۔ مجھے اپنے گھر چلے جانا چاہیے، کیا ہوا جو میں اکیلی ہوں۔ ساتھ امینہ خالہ اور سب لوگ ہیں، خدانخواستہ کوئی پریشانی کی بات ہوئی تو میں انہیں پکار سکتی ہوں۔ دیوار پھلانگ کر ان کے گھر بھی جاسکتی ہوں، ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مجھے مزید یہاں نہیں رہنا چاہیے۔'' اس نے تہیہ کرلیا اور اس وقت شہیر حسن سے بات کرنے کا سوچ کر کمرے سے نکلی تھی کہ لابی سے آتے کریم بابا اسے دیکھ کر بولے۔
''بیٹا! تمہیں شہیر میاں بلا رہے ہیں۔''
''کہاں ہیں؟'' وہ خود کیونکہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی اس لیے فوراً پوچھا تھا۔
''ادھر لان میں بیٹھے ہیں۔ ابھی ہم انہیں چائے دینے گئے تو تمہارا پوچھا پھر کہنے لگے۔'' وہ کریم بابا کو بولتا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی پھر برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دیکھا۔ شہیر حسن چائے کا کپ تھامے کسی سوچ میں گم تھا۔ اس نے قریب پہنچ کر سلام کیا تو چونک کر اسے دیکھنے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کردیا۔
''جی۔'' وہ بیٹھتے ہی سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی، تو وہ بھی رسمی جملوں سے گریز کرکے پوچھنے لگا۔
''آپ نے کریم بابا کو پیسے واپس کیوں کردیے۔''
''کیونکہ مجھے ضرورت نہیں تھی۔'' وہ فوراً بولی۔
''عجیب بات ہے، بہرحال میں آپ پر کوئی احسان نہیں کررہا اور نہ ہی یہ پیسے اپنی جیب سے دیے ہیں۔ آپ کے فادر کے ڈپوزٹ ہیں، جو آپ کی امانت ہیں۔ آپ چاہے ابھی لے لیں یا......''
''سوری۔'' وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ''ابھی نہ پھر بھی کیونکہ اب میں خود کو حق دار نہیں سمجھتی، جتنا میرا حق تھا اس سے زیادہ آپ میرے لیے کرچکے ہیں۔''
''میں...... میں نے کیا کیا ہے؟'' شہیر حسن نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ جزبز ہوکر بولی۔
''میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی کیونکہ میں جو بھی کہوں گی آپ نہیں مانیں گے۔''
''ارے۔'' وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔ ''آپ نے تو خود ہی طے کرلیا کہ میں نہیں مانوں گا۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

''مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔'' قدرے رک کر اس نے کہا تو وہ پورے دھیان سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''جی۔''

''میں اب اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا تو وہ فوراً کچھ نہیں بولا، میز پر رکھا پیکٹ اٹھا کر سگریٹ نکالی اور سلگانے کے بعد کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے اب تو کچھ ہی دن ہیں آپ کے کزن کے آنے میں۔ وہ آجائیں پھر جانے کی بات کیجیے گا۔'' وہ سر جھکا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی کیونکہ سمجھ گئی تھی کہ کچھ بھی کہے گی وہ نہیں مانے گا۔

''ویسے آپ کیوں جانا چاہتی ہیں، آئی مین یہاں کوئی پرابلم ہے آپ کو؟'' وہ پوچھ رہا تھا، اس نے جواب نہیں دیا، ذرا سی گردن موڑ کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔ جانے کیا بات تھی اس میں کہ شہیر حسن کو اس خوب صورت ماحول میں صرف وہی متاثر کر رہی تھی۔

''مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔'' خود کلامی کا انداز تھا۔ شہیر حسن کو اس کی آزردگی اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی، چند لمحے کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''آئیے......'' رملہ نے چونک کر اسے دیکھا، وہ کچھ سمجھی نہیں پھر بھی کھڑی ہو گئی۔

''کم آن۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تب بھی ناسمجھی کے عالم میں اس کی تقلید کی پھر جب اس نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ٹھٹک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''بیٹھ جائیں۔'' شہیر حسن نے سوالیہ نشان نظر انداز کر دیا اور اسے بٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی، کہنے لگا۔

''آئم سوری، میں اس تمام عرصے میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ میری ذمہ داری صرف اتنی نہیں تھی کہ میں آپ کو گھر میں جگہ دے دوں۔ مجھے اور باتوں کا بھی خیال کرنا چاہیے تھا، ضرورتوں کے ساتھ خصوصاً احساسات اور جذبات کا۔ مجھے کریم بابا سے کہنا چاہیے تھا کہ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور آپ کو آپ کے گھر لے جاتے۔'' وہ اب احساس کر کے جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا، وہ سامنے نظریں جمائے ساکت بیٹھی تھی پھر اچانک ایک موڑ پر اسے جھٹکا لگا تھا، ایک دم اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''آپ کے گھر، آپ کچھ دیر وہاں......''

''نہیں۔'' اس نے سختی سے ٹوکا۔ ''مجھے گھر نہیں جانا...... مطلب آپ کے ساتھ نہیں جانا۔''

''میرے ساتھ نہیں جانا......؟'' وہ سمجھا نہیں، حیران بھی ہوا تب وہ خود پر قابو پا کر کہنے لگی۔

''سوری، میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ لوگ پتا نہیں کیا سمجھیں، میں پھر کسی دن کریم بابا کے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

''ہوں۔'' اس نے غالباً سمجھ کر گاڑی چوراہے سے واپس موڑ لی تھی اور گھر آتے ہی وہ فوراً اتر کر اپنے کمرے میں آ گئی اور جو بات ہوئی نہیں تھی اسے سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ اگر وہ گھر تک لے جاتا تو لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے۔ اس نے کسی کو حتیٰ کہ عبیرہ تک کو یہ نہیں بتایا تھا کہ باس کے گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔ بہت ساری باتیں مصلحتاً چھپانی پڑتی ہیں کیونکہ بات کچھ بھی نہیں ہوتی اور فسانے بن جاتے ہیں اور وہ کسی افسانے کا عنوان نہیں بننا چاہتی تھی۔ جب ہی اگلے دن سر درد کا بہانہ کر کے اس نے کالج سے چھٹی کر لی اور شہیر حسن کے آفس جانے کے بعد اس نے اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھایا اور کریم بابا کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! پھر ہم شام سے پہلے آ کر تمہیں لے جائیں گے۔'' کریم بابا نے کہا تو وہ سہولت سے بولی۔

''نہیں بابا! ویسے تو آپ جب چاہیں آئیں لیکن میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں بیٹا! کیا شہیر میاں نے کچھ کہا ہے؟''
کریم بابا کو اچنبھا ہوا۔
''نہیں، انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ بس اب میں اپنے گھر میں رہنا چاہتی ہوں کیونکہ صائم کے آنے میں زیادہ دن نہیں ہیں پھر میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی تو مجھے اپنا گھر یاد آئے گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں یہ تھوڑے سے دن میں اپنے گھر میں رہ لوں۔ خیر آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' وہ روانی سے بولتے ہوئے اٹھ کر جانے لگی تو کریم بابا نے روک دیا۔
''نہیں بیٹا! ہم اس وقت چائے نہیں پیتے، بس اب چلتے ہیں لیکن ہمیں تمہاری فکر رہے گی۔''
کریم بابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر آزردہ ہو گئے تو اس کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی۔ یوں ہی سر جھکائے ہوئے انہیں چھوڑنے دروازے تک آئی پھر دروازہ بند کر کے پلٹی تو کتنی دیر وہیں کھڑی بند دروازوں کو دیکھتی رہی۔
کتنے دنوں بلکہ مہینوں سے بند رہنے کے باعث سارا گھر مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ وہ کمر کس کے صفائی ستھرائی میں جت گئی۔ تو پھر کھانے پینے کا ہوش نہیں رہا، آخر میں کچن کی صفائی کر رہی تھی کہ دیوار پر سے عبیرہ کی آواز آئی۔
''ادھر کون ہے بھئی؟''
''میں ہوں۔'' وہ کچن سے نکل کر سامنے آئی تو عبیرہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔
''پکی بھوتنی لگ رہی ہو۔''
''پتا ہے، جب سے آئی ہوں، صفائی میں لگی ہوں۔ یہ حال تو ہونا ہی تھا۔'' وہ بالوں سے گرد جھاڑتے ہوئے بولی تھی۔
''اچھا، کھانا کھا لیا؟'' عبیرہ ابھی کالج سے آئی تھی جب ہی فوراً کھانے کا پوچھا۔
''نہیں، اب بناؤں گی۔''
''بعد میں بنا لینا۔ جاؤ جلدی سے نہا لو، میں چینج کر کے کھانا ادھر ہی لے آتی ہوں، ساتھ کھائیں گے اور سنو، دروازہ کھول دو۔ میں بجاتی نہ رہ جاؤں۔'' عبیرہ کہہ کر دیوار سے ہٹ گئی تو اس نے بھی دوڑ لگا دی۔ دروازہ کھول کر واش روم میں بند ہو گئی اور جب نہا کر آئی تو عبیرہ دسترخوان پر کھانا لیے بیٹھی تھی، یکلخت اس کی بھوک چمک اٹھی۔
''ہائے عبیرہ! تم کتنی اچھی ہو، ایمان سے بڑی بھوک لگی ہے۔''
''چلو ٹوٹ پڑو۔'' عبیرہ اس کی پلیٹ میں سالن نکال کر کہنے لگی۔ ''سنو جب تم آئی تھیں تو کم از کم امی کو تو شکل دکھا دیتیں، وہ صبح سے پریشان ہو رہی ہیں کہ پتا نہیں کون گھر میں گھس آیا ہے۔''
''اف۔'' اس نے سر پیٹ لیا۔ ''یہ میں نے کیا کیا، خالہ جان کو پریشان کر دیا۔ اصل میں گھر اتنا گندہ ہو رہا تھا کہ میں فوراً جھاڑ پونچھ میں لگ گئی۔''
''اچھا یہ بتاؤ، کون آ رہا ہے، مطلب اسماء خالہ کب آ رہی ہیں؟''
''اسماء خالہ ابھی نہیں آ سکتیں، بس صائم آئے گا وہ بھی عید کے بعد۔'' اس نے کھانے میں مصروف رہ کر بتایا۔
''عید کے بعد؟''
''ہاں، اسماء خالہ نے یہی بتایا ہے، اب بس رمضان کا مہینہ تو ہے اس لیے میں آ گئی۔ روزے اپنے گھر میں رکھوں گی، یوں بھی عبیرہ! مجھے وہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ گو کہ سب لوگ بہت اچھے ہیں لیکن اپنا گھر اپنا گھر ہوتا ہے۔'' اس نے آخر میں عبیرہ کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔
''یہ تو ہے، ویسے تمہیں کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، یہاں سب اپنے ہیں۔ رشتہ داروں سے بڑھ کر، تمہیں اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیں گے۔''
''میں جانتی ہوں، خیر یہ بتاؤ، چائے پیو گی۔'' اس نے دسترخوان سمیٹتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں بھئی، اتنی سڑی گرمی میں چائے کا نام بھی مت لو۔'' عبیرہ اٹھ کر پردے برابر کرنے لگی۔

وہ برتن رکھ کر آئی تو دونوں لیٹ گئیں۔
پھر شام میں وہ تھوڑی دیر کے لیے عبیرہ کے ساتھ اس کے گھر گئی۔ امینہ خالہ اور عقیلہ آپا سے ملی اور جب واپس آنے لگی تو امینہ خالہ نے بہت روکا کہ وہ رات ادھر آ کر سویا کرے، اکیلے گھر میں سونا ٹھیک نہیں ہے اور اسے تو اب کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ تب ہی یہ کہہ کر چلی آئی کہ اگر اسے ڈر لگا تو وہ چلی آئے گی۔

اور وہ ڈری تو نہیں البتہ ابو بہت یاد آ رہے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد اس نے کلام پاک کی تلاوت کی اور ابو کو ایصال ثواب کرنے کا سوچ رہی تھی کہ اس کے ابو کا موبائل بجنے لگا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اتنے دنوں سے ابو کا موبائل بند پڑا تھا اور آج شام میں ہی اس نے آن کیا تھا۔ اسکرین پر نام نہیں تھا، اس نے کچھ سوچتے ہوئے کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو۔''

''شہیر حسن بات کر رہا ہوں۔'' ٹھوس لہجے نے اسے گڑبڑا دیا۔

''جی!''

''آپ ایسے کیوں چلی گئیں، آئی مین آپ کو ابھی نہیں جانا چاہیے تھا۔ صبح میں کریم بابا کو بھیجوں گا آپ ان کے ساتھ آجائیے گا کیونکہ......''

''نہیں پلیز۔'' وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ ''مجھے یہاں اکیلے رہنے میں کوئی پرابلم نہیں ہے، آس پاس سب میرے اپنے ہیں۔''

''اپنے پرائے کی پہچان ہے آپ کو؟'' وہ غالباً بے ساختہ کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔

''میرا خیال ہے......''

''خیال کے سہارے خود کو کسی مشکل میں نہ ڈالیں رملہ!'' وہ فوراً بولا اور اب وہ خاموش ہو گئی تھی۔

''تو کل آپ آرہی ہیں ناں؟'' اس کے لہجے میں جانے کیا تھا، وہ سہم گئی۔

''رملہ......'' وہ منتظر تھا، پکار رہا تھا اور اس کے حلق سے ایک لفظ نہیں نکل سکا تو سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود یعنی اس کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہ ملنے پر بھی اگلے دن کریم بابا چلے آئے۔ کتنی دیر اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے رہے پھر ساتھ چلنے پر اصرار لیکن وہ مان کے نہیں دی اور گزشتہ دن کی طرح انہیں رخصت کرتے ہوئے آزردہ بھی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

رمضان المبارک کا چاند ہو گیا تو پھر اس مہینے کے مخصوص معمولات شروع ہو گئے گو کہ اب اس کے اندر وہ جوش و خروش نہیں تھا جو ابو کے ساتھ ہوتا تھا اور یہ فطری سی بات تھی۔ دل بجھا بجھا رہتا پھر بھی وہ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتی یا زیادہ وقت اس کا تلاوت میں گزرتا۔ افطار سے کچھ پہلے امینہ خالہ اسے بلا لیتی تھیں تو وہ عبیرہ کے ساتھ مل کر پکوڑے اور دہی پھلکی وغیرہ بنا لیتی پھر مغرب کی نماز پڑھ کر ہی گھر آتی تھی۔

اس وقت وہ ظہر پڑھ کر سونا چاہتی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ یہی سمجھی عبیرہ ہو گی، جب ہی بھاگ کر دروازہ کھولا تو سامنے کندھے پر سفری بیگ لٹکائے صائم کھڑا تھا۔

''آپ......'' اس کی حیرت بجا تھا کیوں کہ ابھی تو پہلا عشرہ گزر رہا تھا اور اسے عید کے بعد آنا تھا۔

''پہلے اندر تو آنے دو پھر سوال جواب کرنا۔''

وہ تیز دھوپ سے پریشان تھا۔ وہ فوراً ایک طرف ہٹ گئی پھر اس کے پیچھے چلتے ہوئے اندر کمرے میں آئی تو وہ کندھے سے بیگ گرا کر بولا۔

''پانی...... ٹھنڈا۔'' وہ وہیں سے پلٹ کر ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے آئی۔

''تھینک یو۔'' صائم نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر منہ سے لگالی، وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اچھا خاصا ہینڈسم آدمی جنگلیوں کی طرح پانی

پیتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا۔

''آہ......'' بقیہ پانی اپنے منہ پر ڈال کر اس نے ٹھنڈی آہ بھری پھر اوپر دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''اے سی نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''مائی گاڈ، اے سی کے بغیر کیسے رہتی ہو۔'' وہ غالباً اپنے یہاں قیام کا سوچ کر پریشان ہو گیا تھا۔

''اسماء خالہ کیسی ہیں؟'' وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔

''ٹھیک ہیں اور اب تو چین سے بھی ہوں گی۔'' وہ کہہ کر خود ہی ہنسا جبکہ وہ کچھ سمجھی نہیں۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب ہر دم تمہاری فکر، صبح شام، صائم جاؤ رملہ کو لے آؤ، اب آ گیا ہوں تو انہیں چین آ گیا ہو گا۔'' اس کی وضاحت پر وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''آپ کو فکر نہیں تھی؟''

''فکر کرنے سے کیا میرے پر نکل آتے، میں اڑ کر تمہارے پاس آتا اور اپنے ساتھ تمہیں اڑا کر لے جاتا۔'' وہ کہہ کر استہزائیہ ہنسا تھا۔

''جذبے صادق ہوں تو یہ بھی ممکن ہے۔'' اس نے سوچا پھر اسے لیٹتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاؤں؟''

''نو تھینکس، آرام کروں گا۔'' وہ کروٹ بدل گیا تو وہ کمرے سے نکل آئی۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا، کیا کرے اور وہ تو یہ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ اس کی اچانک آمد نے کہیں تہلکہ کیوں نہیں مچایا۔ دل دھڑکتا یا دھڑکنا بھول جاتا۔ مگر کچھ تو ہوتا کچھ بھی نہیں، وہی سناٹا تھا جو اس گھر کا مقدر ہو گیا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھ گئی۔ تپتی دوپہر جھلسا دینے والی گرمی لیکن اسے احساس تک نہیں تھا۔ وہ اس گتھی کو سلجھانے میں الجھ رہی تھی کہ صائم کے آنے پر اتنی خاموشی کیوں ہے، دل کی گلیاں بھی سنسان پڑی ہیں۔

''رملہ!'' صائم نے شاید گرمی سے گھبرا کر پکارا تھا۔ وہ چونک کر تیزی سے کمرے میں آئی تو وہ کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے مجھے شاور لینا چاہیے، ایسے تو نیند نہیں آئے گی۔''

''جی۔'' اس نے واش روم کی طرف اشارہ کر دیا۔

''کیسے رہتے ہو تم لوگ۔'' وہ اپنا بیگ کھولتے ہوئے بولا اور اس کی خاموشی کا نوٹس لیے بغیر اپنا سوٹ نکال کر واش روم میں بند ہو گیا تو وہ یوں ہی چلتے ہوئے کچن میں داخل ہوئی کہ ایک دم احساس ہوا، اسے صائم کے لیے تو کھانا بنانا چاہیے۔ بس پھر اس کے اندر بجلی بھر گئی کیونکہ اسے پتا نہیں تھا کہ وہ کیسے کھانے پسند کرتا ہے، اس لیے فرائیڈ رائس اور منچورین بنا کر جلدی فارغ ہو گئی۔ صائم شاور لے کر آرام سے اور بے خبر سو رہا تھا، اس نے دروازے میں رک کر چند لمحے اسے دیکھا پھر امینہ خالہ کو اس کی آمد کا بتانے ان کے گھر آئی تو عبیرہ اسے دیکھتے ہی بولی۔

''مجھے بھی آج روزہ لگ رہا ہے۔''

''بھی سے مطلب اور کسے لگ رہا ہے؟'' اس نے پوچھا تو عبیرہ ہنستے ہوئے بولی۔

''تمہاری شکل بتا رہی ہے۔''

''میں ابھی چولہے کے پاس سے آ رہی ہوں جب ہی یہ حال ہو رہا ہے۔'' وہ کہہ کر امینہ خالہ کے پاس بیٹھ گئی۔ ''خالہ وہ صائم آ گیا ہے۔''

''کیا؟ صائم آیا ہے کب؟'' وہ جتنا جھجک رہی تھی، عبیرہ نے اتنا شور مچا دیا۔

''اچھا ہوا۔'' امینہ خالہ نے اسے ٹوک دیا پھر دھیرے سے پوچھنے لگیں۔

''ہاں بیٹا! کب آیا ہے صائم؟''

''جی ابھی کچھ دیر پہلے، میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔''

''اچھا کیا، میں افطار کے بعد آؤں گی

تمہاری طرف۔ مل لوں گی بچے سے اور پوچھ بھی لوں گی کہ اس کا کیا پروگرام ہے۔" امینہ خالہ نے کہا تو وہ ممنونیت سے انہیں دیکھنے لگی کیونکہ وہ بھی یہی چاہ رہی تھی کہ امینہ خالہ ہی بات کریں۔

"اچھا خالہ! میں پھر آؤں گی۔" وہ عبیرہ کی شوخ مسکراہٹ سے نظریں چرا کر نکل آئی تھی۔

پھر افطار سے کچھ پہلے صائم اٹھ کر آیا تو وہ برآمدے میں تخت پر دستر خوان لگا چکی تھی، جس پر افطار کے لوازمات دیکھ کر وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"سوری، میرا تو روزہ نہیں ہے۔"

"آپ سفر میں تھے نا، خیر بیٹھ جائیں، افطار کرنے میں بھی ثواب ہے۔" اس نے گلاس میں اسکوائش ڈالتے ہوئے کہا تو وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

"میں گناہ ثواب کے چکر میں نہیں پڑتا۔" اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، بولی کچھ نہیں کیونکہ سائرن کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ خاموشی سے افطار کر کے نماز کے لیے اٹھ کر کمرے میں آ گئی، پھر نماز سے فارغ ہو کر چائے بنا کر لے آئی۔ صائم اس کی جگہ پر بیٹھا ہر شے سے انصاف کر رہا تھا' اس نے چائے رکھی تو اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"یہ سب چیزیں تم نے بنائی ہیں؟"

"جی۔"

"ویری گڈ، اس کا مطلب ہے تم اچھی کک ہو اور کیا کیا بنا لیتی ہو؟" وہ چائے کا کپ اٹھا کر پورے دھیان سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"ریگولر کھانوں میں تقریباً سب ہی کچھ بنا لیتی ہوں البتہ اسپیشل ڈشز میں چند ایک۔"

"اچھی بات ہے، باقی میں تمہیں سکھا دوں گا۔" اس نے کہا تو وہ متعجب ہوئی۔

"آپ......؟"

"ہاں میں اچھی کوکنگ کر لیتا ہوں۔" وہ مسکرایا پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"او کے، میں ذرا باہر کا راؤنڈ لگا آؤں، تم چلو گی؟"

"نہیں، آپ جائیں بلکہ ابھی تو امینہ خالہ آئیں گی آپ سے ملنے۔" اس نے کہا تو وہ بے نیازی سے بولا۔

"پھر مل لوں گا ان سے، کل پرسوں جب بھی موقع ملا، او کے۔" اس نے خاموشی سے اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھا پھر جلدی سے دستر خوان سمیٹنے لگی۔ برتن دھو کر رکھے، اس کے بعد عبیرہ کو فون کر کے بتایا کہ صائم ابھی باہر گیا ہے کیونکہ وہ امینہ خالہ کو بلاوجہ کی زحمت نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی واپسی سے پہلے وہ عشاء کی نماز اور تراویح سے فارغ ہو چکی تھی۔

ابو کے کمرے میں اس کے سونے کا انتظام کر کے بھی کتنی دیر وہ ٹہلتی رہی۔ نیند بھی آ رہی تھی کیونکہ آج سارا دن سونے کو نہیں ملا تھا، تھکن پر نیند غالب آ رہی تھی۔ دل چاہا دروازہ کھلا چھوڑ کر سو جائے وہ خود ہی آ جائے گا اور قریب تھا کہ وہ ایسا ہی کرتی کہ وہ آ گیا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" وہ عاجز تھی۔

"بتا کر تو گیا تھا۔" وہ آرام سے بیٹھ کر جوتے موزے اتارنے لگا۔

"ہاں لیکن اتنی دیر، خیر یہ بتائیں کھانا گرم کر دوں۔" اس نے جرح ترک کر کے پوچھا تو وہ سیدھا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں کھانے کا پوچھ رہی ہوں۔"

"کھا کر تو گیا تھا، اب مزید کچھ نہیں کھاؤں گا، بیٹھ جاؤ۔" وہ اسے بیٹھنے کا کہہ کر خود اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں، میں اب سونے جا رہی ہوں ورنہ سحری میں آنکھ نہیں کھلے گی۔" وہ کہہ کر جانے لگی کہ وہ ایک دم سامنے آ گیا۔

"سنو، میں تمہارے لیے آیا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔" پلکیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

"جانتی ہو تو پھر بھاگ کیوں رہی ہو، بیٹھو میرے پاس۔" صائم نے اس کے کندھے پر بازو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پھیلا کر اپنے ساتھ بٹھالیا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہتھیلیاں الگ بھیگ گئی تھیں۔

"تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا، سچ کہوں تو اب مجھے بھی افسوس ہو رہا ہے۔ کاش میں بہت پہلے آجاتا، اتنی خوب صورت لڑکی میری راہ دیکھ رہی تھی اور میں......" وہ اس کے کندھے کو نرمی سے دبا رہا تھا، وہ اپنی جگہ سن ہوگئی۔

"بس اب میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا، چلو گی ناں۔" اس نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی، گرم سانسیں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں، زور زور سے دھڑکتا دل سہم گیا۔ اٹھنے کی سکت ہی نہیں تھی۔

"تم بہت خوب صورت ہو۔" وہ انگلی کی پور سے اس کا چہرہ چھونے لگا تو یک لخت اس کے اندر جیسے بجلی بھر گئی اس کا ہاتھ جھٹک کر تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں آکر دروازہ بند کرتے ہی ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

وہ ڈرپوک یا دبو قسم کی لڑکی نہیں تھی لیکن ایسی صورت حال تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ یہاں آتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ اگر کوئی پریشانی کی بات ہوئی تو وہ چیخ چلا کر امینہ خالہ کو بھی پکار سکتی ہے اور پریشانی کی بات تو تھی لیکن وہ کسی کو پکار بھی نہیں سکتی تھی کہ لٹیرا کوئی غیر نہیں، اپنا تھا۔

"اپنے پرائے کی پہچان ہے آپ کو؟" کسی نے دھیرے سے اس کے آنسوؤں پر بند باندھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں، پھر کچھ سوچ کر اسی وقت اسماء خالہ کو فون کر ڈالا۔

"ہاں بیٹا! کیسی ہو، صائم پہنچ گیا ناں۔ تمہاری بہت تعریف کر رہا تھا۔" اسماء خالہ اس کی آواز سنتے ہی شروع ہوگئیں۔

"خالہ میری بات سنیں۔" ضبط کے باعث اس کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔

"ہاں ہاں کہو، کیا بات ہے؟"

"خالہ! آپ صائم سے کہیں وہ اپنے رہنے کا انتظام کہیں اور کر لے۔" اس نے فوراً کہا تو اسماء کا لہجہ بدل گیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ یہاں میں اکیلی رہتی ہوں خالہ! ٹھیک ہے وہ میرا کزن ہے، ہماری شادی ہونے والی ہے پھر بھی اس کا یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں ہے اور یہ بات آپ کو زیادہ سمجھنا چاہیے۔" وہ جلدی جلدی بول رہی تھی کہ کہیں فون بند نہ ہو جائے۔

"اچھا میری صائم سے بات کرواؤ۔"

"سوری خالہ! آپ اسی کے نمبر پر کال کر لیں۔" اس نے کہہ کر خود ہی فون بند کر دیا اور پھر ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ سحری کے لیے بھی وہ کمرے سے نہیں نکلی۔ بنا سحری کے روزے کی نیت کر لی، فجر پڑھ کے جو سوئی تو پھر ہوش ہی نہیں رہا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ صائم کی حرکت کا سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جا رہا تھا اور پتا نہیں اسماء خالہ نے صائم کو فون کیا تھا یا نہیں۔

وہ جب سو کر اٹھی تو ظہر کا وقت نکلا جا رہا تھا، اس لیے فوراً اس کا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں۔ جلدی جلدی وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کمرے سے نکلی تب اس کا خیال آتے ہی وہ قدرے خائف ہونے کے ساتھ محتاط بھی ہوگئی۔ کچن میں آکر قصداً برتنوں کو اٹھا پٹخ کیا تا کہ وہ بھی سن لے اور آکر دیکھ بھی لے کہ وہ اس سے خائف نہیں ہے لیکن وہ نہیں آیا۔ کتنی دیر ہوگئی، اس نے کھڑے کھڑے فروٹ چاٹ بنالی پھر پکوڑوں کے لیے بیسن گھول رہی تھی کہ اس کا سیل فون بجنے لگا، اس نے اندر آکر موبائل اٹھا کر دیکھا، عبیرہ کی کال تھی۔

"ہاں، ہیلو۔"

"بڑی بے مروت ہو، صائم کے آتے ہی ہمیں بھول گئیں، امریکہ جا کر تو کبھی ہمارا خیال بھی نہیں آئے گا۔" عبیرہ سخت شاکی تھی۔

"شٹ اپ، میں کوئی امریکہ نہیں جارہی اور میں نے کیا بے مروتی دکھائی ہے ذرا بتاؤ تو۔"

"اپنا سیل فون چیک کرو، صبح سے کتنی کالیں کرچکی ہوں۔" عبیرہ نے ابھی اس قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

"سوری یار! میں اصل میں ایسی بے خبر سوئی کہ ابھی اٹھی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے صائم کے آنے سے ساری ٹینشن دور ہوگئی، جب ہی محترمہ کھوتے بیچ کے سوئیں۔" عبیرہ کی بات سے اس کے اندر کڑواہٹ گھل گئی۔

"تم بتاؤ صبح سے کیوں فون کررہی تھیں؟"

"یہی پوچھنے کے لیے کہ آج تمہارا صائم گھر پر ہوگا کہ نہیں۔"

"پتا نہیں، اس کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے پوچھا نہیں، خیر جو بھی ہوگا میں افطار کے بعد تمہیں بتادوں گی، ٹھیک......" وہ لائن کاٹ کر عبیرہ کی مس کالز چیک کرنے لگی تھی کہ نظر میسج پر پڑی، اس نے فوراً ان باکس میں دیکھا، صائم کا میسج تھا۔

"بڑی پارسا بنتی ہو، کسی غیر نے تمہیں اپنے گھر میں یوں ہی تو نہیں رکھا ہوگا، کچھ قیمت تو وصول کی ہوگی۔"

"اُف......" اس کی آنکھیں اس روانی سے چھلکیں کہ اس سے آگے سارے لفظ دھندلا گئے۔ کیا ستم تھا کہ وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی جبکہ دل چاہ رہا تھا، چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالے، دل پھٹا جارہا تھا۔

"کمینہ، بے غیرت۔ میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔" اس کے اندر ایسا ابال اٹھا کہ وہ تیزی سے کمرے سے نکلی اور پھر جارحانہ انداز میں ابا کے کمرے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تھی لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا، اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، اس کا بیگ بھی نہیں تھا۔

"بزدل بھاگ گیا......" وہ زہرخندی بڑبڑائی اور اسے مزید گالیوں سے نوازتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ پھر افطار کے بعد اسے عبیرہ کو فون کرنا یاد ہی نہیں رہا۔ اصل میں ایک تو بنا سحری کے روزہ پھر بڑھتے ذہنی انتشار نے اسے ادھ موا کردیا تھا۔ نماز مشکل سے ادا ہوئی پھر چائے کا پانی رکھ رہی تھی کہ عبیرہ اور امینہ خالہ آگئیں۔ اس نے کچن کی کھڑکی سے انہیں آتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہوگئی کیونکہ ابھی وہ ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

"رملہ......" برآمدے میں رک کر عبیرہ نے اسے پکارا تو وہ بمشکل جواب دے پائی۔

"آرہی ہوں۔" پھر جلدی سے تین کپ چائے بنا کر لے آئی، امینہ خالہ وہیں تخت پر بیٹھ چکی تھیں، وہ ٹرے ان کے سامنے رکھ کر کہنے لگی۔

"سوری خالہ! آپ کو زحمت ہوئی، میں ابھی فون کرنے والی تھی۔"

"زحمت تو نہیں ہوئی بیٹا! بس روزہ افطار کرکے چلنے پھرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"جی، تم بیٹھو ناں۔" وہ عبیرہ سے مخاطب ہوئی، تو وہ جو اسے ہی دیکھ رہی تھی، پوچھنے لگی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے، روتی رہی ہو کیا؟"

"ہاں، آج ابو بہت یاد آئے۔" اس کی آنکھیں پھر جل تھل ہوگئیں تو کتنی دیر امینہ خالہ اسے تسلی دینے کے ساتھ صبر کی تلقین کرتی رہیں، جب وہ کافی حد تک پرسکون ہوگئی تب صائم کا پوچھا تو وہ سوچ کر بولی تھی۔

"صائم اپنی پھوپھو کے ہاں چلا گیا ہے خالہ!"

"کیوں؟" عبیرہ نے بے ساختہ ٹوکا، وہ ایک نظر اس پر ڈال کر امینہ خالہ سے کہنے لگی۔

"اصل میں خالہ! صائم کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا، ابو ہوتے تو اور بات تھی۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! سچ پوچھو تو میں بھی اس لیے آئی تھی کہ صائم سے طریقے سے بات

کروں گی کہ وہ اپنے ٹھہرنے کا انتظام کہیں اور کرلے یا پھر تم میرے پاس آجاتیں۔ خیر اچھا ہوا لڑکا خود سمجھ دار ہے، کیا بتایا تم نے کس کے ہاں گیا ہے؟"

"اس کی پھوپھو ہیں۔" اس نے نظریں جھکالیں۔

"چلو پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔" امینہ خالہ مطمئن ہوگئی تھیں اور وہ بات بن جانے پر دل ہی دل میں شکر کرنے لگی۔

☆☆☆

پورے رمضان پھر اسماء خالہ کا فون نہیں آیا۔ وہ لاشعوری طور پر منتظر رہی۔ صائم کا بھی کچھ پتا نہیں تھا وہ یہاں تھا یا واپس چلا گیا تھا۔ اسماء خالہ سے اس کے بارے میں کیا کہا ہوگا کہ پھر انہوں نے رابطہ ہی نہیں کیا۔

اسے دکھ صائم کے جانے کا نہیں تھا کیونکہ اس کی اوچھی حرکت سے وہ جس دکھ سے دوچار ہوئی تھی اسے سوچ کر ابھی بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے پھر اس کا کمینہ پن "بڑی پارسا بنتی ہو" نے اس کے سارے خواب جو وہ اس کے حوالے سے دیکھتی تھی، راکھ کردیے تھے۔ اسے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی ایک ہی تو خالہ تھیں وہ بھی شاید اپنے بیٹے کی باتوں میں آکر اس سے ناتا توڑ بیٹھی تھیں۔

رمضان اس کا ان ہی سوچوں میں گزرا تھا لیکن عید کے دن صبح ہی اسماء خالہ کے فون نے اس کی اس کی سوچوں کی نفی کردی، وہ کہہ رہی تھیں۔

"بیٹا! میں تم سے اور بھائی صاحب کی روح سے بہت شرمندہ ہوں۔ صائم نے تمہارے ہی نہیں میرے بھی سارے خواب چکنا چور کردیے ہیں۔ خدا گواہ ہے میں تمہارے انتظار میں دن گنتی رہی ہوں اور جب انتظار کے دن تمام ہوئے تو......" اسماء خالہ رونے لگیں۔

"اسماء خالہ پلیز آپ روئیں نہیں، بس اللہ کو شاید منظور نہیں تھا۔" الٹا وہ انہیں تسلی دے رہی تھی۔

"لیکن مجھے صائم نے بہت تکلیف پہنچائی ہے، میں اسے معاف نہیں کروں گی۔"

"ایسا نہیں کہیں خالہ! آج بڑا دن ہے، میں اسے معافی کرتی ہوں آپ بھی معاف کردیں۔" اس نے ظرف بڑا کرلیا۔

"کیسے معاف کردوں، مجھے ہر پل تمہارا خیال، تمہاری فکر رہے گی۔ میرے پاس آجاتیں تو تمہارے ماں باپ کی روحوں کو بھی قرار آجاتا۔" اسماء خالہ اس کی محبت میں رورہی تھیں۔

"آپ میری فکر نہ کریں خالہ! بس میرے لیے دعا کیجیے گا اور جب آپ کی صحت اجازت دے تو میرے پاس ضرور آئیے گا۔" اس نے دل سے کہا۔

"ارے بیٹا! میرا بس چلے تو میں ابھی تمہارے پاس آجاؤں۔"

اسماء خالہ کی محبت پر اس کا دل ہلکا پھلکا ہوگیا تھا اور پھر وہ زیادہ اہتمام سے تو نہیں بس تیار ہوکر امینہ خالہ کو سلام کرنے ان کے ہاں آگئی۔ عید کا دن تھا ادھر بھی مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا اس لیے وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکی۔ گوکہ سب ہی اسے روک رہی تھے کہ وہ اکیلے گھر میں کیا کرے گی لیکن وہ پھر آنے کا کہہ کر چلی آئی۔

اکیلا گھر واقعی کاٹنے کو دوڑ رہا تھا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے، کبھی کچن میں جاتی کبھی ابو کے کمرے میں۔

"یا اللہ......" شکوہ لبوں پر آنے کو تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ یہی سمجھی محلے کی کوئی خاتون ہوگی جب ہی بنا پوچھے دروازہ کھول دیا، سامنے کریم بابا کھڑے تھے۔

"السلام علیکم!" اس نے سر پر دوپٹا اوڑھتے ہوئے سلام کیا۔

"خوش رہو بیٹا، خوش رہو، اندر آجائیں۔"

کریم بابا نے دعا کے ساتھ اجازت طلب کی تو وہ فوراً

ایک طرف ہوگئی۔

"آیئے بابا۔"

"ہم نے سوچا ہماری بٹیا اکیلی ہوگی، اس لیے سارے کام چھوڑ کر بھاگے آئے۔" کریم بابا بولتے ہوئے برآمدے میں تخت پر بیٹھنے لگے کہ وہ بول پڑی۔

"کمرے میں چلیں بابا، یہاں گرمی ہے۔"

"ہاں گرمی تو ہے۔" وہ اس کے ساتھ کمرے میں آگئے تو انہیں بٹھا کر وہ ان کے لیے شیر خورمہ لے آئی اور ان کے سامنے رکھ کر پوچھنے لگی۔

"آپ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا۔"

"کچھ نہیں، تم بیٹھو ادھر اور ہمیں بتاؤ، تمہارے رشتہ دار امریکا سے آئے کہ نہیں۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے پوچھا تو اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

"آئے بھی اور چلے بھی گئے۔"

"ہائیں......" کریم بابا وضاحت طلب نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ جز بز ہو کر بولی۔

"بس بابا! میں امریکا نہیں جانا چاہتی۔"

"پھر، ہمارا مطلب ہے یہاں کیسے رہو گی، اکیلی؟" کریم بابا اچنبھے میں گھر گئے۔

"رہ تو رہی ہوں، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے پھر رمضان کی وجہ سے میں نے کچھ سوچا نہیں، اب عید کے دن گزر جائیں تو پھر میں کچھ کرنے کا سوچوں گی۔ آپ دعا کیجیے گا مجھے جاب مل جائے تو پھر وقت کاٹنا مشکل نہیں ہوگا۔" اس کی بات سن کر کریم بابا نفی میں سر ہلانے لگے۔

"تم نے اچھا نہیں کیا بٹیا! آج کتنی لڑکیاں اچھے رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں اور تم نے اچھا بھلا رشتہ ٹھکرا دیا۔ پھر اب نوکری آسانی سے کہاں ملتی ہے، کتنے ہی لوگ خوار ہو رہے ہیں نوکری کے لیے۔" کریم بابا کو بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"تو میں کیا کروں، میری قسمت میں اگر خواری لکھی ہے تو......" وہ تنگ ہو کر بولی۔

"اللہ نہ کرے بٹیا! جو خواری لکھی ہو، اللہ نیک نصیب کرے۔" کریم بابا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ بھی اٹھ گئی اور انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی تو پوچھنے لگی۔

"پھر آئیں گے نا بابا!"

"ضرور آئیں گے، بار بار آئیں گے۔"

انہوں نے فوراً کہا پھر اپنے آپ جانے کیا بولتے ہوئے چلے گئے تو وہ دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔

پھر عید کے تیسرے دن سے عبیرہ کی بڑی بہن عقیلہ آپا کی شادی کے فنکشن شروع ہوگئے تو امینہ خالہ نے اسے اپنے پاس روک لیا تھا۔ یوں وہ سارا وقت ہر کام میں عبیرہ کے ساتھ لگی رہی۔ تین چار دن اس کے بہت اچھے گزر گئے، اس کے بعد وہ امینہ خالہ کی اجازت سے عبیرہ کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اصل میں دونوں شادی کی تھکن اتارنا چاہتی تھیں کہ لمبی تان کر سوئیں گی۔ یہاں کوئی اٹھانے والا نہیں تھا، لیکن لیٹتے ہی عبیرہ نے صائم کا پوچھ لیا کہ وہ کب اسے بیاہنے آرہا ہے اور وہ عبیرہ سے کچھ نہیں چھپا سکی۔ صائم کی حقیقت اس کے سامنے کھول کر رکھ دی، کیونکہ اب اسے یہیں رہنا تھا اور وہ بار بار کوئی نئی داستان نہیں گھڑ سکتی تھی۔ یوں اپنی زندگی کے اس باب کو بند کر کے وہ عبیرہ کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

وہ جانتی تھی اسے کسی اچھی جگہ جاب نہیں مل سکتی کیونکہ ابھی اس کا گریجویشن مکمل نہیں ہوا تھا۔ البتہ آس پاس کے اسکولوں میں وہ کوشش کر سکتی تھی لیکن ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں کے باعث اسکول بند تھے اور دو مہینے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے کمپیوٹر کورس کے لیے انسٹی ٹیوٹ جوائن کر لیا۔

یوں بھی ابھی فوری اس کے سامنے پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ اسماء خالہ نے اس کے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم بھجوا دی تھی لیکن وہ ہمیشہ ان پر

تکیہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے ابھی سے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیے تھے۔ گھر میں پریکٹس کے لیے اس نے کمپیوٹر بھی خرید لیا جو کام کے ساتھ اس کی تنہائی کا ساتھی بھی بن گیا تھا۔

یوں زندگی کچھ مصروف ہوگئی تھی لیکن یہ ایسا نہیں تھا کہ وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اس کے اندر اکثر بیٹھے بیٹھے ہوک اٹھتی تھی کیوں کہ اب سے پہلے اس کی زندگی کی گاڑی سیدھی شفاف سڑک پر رواں دواں تھی جس میں کوئی بریک کوئی، موڑ نہیں تھا اور نہ کبھی اس نے سوچا تھا کہ وہ بیچ راہ میں یوں تنہا ہو جائے گی لیکن اب جب تنہائی مقدر ہوگئی تھی تو وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کڑھنے سے اپنا ہی جی جلتا تھا اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ خود کو مصروف رکھنے لگی تھی۔

اس وقت بھی انسٹی ٹیوٹ سے نکل کر اس نے قریبی مارکیٹ کا رخ کیا۔ کچھ گروسری کا سامان لینا تھا لیکن ابھی اس نے سڑک پار کی تھی کہ قریب گاڑی کے بریک اتنی زور سے چرچرائے کہ وہ گرنے سے تو بچ گئی لیکن ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا قدم آگے بڑھائے یا پیچھے ہٹے۔

''آئم سوری۔'' کوئی قریب آکر معذرت کر رہا تھا، وہ گم صم کھڑی تھی۔ ''آیئے ادھر آجائیں، آئیں پلیز۔'' وہ شہیر حسن تھا، وہ اسے دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگی تو بے اختیار اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے کی طرف کھینچ لیا۔

''یہ کیا حرکت ہے۔'' وہ ناراض ہوئی۔

''آپ ٹریفک نہیں دیکھ رہیں۔'' شہیر حسن نے اس کے عقب میں اشارہ کر کے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔

''چلیں، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔'' وہ کہہ کر پھر اپنی ہی بات کی نفی کرنے لگا۔ ''نہیں شاید یہ مناسب نہیں ہوگا، لوگ جانے کیا سمجھیں۔'' وہ جز بز سی ہو کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔

''ویسے مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ کیا ہم کچھ دیر کہیں بیٹھ سکتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں عجز تھا اور وہ جانتی تھی اسے کیا بات کرنی ہے پھر بھی اس کے ساتھ چل پڑی کیونکہ اس نے ابو کے ساتھ کیا وعدہ نبھایا تھا۔

''مجھے کریم بابا نے بتایا کہ امریکہ سے آپ کے عزیز آئے تھے لیکن آپ ان کے ساتھ نہیں گئیں، کیوں؟'' وہ اس کے سامنے کولڈ ڈرنک رکھ کر سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

''میں نے وجہ بھی بتادی تھی کریم بابا کو!'' وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

''وجہ تو نہیں بتائی کریم بابا! نے مجھے، کیا آپ بتانا پسند کریں گی۔'' اس کی نظروں کی گرفت سے وہ خائف ہونے لگی۔

''آپ ان ہی سے پوچھ لیجیے گا۔''

''نہیں، میں آپ سے سننا چاہتا ہوں۔'' وہ فوراً بولا۔

لہجے میں اصرار اور بے قراری تھی اور وہ نادان نہیں تھی، سمجھ گئی کہ قسمت اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اگر اب اس نے دروازہ نہ کھولا تو قسمت ہمیشہ کے لیے روٹھ جائے گی۔

''آپ بتائیں، کیا وجہ ہوسکتی ہے؟'' اس نے اپنا دامن بچالیا۔

''میں...... میری محبت جس سے آپ دامن نہیں بچاسکیں۔''

بلا کا یقین تھا اور ایک وہی تو تھا جو اس کی پارسائی کا امین تھا۔ وہ اب اس سے دامن نہیں بچاسکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ قسمت روٹھ جائے اس نے مسکرا کر اس کے یقین پر مہر ثبت کر دی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

نشین نعیم

اب کے برس کی عید

آج تئیسواں روزہ تھا۔ سید پور روڈ کے ایک پانچ مرلہ مکان کے پچھلے برآمدے میں دو چودہ سال کے بہن بھائی بیٹھے رازونیاز کر رہے تھے۔

"یار تطہیر! تم کیوں اتنی ڈل ہو اس بار؟" مزمل بہن سے پوچھ رہا تھا۔

"بس میرا دل نہیں کر رہا اس بار عید منانے کو۔"

"تمہیں پتا ہے ماما تمہاری وجہ سے کتنی پریشان ہیں۔ ایک تو تم ان کے ساتھ خریداری کرنے نہیں گئیں۔ پھر وہ چیزیں لے کر آئیں تو تم نے دیکھی تک نہیں۔

پتا ہے؟ ماما نے مجھ سے کہا ہے کہ تم سے پوچھوں تم کیوں عید کی شاپنگ میں انٹرسٹ نہیں لے رہی ہو۔

ویسے میں خود بھی نوٹ کر رہا ہوں۔ تم میں پہلے والا جذبہ ہی نہیں ہے۔ ساماما یہ والی چوڑیاں، یہ والی سینڈل، وہ والی جیولری۔ تم تو ماما کی جان کھا جاتی تھیں عید سے پہلے فرمائشیں کر کر کے۔" مزمل سچ مچ کافی حیران تھا۔

"مجھے پچھلے سال کی طرح کی عید نہیں منانی، اس

لیے میرا دل کر رہا ہے کہ عید ہی نہ آئے۔" تطہیر اداس لہجے میں بولی۔

"پچھلے سال جیسی عید۔" مزمل نے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

"تمہیں کچھ یاد نہیں؟" تطہیر نے افسوس سے بھائی کو دیکھا۔

"پچھلے سال ماما نے شیر خرما بنایا تھا' اور اٹھارہ سو عیدی جمع ہوئی تھی میرے پاس۔ اور۔ اور۔۔۔" اس نے یاد کرنے کی کوشش کی مگر کوئی قابل ذکر بات یاد نہ آسکی۔ "اس سے زیادہ تو مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔" مزمل نے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پچھلے سال بابا اور ماما نے الگ الگ عید منائی تھی۔ عید کے پہلے دن ماما' نانا ابو اور نانو کی طرف گئی تھیں جب کہ بابا تایا ابو کے گھر عید کرنے گئے تھے۔ نہ بابا نے ماما کو عیدی دی تھی ہر بار کی طرح' نہ ہی ماما نے ہمیشہ کی طرح لڑ جھگڑ کر بابا سے عیدی کا مطالبہ کیا تھا۔

عید کے دن اور عید کے بعد کتنے ہی دن تک بابا' ماما نے ڈائریکٹ ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہمارے ذریعے آپس میں بات کرتے رہے تھے۔

"تطہیر' بابا کو یہ کہہ دو۔"

"مزمل! ماما سے یہ کہہ دو۔" وغیرہ وغیرہ۔ اور اب اس سال پھر یہی سب کچھ ہوگا۔

مجھے نہیں چاہیے ایسی عید۔ مجھے عید پر اپنے ماما' بابا ایک دوسرے کے ساتھ خوش دیکھنے ہیں۔ اور مجھے پتا ہے ایسا نہیں ہوگا۔"

"تم نجومی ہو جو پہلے سے آنے والا وقت کا حال پتا چل گیا ہے۔" مزمل نے بہن کو چھیڑا۔

"نجومی نہیں ہوں پر تھوڑا بہت دماغ ہے میرے پاس۔ اور تھوڑی بہت عقل بھی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کو استعمال بھی کرلیتی ہوں۔ تمہاری طرح آنکھیں کان بند کرکے نہیں بیٹھی رہتی۔"

"اچھا تو میری تھوڑے بہت دماغ والی' عقل مند بہن' کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ اس بار والی عید بھی پچھلی جیسی ہوگی۔"

"کیوں کہ ماما' بابا کے درمیان اس بار بھی وہی بحث چھڑی ہوئی ہے جو پچھلی بار جھگڑے کا سبب تھی۔ دونوں اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں سو لازمی بات ہے نتیجہ بھی وہی نکلے گا۔"

"ہوں۔۔۔" مزمل نے لمبی سی ہوں کی۔ "کیا ہم اس سلسلے میں کچھ کرسکتے ہیں۔"

"میں نے بابا اور ماما' دونوں سے الگ الگ بات کی تھی پر دونوں نے مجھے خاموش کرادیا کہ بچوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" مزمل نے سوچتی نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

سیف اور منیزہ خالہ زاد تھے۔ سولہ سال ہوگئے تھے دونوں کی شادی کو۔ شادی کے دو سال بعد اللہ تعالیٰ نے جڑواں بچوں سے نوازا تھا۔ چودہ سال تک وہ لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم کا حصہ رہے۔

چھ سال پہلے سسر اور تین سال پہلے ساس کا انتقال ہوا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے' گھر تنگ پڑنے لگا تو دو سال پہلے سیف اور منیزہ الگ ہوگئے۔

اختلاف الگ ہونے کے بعد آنے والی پہلی عید پر ہوا۔ منزہ کا کہنا تھا کہ وہ عید کا پہلا دن اپنے میکے میں گزارے گی۔ شادی کے بعد چودہ سال تک عید اس نے ہمیشہ اپنے سسرال میں کی کہ ساس' سسر حیات تھے۔ دوسرے دن میکے جایا کرتی۔ اب جبکہ ساس' سسر حیات نہیں رہے تو پہلا حق اس کے ماں باپ کا ہے۔ جبکہ سیف کا کہنا تھا کہ وہ لوگ عید بھائی جان کے ہاں کریں گے اور جیسا کہ ہمیشہ دوسرے دن خالہ خالو کے جاتے تھے اس بار بھی دوسرے دن ہی جائیں گے۔

پر اس دفعہ منزہ اپنی ضد پر اڑ گئیں "میں نے چودہ سال تک آپ کا مان رکھا۔ پہلے دن امی کے ہاں سب

بہن بھائی اکٹھے ہوتے ہیں پر میں نے کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالی۔ اب آپ کے والدین حیات نہیں ہیں اس لیے ہم پہلے امی ابو کی طرف جائیں گے۔ شام میں بھائی جان کی طرف چلے جائیں گے۔"

سیف بھی ضد میں آ گئے سو عید کا دن تلخی کی نظر ہوا۔ منیزہ اور بچے نانا' نانی کی طرف گئے عید کرنے۔ سیف بھائی جان کی طرف۔ پھر عید کے بعد بھی کتنے ہی دن دونوں کا موڈ خراب رہا۔

اب اس سال بھی یہی کچھ ہونے کا امکان تھا۔ رمضان کا آغاز ہوتے ہی منیزہ نے یہ بحث چھیڑ دی تھی۔ نہ منیزہ اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار تھیں' نہ سیف ضد چھوڑنے پر راضی تھے۔ اس سارے قصے میں سب سے زیادہ تکلیف تطہیر کو پہنچی تھی۔ وہ بڑی حساس بچی تھی۔ عید کے دن ماں باپ کا رویہ اس کی عید کا سارا مزہ خراب کر گیا تھا۔ اور اب رمضان کے شروع ہوتے ہی پھر سے وہی بحث۔

مزمل لڑکا تھا اور اس نے ان باتوں کو اتنا محسوس بھی نہیں کیا تھا۔ پر تطہیر کا دل بجھ کر رہ گیا یعنی اس بار بھی عید خراب ہو گی۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔

آج چھبیسواں روزہ تھا۔ دونوں بہن بھائی افطار کے بعد سر جوڑے بیٹھے تھے اور ماں باپ کی دوستی کروانے کے ہر ممکن اقدام پر غور کر رہے تھے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد طے پایا کہ عید کارڈز لیے جائیں اور ماما کی طرف سے بابا کو۔ اور بابا کی طرف سے ماما کو عید کارڈ دیے جائیں۔ اس سے دونوں طرف خیر سگالی کے جذبات ابھریں گے۔ سو مزمل صاحب اپنے کسی دوست کے ابو کی اسٹیشنری کی دکان سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر سن ستر کی دہائی کے کارڈ لے کر آئے۔

کارڈ دیکھ کر تطہیر کا موڈ سخت خراب ہوا۔ کارڈ کے بیچوں بیچ دو کبوتر ایک دوسرے کی طرف منہ کیے بیٹھے تھے۔ دونوں کے درمیان ایک سرخ رنگ کا دل لشکارے مار رہا تھا۔ ایک کبوتر کے منہ میں موتیوں کا ہار تھا جس کا آخری موتی دل کو چھو رہا تھا۔ کارڈ کے اوپر بڑا بڑا لکھا تھا "جان من عید مبارک"

دوسرا کارڈ اٹھایا۔ ایک بڑا سا دل بنا ہوا تھا۔ ایک عدد تیر دل کے آر پار ہو رہا تھا۔ دل سے خون کے تین چار قطرے ٹپک رہے تھے۔ دل کے اوپر بڑا بڑا لکھا تھا Love۔ اور نیچے لکھا تھا دل نہ توڑ صنم

"مزمل ڈفر! یہ کس طرح کے کارڈ اٹھا کر لے آئے ہو۔"

"ایسے ہی کارڈ تھے وہاں پر۔"

"پاس رکھو ان کو سنبھال کے۔" اس نے کارڈ بھائی کی گود میں پھینکے۔

"میرے اتنے پیسے لگے ہیں ان پر۔" مزمل نے دہائی دی۔

"ہاں تو سنبھال لو نا۔ اپنی بیوی کو دینا۔" اب وہ دونوں پھر سے کسی نئی ترکیب پر غور کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

آج اٹھائیسواں روزہ تھا۔

"مزمل' ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ کل ہو سکتا ہے چاند رات ہو جائے۔ ہمیں جو کرنا ہے آج ہی کرنا ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے ہم کوئی گفٹ لے کر بابا کی طرف سے ماما کو دیتے ہیں اور ماما کی طرف سے بابا کو۔" مزمل بولا۔ "پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" تطہیر متفق نظر آئی۔

"تطہیر! تمہارے پاس کتنے روپے ہیں؟"

"بارہ سو تک ہیں۔" تطہیر نے اندازے سے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ ہزار روپے میرے پاس بھی ہیں۔" مزمل نے اپنی کل جمع پونجی نکالی۔

پر گفٹ لائے گا کون۔۔۔؟ تطہیر کو نئی پریشانی نے آگھیرا۔

"میں لے آؤں گا۔ مجھے بتاؤ لانا کیا ہے؟" تطہیر نے اچھی طرح اس کو چیزیں سمجھا دیں۔

☆ ☆ ☆

آج انتیسواں روزہ تھا۔ افطار میں ابھی کچھ وقت تھا۔ سیف شاور لے کر باہر نکلے تو الماری کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ بند کرنے کو آگے بڑھے۔ کوئی چیز رکاوٹ بن رہی تھی' دروازہ بند نہیں ہو رہا تھا الماری کا۔ ہاتھ بڑھا کر ٹٹولنا چاہا تو ایک ڈبا الماری سے نکل کر پیروں میں آکر گرا۔ جھک کر اٹھایا۔ آگے پیچھے سے پلٹ کر دیکھا۔ سلور کلر کا بڑا خوب صورت ریپر تھا جس سے اس ڈبے کو پیک کیا گیا تھا۔

ابھی حیران ہی ہو رہے تھے کہ ایک کنارے پر کچھ لکھا دکھائی دیا۔ "اُفوہ! اتنا باریک لکھا ہے۔" عینک کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

عینک آنکھوں پر جما کر غور سے پڑھا لکھا تھا۔

"منیزہ کی طرف سے"

خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ جلدی جلدی کھولا۔ دیکھ کر حیران رہ گئے اندر سے ایک عدد چوڑیوں کا سیٹ' ایک ایئر رنگز کی جوڑی اور ایک انگوٹھی برآمد ہوئی۔

منیزہ نے یہ چیزیں کیوں گفٹ کی ہیں۔ تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ ڈبے کو دوبارہ سے دیکھا۔ ہینڈ رائٹنگ (لکھائی) پہچاننے کی کوشش کی اور بس چند لمحے لگے تھے بات کی تہ تک پہنچنے میں۔

اب وہ دونوں مجرم بنے باپ کی عدالت میں کھڑے تھے۔ تطہیر کھا جانے والی نظروں سے مزمل کو دیکھ رہی تھی۔ جس نے بے دھیانی میں ماما کا گفٹ بابا والے ریپر میں اور بابا کا گفٹ ماما والے ریپر میں رکھ دیا تھا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" سیف غصے سے دونوں کو گھور رہے تھے۔ "اس طرح کے مذاق کرتے ہیں والدین کے ساتھ۔ تمیز' طریقہ' تہذیب سب بھول گئے ہو تم لوگ۔" آواز دانستہ نیچی رکھی کہ کچن میں کام کرتی منیزہ کو پتا نہ چلے۔ سیف کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ "کس نے یہ حرکتیں سکھائی ہیں تم دونوں کو۔"

اب چپ رہنے کا وقت نہیں تھا۔

"آپ نے سکھائی ہیں بابا۔" تطہیر بولی تو آواز میں آنسوؤں کی آمیزش محسوس ہوئی۔

"نہ آپ پچھلے سال ہماری عید خراب کرتے نہ ہمیں یہ سب کرنا پڑتا۔ آپ دونوں نے اپنی ضد میں ہماری عید خراب کی اور اس سال بھی آپ لوگ یہی سب کچھ کرنے والے تھے اس لیے ہم چاہتے تھے آپ دونوں کی دوستی ہو جائے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"پیسے کہاں سے آئے...؟" سیف کا غصہ قدرے کم ہوا۔

"ہم دونوں نے اپنی پاکٹ منی ملا کر لیے ہیں۔" اب کہ مزمل بولا۔

"اور میری طرف سے ماں کو کیا دیا ہے؟" مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔

"یہ ماں ہی کو تو دینا تھا۔" دونوں کا اعتماد قدرے بحال ہو چکا تھا۔

"اوہوں... بھئی دوسرے گفٹ پیک میں کیا ہے۔" تطہیر نے جلدی سے بیڈ کی سائیڈ سے ایک اور ویسا ہی ڈبہ نکال کر سامنے کیا۔ کھول کر سامنے کیا تو اندر ایک پرفیوم اور کف لنکس رکھے ہوئے تھے۔

"خواہ مخواہ اتنے پیسے ضائع کر دیے۔ چلو اب تم دونوں یہاں سے۔" سیف نے دونوں کو چلتا کیا۔

عید کے دن منیزہ صبح صبح شیر خرما تیار کر رہی تھیں جب سیف نے کچن میں آکر جھانکا۔

"جلدی جلدی کام نمٹالو۔ میں اور مزمل نماز پڑھ آئیں تو پھر خالہ خالو کی طرف نکلتے ہیں۔ وہیں سے واپسی میں بھائی جان کی طرف چلیں گے۔ میں نے رات ہی فون کر دیا تھا بھائی جان کو۔" منیزہ کے ہاتھ سے کفگیر چھوٹ گیا۔ وہ بے یقین سے کھڑی تھیں۔ سیف نماز پڑھنے جا چکے تھے۔

تطہیر' یا ہو... ایک زوردار نعرہ لگاتی ان سے لپٹ گئی آکر۔ "ماما عید مبارک۔"

"عید مبارک بیٹا۔"

دونوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ جو کام منیزہ کے بحث مباحثے سے نہ ہو سکا' وہ تطہیر کے آنسوؤں نے کر دیا تھا۔

☆

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

قانتہ رابعہ

گھر تبدیل کرنا، کہنے لکھنے میں حد درجہ آسان مگر حقیقتاً مشکل، بے حد مشکل ..... گھر کی شفٹنگ کیسا دردِ سر ہے یہ کوئی عینی سے پوچھتا جو تین سال میں چوتھا گھر تبدیل کر رہی تھی۔ نفسیاتی پہلو تو ایک طرف رکھیے کہ نئے لوگ، نیا محلہ نئے طور طریقے جان پہچان ہو بھی نہ پاتی تھی کہ اڑان بھرنے کا حکم چلا آتا اور کہیں مالک مکان کے نازیبا اور غیر اخلاقی رویے مکان بدلنے پر مجبور کرتے ..... لوگ کرائے داروں

کی شکایات سناتے تو عینی حیرانی سے دیکھا کرتی، ارے کبھی مالک مکان کے متعلق شکایات کا سروے کرواؤ تو بتاؤں کہ تن ہمہ داغ داغ شد......!!!

خیر اس مرتبہ گھر بدلنا کسی مجبوری کی بنا، پر نہیں تھا...... بلکہ اس کے دل کی مراد تھی۔ اس کی حسرت تھی جو آج پوری ہونے جا رہی تھی۔ شادی کے چودہ سالوں میں یہ آٹھواں گھر تھا...... اس کا اپنا...... ذاتی ...... اس نے تو خوابوں میں ہی اپنا گھر بنتے دیکھا تھا۔

کجا یہ کہ بیٹھے بٹھائے اللہ نے دے بھی دیا۔ دو ہفتے تو وہ یقین و بے یقینی کی سی کیفیت میں رہی۔ زیور بیچا نہ کمیٹیاں ڈالیں، اللہ نے اسے بغیر مشقت کے گھر دے دیا۔ اس کے امی ابو چھ ماہ کے لیے امریکہ جا رہے تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے عینی ملتان گئی تو ابو بہت خاموش سے تھے، سلام دعا کے کچھ دیر — بعد ایک چیک بک اسے تھمائی، ساتھ میں وصیت نامہ بھی۔

''عینی بیٹے! زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، میں سوچ رہا ہوں جانے سے پہلے جائیداد تقسیم کر جاؤں۔ وصیت نامے کی ایک کاپی تمہیں دے رہا ہوں، گھر دکان سب میں بیٹوں کی طرح تمہارا حصہ بھی ہے، ہاں فیکٹری میں نے فروخت کر دی ہے اس کی پہلی قسط کل ہی ملی ہے جو تمہارے حصے کے لگ بھگ ہے، چیک بک سائن کر کے اسی لیے دے رہا ہوں...... کبھی اپنا گھر بنانا ہو یا اعجاز کو کاروبار شروع کرنا ہو تو خاصی معقول رقم ہے۔'' ابو نے وضاحت کی۔

عینی نے اس وقت تو چیک بک نہ کھولی۔ ہاں ان کی روانگی کے بعد اس نے اس رقم کی بابت وصیت نامے میں دیکھا تو واقعی بہت بڑی رقم تھی' اس نے اعجاز سے رقم کا سرسری ساذکر کیا تھا

اس کی نند کا اسلام آباد سے فون آیا۔

''ہم نے موٹروے کے قریب نیا مکان بنایا ہے پرانا سیل کر رہے ہیں...... دعا کرو، اچھی قیمت میں بک جائے۔'' عینی نے مطلوبہ رقم دریافت کی تو اس کے پاس موجود رقم سے زیادہ تھی مگر اس نے اپنی رقم اور خواہش کا ذکر بھی گوش گزار کر دیا۔

''ارے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں انہیں ابھی منع کرتی ہوں۔ کسی پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ نہ کریں بلکہ پنکھے اور اے سی وغیرہ بھی نہیں اترواتی۔'' عینی کی بڑی نند — نے کہا۔

''لیکن زہرہ آپا! باقی رقم ہم ابھی نہیں دے سکیں گے۔'' عینی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''او...... ہو' اماں کہا کرتی تھیں گھی گرے گا تو ستوؤں میں ڈلے گا...... بھئی دے سکتی ہو یا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے بس ہم اسی ہفتے شفٹ ہو رہے ہیں۔ پینٹ وغیرہ عالیہ کی شادی پر اس سال کے شروع میں کروایا تھا...... تم چاہو تو ابھی سامان شفٹ کروا لو۔''

''ابھی......'' عینی نے تھوک نگلا...... اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا...... چودہ سال مکان بدلنے کی اذیتوں سے چھٹکارا اتنی آسانی سے مل جائے گا' یہ تو سوچا ہی نہ تھا۔

رات اعجاز آئے تو اس نے چودہ سالہ شادی شدہ زندگی کا پہلا اور سب سے بڑا سرپرائز دیا۔ اعجاز بھی ہر ہفتے پنڈی سے جہلم کے سفر سے اعصابی طور پر تھک چکے تھے۔ وہ بھی بے پناہ خوش ہوئے...... بچوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

''امی امی! گرین والا کمرہ میں لوں گی۔'' ماہا خوشی سے چہکی۔

''اور پرپل میرا......'' نومی نے نعرہ لگایا۔

سارے گھر کے کونے کھدروں سے وہ کچرا نکلا کہ الاماں...... بظاہر صاف ستھرا گھر بھی اس وقت کباڑ خانہ لگ رہا تھا، جب الماریوں کے نیچے، بیڈ کے میٹرس کے نیچے سے بھی بسکٹوں کے خالی ریپر نکلے۔ خوشی خوشی سارا سامان پیک ہو رہا تھا۔ خوشی میں مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ نے بھی آسانی کی اور جب ان کی نند اسلام آباد شفٹ ہوئیں تو وہ لوگ سامان پیک کر کے بھجوا چکے تھے۔

اعجاز اپنے بھانجوں کے ساتھ سامان سیٹ کر چکے تھے۔ جب عینی بچوں کے ساتھ اسلام آباد

پھپھی......نند کو نئے گھر کی مبارک باد دی......ملتان سے خریدے خوب صورت کڑھائی والے دوپٹے' سوہن حلوے اور گل ٹیکس کی بیڈشیٹس کے تحائف ان کے حوالے کیے' نند کی بہو اور بیٹیوں نے پرتکلف ناشتہ تیار کیا ہوا تھا۔

"جاؤ ماہا! نومی! زینب! ناشتہ کریں آپ۔" اس نے بچوں سے کہا۔

"اور تم ناشتہ نہیں کرو گی؟" نند نے پوچھا۔

"عینی جھجکی......آپا میرا روزہ ہے......!"

"روزہ......اتنی سخت گرمی میں؟" ان کی بہو نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے بہت سال پہلے منت مانی تھی اللہ نے اپنا گھر دیا تو میں روزے سے داخل ہوں گی۔" عینی شرماتے ہوئے بولی۔

"اوہ......منت کا روزہ ہے، چلو اللہ مبارک کرے۔ آج آرام کرنا اور کل سے ہی گھر سیٹ کرنا شروع کرنا......شام کا کھانا بلکہ افطاری میں بھجواؤں گی۔ فی الحال یہ حلوہ پوری، نان چنے، نہاری لے جاؤ، دوپہر کا کھانا روزے میں کیسے بناؤ گی! دن بھی آج کل خیر سے لمبے ہو گئے ہیں، مجھے تو دوپہر میں نیند بہت آتی ہے۔ تم بھی سو جانا" ......نند نے مشورہ دیا اور بہو نے لپک جھپک کے ناشتے کی اشیاء پیک کر کے ان کے حوالے کیں۔

سلام دعا کے بعد وہ اپنے ذاتی گھر کے لیے روانہ ہو گئی......ذہن میں کرائے کے گھروں میں گزرے چودہ سال چودہ سو سال محسوس ہو رہے تھے۔ اعجاز گھر پر ہی تھے......نند نے پردے بھی نہیں اتروائے تھے۔ پنکھے لگے ہوئے تھے سخت گرمی محسوس ہوئی تو اس نے وضو کیا، شکرانے کے نوافل ادا کیے۔ سفر کی تھکاوٹ اور روزے کی نقاہت کے باوجود اس نے سامان کھولنا شروع کیا......بچوں کو آواز دے کے انہیں مددگار بننے کی درخواست کی......دوپہر کے تین ساڑھے تین بجے بچے بری طرح سے تھک گئے......گیس کا چولھا نند لے گئی تھیں۔ اس کا چولھا سامان میں بندھا تھا......اس نے اوون میں بچوں کو ناشتے کا سامان گرم کر کے دیا اور خود نئے سرے سے کاموں میں جت گئی۔

اعجاز بھی آفس سے حاضری لگا کے آ گئے تھے۔ دو کمروں کا سامان سیٹ ہو چکا تھا......اب وہ ڈرائنگ روم میں تھے جب اعجاز نے آواز لگائی۔

"ارے خوش بخت! تم تھک جاؤ گی۔ اب بس کرو۔" یہ کون سا کرائے کا گھر ہے جہاں سے نکالے جانے کا ڈر ہے......ویسے بھی روزے سے ہو۔"

عینی مسکرائی......"روزہ کیا کہتا ہے مجھے کہ کام نہ کرو......آپ کو نہیں علم جس طرح رمضان میں عبادتوں کا خواہ فرض ہوں یا نفل اجر بڑھ جاتا ہے اسی طرح کاموں کا اجر بھی بڑھ جاتا ہے......"

"خوب! یہ فتویٰ کس نے دیا؟" اعجاز نے فقرہ کسا۔

"فتوے کی کیا بات ہے' عام حالات میں پیاسے کو پانی پلانے پر دو نفلوں جتنا ثواب ہے تو کیا روزے میں یہ ثواب نہیں بڑھے گا؟ اور ہاں" وہ گہرا سانس لے کے بولی۔ "میں جب آپ سب کے کام کرتی ہوں تو بیوی ماں بیٹی بہو بن کے نہیں کرتی بلکہ......" وہ وقفہ لینے کے لیے جان بوجھ کے چپ ہوئی۔

"چپ کیوں ہو گئی ہو مائی ڈیئر" اعجاز نے دلچسپی لی۔

"وہ اس لیے کرتی ہوں کہ ایک تو پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے الخلق عیال اللہ......میں اللہ کے کنبے کی میزبانی کر کے ان کے کپڑے دھو کے، ان کے لیے کھانا بنا کے جو سکون محسوس کرتی ہوں۔ وہ شاید دنیوی مشقتوں میں پھنسی خواتین محسوس ہی نہ کر سکیں۔ اور مجھے اس وقت بے حد خوشی ہو رہی ہوتی ہے کہ میں اللہ کے کنبے کے لیے کام کر رہی ہوں تو اللہ جی کتنے خوش ہو رہے ہوں گے۔ دوسرا یہ کہ جو دین کسی کو مسکرا کے دیکھنے کو صدقہ قرار دیتا ہے کیا اس میں گھر کے ان کاموں کا کوئی اجر ثواب نہیں ہو گا۔" عینی کسی ندی کی سی روانی سے بولی۔

"لیکن روزے میں تو گھر کے کام کاج کم سے کم کرنے چاہئیں عبادت کے لیے مارجن تو رکھنا چاہیے۔" اعجاز نے دلیل دی۔

"عبادت......ارے بھئی عبادت ہم کیوں

کرتے ہیں؟ اللہ کو راضی کرنے کے لیے اور گھر کے کام کرتے ہیں گھر والوں کے آرام سکون کے لیے' میں یہ نہیں کہتی کہ بس کام ہی کرتے رہو۔ کم از کم رمضان میں فالتو کاموں کا پھیلاوا نہیں ہونا چاہیے۔ ضروری کام ہی کرنے چاہئیں...... آٹا گوندھنا۔ کھانا بنانا صفائی ستھرائی ان پر کم از کم وقت لگائیں لیکن جو وقت ان کاموں میں صرف ہو......وہ ضائع نہیں جاتا......بھول گئے آپ مومن کا نیند لینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ سوتے میں انسان جب دنیا و مافیہا سے غافل ہوتا ہے، اسے عبادت بنا دیا تو یہ کام عبادت نہ شمار ہوں گے؟" بڑی ترنگ میں عینی نے گفتگو کا سرا سوالیہ انداز میں اپنے میاں کو تھمایا۔

"دلیلوں میں تم سے کون جیت سکتا ہے تم جیتیں میں ہارا۔" بڑے شرارتی انداز میں اعجاز نے کہا۔

"میں تو آج تک یہی سمجھتا رہا کہ تمہیں ہر وقت کام کرنے کا شوق ہے یا یہ عادت گھٹی میں ملی ہے ہر وقت قائداعظم کے مشن کام کام اور کام پر عمل پیرا ہوتے رہنے کی۔"

"میں نے اللہ جانتا ہے اگر آج تک کسی کا بھی کام کیا ہے تو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارکہ "الخلق عیال اللہ" پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے کو سامنے رکھ کے کیا ہے۔ مجھے تھکاوٹ میں یہی سوچ راحت دیتی ہے۔"

اعجاز نے عینی کی طرف دیکھا۔ سادہ بے ریا انداز......جس کا سب سے بڑا گواہ وہ خود تھا......اور وہ خوش قسمت تھا کہ چار پانچ رشتوں میں سے اس نے اللہ سے نیک فطرت کی حامل لڑکی طلب کی تھی تو وہ رب کا شکر گزار تھا کہ اس نے نیک فطرت ہی عطا کی تھی۔ بغیر شکوے شکایت کے سب کے کام آنے والی، صلہ اور ستائش کی تمنا سے بے نیاز۔

"ارے کن خیالوں میں کھو گئے، آپ نے کھانا نہیں کھایا دوپہر میں۔ اب تو عصر کی اذان بھی ہو چکی ہے آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔" عینی فکر مندی سے بولی۔

"نہیں بھئی، دوپہر کا کھانا میں نے کینٹین سے کھا لیا تھا، اس ہفتہ کی فیس کی پے منٹ کر چکا تھا ناں اور مجھے پتا تھا کہ تمہارا روزہ ہے۔ تمہیں تو خوب بھوک بلکہ پیاس محسوس ہو رہی ہو گی۔ کھانا شاید آپا نے بھجوانا تھا"......ایک ہی وقت میں اعجاز نے کئی سوال کیے۔

"ہاں میرا خیال ہے ابھی بھجوا دیں گی۔ آپ بس جلدی سے نماز ادا کر کے باورچی خانے میں چولھا وغیرہ سیٹ کر دیں۔ مجھے تو گرما گرم چائے کی بھی طلب ہو رہی ہے۔" عینی نے کہا۔

"اوہ ہاں چولھا، ایک منٹ، میرا خیال ہے وہ باہر گیراج میں ہی ڈبے میں بند پڑا ہے۔ اعجاز نے گیراج میں سامان کھولا......آدھ پون گھنٹہ کی اٹھا پٹخ کے بعد چولھے والا کارٹن ملا۔ کچن میں اسے سیٹ کرنے میں بہت دیر لگی مگر کامیابی نہ ہوئی۔

"میرا خیال ہے، پلمبر کو بلانا پڑے گا۔ کوئی مسئلہ ہے جو فٹ نہیں ہو رہا۔" پسینہ پونچھتے ہوئے اعجاز نے خیال ظاہر کیا۔

اور سنو ٹائم کیا ہوا ہے۔ ارے سوا چھ ہو گئے روزہ کھلنے میں تو بہت کم وقت ہے۔ آپا نے کھانا نہیں بھجوایا ابھی۔" اعجاز پریشانی سے بولا۔

"میسج کیا تھا میں نے، آپا نے جواب دیا کہ ڈرائیور کھانا لے کے بہت دیر سے نکلا ہوا ہے۔"

"پھر بھی گھر میں کچھ موجود ہے یا نہیں۔" اعجاز بدستور ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔

"نہیں بسکٹ کیک رسک آپا نے دیے تھے وہ بھی بچوں نے شاید کھا لیے تھے"۔ عینی بہت تھکی ہوئی تھی۔

"اچھا تم فکر نہ کرو، میں پھل اور بیکری سے کچھ لاتا ہوں۔ شاید اتنے میں ڈرائیور بھی آ جائے۔"

اعجاز نے گاڑی کے بجائے موٹر بائیک نکالی۔ عینی قرآن کی تلاوت میں مصروف تھی۔ بار بار نظر کلاک کی طرف اٹھتی۔

"امی امی! اذان شروع ہو گئی۔" ماہا بولی۔

عینی کے سامنے سادہ پانی کا گلاس اور صبح کے بچے پراٹھے کے دو چار لقمے پڑے تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

اس نے بسم اللہ پڑھ کے پانی کا گھونٹ پیا۔
اس کے بعد اس نے پراٹھے کا لقمہ منہ میں ڈالا ...... پراٹھا تازہ نہیں تھا...... پراٹھا گرم اور خستہ بھی نہیں تھا...... ٹھنڈا' بے جان پراٹھا۔ لقمے کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ اس نے پانی کا دوسرا گھونٹ پیا۔ پھر دوسرا لقمہ منہ میں ڈالا...... خستہ اور گرم نہ ہونے کے باوجود اس نے اس لقمے میں کچھ لذت محسوس کی۔
اعجاز کا ابھی فون آیا تھا کہ "کسی غیر ملکی سربراہ کی آمد کی وجہ سے آپا کی گاڑی رش میں پھنسی ہے......اور میں ابھی آرہا ہوں۔" جب تیسرا لقمہ اس نے منہ میں ڈالا تو اعجاز شاپروں سے لدا پھندا اندر داخل ہوا۔ آپا نے ڈرائیور کے ہاتھ پکوڑے، سموسے، بریانی، قورمہ، قیمہ مٹر سمیت کئی مرغوب کھانے بھجوائے تھے۔ اعجاز بھی بیکری سے پزا اور ڈرم سٹکس لے آئے تھے۔ دنیا جہاں کی اشیاء اس کے سامنے پڑی تھیں۔ بچے سارے شاپر کھول کھول کے برتنوں میں یہ سب کچھ نکال رہے تھے۔ بریانی قورمے کی اشتہاء انگیز خوشبو سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔
بچے ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے۔
ڈرائیور برتن لے کے واپس جا چکا تھا۔ اور اعجاز حیران پریشان کھڑے تھے۔ عینی نے آنکھ اٹھا کے بھی اپنی پسندیدہ ڈشز کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ٹھنڈے پراٹھے کے بقیہ لقمے اس نے پانی کے ساتھ کھائے اور الحمدللہ کہہ کے اٹھی تو آنسوؤں سے چہرہ بھیگا ہوا تھا...... ذہن میں چودہ سو سال پہلے کے منظر تھے۔
سیدہ عائشہ کا ارشاد۔ "دو دو تین چاند طلوع ہو جاتے تھے اور خدا کی قسم ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا۔"
"ہمارے گھر کے چولہے میں کئی کئی ماہ آگ نہ جلنے کی وجہ سے گھاس اگ آتی تھی۔"
"مومن کا پیٹ تو ننھی بکری کی طرح ہے جسے سہارا دینے کے لیے چند لقمے بھی کافی ہیں......اور......اور۔"

اور...... وہ کیا وقت ہو گا جب سیدہ عائشہؓ کے ہاں کہیں سے گندم کا آٹا آیا...... زیتون کے تیل سے چپڑ کے شوق سے روٹی پکائی تو پیالہ اپنی کسی سوکن کے ہاں بھجوایا اگر سالن مل جائے تو کیا مزہ آئے گا...... سرد کونین نے یہ سن کے حیرانی سے کہا۔
"عائشہ جب روٹی کو زیتون کے تیل سے چپڑ لیا جائے تو کیا سالن کی ضرورت رہتی ہے۔"
عینی کی خاموشی پر اعجاز معذرت کے انداز میں بولا۔
"بہت معذرت۔ تمہیں وقت پر روزہ کھولنے کے لیے کھانے کی اشیاء نہ مل سکیں۔"
مگر عینی وہاں کب تھی۔ وہ تو کہیں اور تھی یہ پکوڑے' سموسے' بریانی یہ سب منظر سے غائب تھے جو لذت اسے سادہ پانی کے ساتھ پراٹھے کے لقمے سے ملی تھی۔ جس سادہ پانی کے گھونٹ اور روٹی کے لقمے نے اسے لذت آشنائی بخشی تھی اس کے سامنے دو جہاں کے کھانوں کی لذتیں ہیچ تھیں......!!
اور یہ سب ایک حد تک تو ٹھیک ہے مگر رمضان میں پکوڑے، سموسے سمیت پندرہ اشیاء روزانہ بنانا عبادت نہیں عبادتوں سے دور کرتا ہے...... بھلا بھرے پیٹ سے بھی کسی کو معرفت نصیب ہوتی ہے۔ غار حرا کا دروازہ بھوک سے کھلتا ہے۔
شکم کے غلام بھلا وہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں......!
"ارے بابا! کہاں پہنچی ہوئی ہو اللہ والی بیگم۔"
اعجاز نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔
وہ اس سہانی دنیا سے واپس آئی اور آہستہ سے بولی۔
"وہاں جہاں ارشاد ہوا تھا الٰہی ایک دن پیٹ بھر کے کھانا کھلانا کہ تیرا شکر ادا کر سکوں اور ایک دن فاقے سے رکھنا کہ صبر کر سکوں۔"
اور فاقے میں جو لذت اس نے زندگی میں پہلی دفعہ محسوس کی تھی، رگ و پے میں اس کے اثرات تھے۔ بس میں نہیں تھا کہ ابھی سجدے میں گر جائے۔
☆

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رو دی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نعیمہ ناز

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ
بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

بچپن کا پڑھا ہوا یہ شعر گرمیوں میں خصوصاً مئی کے مہینے میں ضرور روزانہ زبان پر آتا تھا۔ جب نہانے کے بعد غسل خانے میں کپڑے پہنتے پہنتے ہی پسینہ آ جاتا۔ کبھی تو دل چاہتا کہ کھلے شاور کے نیچے ہی کپڑے پہن لو۔ بینک جاتا تو تو وہاں پہنچ کر خیر تھی۔ ایئر کنڈیشن میں پورا دن آرام و سکون سے گزر جاتا شام ہوتی تو وہ خود کو واپسی کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے لگتا۔ واپسی کا سفر کسی چھوٹی موٹی جنگ یا معرکے سے کم نہ تھا۔

جب تک موٹر سائیکل پر سفر کرتا تھا، بڑی آسانی تھی۔ ٹریفک جام میں آڑی ترچھی، جیسے تیسے کر کے موٹر سائیکل نکال ہی لیتا تھا، اب جب سے ترقی پا کر چار پہیوں کی گاڑی پر آیا تھا۔ واپسی پر عموماً روز ہی ایسی خواری ہوتی جو بیان سے باہر تھی۔ روزانہ شام میں اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں گاڑیوں کے نرغے میں اپنی معصوم سی اکلوتی گاڑی کو

مکمل ناول

پھنسائے گرمی تھکن، پسینے اور دھوئیں سے بے حال، ٹریفک کے شور سے بے زار وہ دل ہی دل میں عہد کرتا کہ کل سے کار کے بجائے موٹر سائیکل استعمال کرے گا۔ بندہ وقت پر تو گھر پہنچ جاتا ہے وہ بھی ہوا کھاتے ہوئے گاڑی میں تو دو دو گھنٹے ٹریفک میں پھنسے پھنسے ہو جاتے ہیں گھر پہنچتے پہنچتے اتنی رات ہو جاتی ہے جیسے بینک میں اوور ٹائم کر کے آیا ہو۔

آج بھی ان ہی خیالات میں گم چھٹی ہونے پر لفٹ سے اتر کر وہ جیسے ہی اپنی گاڑی کا دروازہ کھولنے لگا۔ پیچھے سے ایک نسوانی اور اجنبی آواز سن کر چونک پڑا۔ پیچھے مڑا تو سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی جس نے اسے ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''جی؟'' عاطف نے کچھ اچنبھے سے اسے دیکھا۔

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا۔ اس کے بینک میں تو کیا اس بلڈنگ کی دوسری منزلوں میں قائم دفاتر میں بھی شاید اس شکل اور حلیے کی کوئی لڑکی ملازم نہیں تھی۔ چھٹی کے وقت، صبح کے وقت سب لوگوں سے ٹکراؤ ہوتا تھا۔ اس بلڈنگ کے دوسرے دفاتر میں تقریباً دس کے قریب صنف نازک تھیں۔ سب کی صورتیں دیکھی بھالی تھیں۔ یہ انجانا چہرہ تھا جو اس ــــ کے سامنے بڑے صبر و تحمل سے انتظار کر رہا تھا کہ عاطف اپنے ''مراقبے'' سے باہر آئے تو وہ آگے کچھ کہے۔

''آپ...... کون ہیں؟''

لڑکی نے اس سوال پر ایک گہری سانس لی اور بغور اسے دیکھا۔

''آپ عاطف شہید احمد ہیں؟''

''جی...... میں عاطف احمد ہوں۔'' اپنا پورا نام سن کر اسے عجیب سا احساس ہوا، سو فوراً تصحیح کر دی۔

''امی کا نام بتائیے؟''

''جی......!! عاطف نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''آپ کون ہیں اور یہ تفتیش کس سلسلے میں کر رہی ہیں؟''

''آپ جلدی سے نام بتائیے۔'' وہ جھنجلائی۔

''زہرہ بانو!'' جلدی تو عاطف کو بھی تھی۔ اس تفتیش کی وجہ جاننے کی اس لیے فوراً جواب دے دیا۔

''نانا کا نام؟''

''محترمہ! میرا شناختی کارڈ بنا ہوا ہے۔ اور پاسپورٹ بننے کے لیے میں نے کوئی درخواست نہیں دی۔ بلکہ میں نے کہیں بھی کسی قسم کی کوئی درخواست نہیں دی پھر...... اوہ!!'' بولتے بولتے اچانک ہی اسے کچھ خیال آیا۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' عاطف نے کچھ سمجھ کر ایک گہری سانس لی۔

''آ آ آ آپ......'' اس نے ''آپ'' کو کھینچتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''نانا کا نام بتائیے پلیز۔ لوگ ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں۔'' سر پر دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''عبدالحکیم صدیقی۔''

''ٹھیک۔'' اس کے چہرے پر کچھ اطمینان نظر آیا۔

عاطف کی نظریں اب اس پر جمی تھیں۔ تو یہ ہیں محترمہ...... چہرے پر اگر تھوڑی سنجیدگی اس سے تھوڑی زیادہ برہمی اور سنجیدگی سے تھوڑی کم بلکہ بہت ہی کم گھبراہٹ نہ ہوتی تو خاصا ٹھیک ٹھاک چہرہ تھا۔ اپنی طرف توجہ مبذول کرانے والا، سراہا جانے والا۔

''اگر میرے معائنے سے فرصت مل گئی تو گاڑی میں بیٹھیں؟ یہاں جتنے بھی لوگ آ رہے ہیں وہ ہمارا معائنہ کرتے ہوئے ہی گزر رہے ہیں۔''

اب کی بار وہ غرائی تو نہ صرف دانت پیس کر غرائی تھی بلکہ اس غراہٹ میں جنگلی بلی کی بھی کچھ کچھ

مشابہت تھی۔ عاطف بڑا شرمندہ ہوکر چونکا اور پھر یوں ہی شرمندہ شرمندہ سا وہ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شرم سار ہوکر اگنیشن میں چابی لگا رہا تھا تب ہی وہ بھی گھوم کر اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر آن بیٹھی۔

"آپ ...... کہاں جانا ہے؟" عاطف نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بتاتی ہوں، یہاں سے تو نکلیں۔"

عاطف نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ کار اب مرکزی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

"آپ فیروزہ آنٹی ......" عاطف نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس نے بات کاٹ دی۔

"آپ اس وقت صرف ڈرائیونگ پر دھیان دیں۔"

اس کا لہجہ پھر ویسا ہی تھا، سنجیدہ سا، برہم سا۔ میں نے تو نہیں بلایا۔ خود اپنی مرضی سے آئی ہے پھر اتنا نخرہ کیوں دکھا رہی ہے؟

عاطف نے ایک چور نگاہ پھر اس پہ ڈالی۔ اس کی خفگی کے باوجود وہ بالکل چپ بیٹھی تھی۔ منہ صرف اس وقت کھلتا جب اسے ہدایت دینی ہوتی۔

اب اس سڑک پر لے لیں۔ اب ادھر اب ادھر۔

عاطف بڑی فرماں برداری سے اس کی ہدایات پر عمل کر کے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

مگر اب ذرا سا، زیادہ نہیں بس ذرا سا پریشان ہو چلا تھا۔ کہاں اس کا گھر ماڈل کالونی میں تھا۔ جہاں وہ اب تک پہنچ چکا ہوتا اور کہاں یہ ہدایات دے دے کر اورنگی ٹاؤن تک لے آئی تھی۔

واپسی کب اور کیسے ہوگی؟

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے پھر سوال کرنے کی ہمت اور جرات کر لی۔

"فکر نہ کریں۔ آپ کو اغوا کر کے نہیں لے جا رہی جو اتنا پریشان ہو رہے ہیں۔ پہنچنے والے ہیں بس ابھی۔"

اتنی ملائمت سے کیے گئے سوال کا ایسا لٹھ مار جواب اور اتنا کھردرا لہجہ۔ بے چارہ عاطف اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ویسے وہ اس وقت سوچ رہا تھا کہ جو کچھ وہ پہلے سوچ رہا تھا اس لڑکی کے متعلق وہ شاید غلط تھا۔ اسے اب نہیں لگ رہا تھا کہ یہ لڑکی فیروزہ آنٹی کی۔

"بس یہیں روک دیں۔" اس کے ایک دم بول پڑنے پر عاطف نے اپنے خیالات اور گاڑی دونوں کو ہی بریک لگائے۔

"اب؟" بریک لگا کر عاطف نے اسے دیکھا۔ "نیچے اتریں اور گاڑی ٹھیک سے لاک کیجیے گا۔ اگر خدانخواستہ غائب ہوگئی تو میری ذمہ داری نہیں ہوگی۔" اپنے مخصوص درشت لہجے میں اس نے مزید ہدایت دی۔

"جی بہت بہتر۔" عاطف نے پہلی بار ذرا بدمزہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ ابھی کے ابھی اپنی کار میں بیٹھے اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ واپسی کا سفر شروع کر دے مگر اپنے خیال

بلکہ آرزو پر عمل کرنے کے بجائے وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے پر چلنے پر مجبور تھا۔ آخر تجسس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

اس کی رہنمائی میں چلتا ہوا وہ دو ذیلی سڑکیں اور چار پانچ گلیاں عبور کر چکا تھا۔ بالآخر سفر کا اختتام ایک سفید رنگ کے گیٹ پر ہوا۔ سفر تمام ہو گیا تو تجسس بھی تمام ہو ہی جائے گا۔ عاطف کی تمام حسیات بیدار تھیں۔ وہ بے چینی سے گیٹ کھلنے کا منتظر تھا۔ اس کا انتظار زیادہ طویل نہیں تھا۔ گیٹ کھولنے والی ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ صاف رنگ، فربہی مائل، لمبی تڑنگی، عاطف نے اس وقت تو نہیں مگر بعد میں غور کیا تھا کہ خاتون اور لڑکی کے چہروں میں کافی مشابہت تھی۔

''آ گئیں تم۔'' خاتون بولتے بولتے عاطف کو دیکھ کر چونکیں۔

''یہ کون ہے؟'' ان کے پوچھتے پوچھتے لڑکی اندر گھس گئی اور عاطف کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر آ گیا تو لڑکی نے گیٹ بند کر دیا۔

''یہ......وہ ہے؟ اچانک خاتون نے اسے غور بلکہ انتہائی غور و خوص سے دیکھتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''جی یہ وہی ہے۔'' لڑکی نے خاتون کو جواب دے کر سامنے کھلے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں بیٹھو، میں آتی ہوں ابھی۔''

''جی اچھا!'' عاطف نے اپنی الجھن، بے تابی اور پریشانی دل میں دبا کر اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کھلے دروازے سے ہو کر کمرے میں بیٹھ گیا۔ سادہ سا ڈرائنگ روم، صوفے، کارپٹ اور دیوار پر لگا آیت الکرسی کا طغرہ، کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ یہاں بیٹھا کیوں ہے؟ پہلے سارے راستے اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اب ان خاتون کے بارے میں سوچ رہا تھا جن کی دھیمی دھیمی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

خاتون کو دیکھ کر اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ مانوسیت کا، شناسائی کا، جیسے کہیں دیکھا ہو انہیں یا ان سے ملتی جلتی کوئی خاتون کہیں دیکھی ہو۔ دماغ ابھی تاویل پیش کر رہا تھا کہ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا، حالانکہ دل اس خیال کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔ مگر وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ تیزی سے باہر نکلا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ صحن کے ایک حصے میں جست کی ٹنکی رکھی تھی۔ درمیانے سائز کی۔ وہ لڑکی ڈیڑھ لیٹر والی پانی کی بوتل اٹھا کر اس میں انڈیل رہی تھی۔ وہ خاتون اس کے قریب کھڑی اس سے کہہ رہی تھیں۔

''کہاں سے ملا؟''

''ڈھونڈ کر لائی ہوں۔'' لڑکی کی ساری توجہ خالی ہوتی بوتل کی طرف تھی کہ خاتون نے عاطف کو دیکھا۔

''بیٹا آپ......''

''آپ عظمیٰ پھپھو ہیں نا؟'' عاطف نے بے صبری سے ان کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

''پہچان لیا تم نے؟'' ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ تھوڑی خوشی تھی، ندامت بھی اور حیرت بھی۔

''یہ گوگو ہے؟'' عاطف نے سوال عظمیٰ پھپھو سے کیا تھا مگر نظریں لڑکی پر تھیں۔

''میرا نام آرزو ہے۔ آرزو واجد خان۔'' خالی بوتل نیچے رکھتے ہوئے وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی تھی۔

''ہاں ہاں جانتا ہوں۔ آرزو واجد خان عرف گوگو۔'' عاطف نے لاپروائی سے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔ سات سال کی عمر اتنی کم بھی نہیں ہوتی کہ بالکل ہی کچھ یاد نہ رہے۔

''مجھے کیوں لائی ہو یہاں؟'' وہ اچانک ہی بالکل سنجیدہ ہو گیا۔

''بے مقصد نہیں لائی۔'' آرزو نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہاں آؤ۔''

عاطف ایک بار پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔ دو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

قدم پر ہی ڈرائنگ روم کے برابر والا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ وہ اس کھلے دروازے کے اندر گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور عجیب سی ناگوار مہک بھی آرزو نے بٹن دبایا۔ کمرے میں روشنی ہوگئی۔

چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں فقط ایک پلنگ پڑا ہوا تھا اور کچھ نہیں۔ فرش بھی خالی تھا۔ پلنگ پر ایک کم زور سا بلکہ کافی نحیف ونزار وجود پڑا ہوا تھا۔ دونوں کی آمد اور آہٹ پر بھی اس وجود میں کوئی حرکت، کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

''یہ شہید ماموں ہیں۔'' آرزو نے اتنا ہی کہا تھا کہ عاطف کا موبائل بجنے لگا۔ خالی الذہنی کے عالم میں اس نے موبائل پتلون کی جیب سے نکالا۔ حسب توقع ماں کا فون تھا۔

''جی!''

''کہاں ہو؟ اتنی دیر ہوگئی، گھر نہیں پہنچے اب تک۔''

''ابھی آرہا ہوں۔''

''آخر ہو کہاں؟ آج تو ٹریفک جام بھی نہیں ہے۔ منیب تمہاری بلڈنگ میں ہی جاب کرتا ہے، وہ کب کا گھر پہنچ گیا۔'' امی نے پڑوسی لڑکے کا نام لیا۔

''ایک دوست کے والد بیمار ہیں۔ انہیں دیکھنے آگیا تھا۔ بس نکلتا ہوں ابھی۔'' عاطف کو بولتے ہوئے خود اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہورہی تھی۔

''جلدی نکلنا، معلوم بھی ہے، میں فکرمند ہوجاتی ہوں۔ پھر بھی بغیر بتائے کہیں بھی چلے جاتے ہو۔'' امی نے سرزنش اور تاکید دونوں کرتے ہوئے فون بند کردیا۔

آرزو، پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ منیب نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں جاکر کھڑا ہوگیا اور وہاں کھڑے ہوتے ہی اسے کمرے میں پھیلی ناگوار بو کا منبع اور وجہ معلوم ہوگئی۔

نحیف ونزار وجود کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ پتا نہیں نیند تھی یا بے ہوشی، عاطف کو اندازہ نہیں ہوسکا۔

''تم پہلے انہیں دیکھ لو ذرا۔'' آرزو کی مبہم سی بات اس کے سر سے گزر گئی۔

''کیا مطلب؟''

آرزو چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''ان کا پیمپر چوبیس پچیس گھنٹوں سے بند ہے، پہلے انہیں صاف کردو۔ میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔'' حیرت انگیز طور پر اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔

''مگر...... میں کیسے یہ سب کروں گا؟ میں نے کبھی نہیں کیا۔ اس طرح کا کام۔'' عاطف تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔ درحقیقت وہ بوکھلا گیا تھا۔ اس کے تجسس کے پہاڑ سے چوہا نہیں بلکہ ڈائنوسار برآمد ہوا تھا۔ خوف ناک، خطرناک اور ہیبت ناک۔

''تمہارے علاوہ یہ کام اور کون کرے گا؟ کس کو کرنا چاہیے؟'' آرزو نے سوال کیا۔ اس بار پیشانی پر ذرا بل پڑ گئے تھے۔

عاطف متذبذب سا خاموش کھڑا تھا۔ آرزو نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

''میں پانی لاتی ہوں۔'' وہ باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں پانی کی بالٹی لاکر اس نے رکھی۔ صابن، تولیہ مگ، اور ایک دھلا ہوا مردانہ جوڑا لیکن نہیں۔ عاطف نے بعد میں دیکھا تھا۔ وہ ایک پاجامہ اور ٹی شرٹ تھی۔ لمبی قمیص اتارنے چڑھانے میں مشکل ہوتی ہے اور دامن بھی خراب ہوجاتا تھا۔ آرزو ایک بار پھر آئی، دو بڑے شاپر ساتھ تھے۔ جو اس نے نیچے رکھ دیے۔

''اس میں پیمپر ڈال دینا۔'' اس نے ساری تیاریاں کرکے عاطف کے فرار کے سارے راستے مسدود کردیے تھے۔ آرزو کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

بالکل گم صم خاموش، اپنا دماغ اسے بالکل خالی محسوس ہورہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا

کرے۔ اس کے سامنے پلنگ پر یہ کمزور اور بے بس انسان اس کا باپ تھا مگر اسے کوئی قلبی لگاؤ یا وابستگی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی یہ کام اسے کرنا ہی تھا۔

وہ کشمکش میں تھا۔ ایک طرف دل کہہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے نکل پڑے۔ یہاں جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا۔ اس سب کا ذمہ دار وہ نہیں تھا۔ اور دوسری طرف ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ محبت نہ سہی، ہمدردی ہی سہی۔ اپنا نہ سمجھے تو غیر سمجھ کر ہی ترس کھالے، رحم کھالے، اور کون جانے کل مجھے بڑھاپا (اگر ملا) تو کیسا گزرے؟

یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے ضمیر کا ہاتھ پکڑ کر اسے فتح کے منصب پر براجمان کیا اور جی کڑا کے اس کام میں لگ گیا۔ درمیان میں شہید احمد نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ غور سے عاطف کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے پھر ناکام ہو کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

عاطف نے اچھی طرح صاف کرنے اور دھلانے کے بعد وہ صاف تولیہ جو آرزو رکھ گئی تھی اسے پانی میں اچھی طرح نچوڑ کر سارے بدن کو صاف کر دیا۔ پھر انہیں کپڑے پہنا کر وہ باہر آیا۔ واش بیسن سامنے ہی لگا ہوا تھا۔ صابن سے اچھی طرح ہاتھ دھو کر وہ ہاتھ خشک کر رہا تھا۔ جب امی کا فون دوبارہ آ گیا۔

''امی! مجھے تھوڑا سا وقت لگے گا نکلنے میں۔ میرا دوست ایک کام سے گیا ہوا ہے۔ میں انکل کے پاس ہوں، جیسے ہی وہ آ جائے گا۔ میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

پچیس سالہ زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ ماں سے جھوٹ بول رہا تھا۔ پہلا جھوٹ ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ اسی گھر میں کھڑے ہو کر بولا تھا۔

آرزو کمرے میں سے باہر آ رہی تھی جو تھیلی ڈسٹ بن میں ڈالی اور واپس پھر کمرے میں گھس گئی۔ اب شڑاپ شڑاپ فرش دھونے کی آوازیں باہر آ رہی تھیں۔ وہ باہر احمقوں کی طرح کھڑا تھا۔ عظمٰی پھپھو برآمدے کے ایک کونے میں بنے مختصر سے کچن میں نیچے پیڑھی پر بیٹھی ہوئی گلاس میں کچھ گھول رہی تھیں۔

''اندر بیٹھ جاؤ بیٹا!'' عاطف کو صحن میں متذبذب کھڑا دیکھ کر انہوں نے مشورہ دیا۔

عاطف عجیب سی کیفیت کے زیر اثر تھا، خاموشی سے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دماغ میں بہت کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ بچپن میں وہ جس بڑے سے گھر میں رہتا تھا۔ وہ وقت، واقعات اور افراد اس کے یادداشت سے محو نہیں ہوئے تھے۔ ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ماضی اور بچپن کی وہ تصویر اب بھی پوری جزئیات کے ساتھ موجود تھی۔ اس وقت اس کے دماغ میں وہ سب کچھ کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔

اس فلم میں ان کے باپ کا کردار مختصر سا تھا اور وہ بھی مثبت نہیں بلکہ ایک منفی کردار تھا۔ اس گھر سے عاطف کے نکلتے ہی عاطف کی زندگی سے وہ کردار ختم ہو گیا تھا اور اب وہ ایک قابل رحم اور کسی حد تک عبرت ناک انداز میں اس کے سامنے آیا تھا۔

''شربت پی لو۔'' عظمٰی پھپھو کی آمد اور آواز سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر میزبان کی دل جوئی کی خاطر اس نے وہ گلاس بے دلی کے ساتھ اٹھا لیا۔ اور پہلا گھونٹ لیا۔ شربت نہ ٹھنڈا نہ تھا میٹھا۔ کسی سستے سے ساشے سے بنایا گیا تھا۔ عجیب سی ہیک آ رہی تھی۔ عاطف کا یہ جائزہ میزبانوں کی ہتک یا بے عزتی کے لیے نہیں تھا بلکہ وہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ عرش سے فرش پر آنے والا یہ گھرانہ کس حد تک تنزلی اور غربت کا شکار ہو چکا ہے۔

''پانچ سال ہو گئے تمہارے ابو کی اس حالت کو۔'' عظمٰی پھپھو نے بات شروع کی۔

'' تمہارے ابو'' عاطف کو بڑے اجنبی سے الفاظ لگے۔ وہ شخص ہی اجنبی لگ رہا تھا تو ان کے

متعلق الفاظ کیسے مانوس لگتے۔ کیسے اپنائیت محسوس ہوتی ان لفظوں سے؟ عاطف کی ذہنی کیفیت اور خیالات سے بے خبر وہ مسلسل بولتی جارہی تھیں۔

"کچھ عرصے پہلے تک اتنی بری حالت نہیں تھی۔ چل پھر لیتے تھے۔ کسی کام میں، کسی کی محتاجی نہیں تھی۔ تقریباً دو مہینے پہلے اچانک ہی چکرا کر گر پڑے۔ پھر خود سے نہیں اٹھ سکے۔ ہم دونوں ماں بیٹی کھانا کھلا دیتے، ہاتھ منہ دھلا دیتے۔ لیکن دوسرے کام" ...... ان کے چہرے پہ تاسف اور بے بسی چھا گئی۔

"دوسرے کام تو کوئی لڑکا یا مرد ہی کرسکتا ہے اس محلے میں آئے ہوئے ہمیں ایک سال ہوا ہے۔ اڑوس پڑوس کے علاوہ کسی اور سے اتنی واقفیت بھی نہیں ہے۔ بلکہ کہو کہ زیادہ راہ ورسم ہم نے بڑھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ پڑوس کے لڑکے کی منت کر کے اس کام پر آمادہ کیا۔ وہ صبح اور رات میں آکر بھائی صاحب کا کام کر جاتا تھا۔ ایک دن میری غیر موجودگی میں ......" عظمیٰ پھپھو کی آنکھیں جھک گئیں۔ الفاظ منہ میں ہی اٹک گئے جیسے انہیں باہر آتے ہوئے شرم آرہی ہو۔

اتنے میں آرزو اندر آگئی۔ عظمیٰ پھپھو خاموش ہوگئیں۔ پتا نہیں ان کی آواز باہر جارہی تھی یا نہیں۔ آرزو کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ آکر پھپھو کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"ایک دن امی کی غیر موجودگی میں پڑوسی لڑکے نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے تھپڑ مار دیا اور اس نے گھر سے باہر نکل کر شور مچا دیا کہ ماموں کے بہانے میں اسے اکیلے گھر میں بلاتی ہوں۔ اس دن میرے سر میں شدید درد تھا۔ امی میرے لیے سر درد کی گولی لینے ہی قریبی میڈیکل اسٹور تک گئی تھیں۔ جب تک وہ واپس آئیں، ہمارے دروازے پر پڑوس کی پوری فیملی سمیت آدھے سے زیادہ محلہ جمع ہو چکا تھا۔ میں نے کسی کے سامنے کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ امی کو اندر کر کے میں نے دروازہ بند کرلیا۔ جس کو جو سمجھنا ہے وہ سمجھے۔ میری طرف سے سب بھاڑ میں جائیں۔"

ماں کے ٹوٹے ہوئے سلسلہ کلام کو آرزو نے جوڑا اور پھر بولی تو بولتی ہی چلی گئی۔

"یہ بات بتانے کا مقصد اپنی مظلومیت ظاہر کرنا نہیں ہے تم پر۔ نہ ہی ہمدردی اور ترس کی بھیک چاہیے۔ بلکہ یہ جتانا مقصود ہے کہ انتہائی مجبوری اور اشد ضرورت کے تحت میں تمہیں یہاں لے کر آئی ہوں۔ ماموں کے لیے ایک لڑکا دیکھا تھا۔ وہ کچرا چننے والا تھا۔ اس نے روز کے سو روپے مانگے پھر ستر روپے طے ہوگئے۔ ایک ماہ تک وہ آیا۔ اس دوران میں نے تمہارا سراغ لگانے کی ٹھانی بلکہ یہ خیال میرے دل میں تب آیا جب ہماری ایک جاننے والی نے بتایا کہ تم اور تمہاری امی کو انہوں نے دیکھا ہے۔ تمہارے محلے میں ان کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ مایوں کی تقریب میں وہ ممانی سے ملیں۔ امی سے ویسے ہی ذکر کیا۔

تب اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ ماموں کی ذمہ داری اٹھانے کا پہلا اور آخری فرض تمہارا ہے۔ نور آنٹی کی بیٹی داماد سے مل کر تمہارے بارے میں معلومات کیں۔ کسی سے کچھ نہ کہنے کی درخواست کی اور آج تمہارے آفس ایمرجنسی میں آنا پڑا۔

وہ لڑکا پرسوں سے نہیں آیا۔ روز کے ڈیڑھ سو روپے مانگ رہا تھا۔ اسے ہماری ضرورت اور مجبوری کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا، اس لیے اپنی اجرت دگنی کردی۔

میری اپنی آمدنی تین سو، ساڑھے تین سو روپے روز کی ہے، اس میں کرائے اور بلوں کے علاوہ سارے ہی اخراجات ہیں۔ یہ ستر روپے روز کے بھی ہم جس مشکل سے نکالتے تھے، ہم ہی جانتے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپے تو کیا میرے لیے سو روپے دینا بھی مشکل تھا۔ میں نے پیسے بڑھانے سے انکار کردیا۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔ وہ پھر دوبارہ آیا ہی نہیں۔ اس لیے مجھے آج اس طرح تمہیں یہاں لانا پڑا۔" آرزو خاموش ہوگئی پھر دوبارہ بولی تو اس کی

نظریں سامنے دیوار پر تھیں۔
"فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔"
عاطف خاموشی اور بے بسی سے باری باری دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔
میں اپنے گھر تو انہیں لے جا نہیں سکتا اور کہیں اور انتظام کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔" بالآخر عاطف نے جواب دیا۔
کمرے میں اب خاموشی تھی۔ تینوں جیسے اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔
"ویسے انہیں کیا بیماری ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ......" عاطف نے سوال کرتے ہوئے ادھورا چھوڑ دیا۔
"ہمارے پاس کبھی اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے کہ سر میں اگر درد ہے تو اس کی گولیاں کھالیں۔ اسپتال لانے لے جانے کا کرایہ تک نہیں تھا ہمارے پاس، کیا کرتے؟"
"آپ لوگوں کے حالات تو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، بہت اچھے تھے پھر آپ یہاں کیسے آگئے؟" عاطف نے بڑی دیر سے ذہن میں کلبلاتا سوال پوچھ ہی لیا۔
آرزو کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اتنے شدید تھے کہ بالکل واضح نظر آرہے تھے۔
"میں نے یہ سب صرف اس لیے بتایا ہے کہ تم جان لو اور سمجھ لو کہ ہم ماموں کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ لہٰذا تم کچھ کرسکتے ہو تو کرو اور برائے مہربانی ہمارے اگلے پچھلے حالات کی کھوج لگانے کی کوشش نہ کرو۔" اس نے بڑے سخت لہجے میں عاطف کو جواب دیا تھا۔
عاطف نے ایک نظر اسے دیکھا اور دو القابات ذہن میں دہرائے۔
بہت بدلحاظ اور جی بھر کے بددماغ۔
"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"کل تو آؤ گے نا؟" پھپھو کے لہجے میں سوال سے زیادہ لجاجت تھی۔
"جی! جب تک کوئی بندوبست نہیں ہوجاتا، مجھے آنا تو پڑے گا۔" عاطف نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ آرزو یونہی ٹھس سی بیٹھی رہی۔ پھپھو البتہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔
"خدا حافظ بیٹا!"
"خدا حافظ۔"
وہ باہر نکلا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔
واپسی کے سفر میں تمام راستے اس کے دماغ میں کھد بد ہوتی رہی۔ بچپن کے جو مناظر اور باتیں اس کی یادداشت میں محفوظ تھیں اور جو کہانیاں امی اسے سنایا کرتی تھیں، اس حساب سے تو اسے اپنے باپ اور عظمیٰ پھپھو دونوں سے بے تحاشا اور بے حساب نفرت کرنا چاہیے تھی جیسے اس کی امی کرتی تھیں مگر پتا نہیں کیا بات تھی، اسے ان دونوں ہستیوں کے لیے اپنے دل میں پیار محبت اور احترام محسوس نہیں ہورہا تھا نفرت، حقارت، بھی نہیں تھی۔
گھر پہنچا تو امی حسب توقع بے چینی سے اس کا انتظار کررہی تھیں۔
"شکر ہے، تم آگئے، میں تو اتنی پریشان ہوگئی تھی۔ دو نفل منت کے مان لیے، اب عشاء کے بعد پڑھوں گی۔" امی اسے دیکھتے ہی شروع ہوگئیں۔
وہ ایسی ہی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہوجاتیں۔ عاطف کو وہ اپنے سائے میں یوں رکھتیں جیسے مرغی اپنے پروں میں ننھے سے چوزے کو چھپا کر رکھتی ہے۔ ویسے وہ جب اسے اپنے ساتھ لائی تھیں تو وہ چھوٹا سا تھا۔ ایک ننھے منے چوزے کی طرح، انہوں نے اسے محنت مشقت کرکے، چوگا کھلا کھلا، پال پوس کر اتنا بڑا کردیا تھا مگر اب بھی عاطف ان کے لیے ایک ننھا منا چوزہ ہی تھا جس کی سلامتی کے لیے وہ ہر پل فکرمند اور دعا گو رہتیں۔
"تم فریش ہوکر آجاؤ، میں کھانا لگاتی ہوں۔"
وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے مڑیں۔ "کھا کر تو نہیں آئے نا؟"

"کبھی کھاتا ہوں آپ کے بغیر؟" عاطف نے اپنی زندگی میں یہی ایک رشتہ دیکھا تھا، ماں کا رشتہ اس کی محبت، اس کی مشقت اور اس کی محنت عاطف کو اپنی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ اگر جو انہیں پتا چل جائے کہ میں کہاں سے آرہا ہوں تو؟ عاطف نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

جب تک وہ فریش ہو کر آیا۔ امی نے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔

"بڑی زبردست خوشبو آرہی ہے۔" اس نے قاب کا ڈھکن اٹھایا۔ اس کی پسندیدہ مٹن کڑاہی تھی۔

پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے ایک دم ہی اسے کچھ خیال آیا۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ مشکل سے ماہانہ دس ہزار کی آمدنی میں آٹھ ہزار کرائے اور بلوں میں نکل جاتے ہیں۔ باقی دو ہزار میں دونوں ماں بیٹی کیسے گزارا کرتی ہیں۔ کیا کھاتی پیتی ہیں؟ اور ضروریات زندگی......؟

"روٹی لو۔" امی نے ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال کر آدھی کی اور اسے دے دی۔ آدھی خود لے لی۔ دونوں اسی طرح کھانا کھاتے تھے۔ عاطف نے بے دلی سے نوالہ توڑ کر کھانا شروع کیا۔

"کیسے ہیں تمہارے دوست کے والد؟"

"ٹھیک نہیں ہیں، محتاج ہیں دوسرے کی مدد کے۔" بے اختیار عاطف کے منہ سے نکلا۔

"اللہ انہیں صحت یاب کرے۔ پاک پروردگار سب کو ایسی بیماری اور محتاجی سے بچائے۔ آمین"

"آمین!" عاطف نے زیرلب کہا اور پانی کا گلاس اٹھا کر پورا پی گیا۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کھانا کھائے بغیر فقط پانی پی پی کر اپنا پیٹ بھر لے۔ وہ نیم دلی سے چھوٹے چھوٹے نوالے توڑ رہا تھا۔

"کیا بات ہے، ٹھیک سے کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" امی پریشان ہو گئیں۔

اس کی پسندیدہ ڈش ہوتی تو دو روٹیاں لازمی کھاتا تھا۔ مگر اس وقت تو وہ آدھی روٹی بھی ٹھیک سے ختم نہیں ہوئی تھی جو اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ پانی پی پی کر اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

"کچھ نہیں امی۔ طبیعت ٹھیک ہے میری۔" عاطف نے سر جھٹکا۔ "بس بار بار وہاں کا خیال آرہا ہے۔ جہاں سے ابھی آیا ہوں۔ بیماری اور لاچاری انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ جب تک ہم صحت مند اور خوش حال ہوتے ہیں کبھی ایسی باتیں سوچتے ہی نہیں۔"

"تم تو بچپن سے ہی ایسے حساس ہو۔ نرمی اور ہمدردی تو تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یاد ہے تم چھوٹے سے تھے تو ایک بار سڑک سے ایک بلی کا بچہ اٹھا لائے تھے جو کسی گاڑی کی ٹکر سے زخمی ہو گیا تھا۔ جب تک اسے فرسٹ ایڈ دی جاتی، وہ مر گیا۔ تم ایسے پھوٹ پھوٹ کے روئے جیسے تمہارے ہاتھوں کا پالا پوسا بچہ تھا۔" امی کا سنایا واقعہ اسے یاد تھا۔ اسے وہ زخمی خون بہتا معصوم بچہ یاد آگیا۔ ہاتھ میں موجود آخری نوالہ اس نے کھا کر پانی پیا اور میز پر سے اٹھ گیا۔ امی اس کا مزاج اور طبیعت سمجھتی تھیں اس لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

"سونے سے پہلے دودھ ضرور لے لینا۔ کھانا تو ٹھیک سے کھایا نہیں تم نے۔" انہوں نے ہدایت کی۔

"جی!" عاطف نے صرف اثبات میں ہی سر نہیں ہلایا تھا بلکہ وہ سچ مچ ماں کا بہت فرماں بردار تھا۔ لہٰذا ان کی ہدایت کے مطابق اس نے سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پیا، اور حسب عادت برش کر کے سونے لیٹ گیا۔

روزانہ تھکن کے مارے اسے لیٹتے ہی نیند آجاتی تھی، آج تھکاوٹ معمول سے زیادہ تھی مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو رہ رہ کے وہ سارے منظر ایک ایک کر کے سامنے آجاتے، جن کو آج شام اس نے دیکھا تھا۔ زندگی کا یہ رخ حیران

کن تو تھا ہی، اس کی حساس طبیعت کے لیے کسی حد تک تکلیف دہ بھی تھا۔ جن تینوں سے وہ آج ملا تھا۔ ان ہی کے متعلق سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

☆☆☆

سارے کام نمٹا کر اس نے حسب معمول ماموں کا جائزہ لیا۔ ان کی حالت میں کوئی تغیر آیا تھا نہ تبدیلی۔ ویسے ہی نیم بے ہوش سے یا غنودگی میں تھے۔ اسی کمرے میں ایک طرف نیچے فرش پر چٹائی بچھا کر دونوں ماں بیٹیاں لیٹ جاتی تھیں۔ روز رات کو سونے سے پہلے دونوں اپنے اپنے خیالات کی سرزمین پر بھٹکتی رہتیں۔

آرزو عمر کے جس حصے سے گزر رہی تھی، اس میں لڑکیاں سنہرے سپنے اپنی آنکھوں میں سجا لیتی ہیں۔ خوش آئندہ خواب دل کے آسمان پر معصوم پرندوں کی طرح پرواز کرتے ہیں۔ کسی مانوس اجنبی کا البیلا سا احساس من کے اندر گدگدیاں کرنے لگتا ہے۔ مگر آرزو کی زندگی جس بھنور میں چکرا رہی تھی، اس میں زندگی کا وجود ہی سلامت رہ جائے تو بڑی بات تھی۔ انوکھے سپنوں کی گنجائش نہ زندگی میں تھی نہ آنکھوں میں۔ وہ سونے لیٹتی تو دن بھر کا حساب لگاتی کہ کہاں کیا خرچے کیے اور یہ کہ کل یہ خرچے مزید کیسے کم کیے جاسکتے ہیں۔

لطفی پھپھو عمر اور حالات کے جس دور میں تھیں، اس میں زیادہ تر ناسٹلجیا (ماضی پرستی) کا شکار رہتیں۔ اپنے ماضی کو سوچ سوچ کر کبھی خود ترسی کا لبادہ اوڑھ لیتیں۔ کبھی احساس جرم بری طرح ستانے لگتا۔ ابھی تک وہ حالات سے سمجھوتہ نہیں کرسکی تھیں۔ موجودہ زندگی کبھی گناہوں کی سزا لگتی اور کبھی اپنے اور اپنی بیٹی کے لیے خدا سے شکوے شکایات کے دفتر کھول دیتیں۔ ان ہی حالات میں اوندھی سیدھی زندگی، گرتی پڑتی آگے کی طرف چلی جارہی تھی۔

وہ زندگی جو کبھی کتنی حسین تھی۔ رات لیٹے لیٹے نیند کے جھولے میں جھولنے کے بجائے وہ ماضی کے جھروکوں میں پہنچ گئیں۔

☆☆☆

''شہید کی دلہن بن کر میری بھتیجی آئے گی گھر میں۔'' اس بحث کا اختتام امی کے اس دعوے پر ہوتا تھا۔ بابو فوراً ہی ان کے اس دعوے پر قلعی پھیر دیتے یہ کہہ کر ''شہید کی دلہن اور میری بہو، بس ایک ہی لڑکی ہے مہربانو، جو اس گھر میں آئے گی۔''

مہربانو ان کی بھانجی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں اب یہ بحث آئے دن ہونے لگی تھی۔ جب سے بیٹا برسرروزگار ہوا تھا۔ ماں باپ کی تکرار زور پکڑ گئی تھی۔ بے چارہ شہید احمد ایک انار دو بیمار والا معاملہ تھا۔ ماں باپ وہی روایتی تھے۔ شادی کے معاملے میں اولاد کی پسند یا مرضی کو فوقیت دینے کے بجائے اپنی مرضی اور انا کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک کو اپنی بھتیجی پیاری تھی تو دوسرے کو بھانجی کے سوا دنیا میں کوئی لڑکی نظر نہ آتی تھی۔

ثمینہ بیگم کی اپنی نند سے کبھی بنی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی نند نے کوشش کی کہ میکے میں بھاوج سے تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کریں۔ دونوں میں ایک سیر تھی تو دوسری سوا سیر، مگر بڑوں کے آپس کے تعلقات سے قطع نظر ان کے بچوں کی ایک دوسرے بہت بنتی تھی۔

دوستی اور میل ملاپ زیادہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حمیرا یعنی ثمینہ کی نند اس محلے میں رہائش پذیر تھیں۔ بچے بنا کسی روک ٹوک کے ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے تھے۔ کھیلتے تھے، باتیں کرتے تھے۔ ان کی بلا سے یہ دونوں نند بھاوج ایک دوسرے سے کنس بازی رکھیں، سرد جنگ لڑیں یا بغض اور کینے سے اپنے دل بھرے رکھیں۔ دونوں کی اولادیں ایک دوسرے کے ساتھ اتنی ہی شیر و شکر تھیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے دوستی اور انسیت بہت بڑھ گئی تھی۔ بڑے ہوئے تو بچپن

کی بے تکلفی کی جگہ تھوڑی جھجک حائل ہو گئی مگر اب دل اور ہی تال پر دھڑکنے لگے تھے۔ سولہ سالہ عظمیٰ، حمیرا پھپھو کے ارسلان کو دیکھتے ہی سرخ پڑ جاتی۔ بچپن میں پھپھو تواتر سے اس کے سامنے دہراتی تھیں۔ ”میری گڑیا تو میرے ارسل کی دلہن بنے گی۔“ اب یہ بات سمجھنے کی عمر آئی تو عظمیٰ کا دل آپوں آپ ارسلان کی محبت سے لبالب بھر کر چھلکنے لگا۔

شہید کو کامنی سے مہربانو اچھی لگتی تھی۔ بچپن میں کٹ کھنی بلی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر کاٹنے کو دوڑتی۔ بڑی ہونے پر بھی ویسی ہی تھی۔ کاٹنے پر بس نہیں چلتا مگر پنجہ تو مار ہی دیتی۔

حمیرا پھپھو کو بھاوج سے لاکھ عناد سہی مگر بھتیجا اور بھتیجی جان سے پیارے تھے۔ وہ ببانگ دہل اعلان کرتی تھیں۔ ”ایک دوں گی، ایک لوں گی۔“

ثمینہ بیگم تک سب خبریں پہنچتی تھیں۔ ایسی باتیں سن کر استہزائیہ مسکراہٹ ان کے لبوں کا احاطہ کر لیتی۔ ”میری اولاد کے فیصلے دوسروں کی نہیں، میری مرضی سے ہوں گے۔“ وہ مغرور انداز میں سوچتیں۔ دنیا کی اور بہنوں کی طرح انہیں بھی اپنا بھائی اور بھائی کے بچے بہت پیارے تھے۔

عفت جو سب سے بڑی بھتیجی تھی۔ بڑی موہنی سی تھی۔ اس کے بچپن سے ہی وہ اسے اپنے شہید کی دلہن بنانے کے خواب دیکھنے لگی تھیں اور اب بہت جلد ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہی چلچلاتی دھوپ، گرمی، پسینہ۔

گاڑی روک کر وہ سوچ رہا تھا کہ یہیں کھڑی کر دے جیسے کل کھڑی کی تھی۔ یا پھر وہاں گھر تک لے جائے۔ اتنی دھوپ اور گرمی میں یہاں سے وہاں تک پیدل چلنے کے خیال سے ہی اسے وحشت ہو رہی تھی پھر کچھ سوچ کر وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

کل آرزو نے یہاں کھڑی کروائی تھی۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی۔ کار کو اچھی طرح لاک کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ یہاں سے گھر تک کا راستہ سیدھا اور آسان تھا۔ ایک ہی بار آیا تھا کل پہلی بار، مگر آج آنکھیں بند کر کے پہنچ سکتا تھا۔

اسی گلی میں پہنچ کر اس نے ہرے رنگ کا وہ لوہے کا دروازہ اپنی چابی سے بجایا۔ اس گلی کے سارے گھروں میں کوئی بڑا گیٹ نہیں تھا نہ ہی گھروں کے آگے کوئی گیلری تھی۔ سب گھروں میں صحن یا کمروں کے دروازے سے ڈائریکٹ گلی میں کھلتے تھے۔

دروازہ عظمیٰ پھپھو نے کھولا تھا۔ عاطف کو دیکھ کر ان کے چہرے پر حیرت اور مسرت چھا گئی۔

”تم، اس وقت!!“ وہ آگے سے ہٹ گئیں۔

عاطف اندر آ گیا تو انہوں نے دروازہ بند کیا۔

”آدھی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ بینک سے۔“ عاطف نے انہیں بتایا۔

”اچھا، آؤ بیٹھو۔“

”پہلے انہیں دیکھ لوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسپتال لے جاؤں۔“ عاطف کے لہجے اور لفظوں میں جھجک تھی۔ باپ کے رشتے کو باضابطہ کسی لفظ سے پکارنے سے وہ گریزاں تھا۔

”جاگ ہی رہے ہیں۔ ابھی میں دلیہ کھلا رہی تھی بھائی صاحب کو۔“

وہ بولتی ہوئی سامنے کمرے میں چلی گئیں۔ عاطف بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ عظمیٰ پھپھو نے تکیے کے سہارے انہیں بٹھایا ہوا تھا۔ لیکن وہ بالکل سیدھے بیٹھے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ آدھے بیٹھے اور آدھے لیٹے تھے۔ گلے میں ایک کپڑا نیپکن کی طرح باندھا ہوا تھا۔ پھپھو پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

”وہ موڑھا لے آؤ۔“ انہوں نے کمرے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ عاطف موڑھا اٹھا کر لایا اور بیٹھ گیا۔

عظمیٰ چمچے میں تھوڑا تھوڑا دلیہ لے کر انہیں کھلا رہی تھیں بلکہ کھلا کیا رہی تھیں وہ پتلا رقیق سا دلیہ ان کے منہ میں انڈیل رہی تھی جو سیدھا حلق سے نیچے چلا جاتا۔ منہ چلانے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑ رہی

تھی۔ شاید ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ منہ بھی چلاسکیں۔ عاطف کبھی کمرے کی خالی دیواروں کو گھورنے لگتا کبھی ان دونوں بہن بھائی کو دیکھنے لگتا جن سے اس کا سب سے قریبی اور خون کا رشتہ تھا۔ پھپھو جس طریقے سے انہیں کھلا رہی تھیں، وہ بڑا صبر آزما تھا۔ ایک پیالہ پانی سا دلیہ ختم کرنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔

''آرزو کہاں ہے؟''

''وہ تو کام پر گئی ہے۔ نوکری کرتی ہے۔''

''کہاں؟''

یہیں قریب میں ایک فیکٹری ہے۔ وہیں جاتی ہے۔ کرایہ نہیں لگتا۔ پیدل آنا جانا کرلیتی ہے۔'' دلیہ ختم کرکے وہ گلے میں بندھے کپڑے سے بھائی کا منہ صاف کرکے اسے کھولنے لگیں۔ عاطف ایمبولینس کو کال کرنے لگا۔

''کھانا کھالو۔'' اس نے موبائل دوبارہ جیب میں رکھا تو پھپھو نے کہا۔

''نہیں، میں لنچ کرکے آیا ہوں۔'' عاطف نے جھوٹ بولا۔ وہ جلدی چھٹی لے آیا تھا۔ جلدی آنے کی وجہ سے اس نے لنچ کا ارادہ ملتوی کردیا تھا کہ بعد میں دیکھے گا مگر اب اس وقت بھوک محسوس ہورہی تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ اس گھر میں موجود دو نفوس خود بھی پیٹ بھر کے یا کوئی عمدہ کھانا شاید ہی کھاتے ہوں۔ اسے اب خیال آرہا تھا کہ وہ یہاں آرہا تھا تو کچھ کھانے پینے کا سامان ہی لیتا ہوا آجاتا۔ گوشت، سبزی، پھل، دودھ وغیرہ۔ عاطف کو تاسف ہورہا تھا کہ یہ خیال یہاں آنے سے پہلے کیوں نہیں آیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' پھپھو نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ اب تک وہیں پلنگ پر ایک طرف بیٹھی تھیں۔ شہید احمد کا مختصر سا وجود ان کے بیٹھنے میں مانع نہیں تھا۔

ایمبولنس آگئی تھی۔ عاطف نے شہید احمد کے ہلکے پھلکے وجود کو اٹھا کر اسٹریچر پر منتقل کیا۔

''میں چلوں؟''

''میرا خیال آپ ابھی رہنے دیں۔ وہاں پتا نہیں کتنا وقت لگ جائے، یہاں آرزو کو اکیلے رہنا پڑے گا۔ میں مینج کرلوں گا۔'' عاطف نے سوچ کر انہیں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' انہیں عاطف کی بات معقول لگی تھی۔

اسپتال میں ڈاکٹر نے شہید احمد کو چیک کرنے کے بعد چند ٹیسٹ لکھے تھے۔ ان کی رپورٹ آنے کے بعد ہی وہ کوئی حتمی فیصلہ کرتے۔ فی الحال عارضی طور پر انہیں ایک دو روز کے لیے داخل کرلیا تھا۔ یہ ایک نیم سرکاری اسپتال تھا۔ عاطف کے ایک کولیگ کے بڑے بھائی یہاں ڈاکٹر تھے۔ عاطف پہلے بھی یہاں اپنی امی کو لے کر آچکا تھا۔

یہاں کا عملہ اور انتظام بہت اچھا تھا اور علاج کے نام پر مریضوں اور ان کے لواحقین کی کھال نہیں اتاری جاتی تھی۔ شہر میں بہت اچھے پرائیویٹ اسپتال تھے مگر عاطف ان کے اخراجات کا متحمل نہیں تھا۔ عاطف نے ٹیسٹ کروالیے۔ رپورٹس کل ملنا تھیں۔ اب مسئلہ تھا رات میں ٹھہرنے کا۔ عاطف کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا جو یہاں رات میں رک سکتا۔

''آج پھر امی سے جھوٹ بولنا پڑے گا۔'' عاطف نے ایک گہری سانس لی۔ امی سے بات کی تو ان کا ردعمل حسب توقع تھا۔

''تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے ان بڑے میاں کا جو رات میں رک جائے۔''

''بتایا تو تھا امی، میرا دوست ان کا بیٹا ہے۔ وہ اکیلا ہے بے چارہ، چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہوگئے ہیں اسے اسپتال میں۔ اس لیے میں نے خود ہی آفر کردی تھی اسے کہ تم آج گھر چلے جاؤ میں یہاں رک جاؤں گا۔'' عاطف کو اب اندازہ ہوا تھا کہ پہلا جھوٹ بولنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد زبان اور دماغ دونوں ہی چل پڑتے ہیں۔

''معاف کر دینا میرے پیارے اللہ، امی سے جھوٹ کیوں بولنا پڑا ہے۔ تو تو جانتا ہی ہے۔'' فون بند کر کے عاطف نے دل ہی دل میں جھوٹ بولنے پر اللہ سے معافی مانگی۔

☆☆☆

برا وقت بتا کر نہیں آتا۔ کبھی تو اپنے آنے کا سراغ بھی نہیں دیتا بس اچانک سے یوں سامنے آن کھڑا ہوتا ہے کہ انسان کا دل دھک سے رہ جائے اور ثمینہ بیگم کا دل واقعی دھک سے رہ گیا تھا۔

ان کے بھائی کی معمولی سی بیماری اچانک ہی بڑھ گئی۔ تکلیف معمولی سمجھ کر پہلے تو محلے کے ڈاکٹر سے ہی علاج کراتے رہے۔ اس سے بھی افاقہ نہ ہوا تو کسی حکیم کے پاس چلے گئے۔ کوئی بھی تشخیص نہیں کر پایا۔ حالت زیادہ خراب ہونے پر بڑے سرکاری اسپتال کا رخ کیا۔ ٹیسٹوں کے بعد انہیں پتا چلا کہ ہیپاٹائٹس سی ہے۔ جو اندر ہی اندر بہت پھیل چکی۔ وہ اسپتال میں بے بسی کی تصویر بنے لیٹے ہوئے تھے۔ ثمینہ بھائی کی یہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔

''کاش اتنی مہلت مل جاتی کہ بیٹی کی خوشی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔'' ان کے لہجے میں اتنی حسرت اور بے بسی تھی کہ ثمینہ نے شوہر اور بیٹے کی پروا کیے بغیر فوراً ہی فیصلہ کر لیا۔

''آپ کوئی حسرت دل میں نہ رکھیں بھائی جان! عفت کی خوشی ان شاء اللہ آپ اپنے آنکھوں سے دیکھیں گے۔ میں کل ہی شہید اور عفت کا نکاح کروا دیتی ہوں۔''

ان کے ساتھ سالے کی عیادت کے لیے آئے غیور احمد جز بز ہو گئے مگر سالے کی حالت واقعی نازک تھی، اس موقعے پر انہیں کوئی اعتراض کرنا یا اپنی ٹانگ اڑانا انسانیت اور اخلاقیات کے خلاف لگا سو وہ خاموشی سے سارا تماشا دیکھتے رہے۔ شہید نے منمنا کر اعتراض کرنے کی کوشش کی مگر ثمینہ بیگم بڑی کرخت مزاج اور دبنگ خاتون تھیں، وہ اپنے شوہر کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں تو بیٹے کی کیا مجال اور کیا اوقات کہ وہ ماں کے آگے ذرا بھی چوں چرا کرتا۔

ثمینہ کی مرضی اور خواہش کے مطابق شہید اور عفت کا نکاح ہو گیا۔ حمیرا اور اس کے بچوں پہ بھی وہی بجلی گر پڑی جو شہید اور عظمیٰ پر گری تھی۔ سب کے خواب مٹی میں رل گئے، ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ آنکھیں جو من چاہے خوابوں سے بھری تھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''بھئی عظمیٰ! تیری ماں نے جو دل میں ٹھانی تھی وہی کر کے دکھا دیا اب ہم بھی اپنی من مانی کریں گے۔'' حمیرا کو بچوں کے احساسات سے زیادہ اپنی سبکی کا احساس تھا۔ بھاوج پہ زور نہ چلا تو عظمیٰ کو باتیں سنا ڈالیں۔

''پھپھو! اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' عظمیٰ روہانسی ہو گئی۔

''قصور تو سارا ہمارا ہے بچے! جو اپنے بھائی سے اور ان کے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔'' حمیرا تلخی سے بول رہی تھیں مگر ان کی محبت کم نہیں ہوئی تھی۔ بھاوج نے انہیں مایوس کیا مگر انہوں نے عظمیٰ اور ارسلان کو مایوس نہیں کیا۔ وہ فوراً اپنے بھائی کے پاس پہنچ گئیں۔

''بھائی! شہید کے معاملے میں تو بھابھی نے اپنی ضد پوری کر لی، اب عظمیٰ کو تو مجھے دے دو یا اس کا فیصلہ بھی بھابھی خود ہی کریں گی، تمہیں بھی بتائے بغیر۔'' غیور احمد حسب توقع بھڑک گئے۔

''ایک بیمار بندے کی آس توڑنا مجھے اچھا نہیں لگا اس لیے تیری بھابھی کو موقع مل گیا اپنی من مانی کرنے کا، مگر عظمیٰ کی باری میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، تو خود چل کر میرے پاس آئی ہے، تیرا مان نہیں توڑوں گا، بھائی کے گھر سے بہنیں خالی ہاتھ جاتی اچھی نہیں لگتیں۔ تو بیاہ کی تیاریاں کر، شہید کے ولیمے پہ عظمیٰ کا نکاح لے لینا، رخصتی پھر چھ ماہ بعد۔''

غیور احمد نے مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے

اپنا فیصلہ بھی سنا دیا اور آئندہ کا لائحہ عمل بھی، عظمیٰ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ قسمت ان پہ یوں بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ جھوم جانے کو من کر رہا تھا۔ اس کے برعکس ثمینہ بیگم کے سر پہ لگی تو تلووں سے بجھی۔

"ابھی عظمیٰ کی عمر ہی کیا ہے جو اتنی جلدی ہو رہی ہے۔ چپ چپاتے دونوں بہن بھائیوں نے فیصلہ کر لیا، مجھے ایسے نکال باہر پھینکا جیسے دودھ میں سے مکھی۔" وہ بڑبڑاتی رہیں، کلستی رہیں۔

غیور احمد کان لپیٹ کر ادھر ادھر پھرتے رہے، شہید بے چارہ گم صم تھا۔ اپنے ماموں کی بیماری اور حالت کا احساس تھا مگر جو احساسات دل میں مہربانو کے حوالے سے تھے، عفت کے لیے دل اور زندگی میں جگہ کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔

نکاح کے دو ہفتے بعد عفت کی رخصتی اور ولیمہ تھا۔ اس میں سے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اب فقط ایک ہفتہ بچا تھا اسے خود کو تیار کرنے کے لیے، پرانے خواب آنکھوں سے نوچ کر پھینکنے کو اور نئی ہستی کے لیے جگہ بنانے کو۔

یہ سب اتنا آسان نہیں تھا، بار بار مہربانو کا خیال آتا اور وہ نرم گوشہ جو عفت کے لیے دل میں بنانے کی کوشش کر رہا تھا جہاں کا تہاں رہ جاتا۔ ابھی تک اس میں ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی حمیرا پھپھو کے گھر جاتا اور ان کا اور خاص طور پر مہربانو کا سامنا کرتا۔ بچپن سے لے کر آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ مسلسل ایک ہفتہ اس گھر میں نہ گیا ہو۔ اس کا تو ایک دن کا بھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اب دل کو ہی ہاتھوں میں لے کر مسل کر پھینک دیا گیا تھا تو ساری ہمت ہی ٹوٹ گئی۔ جرأت جواب دے گئی تھی۔ خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ کر وہ آپ اپنا تماشا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

"انہیں ایسی کوئی بیماری نہیں ہے جو خطرناک ہو۔ ان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اندر جینے کی امنگ ختم ہو گئی ہے۔ یہ ایسی کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لے رہے جو زندگی کو رواں دواں رکھتی ہے، اس میں خوراک بھی شامل ہے جو سب سے اہم فیکٹر ہے۔ خوراک بہت ناقص اور معمولی ہے جس کی متواتر کمی سے کمزوری اور نقاہت بڑھتی چلی گئی ہے اور سب سے اہم بات جو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں ان کے اندر زندہ رہنے کا جذبہ دم توڑ گیا ہے۔"

ڈاکٹر نے رپورٹس آنے اور شہید احمد کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد عاطف کو تفصیل سے ان کی کیس ہسٹری سمجھائی، پھر مزید بولے۔

"انہیں ڈاکٹری علاج سے زیادہ بھرپور خوراک، پوری نیند، آس پاس کے لوگوں کا پیار، ہمدردی اور ساتھ چاہیے۔ یوں سمجھ لیں ان کا مسئلہ جسمانی سے زیادہ نفسیاتی ہے۔" ڈاکٹر کی بات کچھ کچھ عاطف کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

"اور یہ اتنی کمزوری، یہ ٹھیک سے خود اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتے؟"

"اس لیے کہ یہ خود سے کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے، انہوں نے خود کو ایک مردے کی طرح دوسروں کے رحم و کرم پہ چھوڑا ہوا ہے اور کمزوری دور ہو سکتی ہے، متوازن خوراک باقاعدگی کے ساتھ دیں۔ ان شاء اللہ بہتری آئے گی۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب!" عاطف اٹھ کھڑا ہوا۔

"اِٹس مائی ڈیوٹی۔" ڈاکٹر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

شہید احمد کو چھٹی کرا کے وہ واپس عظمیٰ پھپھو کے پاس لے آیا۔

"کیا کہا ڈاکٹر نے؟"

پھپھو کے استفسار پہ اس نے وہ سب دہرا دیا جو ڈاکٹر نے بتایا تھا۔ یہ سن کر وہ گم صم سی ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد آہ بھر کے بولیں۔

"عرصہ ہو گیا انہوں نے خود کو مردہ ہی سمجھ لیا ہے۔ ٹھیک کہا ہے ڈاکٹر صاحب نے۔"

"ایسا کیا ہوا ہے ان کے ساتھ؟" عاطف نے

بے اختیار سوال کیا۔

"ہم سب اپنے اپنے کرموں کے پھل سمیٹ رہے ہیں بیٹا، تمہیں کیا بتاؤں؟" پھپھو کے چہرے پہ تاریک سایہ لہرا گیا۔

"اٹس او کے!" عاطف نے اصرار نہیں کیا، انہیں بتانے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ اس کہانی کو اس کے سامنے لے ہی آئیں گی۔

"یہ میں کچھ سامان لایا تھا۔ یہ استعمال میں لے لیجیے گا۔"

"کیا ہے۔" وہ تھیلے کھول کر دیکھنے لگیں۔ دودھ کا کاٹن، مختلف دالیں، گوشت، پھل، پھر ان کے ہونٹوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"بیٹا! تم اتنا سب کچھ اٹھا کر لے آئے، باقی چیزوں کی تو خیر ہے مگر گوشت اور پھل رکھیں گے کہاں، گھر میں فریج تو ہے نہیں۔"

"فریج نہیں ہے؟" عاطف نے حیرت اور بے یقینی سے سوال کیا اور بے اختیار ہی اس کے ذہن کی اسکرین پر یہ چھوٹا سا پورا گھر نمودار ہوا۔ دو کمرے، برآمدہ، چھوٹا سا صحن سب کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس نے نوٹس ہی نہیں لیا کہ اس گھر میں فریج نہیں ہے۔

"پھر اب کیا ہوگا؟" پریشان نظروں سے اس نے پھپھو کو دیکھا۔

"چلو ابھی تو میں دو تین حصوں میں کر کے محلے میں رکھوا دیتی ہوں۔ آگے کا اللہ مالک ہے۔" وہ اٹھیں اور دو تین شاپر لے آئیں اور گوشت نکال کر حصے کرنے لگیں۔

"گرمی ہے نا، جلدی ٹھکانے نہیں لگایا تو خراب نہ ہو جائے۔"

"جی......!" عاطف کچھ سوچ رہا تھا۔ آج اس نے آفس سے چھٹی لی تھی۔ اس سے پہلے آدھی چھٹی لی تھی۔ اب آگے مزید کوئی چھٹی لینا بہت مشکل تھا۔ مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل، جلدی نکالنا ضروری تھا، اس طرح کب تک گاڑی چلے گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ آج کی تو خیر تھی، فون کر کے پہلے ہی امی کو بتا دیا تھا کہ آفس میں کام زیادہ ہے اس لیے دیر ہو جائے گی۔ عاطف اپنی الجھی سلجھی سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔

پھپھو نے اپنے بھائی کے لیے کھانا پکا لیا تھا، انہیں کھلانے کمرے میں جا رہی تھیں۔ عاطف بھی ایک معمول کی طرح ان کے پیچھے ہو لیا۔ وہی منظر پھر سے دہرایا گیا، پھپھو نے تکیے کے سہارے ان کا سر ذرا اونچا کیا اور پتلی کھچڑی چمچہ چمچہ ان کے حلق میں انڈیلنے لگیں، عاطف سامنے ہی موڑھے پر بیٹھا تھا۔

شہید احمد کی آنکھیں کھلی تھیں۔ چھت کو دیکھتے دیکھتے انہوں نے آنکھیں گھمائیں اور عظمیٰ پھپھو سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں عاطف پر ٹک گئیں۔ ان کی نگاہوں میں کچھ نہیں تھا، نہ تجسس نہ سوال، خالی خالی آنکھیں، ہر جذبے سے عاری، ہر تاثر سے خالی، اتنی ویرانی تھی ان آنکھوں میں کہ عاطف کا دل دہل سا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹھیک کہا تھا، انہوں نے جیتے جی خود کو مردہ بنا لیا تھا۔ اس مردہ کو زندہ کرنے کے لیے ایک مسیحا چاہیے تھا۔

"لائیں، میں کھلا دیتا ہوں۔" عاطف نے خود کو کہتے ہوئے سنا۔ پھپھو نے حیرت سے اسے دیکھا پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کیا۔ انہوں نے پیالہ عاطف کی طرف بڑھایا اور پلنگ سے اٹھ گئیں۔ عاطف ان کی جگہ بیٹھ گیا۔

پھپھو کی طرح اس نے دھیرے دھیرے ایک ایک چمچہ کر کے انہیں پورا پیالہ کھلا دیا۔ شہید احمد کی آنکھیں اسی طرح بے تاثر تھیں۔ انہیں شاید کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کھائیں یا نہ کھائیں۔ بہن کھلائے، بھانجی یا کوئی اجنبی۔ اس بات کا امکان بہت ہی کم تھا کہ انہوں نے عاطف کو پہچانا ہو۔ بہن بھانجی کے علاوہ ہر شکل ان کے لیے اجنبی ہی تھی شاید۔ عاطف نے خالی پیالہ اور چمچہ

پھپھو کی طرف بڑھایا اور باپ کے گلے سے بندھا کپڑا کھول کر ان کا منہ صاف کیا اور وہ کپڑا بھی پھپھو کو دے دیا۔

"گوگو کب تک آتی ہے؟"

"بس اب آتی ہی ہو گی، چھٹی کا وقت تو ہو گیا ہے۔" پھپھو نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کہیں تو میں چلا جاؤں لینے کے لیے؟"

"تم......؟" ان کی آنکھوں میں چمک سی ابھری پھر معدوم ہو گئی۔

"رہنے دو، خوامخواہ ناراض ہو گی۔ غصہ کرے گی۔" وہ سر جھکائے اب آلو چھیل رہی تھیں۔

"اتنا غصہ کیوں آتا ہے اسے؟" عاطف کے دل میں سوال ابھرا اور پھر دل میں ہی رہ گیا، زبان تک نہیں آیا۔ دماغ سمجھ رہا تھا یہ بات کہ اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟

جس قسم کے حالات سے وہ گزر رہی تھی اور جس طرح کی زندگی گزار رہی تھی۔ اگر ایسے حالات اور ایسی زندگی سے میرا واسطہ پڑتا تو شاید میں بھی ایسا ہی چڑچڑا اور غصہ ور ہو جاتا۔ عاطف نے سوچتے ہوئے آرزو کے لیے اپنے دل میں نرمی اور ہمدردی محسوس کی۔

وہ برآمدے میں موڑھا ڈال کر بیٹھا تھا۔ قریب ہی وہ کونا تھا جسے کچن کا درجہ دیا گیا تھا۔ پھپھو آٹا گوندھ رہی تھیں۔ چولہے پر ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی جس کی خوشبو سارے گھر میں پھیل رہی تھی۔ تبھی تو جیسے ہی آرزو گھر کے اندر آئی۔ اک دم ٹھٹک سی گئی۔ کرسی پہ بیٹھے عاطف کو نظر انداز کر کے وہ سیدھی ماں سے مخاطب ہوئی۔

"کیا پک رہا ہے؟"

"آلو گوشت بنا رہی ہوں، میں نے سوچا آج یہ بھی کھانا یہیں کھا لے گا۔" بیٹی کے سخت لہجے اور گھورتی نگاہوں کو نظر انداز کر کے وہ رسان سے بولتی رہیں اور ہنڈیا بھونتی رہیں۔

"گوشت کہاں سے آیا اور یہ......؟" اس کی نظر اس سامان پہ پڑی جو عاطف لایا تھا۔

عظمیٰ پھپھو نے مدد طلب نظروں سے عاطف کو دیکھا، جیسے کہہ رہی ہوں اب تم بھی تو کچھ بولو۔

"یہ سامان میں لایا تھا۔" عاطف نے پھپھو کی التجائیہ نظروں کو مایوس نہیں کیا۔

"کیوں؟" کڑے تیور، کڑا لہجہ۔

"مجھے لگا کہ آپ تینوں کو اس کی ضرورت ہے۔" عاطف نے سوچ کر جواب دیا۔

"تمہارے لائے ہوئے سامان کی ضرورت صرف ماموں کو ہے اور حق بھی ان ہی کا ہے۔ ہم ماں بیٹی پر اپنی مہربانیاں ضائع نہ کرو۔"

آخر میں اس کا لہجہ ذرا دھیما پڑ گیا۔ تھکی تھکی سی وہ کولر کے پاس جا کر گلاس میں پانی نکالنے لگی۔ گرمی بلا کی پڑ رہی تھی۔ وہ پیڑھی پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔ عاطف اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ آرزو نے پانی پی کر گلاس واپس رکھا تو بولا۔

"ایک گلاس اور پی لو، تمہارے مزاج کی گرمی کو ٹھنڈے پانی کی سخت ضرورت ہے۔" عاطف نے بالکل سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا۔

"میں پاگل نہیں ہوں۔" آرزو نے بیٹھے بیٹھے عاطف کی طرف نظر اٹھائی، لہجہ خلاف توقع دھیما تھا۔

"بہت تلخ ہو۔"

"زندگی کی کڑواہٹ زبان میں اتر آئی ہے۔" آرزو کا بدن اور دل دونوں بری طرح دکھے ہوئے تھے۔ فیکٹری میں جہاں وہ کام کرتی تھی، بندہ، مزدور کے اوقات بہت تلخ تھے اور بندہ، مزدور کی اپنی اوقات کچھ نہیں تھی۔ معمولی معمولی باتوں پہ تنخواہ میں سے کٹوتیاں ہو جاتی تھیں۔ صبح پانچ منٹ بھی دیر سے پہنچو تو لیٹ لگ جاتی تھی۔ ایسی ہی دو چار منٹ کی تین بار "لیٹ" پر اس کی پورے ایک دن کی اجرت کاٹ لی گئی تھی۔

آرزو کو اس کا بڑا غم تھا۔ زندگی کی تلخیوں میں

اور زبان میں تھوڑی سی کڑواہٹ اور گھل گئی تھی۔ یہی کڑواہٹ لیے گھر واپس آئی تو عاطف سے سامنا ہو گیا۔ وہ بے چارہ اچھے دل کا تھا، آرزو کو بعد میں افسوس بھی ہوتا تھا۔ بری تو وہ بھی نہیں تھی، بس حالات برے تھے جنہوں نے انسانوں کو بھی برا بنا دیا تھا۔

کھانا تیار تھا۔ آرزو نے ڈرائنگ روم میں ہی چھوٹا سا دستر خوان لگا دیا تھا۔ آلو گوشت کا سالن، چپاتیاں، عاطف نے بہت عرصے بعد ماں کے ہاتھ کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں کا ذائقہ چکھا تھا۔ ہوٹلنگ کا شوق نہیں تھا۔ پہلے حالات کی اجازت نہیں تھی پھر امی کی وجہ سے کہ وہ بڑی محنت اور چاہت سے اس کے لیے کھانا تیار کرتی تھیں۔ اب کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام بن جاتا تھا۔ مگر اپنے گھر کے علاوہ کسی اور گھر کا ذائقہ چکھنے کا موقع شاذونادر ہی ملتا تھا۔ شوربے میں آلو توڑتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ بہت ساری تبدیلیاں اب ناگزیر ہیں۔

رات کو گھر پہنچا تو امی حسب معمول اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

"آج کل بہت دیر سے آ رہے ہو بیٹا!" امی کا لہجہ سادہ سا تھا۔

"کام بہت زیادہ ہے آج کل، اس لیے۔" عاطف نے ان کی طرف دیکھے بغیر چور لہجے میں جواب دیا۔

"کھانا لگا رہی ہوں میں، فریش ہو کر آ جاؤ۔" وہ کچن میں چلی گئیں۔

عاطف کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ گھر آ کر اسی صورت حال سے واسطہ پڑے گا، اس لیے اس نے عظمیٰ پھپھو کے ہاں آدھا پیٹ کھانا کھایا تھا۔ وہ ان کا مان نہیں توڑنا چاہتا تھا اور گھر پہ ماں کا ساتھ دینا بھی ضروری تھا۔ جب تک وہ گھر نہیں آ جاتا تھا، وہ بھوکی بیٹھی رہتی تھیں اس کے انتظار میں۔ کھانا نہیں کھاتی تھیں۔

نہا دھو کر، کپڑے تبدیل کر کے، وہ کھانے کی میز پہ آ گیا۔ آج امی نے ماش کی پھریری دال کے ساتھ کباب تلے تھے۔ اس کی پسندیدہ انار دانے کی چٹنی بھی تھی۔ وہ زیادہ تر عاطف کی پسند کے ہی کھانے بناتی تھیں تاکہ وہ شوق اور رغبت سے کھا لے، مگر پچھلے ایک ہفتے سے وہ دیکھ رہی تھیں کہ عاطف کی خوراک کچھ کم ہو گئی ہے اور سوچنا زیادہ ہو گیا ہے۔ آج بھی کھانے کے دوران وہ کھانا کم کھا رہا تھا اور خاموش زیادہ تھا۔

"کیا بات ہے، آج کل تم بڑے چپ چپ اور خیالات میں گم رہنے لگے ہو؟" امی کے اچانک بولنے پہ وہ ایک دم اچھل ہی پڑا۔ دل میں چور تھا اسی لیے بولتے ہوئے زبان لڑکھڑا گئی۔

"وہ...... دراصل، دراصل کام کا پریشر بہت ہے آج، نئے باس آئے ہیں، سختی بہت کی ہوئی ہے تو بس دماغ وہیں الجھا رہتا ہے۔" عاطف کو بالآخر بہانہ سوجھ ہی گیا۔

"اچھا چلو، خیر ہے۔ تم اتنی ٹینشن مت لو، کام کی فکر کو سر پہ سوار مت کرو۔ دیکھو تو کیسا ذرا سا چہرہ نکل آیا ہے ہفتے دس دن میں۔" امی کا لہجہ مامتا اور شفقت سے بھرا ہوا تھا۔

"جی!" عاطف نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔

"کھانا تو ٹھیک سے کھاؤ۔"

"کھا لیا امی، دیر ہو جاتی ہے تو زیادہ کھایا نہیں جاتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" امی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے دیر ہو جایا کرے تو آپ میرا انتظار نہ کیا کریں، کھانا کھا لیا کریں۔ میری وجہ سے آپ بھوکی بیٹھی رہتی ہیں، دیر سے کھاتی ہیں میرے ساتھ تو دو چار نوالے کھا کر اٹھ جاتی ہیں۔"

"اچھا ہی نہیں لگتا اکیلے کھانا، تمہارے بچپن سے عادت پڑی ہوئی ہے۔ تمہارے بغیر نہ نوالہ توڑا

جاتا ہے نہ حلق سے نیچے اترتا ہے۔'' امی اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

''جی!'' عاطف نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ برتن اٹھا کر کچن میں رکھے۔ واپس آیا تو امی بدستور وہیں بیٹھی تھیں۔

''عاطف! ذرا یہاں بیٹھو، مجھے ایک ضروری بات کہنی تھی تم سے۔''

''جی!'' ان کے انتہائی سنجیدہ لہجے پہ عاطف کچھ کھٹک گیا۔

''فیروزہ آئی تھی آج، وہ جو رشتہ بتایا تھا نا میں نے تمہیں، جسے میں دیکھ کر آئی تھی، مجھے تو بہت پسند آئی لڑکی بھی، گھرانہ بھی، فیروزہ سے میں نے تصویر منگوائی تھی تمہیں دکھانے کے لیے۔ تم کہو تو ان لوگوں کو گھر بلالوں، تم سے ملنے کے لیے؟''

امی بولتی جا رہی تھیں اور نہ جانے کیوں اس کا دل جیسے ڈوبتا جا رہا تھا۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' امی اسے وہیں اپنے خدشات و خیالات میں غلطاں چھوڑ کر، اٹھ کر اپنے کمرے میں گئیں۔ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

''یہ دیکھو لو۔'' انہوں نے لفافے سے تصویر نکال کر عاطف کی طرف بڑھائی۔ عاطف نے ایک گہری سانس لے کر تصویر کی طرف دیکھا۔

''اچھی ہے نا؟'' امی کے لہجے میں بچوں جیسا اشتیاق تھا۔

''جی!'' عاطف کے لبوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس کے سوا اور کیا کہتا؟ تصویر میں موجود لڑکی واقعی بہت اچھی، پیاری سی تھی۔ کم عمر، نازک اور بھولی بھالی سی۔

''تمہارے ساتھ جوڑی خوب جچے گی ہے نا؟'' امی نے تصویر کو واپس لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی!'' عاطف کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ امی کی بات سے اختلاف کرتا اور پھر ان کے چہرے پہ پھیلے شوق اور خوشی کے تاثرات عاطف چاہ کر بھی ان تاثرات کو ان جذبات کو مٹا نہیں سکتا تھا ان کے چہرے سے۔

''پھر؟ اس اتوار کو بلالوں؟''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' عاطف نے ان کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''جیتے رہو میرے بچے، سدا خوش رہو۔'' امی نہال ہو گئیں بیٹے کی سعادت مندی پر، اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور سونے سے پہلے دودھ پینے کی تاکید کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

☆☆☆

ایمرجنسی کی شادی تھی مگر خوب انتظام کیا تھا غیور احمد نے، آخر پیسہ جمع کس لیے کیا تھا؟ دو ہی بچے تھے۔ بیٹے کا ولیمہ شاندار تھا، اسی دن عظمیٰ کا نکاح ارسلان سے ہو گیا۔ حمیرا نے چھ ماہ کا وقت غنیمت جانا تھا۔ انہیں مہربانو کے لیے ایسا رشتہ ایسا بر تلاش کرنا تھا کہ جو شہید احمد کو بھی مات کر دے، ثمینہ کو چاروں شانے چت کر دے، اس کے سینے پہ سانپ لوٹ جائیں اور وہ جل جل مرے۔ حمیرا اپنے خیالات کے ساتھ اپنی مہم میں مصروف ہو گئیں، وچولن کی ہتھیلی پہ ایک خطیر رقم ایڈوانس میں رکھ کر انہوں نے اپنی مہم، اس کے سپرد کر دی۔

شہید احمد کی زندگی میں عفت داخل ہو گئی، بڑے سبھاؤ سے۔ دھیرے دھیرے بولنے والی عفت، سجل رنگ وروپ کی مالک تھی۔ شہید احمد کا دل مہربانو میں نہ اٹکا ہوتا تو وہ ایسی خوب صورت دلہن کو پا کر اپنی قسمت پہ ناز کرتا، اور واقعہ یہ ہے کہ شہید احمد سب کچھ بھول کر اپنی نئی زندگی کو ایمان داری سے شروع کرنے کی نیت رکھتا تھا اور عفت کو پا کر وہ اپنی قسمت پہ ناز کر ہی لیتا مگر مہربانو کی آنسو بھری شکوہ کناں آنکھیں، اس کی آنکھوں میں عفت کو بسنے نہیں دے رہی تھیں۔

مہربانو کے، بزدلی اور وعدے بھولنے کے طعنے، عفت کی طرف مائل ہونے میں مانع تھے۔

بحیثیت ایک شوہر' فطرت نے اسے اپنی بیوی کے قریب کر دیا تھا مگر اس کا دل اس سے ہنوز دور تھا۔ شہید احمد کے چاہنے اور کوشش کرنے کے باوجود بھی عفت کو اپنے دل کے قریب نہیں کر پا رہا تھا۔ مہربانو کا وجود بار بار آڑے آ رہا تھا۔ مہربانو کی کہیں اور شادی ہو جائے تو اس کے شکوے شکایات ختم ہو جائیں اور میرا احساس جرم بھی، شہید احمد یہی سوچ کر دل کو تسلی دے رہا تھا۔

ثمینہ بیگم اپنی نئی نویلی بہو کے چاؤ چونچلوں میں مگن رہتیں اور ساتھ ساتھ عظمٰی کے جہیز کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔

عظمٰی کے پاؤں مسرت کے مارے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اپنی نئی بھابھی سے اسے کوئی خاص پرخاش نہیں تھی۔ ہاں پہلے اس کا دل بہت وسوسوں اور اندیشوں کا شکار تھا، بہت سہم گیا تھا کہ حمیرا پھپھو کا ببانگ دہل اعلان۔ ''ایک دوں گی ایک لوں گی۔'' پر ماں کے فیصلے نے پانی پھیر دیا تھا۔

اب وہ اپنے اعلان کے آدھے حصے پہ عمل درآمد کریں یا نہ کریں، مگر حمیرا پھپھو اس پہ مہربان تھیں اور قدرت بھی تب ہی تو اس کا سنجوگ ارسلان کے ساتھ ممکن ہوا۔ جہیز کے لیے ایک ایک رنگ' ایک ایک شے وہ وہی خرید رہی تھیں جو ارسلان کی پسند، جو عظمٰی پر یوں جچے اور یوں سجے کہ دیکھنے والا نگاہیں ہٹانا بھول جائے۔

ان کی دلی خواہش تھی کہ ارسلان کی نظریں کبھی اس پر سے نہ ہٹیں اور نہ ہی دل۔

مہربانو کی قسمت زوروں پر تھی یا پھر، حمیرا کے جتن اور دوڑ دھوپ کی بھاگ دوڑ کام میں آئی کہ اس کا ایسا رشتہ آیا کہ حمیرا کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس لیے کم کہ بیٹی کا روشن' سنہرا اور خوشیوں بھرا مستقبل سامنے نظر آ رہا تھا۔ زیادہ اس لیے کہ ثمینہ کو جلانے اور تپانے کا ایک انتہائی شان دار موقع اللہ انہیں دے رہا تھا۔ ان کی خواہش کے عین مطابق مہربانو کا ایسا رشتہ ملا تھا کہ حاسدوں کے سینوں پہ سانپ لوٹ جاتے تھے اور ان کی نگاہ میں بھاوج سے بڑا حاسد اور کون تھا بھلا؟

بھاوج کا بھی اپنی نند کے بارے میں حسن ظن یہی تھا تب ہی دونوں کے درمیان تناؤ اور کشیدگی ہمیشہ برقرار ہی رہی، ختم اور کم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مہربانو کے لیے معیز عالم کا جو رشتہ آیا تھا وہ فوراً سے پیشتر انہوں نے اوکے کر دیا۔ لڑکا دکھانے کے لیے اپنے بھائی کو ساتھ لے جانا تھا۔ سو غیور احمد کے گھر گئیں۔ وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہوئے ان کا ٹھسا اور شان ہی کچھ اور تھے۔

''کیا بتاؤں بھائی صاحب! ہماری بیٹی کے تو سمجھو بھاگ کھل گئے۔ ایسا رشتہ تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا میں نے' بس دو ماں بیٹا ہیں، اتنا بڑا بنگلہ، نوکر چاکر' اپنا کاروبار' لڑکے کو پہلی ہی بار ساتھ لائیں۔ ایسا گبھرو جوان، آپ کا بھی دل خوش ہو جائے گا دیکھ کر۔''

حمیرا کی یہ ساری تفصیل فقط بھائی کو نہیں بلکہ سارے جملہ حاضرین کو سنانے کے لیے تھی جس میں شہید احمد بمعہ نئی نویلی بیگم اور دوسرے غیور احمد کی بیگم یعنی ثمینہ بیگم، جو حمیرا کی لن ترانیاں سن کر دل ہی دل میں کلس رہی تھیں مگر بظاہر مسکرا مسکرا کر ماشاءاللہ ماشاءاللہ کہہ رہی تھیں۔

ادھر غیور احمد سچ مچ اپنے دل کی خوشی اور سچائی کے ساتھ بہن سے مخاطب تھے۔

''جیسی عظمٰی ہے میرے لیے ویسے ہی مہربانو، میری بیٹی کا اتنا اچھا نصیب ہو، مجھ سے بڑھ کر کسے خوشی ہو گی، اللہ اسے بھی یہ خوشیاں مبارک کرے اور تمہیں بھی۔''

''آمین ...... ثم آمین۔'' حمیرا نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ کہا تھا۔

عفت نے مہربانو کے رشتے کا سن کر سکون اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی تھی۔ مہربانو کے بارے میں اس نے ثمینہ کی زبان سے ہی ذکر سنا

تھا، جب وہ آئے دن آ کر اپنے بھائی کے سامنے اپنے دکھڑے روتی تھیں۔

"دونوں ماں بیٹی نے میرے سیدھے سادے شہید کو پھنسایا ہوا ہے۔ میں بھی دیکھتی ہوں یہ چھچھوندریاں کیسے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہیں، اپنے بیٹے کے لیے تو میں اسی گھر سے دلہن لے کر جاؤں گی۔"

اور جب عفت اس گھر میں دلہن بن کر آئی تو دل امنگوں، آرزوؤں اور خوابوں سے کم مختلف اوہام وخدشات سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔

شہید احمد کا رویہ عفت کے ساتھ نارمل تھا۔ نہ بہت زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ نہ بالکل ہی روکھا پھیکا رویہ، نہ محبت کا اقرار نہ نفرت اور بے زاری کا اظہار۔ عفت اس رویے پر ذرا بجھ سی گئی تھی۔ جن خدشات کو دل میں لے کر وہ اس گھر میں آئی تھی، وہ سچ ہونے لگے تھے۔ پھر مہربانو کی گھر میں آمد اسے مزید الجھن میں مبتلا کر دیتی۔

مہربانو کی نظریں بڑی ظالم تھیں' سورج مکھی کی طرح شہید احمد کا ہی طواف کرتی رہتیں۔ اس کی زبانی خاموش رہتی تھی مگر آنکھیں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی رہتی تھیں۔ اس کے آتے ہی، عفت جلے پاؤں کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہتی۔

شہید احمد کے دل کا چور عفت کو واضح طور پر اس کے چہرے پہ نظر آتا۔ جسے چھپانے کے وہ جتن کرتا رہتا اور ثمینہ بیگم مہربانو کو کچھ اس طرح گھورتی رہتیں جیسے آنکھوں آنکھوں میں اسے کچا کھا جائیں گی۔

اب مہربانو کے بارے میں یہ خوش خبری سن کر اس کے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی تھی۔ "خس کم جہاں پاک" اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر اپنی ساس کی طرح مسکراتے ہوئے حمیرا پھپھو کو گرم جوشی کے ساتھ مبارک باد دی۔ اب اسے امکان ہو چلا تھا کہ شہید احمد بلاشرکت غیرے صرف اور صرف اس کا ہوگا۔

مہربانو کا رشتہ طے کرنے میں حمیرا پھپھو نے بڑی عجلت دکھائی۔ اگلے ہفتے ہی مٹھائی کا ڈبا لیے حاضر ہو گئیں۔ سب کو اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلائی' ساتھ ساتھ مہربانو کی سسرال کی امارت اور فیاضی کے قصے بھی سناتی رہیں۔ اب چار ماہ۔ عظمیٰ اور ارسلان کے ولیمے میں ماہ نور کی رخصتی تھی۔

عفت اس رشتے سے خوش تھی' بہت خوش مگر وہ ابھی اس خوشی سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہو سکی تھی کہ ایک جانکاہ صدمے نے اسے آلیا۔ اس کے عزیز از جان ابو اپنی بیماری سے جنگ میں ہار گئے تھے۔ ثمینہ بیگم بھائی کے سوگ سے باہر آئیں تو بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں کہ دنیا کا دستور یہی ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن، تیسرے دن لوگ سب کچھ فراموش کر کے زندگی میں مگن ہو جاتے ہیں۔ اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

دنیا کا دستور یہی ہے سو ثمینہ بیگم اسی دستور پہ عمل کر رہی تھیں مگر عفت کا دل ابھی غم زدہ تھا۔ اس غم کو یکسر فراموش کر کے' نظر انداز کر کے کسی کی بھی خوشیوں میں شریک ہونا اس کے لیے بہت مشکل تھا پھر اس کی طبیعت کی خرابی' عجیب سی طبیعت ہو گئی تھی۔ سست اور بے زار سی، وہ زیادہ تر منہ لپیٹے اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

عظمیٰ کو بھاوج کی یہ سستی اور بے زاری اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اپنی خوشیوں میں مست تھی۔ مگر ثمینہ بیگم معاملہ سمجھ چکی تھیں بلکہ ڈاکٹر سے تصدیق بھی کرا لائی تھیں۔ اپنے اصل کے سود کا انتظار وہ ابھی سے بڑی بے چینی کے ساتھ کر رہی تھیں۔

☆☆☆

"مسز شہاب صدیقی نے اسے اپنے آفس میں کام سے بلایا تھا۔ وہ جیسے ہی جا کر بیٹھا' ان کا موبائل بجنے لگا۔

"ایک منٹ عاطف۔" انہوں نے معذرت خواہانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"ڈونٹ میٹر۔" عاطف نے بھی خوش اخلاقی دکھائی۔

وہ عاطف سے عمر اور عہدے دونوں میں بڑی
تھیں مگر بے حد خوش اخلاق اور تعاون اور خیال کرنے
والی، وہ موبائل کان سے لگائے بات کر رہی تھیں۔

''آئم سوری یار! ابھی تک کوئی خاص
اچیومنٹ نہیں ہوئی۔ میں نے جس خاتون کے
بارے میں آپ کو بتایا تھا وہ ٹوئنٹی فور آورز کے لیے
راضی نہیں ہے۔ حالانکہ میں نے بتایا تھا کہ رہائش
کے لیے سرونٹ کوارٹر ہے، کھانا پینا فری ہے، سیلری
پیکیج اچھا ہے۔ پھر کام بھی کوئی اتنا زیادہ نہیں' ایک
بوڑھی خاتون کی دیکھ بھال کرنی ہے، ان کے ساتھ
ساتھ رہنا ہے، مگر وہ عورت صبح سے شام تک کے
لیے اصرار کر رہی ہے، رہنا اس کے لیے ممکن نہیں'
دراصل دیکھا جائے تو اس کا کہنا بھی ٹھیک ہی ہے،
اس کے تین بچے ہیں تینوں اسکول جاتے ہیں۔
آپ کے ہاں رہنے سے بچوں کے اسکول کا مسئلہ
شوہر کی بھی کام کی جگہ بہت دور پڑے گی اور سب
سے بڑی بات کہ اس کے شوہر نے اجازت دی ہے
صرف صبح سے شام تک کی جاب کی۔''

اپنی طویل بات مکمل کر کے وہ دوسری طرف کی
بات سننے لگیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولیں۔

''ہاں یہ بہتر ہے۔ آپ اخبار میں ایڈ دے
دیں۔ ہو سکتا ہے آپ کا کام ہو جائے......جی......اوکے
خداحافظ۔''

موبائل آف کر کے وہ عاطف کی طرف متوجہ
ہو گئیں۔ جس کام کے متعلق بلایا تھا وہ ڈسکس کرنے
لگیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد جب یہ بات چیت ختم
ہوئی۔ تو انہوں نے اپنی مخصوص خوش اخلاقی سے
''تھینک یو عاطف'' کہا اور اپنی دراز کھولنے لگیں
اصولاً اس کے بعد عاطف کو اٹھ کھڑا ہو جانا چاہیے تھا
مگر وہ بیٹھا رہا اور ذرا جھجک کر اس نے مسز شہاب
صدیقی کو مخاطب کیا۔

''ایک بات پوچھوں میم! اف یو ڈونٹ
مائنڈ۔''

''شیور!'' وہ عاطف کی طرف دوبارہ متوجہ ہو
گئیں۔

''آپ فون پر بات کر رہی تھیں۔ ایمپلائی کی
ضرورت ہے کسی کو؟''

''ہاں، میری بڑی بہن ہیں۔ انہیں اپنی مدر
ان لا کے لیے ایک کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔ دراصل
ہماری آپا خود بھی جاب کرتی ہیں۔ بچے اور ہزبینڈ
باہر ہیں۔ ساس اتنی کوئی بیمار تو نہیں مگر بوڑھی ہیں،
اکیلی ہیں تو کوئی ایسی کیئر ٹیکر چاہیے جو چوبیس گھنٹے
ان کے ساتھ رہ سکے۔ ان کا خیال رکھے' انہیں کمپنی
دے۔ رہائش اور کھانا پینا فری ہے، اس کے علاوہ
سیلری ہے، سیکورٹی کی گارنٹی بھی ہے۔'' وہ ایک لمبے
سانس لینے کو رکیں، پھر دوبارہ گویا ہوئیں۔

''کیا تم ارینج کر سکتے ہو کسی کو؟''

''جی، میں یہی کہنا چاہ رہا تھا آپ سے' ایک
فیملی ہے میری نظر میں، تین افراد ہیں۔ ایک لڑکی
ہے اس کی والدہ اور ماموں' وہ لڑکی یہ کام کر لے گی
جو آپ بتا رہی ہیں۔ رہائش تینوں کو چاہیے ہو گی۔''

''اچھا......!'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے
عاطف کو دیکھا۔

''تمہارے جاننے والے لوگ ہیں؟ آئی مین
تم گارنٹی لے سکتے ہو؟''

''جی بالکل۔''

''اوکے، میں ابھی تمہیں اپنی آپا کا نمبر سینڈ
کرتی ہوں، تم کسی وقت بات کر کے ان سے ٹائم
لے لینا اور اس فیملی کو ملوا دینا ان سے اور میں بھی
انہیں فون کر کے تمہارے بارے میں بتا دوں گی
ابھی ٹھیک ہے؟''

''تھینک یو، تھینک یو میم!'' عاطف کھڑا ہو گیا۔
مسز شہاب صدیقی سر خم کر کے مسکرا دیں۔

عاطف باہر نکل آیا۔ وہ جس فکر اور پریشانی میں مبتلا
تھا۔ اللہ نے اس کی مدد کا سامان کر دیا تھا۔ اب خدا
کرے کہ گو گو مان جائے، اپنی ناک نہ لائے، بیچ
میں، اپنی سیٹ پہ واپس بیٹھتے ہوئے وہ ان ہی تینوں
کے متعلق سوچ رہا تھا۔ عاطف جتنی دیر اس گھر میں

ان تینوں کے ساتھ رہتا تھا' مستقل احساس شرمندگی کا شکار رہتا تھا، نہ جانے کیوں؟ حالانکہ وہ لوگ جس حال میں تھے، اس میں عاطف کا تو کوئی قصور نہیں تھا مگر اس کی حساس طبیعت بہت کڑھتی تھی۔

ایک گھنٹہ بھی لوڈشیڈنگ میں وہاں گزارنا ایک اذیت ناک مرحلہ ہوتا تھا اس کے لیے، وہ پسینے میں شرابور گرمی سے بے حال یہی سوچتا رہتا کہ مجھ سے ایک گھنٹہ برداشت نہیں ہو رہا، یہ لوگ کئی کئی گھنٹے کبھی اعلانیہ کبھی غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ میں کیسے گزارا کرتے ہیں؟ کیسے رہتے ہیں اتنی گرمی، حبس اور گھٹن میں۔ یہی سوال اس نے عظمیٰ پھپھو سے کر ڈالا، سن کر وہ بے بسی سے مسکرادیں پھر کہنے لگیں۔

"کچھ عادت پڑ گئی ہے کچھ پڑ جائے گی۔"

"گوگو نے کہاں تک پڑھا ہے؟" عاطف ذہن میں اٹھنے والا ہر سوال عظمیٰ پھپھو سے ہی کرتا تھا۔

"بی ایس سی فائنل ایئر میں تھی، جب ہم اپنے گھر سے نکلے تھے، سارے کاغذ وغیرہ وہیں رہ گئے، شناختی کارڈ بھی نہیں ہے ہمارے پاس۔" عظمیٰ پھپھو نے ایک سرد آہ بھری۔

"یہاں کیسے آئیں؟"

"یہاں ...... ان کے چہرے پہ ایک تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ میری ملازمہ تھی' وہ ہمیں اپنے ساتھ لے آئی۔ بھائی صاحب کی صحت اس وقت کچھ بہتر تھی۔ بس اتنی کہ چل پھر لیتے تھے۔ آرام آرام سے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھا لیتے تھے، تو صغریٰ یہاں اپنی ماں کے گھر لے آئی تھی۔ کچھ دن ان کے ساتھ رہے پھر اس نے قریبی فیکٹری میں آرزو کو رکھوا دیا۔ اس سے پہلے بہت جگہ اپلائی کیا اس نے' کئی جگہ گئی نوکری کے لیے مگر نہ شناختی کارڈ' نہ کوئی اور کاغذ نہ تعلیمی سرٹیفکیٹ نوکری کہاں ملتی بھلا پھر اسی فیکٹری کو غنیمت جان کر یہیں کام شروع کر دیا، میں نے کہا بھی کہ تم گھر سنبھالو میں نوکری کر لیتی ہوں یہاں، مگر مانی نہیں' کہنے لگی، کام سخت ہے، محنت بہت ہے، آپ سے نہیں ہوگا، خود جانے لگی۔" بولتے بولتے ان کی آواز بھرا گئی۔ چہرہ نیچے کر کے انہوں نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کیں۔

"کہتے ہیں کہ راجا کی بیٹی، تقدیر کی ہیٹی، میں نے بڑے نازوں سے پالا تھا اسے، ایک کپ چائے بنانی پڑ جاتی تھی تو سو نخروں سے بناتی تھی، یہاں شروع شروع میں جب فیکٹری سے واپس آتی تو روزانہ ہی پاؤں سوج جاتے تھے، بارہ گھنٹے مستقل کھڑے ہو کر کام کرنا آسان نہیں ہوتا۔" ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔

"کبھی میں سوچتی ہوں، میں تو چلو اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہوں' میری بیٹی نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا' کسی کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے؟"

وہ اب عاطف سے اپنے تھوڑے بہت دکھ سکھ کہہ لیتی تھیں مگر فقط اس وقت جب آرزو نہیں ہوتی تھی۔ اس کی موجودگی میں وہ اس طرح کی باتیں نہیں کرتی تھیں۔ بیٹی سے نہیں ڈرتی تھیں' اس کی دل شکنی کے خیال سے ڈرتی تھیں۔

☆☆☆

مسز شہاب صدیقی نے اپنی آپا کا نمبر سینڈ کر دیا تھا ساتھ پیغام بھی۔ "میں نے ان سے بات کر لی ہے تم کال کر لینا ابھی۔"

عاطف نے ان کی ہدایت کے مطابق آپا جان کو کال کر کے بات کر لی تھی۔ ان کا نام ثاقبہ خان زادہ تھا، انہوں نے اتوار کو شام پانچ بجے بلایا تھا۔ وقت کی پابندی ضروری تھی۔

عاطف آفس سے نکلا' سیدھا اورنگی ٹاؤن پہنچا، عظمیٰ پھپھو کو ساری بات بتائی، شہید احمد کے پاس کچھ دیر بیٹھا، معمول کے مطابق ان کے کام کیے، کمرے سے نکلا تو عظمیٰ پھپھو آرزو کے ساتھ کچھ کھسر پھسر کر رہی تھیں اور وہ تنے ہوئے چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"ہیلو!" وہ مسکرایا۔

"تم سے کس نے کہا کہ تم ہمارے لیے گھر اور

نوکری تلاش کرتے پھرو؟ ہم یہیں ٹھیک ہیں' سمجھے تم۔" عاطف کی مسکراہٹ اور ہیلو نظر انداز کر کے وہ بری طرح اس پہ برس پڑی۔

عاطف بوکھلا گیا۔ اتنا برا غصہ اس نے پہلے کبھی نہیں دکھایا تھا جیسا آج' اس وقت دکھا رہی تھی۔

"رہائش اور نوکری کی ضرورت تم لوگوں کو ہے، ایسے کب تک گزارا کرتی رہو گی، اتنی محنت کرتی رہو گی۔ اگر کم محنت میں کچھ بہتر زندگی مل رہی ہے تو غور کرنے میں کیا حرج ہے۔" عاطف رسان سے کہتا ہوا موڑھے پہ ٹک گیا۔

"تمہیں کیا مطلب، ہماری محنت سے اور زندگی سے، میں تمہیں ماموں کے لیے ڈھونڈ کر لائی تھی، تم ان ہی تک محدود رہو تو اچھا ہے زیادہ آگے نہ بڑھو، اتنی ہمدردی جتانے کی ضرورت نہیں ہے ہم سے، اپنے کام سے کام رکھو تو بہتر ہوگا، میری امی کو اور مجھے تمہاری بھیک کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تمہیں اتنا غصہ کیوں آرہا ہے؟" عاطف واقعی حیران ہو رہا تھا۔

"تمہیں کرنا کیا ہے سجھ کے؟" آرزو نے تلخی سے جواب دیا۔

"تمہارے غصے اور یوں چیخنے چلانے اور باتیں سنانے کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔" عاطف نے اٹھ کر کولر سے گلاس میں پانی بھرا اور اسے دیا۔ "یہ پی لو، تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"جب ایک ایک کر کے سب نے ہمیں چھوڑ دیا تو تم کیوں ہماری بھلائی کے پیچھے لگ گئے۔ آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟" آرزو کی آنکھیں سرخ ہونے لگی تھیں۔

"دیکھو پلیز رونا مت، مجھے کسی روتی ہوئی لڑکی کو چپ کرانا بالکل نہیں آتا۔" عاطف سچ مچ گھبرا گیا۔

"ہونہہ۔" آرزو نے دوپٹے سے منہ رگڑا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "اتنی کمزور نہیں ہوں میں، کہ ہرایرے غیرے نتھو خیرے کے آگے، آنسو بہانے بیٹھ جاؤں۔" اپنی بھڑاس نکال کر وہ

اٹھی اور سیدھی بیٹھک کے اندر چلی گئی۔

"اسے ہوا کیا ہے آج؟" عاطف نے سوالیہ انداز میں عظمیٰ پھپھو سے سوال کیا۔

عاطف کا سوال سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہیں پھر اسے بتانے لگیں۔

"آج کے دن ہم اپنے گھر سے نکلے تھے۔ ایک سال ہو گیا۔" انگوٹھے کے ناخن سے وہ اپنی انگلی کا ناخن کھرچ رہی تھیں۔

"اوہ' تو یہ بات ہے۔" عاطف نے اپنے ہونٹ بھینچے۔

"آج ہی اس کی سالگرہ بھی ہوتی ہے۔" عاطف کی طرف دیکھے بغیر وہ بولیں۔ "پندرہ سال کی عمر تک اس کی ہر سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی، پھر ارسلان سب کچھ بھول گئے، بیٹی کو بھی بیوی کو بھی۔"

عظمیٰ پھپھو آرزو کی طرح بہادر اور مضبوط نہیں تھیں، انہیں اب بھی کبھی اپنا ماضی دہراتے ہوئے عاطف کے سامنے رونا آجاتا تھا اور وہ اپنے آنسو روک نہیں پاتی تھیں۔ عاطف تاسف کے عالم میں بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا پھر وہ اک دم کھڑا ہو گیا۔

"آتا ہوں ابھی۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو عظمیٰ پھپھو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے شہید احمد کے کمرے میں گھس گیا۔ کمرے کے کونے میں رکھی چٹائی پلنگ کے قریب بچھائی اور پھپھو سے ایک ٹرے اور چھری پلیٹ اور چمچے لانے کو کہا اور آرزو کو بلانے کا بھی کہا۔

پھپھو نے پہلے اسے برتن لا کر دیے پھر آرزو کو بلا لائیں۔

"کیا ہے؟" اس نے آتے ہی اکھڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو؟" عاطف نے آئس کریم پہ موم بتی لگاتے ہوئے اسے وش کیا۔ آرزو کا مزاج ہنوز بگڑا ہوا تھا۔ گھورتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"بیکری کا معلوم نہیں یہاں کہاں ہے، اس لیے آئس کریم لے آیا۔ چلو جلدی سے آ کر کاٹو ورنہ پگھل جائے گی۔" عاطف اتنے نارمل انداز میں مخاطب تھا جیسے وہ ہر سال اسی طرح اس کی سالگرہ مناتا ہو۔

"آؤ نا!" عاطف بڑے اہتمام سے چٹائی پر بیٹھا تھا۔

"نہیں۔" وہ ایک جھٹکے سے واپس جانے کے لیے مڑی تب ہی ایک کمزور اور نحیف سی آواز آئی۔

"گوگو......!" آرزو اور عظمیٰ پھپھو سے زیادہ عاطف نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا۔

شہید احمد اب اشارے سے اسے بلا رہے تھے۔

"جی ماموں!" وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی آئی اور چٹائی پہ بیٹھ گئی۔ پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور آئس کریم کاٹی۔ تالیاں عظمیٰ پھپھو اور عاطف دونوں نے بجائیں۔ ہیپی برتھ ڈے کا نغمہ عاطف نے گایا۔

آرزو بے تاثر چہرے کے ساتھ آئس کریم کاٹ کاٹ کر پیالیوں میں ڈال رہی تھی۔ ایک پیالی اس نے اپنی امی کے آگے رکھی عاطف نے ایک پیالی اٹھائی اور پلنگ پر آن بیٹھا' چمچ چمچ شہید احمد کو آئس کریم کھلانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ بولتا بھی جا رہا تھا۔

"ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے، بس آپ نے خود کو چھوڑ دیا ہے، دوسروں کے رحم و کرم پر، اس لیے آپ کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے، اپنے اندر جینے کی امنگ پیدا کریں۔"

شہید احمد پہلے کی طرح بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے سن رہے تھے، اپنی آنکھیں جو عاطف کو دیکھ رہی تھیں، انہوں نے بند کر لیں اور اپنا منہ بھی، عاطف کا آئس کریم کھلاتا ہاتھ تھم گیا اور زبان بھی۔

"تھوڑی سی اور کھالیں۔"

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"گوگو کی سالگرہ کی خوشی میں؟" عاطف جانے کیوں ان سے اصرار کیے جا رہا تھا ان کی بند آنکھیں پھر بھی نہیں کھلیں۔

"خود کو جیتے جی یوں مت ماریں۔ رزق سے منہ نہ موڑا کریں۔ اسے ختم کریں پلیز ابا!" دھیمے سے بولتے بولتے آخر میں عاطف کی آواز کسی سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

شہید احمد آنکھیں کھولے بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹھیک سے نہیں جانتے تھے پھر بھی شاید کچھ کچھ سمجھ گئے تھے' کسی کے نہ بتانے کے باوجود بھی کہ دیہاڑی پہ کام کرنے والے ملازم کے لمس میں ایسی اپنائیت اور محبت نہیں ہوتی، ان کی آنکھوں میں وہ فکر اور توجہ نہیں ہوتی جو اس لڑکے کی آنکھوں میں تھی، اس کے ہاتھوں میں، اس کے انداز میں تھی۔ مگر یوں رشتے سے مخاطب اس نے آج کیا تھا۔ پہلی بار وہ یک ٹک عاطف کو دیکھ رہے تھے۔

عاطف ان کی نظریں پڑھ سکتا تھا۔ اس میں بے یقینی، حیرت اور خوشی تھی۔ ساتھ ہی پشیمانی اور بے بسی بھی، عاطف انہیں بقایا آئس کریم دوبارہ کھلانے لگا تھا۔ وہ چپ چاپ کھا رہے تھے۔

"آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں ابا! ہمیں آپ کی ضرورت ہے، خصوصاً مجھے۔" ان کا منہ گیلے رومال سے صاف کرتے ہوئے اس نے شہید احمد کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکرایا بھی۔ انہوں نے اپنا سر جیسے تھکن کے عالم میں تکیے پر گرایا تھا اور کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہے تھے۔

☆☆☆

عظمیٰ اور ارسلان کے ولیمے میں مہربانو بھی معیز عالم کے سنگ پیا دیس سدھار گئی۔ شادی بڑی دھوم دھام اور چاؤ چونچلوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ حمیرا اور اس کے شوہر نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، بیٹے کی بری شان دار تھی تو بیٹی کا جہیز اس سے بھی شان دار، پہناوئی میں سمدھن کو سونے کا سیٹ دیا اور داماد کو سلامی میں زیرو میٹر نئی نویلی کار کی چابی۔

دھن دولت کی گھر میں کمی نہ تھی۔ شوہر کا الیکٹرونکس کا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ پھر بیٹے کی طرح

بیٹی بھی اکلوتی تھی۔ جو نہ دیتیں کم تھا، سو خوب ہی، دل بھر کے ارمان نکالے پھر ثمینہ بیگم کو جلانے کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھیں۔ ایک ایک شے کی خوب ہی نمائش کی۔ خدا خدا کر کے مہربانو کا ولیمہ بھی ہو گیا۔ ویسی ہی دھوم دھام اور شان و شوکت کے ساتھ جیسے بارات کی دعوت تھی۔ بیٹی کو شاہانہ قیمتی جوڑے اور بیش قیمت زیورات پہنے، شہر کے مہنگے بیوٹی پارلر کے میک اپ میں، شہزادے جیسی آن بان والے معیز عالم کے پہلو میں بیٹھا دیکھ کر حمیرا کے دل سے وہ رنج اور زخم مٹتا گیا جو شہید احمد سے شادی نہ ہونے کی کسک میں لگا تھا۔

"اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے، بھلا ہماری بھاوج یہ سب دے پاتیں میری بیٹی کو جو یہاں مل رہا ہے۔" پہلی بار انہوں نے سوچا۔ "ایسے چونچلے اٹھاتیں؟ جیسے معیز کی ہاں اٹھا رہی ہیں۔"

ان کی نظریں اسٹیج پر تھیں جہاں مہربانو کی ساس اسے سلامی میں ڈائمنڈ لاکٹ دے رہی تھیں اور جو ہوتیں ان کی جگہ ہماری بھاوج بیگم، وہ تو سونے کا چھلہ تک نہ پہناتیں میری بچی کو، اچھا ہی ہوا نا قدروں سے بچ گئی میری بیٹی۔" حمیرا سوچ رہی تھیں اور دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

☆☆☆

ثمینہ بیگم اپنی بہو کے آؤ بھگت اور چونچلوں میں مصروف تھیں۔ آخر کو وہ اس گھر کا وارث پیدا کرنے جا رہی تھی اور وارث پیدا ہونے کی بات ان پر الہام تو نہیں ہوا تھا۔ یہ تو بس دونوں میاں بیوی کی دلی خواہش و تمنا تھی کہ گھر میں پہلی اولاد پوتا ہی آئے، شہید احمد کو مہربانو کی شکوہ کناں نگاہوں سے نجات ملی تو اس کا احساس جرم بھی ختم ہو گیا دل و نگاہ عفت پہ مائل و نثار تھے، وہ ویسے بھی ماں بننے جا رہی تھی۔

اس کے ناز نخرے اٹھانے میں، وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے اب ایک ہی چہرہ، ایک ہی منظر تھا لہٰذا وہی چہرہ نگاہوں کے سامنے رہنے لگا۔ عفت کو خوش ہونا چاہیے تھا۔

ہاں، وہ خوش تھی مگر دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی شہید احمد کے لیے وہ اپنے شوہر کی پہلی چاہت نہیں تھی، دوسری تھی اور محبت کے بارے میں اس کا فلسفہ تھا کہ اصل اور سچی محبت تو وہی ہوتی ہے جو پہلی بار ہوتی ہے، اس کے بعد جو کچھ ہو وہ وقت گزاری ہو سکتی ہے یا مجبوری ہو سکتی ہے، مگر اسے محبت سمجھنا یا محبت کا نام دینا غلط فہمی ہے۔

سوا اپنے اس فلسفے کے تحت وہ شہید احمد کی الفت کو، اس کے لگاؤ کو اور گزرے وقت کی تلافی کی کوشش کو، اس کی مجبوری سمجھنے لگی تھی کہ اس کے سوا اور کیا راستہ ہے شہید احمد کے پاس؟

شادی سے پہلے وہ ثمینہ پھپھو کی مہربانو کے متعلق باتوں کو مبالغہ آرائی سمجھتی تھی مگر شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کی باتیں نری مبالغہ آرائی نہیں تھیں، ان میں کافی کچھ سچائی اور حقیقت تھی۔ مہربانو کی نظریں جس طرح شہید احمد کا طواف کرتی تھیں اور جس طرح وہ مہربانو سے نظریں چراتا تھا، عفت کی نگاہوں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں تھا۔ اپنا جلنا اور کلسنا اس نے فراموش نہیں کیا تھا اور یہی عادت اس میں خراب تھی۔ یہ بری عادت ثمینہ میں بھی تھی بلکہ عفت کی بیشتر اچھی بری عادات اور مزاج ثمینہ کی طرح ہی تھے۔

ماں بیٹی دو ذات، پھوپھی بھتیجی ایک ذات، تو ذات ایک ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں اپنی فطرت اور خصلت میں بھی ایک ہی تھیں۔

کسی کے خلاف دل میں اگر میل آ جائے تو پھر اس کی طرف سے دل صاف نہیں ہوتا تھا، چاہے کچھ بھی ہو کسی بھی انسان میں یہ خصلت رشتوں کے بگاڑ میں اہم کردار ادا کرتی ہے جہاں غلطیوں کو کوتاہیوں کو درگزر کرنے کا، معاف کرنے کا حوصلہ نہ ہو وہاں معاملات کی گاڑی آگے نہیں چلتی، ایک جگہ ہی ٹھہری رہتی ہے اور ایک جگہ ٹھہرے رہنے سے تو صاف شفاف پانی میں بھی کائی لگ جاتی ہے۔

عفت اپنے مزاج اور اس عادت کے سبب،

زندگی میں شہید احمد کے ہمراہ آگے جانے کے بجائے وہیں رکی ہوئی تھی، کبھی کبھی وہ خود سے کوشش کرکے اور شہید احمد کے جتن سے ایک دو قدم آگے بڑھ جاتی تو دونوں کے درمیان معاملات کی گاڑی اسی طرح رک رک کر چل رہی تھی۔ مگر جب چند ماہ بعد وہ ایک گل گوتھنے سے بیٹے کی ماں بن گئی تو ٹھہرے ہوئے پانی کی کائی بہت حد تک چھٹ گئی۔ گھر میں تو جشن کا سماں تھا ہی، عفت کی سرد مہری کی برف بھی اب کچھ پگھلنے لگی تھی۔

ادھر مہربانو اپنا ہنی مون کا دور گزار کر عملی زندگی میں قدم رکھ رہی تھی۔ پری کی کہانی میں جن آگیا تھا اور تتلی کے خوب صورت پر ایک ایک کرکے جھڑ رہے تھے۔ گھر میں اس کی ساس اور شوہر تھے، صفائی ستھرائی اور کچن کے اوپری کاموں کے لیے دو دو ملازمائیں تھیں۔ چوکیدار، ڈرائیور، مالی، گھر کے افراد سے زیادہ گھر میں ملازمین کی فوج تھی، جسے دیکھ کر حمیرا بیگم الجھ گئی تھیں کہ بیٹی شہزادیوں کی طرح راج کرے گی مگر وہ خوابوں کے محل سجاتے ہوئے وہ فراموش کر گئیں کہ شہزادیوں کا راج کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے بڑی محنت ہوتی ہے اور یہی کام مہربانو کے لیے بہت مشکل تھا۔

سسرال کا طریقہ یہ تھا کہ کھانا پکانا خاتون خانہ کریں گی۔ مدد کے لیے ملازمہ موجود ہے مگر یہ ذمہ داری اپنے ہاتھوں سے اپنے شانوں پہ اٹھانا مہربانو کو بڑا گراں گزر رہا تھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ ہر وقت سولہ سنگھار کیے میاں کے ساتھ سیر سپاٹے کرتی رہے گی مگر وہ شروع کے دن تھے' بیت گئے۔ سولہ سنگھار اور سیر سپاٹے پہ کوئی پابندی تو نہیں لگی تھی، تین افراد کا کھانا تیار کرنے کے بعد جہاں دل چاہے جائے، جو دل چاہے کرے، بظاہر سننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی جب شوہر نے بٹھا کر پیار سے یہ بات سمجھائی مگر جب مہربانو اس پر عمل کرنے کھڑی ہوئی تو پتا چلا کہ یہ کام اتنا حلوہ بھی نہیں۔ دونوں وقت تازہ ہنڈیاں پکتی تھیں، ایک گوشت کی، ایک دال یا سبزی تھوڑے چاول اور روٹی' سلاد، رائتہ لازمی اور رات میں میٹھا، کھانا اتنی مقدار میں پکتا تھا کہ اگر دو چار مہمان اچانک آجائیں، جو کہ اکثر آہی جاتے تھے تو کوئی پریشانی نہ ہو۔

مہربانو کو یہ کام بڑا بھاری لگنے لگا تھا پھر شوہر اور ساس جس ذائقے کے عادی تھے، انہیں ہر شے میں وہی ذائقہ چاہیے تھا۔ ساس خود بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں، وہ سر پہ کھڑے ہوکر مشورے دیتی رہتیں۔

مہربانو اس بات سے الجھتی، وہ ان کے جانے کے بعد اپنی من مانی کرتی، اپنی مرضی اور طریقے کے مطابق پکاتی، پھر کھانے کی میز پہ اس کے پکائے کھانوں میں نقص نکالے جاتے، مہربانو کا دل اور کھٹا ہوتا۔ کٹ کھنے مزاج کی تھی، کب تک برداشت کرتی' ایک روز جواب دے بیٹھی...... ساس سے زیادہ شوہر کو برا لگا۔

ماں سے محبت اور احترام کا رشتہ تھا، بیوی کی اتنی دراز زبان جو ماں تک پہنچے، انہیں برداشت نہیں ہوئی۔ متحمل مزاج کے تھے، پہلے پہل پیار محبت سے سمجھانے کی کوشش کی، مگر مہربانو ساس کی بردباری اور شوہر کے تحمل کو ان کی کمزوری سمجھ کر اور شیر ہو رہی تھی ایک بار زبان کی جھجک کھل گئی اور وہ چل پڑی تو پھر چل ہی پڑی۔

آئے دن فضیحتے ہونے لگے۔ ہر دوسرے تیسرے دن لڑائی جھگڑا معمول بن گیا۔ کبھی ساس کے ساتھ الجھ پڑتی' کبھی شوہر کو سنا دیتی' وہ حد سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اس دن بھی وہ کچن میں دو گھنٹے گزار کر اپنے کمرے میں آئی تو شوہر کو ٹھنڈے یخ کمرے میں ریموٹ ہاتھ میں لیے ایل ای ڈی کے آگے براجمان دیکھ کر اس کی تو جان ہی جل گئی۔ پھر جب سے اس نے اپنی زبان قابو سے باہر کی تھی، شوہر کا التفات ذرا کم ہو گیا تھا۔ ان کی خاموش ناراضی ان کے بے نیاز رویے سے ظاہر ہوتی جارہی تھی۔ مہربانو کو شوہر کا یہ انداز بھی بہت کھٹکنے لگا تھا۔ اسے ناز نخرے اٹھوانے کی، دل داری کی عادت تھی،

شوہر کی یہ لاپروائی، بے نیازی اور ناراضی اس سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

"خود تو ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے میں بیٹھے ہیں، بیوی کو لاتے ہی چولہے میں جھونک دیا۔" بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے مہربانو نے فقرہ اچھالا، اس کے طنز پہ شوہر نے بڑے سکون سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تم نے شکر کرنا نہیں سیکھا؟" وہ کمبل میں لپیٹ کر جوتا مارتے تھے۔

"کس بات پہ شکر کروں، سارا سارا دن کچن میں کھڑی رہتی ہوں چولہے کے آگے، کھانا پکانے کے لیے ملازمہ کی ضرورت تھی، وہ رکھنے کے بجائے شادی کر لی بیوی گھر لے آئے۔ ٹو ان ون، بیوی کی بیوی خادمہ کی خادمہ۔" مہربانو کی زبان کے آگے خندق تھی، بولتی تو بولتی ہی چلی جاتی 'چپ ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

"تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟" ٹی وی سے نظریں ہٹا کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "تمہیں اپنا عیش و آرام نظر نہیں آتا؟ خوشحالی اور پیسوں کی فراوانی نظر نہیں آتی؟ پہننے اوڑھنے میں کوئی کمی نہیں، کھانے پینے میں کوئی کمی نہیں، کہیں آنے جانے پہ پابندی نہیں، پھر بھی تمہارا ناشکرا پن ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا، تین افراد کا کھانا پکانا اتنا بھاری پڑتا ہے تم پر کہ دو گھنٹے کچن میں کام کر کے سارا دن بڑبڑاتی رہتی ہو، باتیں سناتی رہتی ہو، لڑتی جھگڑتی رہتی ہو، آخر تم چاہتی کیا ہو؟" معیز عالم کے صبر کا پیمانہ بہت دنوں سے لبریز تھا، آج وہ پھٹ پڑے۔

"سکون چاہتی ہوں اپنی زندگی میں اور بس۔" مہربانو کی زبان پھر قینچی بن گئی۔ "وہ سکون جو اس گھر میں ایک پل کے لیے بھی نہیں 'ہر وقت میرے کام میں کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ حد ہوتی ہے برداشت کی، آخر میں کب تک دو ٹکے کی ملازمہ بنی باتیں سنتی رہوں، انسان ہوں، پتھر نہیں ہوں۔ ہر وقت کی چخ چخ سے تنگ آ گئی ہوں۔"

معیز عالم یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مہربانو اتنی زیادہ بھری بیٹھی ہے، اس کا لہجہ، اس کی باتیں معیز عالم کے لیے تکلیف دہ تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مہربانو اپنے دل میں اتنا بغض بھر کر بیٹھی ہے۔

"ٹھیک ہے 'جہاں تمہیں سکون ملتا ہے 'وہیں رہ لو۔" انہوں نے اپنے اندر کھولتے غصے کے آتش فشاں پر ظاہری اطمینان کا غلاف چڑھا لیا۔

مہربانو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ معیز عالم کی بات پر نہیں بلکہ ان کا سکون و اطمینان دیکھ کر۔

"میں یہاں رہوں یا نہ رہوں۔ اس شخص کو بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔" جلتی بھنتی کلستی ہوئی وہ تنجی سے سوچ رہی تھی اور غصے میں اس نے فیصلہ کر لیا اس غصے میں، جو اس کی زبان کی طرح بے قابو اور تیز تھا۔

☆☆☆

دن تو چھٹی کا تھا مگر وہ معمول کے مطابق جلد بیدار ہو گیا تھا، ناشتے سے فارغ ہوا تو امی دن بھر کے کاموں اور سامان کی فہرست بنائے بیٹھی تھیں۔

"عاطف، مجھے یہ سودا لا دینا۔" انہوں نے فہرست اسے پکڑائی۔

"جی اچھا!" عاطف نے فرماں برداری کے ساتھ فہرست لے کر جیب میں رکھ لی۔ ملازمہ آ گئی تھی، وہ صفائی کر رہی تھی اور امی اس کے سر پر سوار تھیں۔ ڈرائنگ روم کی تفصیلی صفائی کروائی۔ پردے اور کشنز تبدیل کروائے، ٹی وی لاؤنج کو بھی خصوصی توجہ ملی پھر کہیں جا کر کچن کی باری آئی۔ عاطف نے کچھ وقت موبائل کے ساتھ سوشل میڈیا پہ گزارا پھر وہ امی کا منگوایا ہوا مطلوبہ سامان لینے سپر مارکیٹ چلا گیا۔ کچھ شاپنگ اپنی بھی کی، کافی وقت لگ گیا، واپس آیا تو امی کچن میں تھیں۔

"کھانا تیار ہے 'امی؟ بھوک لگ رہی ہے۔" عاطف نے صبح کا ناشتہ کیا ہوا تھا، اب بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

"تیار ہے 'لے جاؤ۔" امی نے ثابت مسور کی دال، چاول بنائے تھے ساتھ میں لہسن مرچ کی چٹنی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اور اچار کھاتے کھاتے عاطف کو کچھ خیال آیا۔
''تھوڑا سا کھانا پیک کر دیں گی امی؟''
''کس کے لیے؟'' وہ چونک پڑیں۔
''اپنے دوست کو کھلاؤں گا۔''
''تو یہیں بلا لیتے۔''
''ابھی جاؤں گا نا اس کے پاس تو لیتا جاؤں گا۔'' عاطف نے چاولوں پہ دال اور چٹنی ڈالی۔
''اب کہاں جانا ہے تمہیں؟ شام میں مہمان آئیں گے تم سے ملنے۔'' امی نے خفگی سے اسے مخاطب کیا۔
''ضروری کام ہے امی! ایک دوست کو جاب کی ضرورت ہے، اسی سلسلے میں کسی سے ملوانا ہے اسے، جب تک مہمان آئیں گے تب تک آ جاؤں گا۔'' عاطف نے کھانا کھاتے ہوئے ماں کو تسلی دی، مگر وہ اتنی آسانی اور آرام سے بہلنے والی نہیں تھیں۔
''آج ہی جانا ضروری ہے تمہارا؟ کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی، سارے جہاں کا درد تمہارے ہی جگر میں ہے۔ اپنے کام چھوڑ چھاڑ کر دوسروں کے کاموں کے لیے مارے مارے پھرتے ہو۔'' امی نے اس کی اچھی خاصی کلاس لے لی۔
''امی پلیز، بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ایک افسر سے ٹائم لیا ہوا ہے۔ اگر وقت پر دوست کو لے کر نہیں پہنچا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔''
''اور اگر وقت پر گھر واپس نہیں آئے تو؟''
''آ جاؤں گا، آپ بے فکر ہو جائیں۔'' عاطف نے جلدی سے کہا۔
''وہی کرو گے جو دل میں ٹھان لی۔'' امی نیم رضامند تھیں مگر لہجہ خفا خفا تھا۔
کھانا کھا کر اس نے میز صاف کرنے میں امی کی مدد کی پھر جانے کے لیے نکلنے لگا۔
''اچھا امی! میں جا رہا ہوں۔''
''پانچ بجے تک آ جانا۔''
''چھ بج جائیں گے، پانچ بجے تو ملاقات کا ٹائم ہے۔'' عاطف ٹھہر گیا۔

''اچھا۔'' امی نے ایک گہری سانس لی۔
''چھ بجے تک لازمی آ جانا، چھ کے سات نہ کر دینا۔'' انہوں نے تاکید کی۔
''جی ٹھیک ہے۔'' عاطف نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔
''رکو تو!''
''جی!'' وہ رک گیا۔
''یہ کھانا تو لے جاؤ دوست کے لیے۔'' امی نے کھانا پیک کر کے میز پہ رکھا ہوا تھا۔
''اوہ یہ تو میں بھول ہی گیا۔'' عاطف کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اس نے جلدی سے اسے اٹھایا۔
''تھینک یو امی جان!'' وہ کچھ نہ بولیں، بس مسکرا دیں۔
عاطف سلام کر کے باہر نکل آیا۔
''اب وہاں جا کر محترمہ سے مغز ماری کرنی ہے۔'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ عظمیٰ پھپھو کو اس مشن پر لگا آیا تھا کہ وہ آرزو سے بات کر کے اسے راضی کرنے کی کوشش کریں۔ اب خدا جانے یہ ''مشن پاسیبل'' ہو گیا یا ''مشن امپاسیبل'' ہی رہا۔ محترمہ کا دماغ بھی تو ہر وقت آسمان پہ ہی رہتا ہے۔ غصے کے آسمان پر، عاطف کو پچھلے ہفتے کا واقعہ یاد آ رہا تھا۔ اسے اچانک ہی کچھ یاد آیا اور شامت اعمال وہ آرزو سے کہہ بیٹھا۔
''تمہارا ایک بھائی بھی تو ہے نہ، وہ کہاں ہے؟''
''بھائی؟'' آرزو نے پہلے عاطف کو گھورا پھر تنفر سے جواب دیا۔ ''اب نہیں ہے۔''
''اوہ، آئی ایم سوری، کیسے ہو گیا یہ سب؟''
عاطف کچھ اور ہی سمجھا۔
''افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کو پیارا نہیں ہوا، اپنی بیوی کو ہوا ہے۔ اس کے ساتھ جرمنی میں رہتا ہے۔'' آرزو کا لہجہ معمول سے زیادہ کڑوا تھا۔
''بالکل کوئی رابطہ نہیں ہے اس سے؟'' عاطف

کا پوچھنا غضب ہو گیا۔
"تم کیوں اتنی تفتیش میں لگے رہتے ہو؟ تمہیں کیا مطلب اس سے، وہ رابطہ رکھے نہ رکھے، ہماری بلا سے بھاڑ میں جائے، تمہیں کیا۔"
وہ عاطف پر ہی برس پڑی، اس کی ساری بد دماغی اور بدمزاجی کو مجبوری سمجھ لیتا تھا، اسی لیے برا ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
خیالوں کے ساتھ ساتھ اس کا سفر تمام ہوا، آج گھر پر آرزو موجود تھی۔ چھٹی کا دن تھا صحن میں نل کے نیچے وہ ہاتھ سے کپڑے دھو رہی تھی۔ گھر میں الیکٹرونک کی کوئی شے نہیں تھی۔ عاطف کو اب کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی تھی' ہاں افسوس ہوتا تھا، جب انہیں وہ سب کام ہاتھ سے کرتا ہوا دیکھتا تھا جو مشینوں سے کرنا معمول بن گئے ہیں۔
عظمٰی پھپھو اور آرزو سے علیک سلیک کر کے وہ شہید احمد کے پاس گیا۔ ان کی حالت اب پہلے سے ذرا بہتر تھی۔ پہلے جس طرح انہوں نے خود کو دوسروں کے رحم و کرم پہ بالکل ہی ڈال رکھا تھا' اس میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ اب وہ خود سے منہ چلا کر کھانا کھالیا کرتے تھے۔ خود اٹھ کر بیٹھنے لگے تھے، کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے جب عاطف کمرے میں گیا، اسے دیکھ کر وہ اک دم گڑبڑا کر لڑکھڑا گئے۔
"ارے......!" عاطف لپک کر ان تک پہنچا۔
وہ پلنگ پہ گر چکے تھے۔ عاطف بے اختیار ان پہ جھکا۔
"چوٹ تو نہیں آئی آپ کو؟" اضطراری کیفیت میں عاطف ان کے دونوں بازو پکڑ کر پوچھ رہا تھا۔
"اونہوں!" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔
"آپ نے کھانا تو نہیں کھایا نا، میں ایک چیز لایا ہوں آپ کے لیے، ابھی لے کر آتا ہوں۔" عاطف، واپس عظمٰی پھپھو کے پاس گیا۔ انہیں دال چاول دے کر آیا تھا ایک پلیٹ میں نکلوا کر شہید احمد کے پاس لے آیا۔
"آج آپ خود اٹھ کر بیٹھیں گے اور یہ کھائیں گے۔"
شہید احمد نے ایک نظر پلیٹ کو دیکھا پھر اس کے چہرے کو اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔
عاطف ان کی مدد کرنے کے بجائے خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ شہید احمد خود سے کوشش کریں۔ اس کوشش میں بھلے ہی وہ ناکام ہو جائیں لیکن اصل چیز وہ جذبہ ہے جسے کوشش کہتے ہیں، امنگ کہتے ہیں، جو ان کے اندر ختم ہو چکی تھی، مر چکی تھی مگر اب دھیرے دھیرے اس مردہ جذبے میں زندگی کے آثار نمو پا رہے تھے، اب وہ خود سے کوشش کرنے لگے تھے۔
عاطف انہیں چمچے سے دال چاول کھلا رہا تھا۔ عظمٰی پھپھو بھی وہیں آ کر موڑھے پہ بیٹھ گئیں۔
"کیا پروگرام ہے آج کا؟" عاطف نے انہیں دیکھے بنا سوال کیا۔
"میں تو تیار ہوں چلنے کے لیے، مگر آرزو......"
"آپ تیار ہیں نا، بس کافی ہے، ان محترمہ کو بھی دیکھ لیں گے۔" عاطف نے لاپروائی سے کہا۔
"بہت ضدی ہو گئی ہے' پہلے تو ایسی نہیں تھی۔" انہوں نے خود کلامی کی تھی۔
"یہ ضد نہیں ہے اس کی، احتجاج ہے، گو کو نے اب تک اپنے ساتھ ہونے والے سانحے اور غیر متوقع حالات کو قبول نہیں کیا ہے۔ اس کی ضد' اس کا غصہ' اصل میں احتجاج ہے، ایک کمزور اور بے بس انسان اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے؟" عاطف دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔
شہید احمد نے کھانا کھالیا تھا۔ عاطف نے پانی کا گلاس ان کے منہ سے لگایا۔ انہوں نے پہلی بار اپنا ہاتھ بڑھا کر گلاس تھام لیا، ان کے ہاتھ آدھے گلاس پر تھے اور آدھے عاطف کے ہاتھ پر، وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی رہے تھے۔
"کتنا اچھا ہوتا اگر ہم ساتھ ہوتے اور وہ سب

نہ ہوا ہوتا جو ہوا ہے۔"

ان کا لمس محسوس کرتے ہوئے عاطف کے دل میں ایک کسک سی اٹھی تھی۔ ماں نے اس کے بچپن سے لے کر اب تک بارہا اس کہانی کو عاطف کے سامنے بیان کیا تھا جس میں وہ ایک مظلوم عورت ایک بے بس بیوی اور ایک مجبور ماں تھیں اور اس کہانی میں ان کا شوہر اور اس کی بہن ظالم' غاصب اور خود غرض تھے۔

عاطف کو اس کہانی کی سچائی پہ شک نہیں تھا۔ اسے اپنی ماں پہ بھروسا تھا کہ انہوں نے بیٹے سے غلط بیانی نہیں کی۔ ساری حقیقت معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو اس نفرت پر آمادہ نہیں کر پایا جو ماں، ان لوگوں سے کرتی تھی۔ شاید اس کا دل سخت نہیں تھا۔ وہ نرم، حساس دل کا مالک تھا۔ تب ہی تو وہ اپنے باپ سے بیگانگی، سرد مہری اور بے نیازی کا رویہ زیادہ وقت نہیں رکھ پایا۔ اسے عظمیٰ پھپھو سے بھی ہمدردی اور اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔

رگوں میں دوڑتے خون کا بھی اثر تھا اور کچھ اس کی طبیعت اور مزاج کا خاصہ کہ وہ ماضی کو فراموش کر کے حال میں جینے پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے دل میں اگر ان دونوں بہن بھائیوں کے لیے ناپسندیدگی بھی ہوتی تو تو وہ رشتوں کے احترام میں بھی حسن سلوک کرتا' جواب کر رہا تھا۔

شہید احمد نے پانی کا گلاس چھوڑا تو عاطف نے وہ گلاس عظمیٰ پھپھو کے ہاتھ میں دیا اور خود باپ کا منہ صاف کرنے لگا۔

"آپ نے کھائے نہیں دال چاول، آپ کے لیے تو خاص طور پر لایا تھا میں۔" عاطف نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔

"میں نے تو باتوں باتوں میں یونہی کہہ دیا تھا، تمہیں یاد رہی وہ بات؟" عظمیٰ پھپھو متعجب سی تھیں۔

کل ہی باتوں کے دوران ان کے منہ سے نکل گیا کہ کالی دال چاول انہیں بہت پسند ہیں اور شہید احمد کو بھی، مگر آخری بار ایک سال پہلے کھائے تھے

اپنے اس گھر سے نکالے جانے سے قبل اور عاطف آج دال چاول لے کر آ گیا تھا۔

"امی نے آج پکائے تھے، مجھے آپ کی بات یاد آئی تو میں لے آیا۔" عاطف نے سادگی سے بولتے ہوئے کندھے اچکائے۔ پتا نہیں کیوں، شہید احمد کے چہرے پہ کرب کا سایہ سا لہرایا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

عظمیٰ پھپھو بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "میں ذرا برتن رکھ آؤں۔" عاطف سے نظریں چرائے وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ عاطف بھی ان کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

"بس اب چلنے کی تیاری کریں۔" کپڑے پھیلاتی گوگو کو اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔

"تیاری!" عظمیٰ پھپھو کے دل سے ایک ہوک سی نکلی۔

"کبھی کرتی تھیں وہ تیاری، کہیں جانے کے لیے، ان کی نگاہوں میں اپنے وہ قیمتی جوڑے، مہنگی جوتیاں، زیور اور دیگر اسباب زندگی گھوم گئے جو کبھی ان کی زندگی اور معمولات کا حصہ تھے۔

"بس میں تو تیار ہی ہوں۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی اور تن پہ پہنے جوڑے کو دیکھا، سستی سی لان کا یہ جوڑا، آرزو نے ہی اتوار بازار سے لا کر دیا تھا جو کثرت استعمال سے بدرنگ ہو چلا تھا۔

"تم ریڈی ہو؟" عاطف نے روئے سخن کی شمع ، آرزو کی طرف بڑھائی۔

"میں کہیں نہیں جا رہی۔" اسی رکھائی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے' میں پھپھو کو لے جاتا ہوں۔ ویسے بھی جاب تو انہیں ہی کرنی ہے تو ان کا دیکھنا اور ملنا زیادہ ضروری ہے۔" عاطف سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

"یہ کیوں کریں گی جاب ؟ میں مر گئی ہوں کیا؟" آرزو تڑخ کر بولتی ہوئی برآمدے میں آ گئی۔

"آپ دونوں میں سے کسی ایک کو یہ جاب کرنی ہے، آپ نہیں کریں گی تو آپ کی امی کریں

گی۔" عاطف کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ تھا۔

"کوئی زبردستی ہے کیا؟" آرزو نے اس خدائی فوجدار کو گھورا۔

"تم اتنی کم عقلی اور نادانی کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ ایک بوڑھی خاتون کی دیکھ بھال بہرحال اس کڑی محنت اور مشقت سے بہتر ہے جو تم یہاں رہ کر کر رہی ہو پھر تمہیں نہ کرائے کی فکر ہوگی نہ بجلی گیس کے بلوں کی' کچھ آرام اور سہولیات بھی مل جائیں گی، کیا یہ سب برا ہے تمہارے نزدیک؟"

"ہاں، برا ہے۔ بس یا اور کچھ؟" آرزو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"تمہیں اس لیے برا لگ رہا ہے کہ یہ آفر میں لے کر آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنے معاملات میں میری مداخلت بری لگتی ہے، مگر میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، اس کے پیچھے صرف اور صرف میری نیک نیتی اور خلوص ہے، مجھے کوئی انتقام یا بدلہ تو لینا نہیں ہے تم لوگوں سے جس کے لیے میں تمہیں ٹریپ کروں گا۔" عاطف آخری حد تک سنجیدہ تھا۔

آرزو نے اس کی آخری بات پر بے حد چونک کر اسے دیکھا۔ یہ شخص تو دل میں گھس کر دل کا حال جاننے لگا ہے۔ دیکھنے میں بے ضرر سا، اندر سے اتنا خطرناک۔ آرزو خاموش ہو گئی۔ سچ ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو ان سے مخلص ہو سکتا ہے، جہاں سگے رشتے ناقابل اعتبار نکلے، دھوکے باز نکلے، وہاں ایسی ہمدردی اور خلوص، وہ بھی ایسے فرد کی طرف سے جس پہ واجب تو دراصل بدلہ اور انتقام ہے، مگر وہ اس کے برعکس عمل کر رہا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کوئی یہ کیوں کرے گا؟

آرزو سوچتی ـــ اور شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتی۔ عاطف اسے ڈھونگی لگ رہا تھا فراڈ لگ رہا تھا۔ دوغلا لگ رہا تھا۔ وہ اپنی زبان سے تو اظہار نہ کر سکی مگر رویے سے ضرور کر رہی تھی اور عاطف یہ بات سمجھ گیا تھا۔

"کیا یہ میرے لیے شرمندگی کی بات ہے کہ میرا اندازہ اور خیالات غلط نکلے ہیں؟" آرزو بیٹھی سوچ رہی تھی۔

"اگر ہم تھوڑی دیر میں نکل جائیں تو اس وقت پر پہنچ جائیں گے جو انہوں نے ہمیں دیا ہے۔" عاطف نے عظمٰی پھپھو کو مخاطب کیا۔

"ہاں ٹھیک ہے چلو۔" وہ عاطف کا از حد سنجیدہ رویہ دیکھ کر الجھ سی گئی تھیں۔

☆☆☆

انا پہ چوٹ ایسی کاری لگی تھی کہ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے میکے آ گئی تھی۔ ماں کو ساری داستان سنائی تو ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"دیکھنے میں تو دونوں ماں بیٹے سیدھے لگتے تھے۔"

"صرف دیکھنے میں ہیں، ویسے زبان اور گنوں کے پورے ہیں۔" مہربانو کمرے میں بیٹھی چپکے چپکے ماں سے اپنے دکھ سکھ بیان کر رہی تھی۔ سمجھدار مائیں ایسے حالات میں بیٹی کو سمجھاتی ہیں' صبر و تحمل کی، برداشت کی صلاح دیتی ہیں۔ گھر بسانے کی ترغیب دیتی ہیں مگر حمیرا ان سمجھدار ماؤں میں سے نہ تھیں۔

"آرام سے بیٹھو یہاں' بیٹی کی دو روٹیاں ہم پہ بھاری تھوڑی ہیں۔ خود ہی آئیں گے ناک رگڑتے ہوئے۔" حمیرا کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ بیٹی کی بے جا حمایت' کتنی بڑی قیامت ان کے گھر لانے والی ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

امت العزیز شہزاد

بس تو پھر ٹھیک ہے جاوید صاحب!" کڑکڑاتے گہرے سرمئی شلوار قمیص میں ملبوس حبیب اللہ اپنی دونوں اطرف سے اوپر کی جانب اٹھی ہوئی مونچھوں کو عادتاً تاؤ دیتے ہوئے لب کشا ہوئے۔ "یوں کرتے ہیں کہ اس اتوار بجائے بچوں کی منگنی کے ان کا نکاح ہی پڑھوا دیتے ہیں..... اور رخصتی ان کے فائنل ایگزامز کے بعد ہو جائے گی۔"

یہ بٹ خاندان کی نیازی خاندان سے دوسری باضابطہ اور انتہائی اہم ملاقات تھی۔ اب تک دونوں ہی جانب سے کیا جانا والا گرم جوشی کا مظاہرہ اس امر کا غماز تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو سند قبولیت بخش چکے ہیں۔ بس کچھ رسمی تقاضے باقی تھے جو آج پورے ہو جاتے۔ اور اسی لیے ایک پر تکلف اور ذائقے دار عشائیے سے بھرپور انصاف کے بعد وہ سب اس وقت نیازی ہاؤس کے نفاست و خوب صورتی سے آراستہ و پیراستہ ــــ مہمان خانے میں براجمان تھے۔ کشمیری قہوے کا دور چل رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مختلف موضوعات پر ہلکی پھلکی بات چیت بھی جاری تھی تب ہی اچانک حبیب اللہ صاحب اپنے مخصوص انداز سے فیصلہ صادر کرنے والے لہجے میں گویا ہوئے۔

اگرچہ تجویز ان کی معقول تھی مگر......اب بھلا یہ کوئی انداز تھا بیٹی والوں سے بات کرنے کا...... کسی اور کو تو چھوڑیں خود ثناء اللہ جو ایک مہربان چہرے والے شفیق باریش بزرگ تھے نے خاصی ناگواری سی نگاہ اپنے سپوت پر ڈال کر گویا انہیں ان کے لہجے کا احساس دلانے کی سعی لاحاصل کی کہ وہ ان کی جانب متوجہ ہی کب تھے؟

"مگر بٹ صاحب!" جاوید نیازی، ان کا قطعی لہجہ محسوس کرتے ہوئے فکر مندی سے بولے۔ "اتوار آنے میں محض دو ہی دن رہ گئے ہیں......اور صرف دو دن میں اتنی اہم اور وسیع پیمانے پر منعقد کی جانے والی تقریب کا انتظام کیسے ممکن ہے؟"

"اوہو جاوید!" سونیا بیگم یکدم ہی بیچ میں بول اٹھیں، "ایک تو میں آپ کی یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس قدر پریشان ہو جانے والی عادت سے بری طرح عاجز ہوں، ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں بٹ صاحب۔ اچھا ہے نا کہ منگنی کے بجائے ڈائریکٹ نکاح ہی کر دیا جائے تو ذرا بڑا فنکشن ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی میں آپ کو بتا دوں کہ میں ملنے گلنے کی بہت زیادہ

شوقین ہوں۔ مجھے تو بس اللہ موقع دے۔

وہ بولیں...... تو جہاں گلابی کڑھائی والے بڑے سے دوپٹے کی بکل مارے کمزور۔ شخصیت کی حامل حلیمہ خاتون نے بڑی رشک آمیز نگاہوں سے بے ساختہ اپنی متوقع سمدھن کا پراعتماد و بے باک انداز دیکھا تھا وہیں ثناء اللہ صاحب ان کے انداز پر پہلو بدل کر رہ گئے تھے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ انہیں پہلی ہی ملاقات میں یہ فیشن زدہ، اونچے اونچے مردانہ قہقہے لگانے والی خاتون کچھ خاص پسند نہیں آئی تھیں مگر کیا کیا جائے کہ معاملہ اکلوتے لاڈلے پوتے کی محبت کا تھا اور قسمت کی ستم ظریفی (ثناء اللہ کی دانست میں) اس "محبت" نے ان ہی کے بطن سے جنم لیا تھا سو بھلائی خاموش رہنے ہی میں مضمر تھی اور وہ اسی لیے بس چپ چاپ سے بیٹھے محض ایک بے بس تماشائی کا سا کردار نبھا رہے تھے۔

"بس تو پھر، بسم اللہ کرتے ہیں حبیب اللہ، سونیا بیگم کی جانب سے گرین سگنل دیے جانے پر تیزی سے بولے۔" اب دیر کس بات کی۔"

"لیکن ایک مسئلہ ہے نا بٹ صاحب؟" جاوید تو اب لب بستہ تھے۔ سونیا ہی بیچاری سی شکل بنا کر بولی تھیں۔

"اس اتوار تو مجھے بہت ضروری کام ہے۔ ایسا کرتے ہیں بچوں کے نکاح کی تقریب منڈے کو رکھ لیتے ہیں۔ کیوں؟" انہوں نے اتنی بے پروائی اور روانی سے کہا گویا حبیب اللہ صاحب ان ہی کی ماننے کی خاطر تو یہاں جمے بیٹھے ہیں نا......

"ایسا کون سا کام ہے جو آپ کے لیے اکلوتی بیٹی سے زیادہ اہم ہے۔" ثناء اللہ صاحب نہ چاہتے ہوئے بھی خفا سے لہجے میں چوٹ کر گئے۔

"ہوتے ہیں کچھ کام بابا جی، سونیا چڑ کر بولیں۔ "جن کی خاطر اپنی ذات کو پس پشت ڈالنا پڑتا ہے۔"

ان کے جواب پر ثناء اللہ صاحب جز بز ہو گئے البتہ حلیمہ نے خاصی تحیر آمیز سادگی سے بے ساختہ پوچھا۔

"مگر بہن! ایک عورت کے نزدیک اپنی اولاد سے زیادہ اہم اور کیا ہو سکتا ہے؟"

"کیوں؟" وہ استہزائیہ انداز سے انہیں دیکھ کر چیختے ہوئے بولیں۔ "کیا ایک عورت کا سوائے ایک بیوی یا ماں ہونے کے معاشرے میں کوئی تیسرا کردار نہیں ہو سکتا؟"

"نہیں وہ تو میں بس یوں ہی۔" سونیا کے حملہ آور ہونے پر حلیمہ منمناتی ہوئی واپس اپنے خول میں دبک گئیں۔

"اوہو بھئی۔" ماحول پر چھاتے تکدر کو بھانپ کر جاوید صاحب نے یہ تکدر زائل کرنے کی خاطر دانستہ متبسم اور ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"اس موضوع پر تو افعی نتیجہ خیز بحث کی جا سکتی ہے مگر ابھی وہی کام کیوں نہ کرلیں جو کرنے بیٹھے ہیں۔ کیوں حبیب اللہ صاحب؟"

"میں تو کہہ چکا ہوں کہ میری طرف سے یہ اتوار فائنل ہے، مگر آپ کی بیگم ہی راضی نہیں ہو رہی ہیں۔" وہ بھی ناراضی سے بولے۔

"بات رضا مندی کی نہیں" سونیا یکدم ہی خشک لہجے میں بولیں "مصروفیت کی ہے۔"

"اور اس اتوار کے بعد میں مصروف ہو جاؤں گا" اب پتا نہیں حبیب اللہ نے سچ کہا تھا یا سونیا کی جانب سے مسلسل کیے جانے والے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنا بیٹھے تھے۔ خیر جو بھی تھا۔ صورت حال بڑی تیزی سے کشیدگی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ان دونوں کی بحث سے سب ہی پریشانی محسوس کر رہے تھے۔ اسی لیے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد جاوید صاحب جیسے صلح جو اور دھیمے مزاج کے آدمی نے درمیانی راہ نکالنے کی خاطر کہا۔

"اچھا...... ٹھیک ہے حبیب اللہ صاحب، ایسا ہے کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے کل شام تک آپ کو فائنل بتاتے ہیں۔"

"مشورہ کیا کرنا ہے؟" سونیا نے اپنے احمق شوہر کو گھور کر دیکھا۔" جب میں صاف طور پر بتا رہی ہوں کہ اس اتوار یہ تقریب ممکن ہی نہیں۔"

"آخر ایسی کیا مصروفیت ہے۔" حبیب اللہ طنزیہ مسکرائے۔ "ذرا ہمیں بھی تو پتا چلے نا۔"

"دراصل اس اتوار کو میرے محبوب لیڈر کا جلسہ ہے یہاں...... اور جسے میں ہرگز ہرگز بھی مس نہیں کر سکتی۔" سونیا بیگم نے اس مرتبہ انتہائی جذباتیت سے اپنی مصروفیت کی بابت بتاتے ہوئے جملہ حاضرین کو مخمصے میں ڈال دیا...... البتہ جاوید صاحب یہ مخمصہ یا جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں اس لیے نہ گئے کہ واقف حال تھے اسی لیے محض منہ ہی منہ کچھ بدبدا کر خاموش ہو رہے......

"آہم...... آہم" چند ثانیے بعد، حبیب اللہ نے گلا کھنکھارتے ہوئے اپنے لہجے کو دانستہ سرسری بنانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "کس لیڈر کی بات کر رہی ہیں آپ؟"

"اپنے "انقلاب خان" کی...... سونیا تفاخر سے گردن اکڑا کر بولیں۔ "اور کس کی کروں بھلا کیا پیٹ بھر کر "نااہل ظریف کی؟" انہوں نے عجیب انداز سے ٹھٹھا لگایا۔

"کیا کہا؟" اور دیکھنے والوں نے کھلی آنکھوں سے حبیب اللہ جیسے اچھے خاصے سنجیدہ شخصیت کے حامل انسان کو اپنی نشست سے یوں اچھلتے ہوئے دیکھا گویا انہیں بچھو نے ڈنک مار دیا ہو (اور ڈنک مارنے کے بعد اپنا واہیات منہ، مارے شرمندگی سے چھپاتا پھر رہا ہو کہ ارے! یہ تو مجھ سے بھی زیادہ......)

"خبردار...... خبردار!" وہ مارے طیش کے کپکپاتے ہوئے دہاڑے، "جو میرے شریف النفس معصوم، مخلص لیڈر کا نام بگاڑا ہو تو۔"

"ہیں؟" سونیا کا مسکراتا چہرہ یکدم تبدیل ہوا، آپ کا لیڈر...... کون ہے آپ کا لیڈر؟"

"وہی جسے آپ نے ابھی نااہل قرار دیا ہے!"

وہ آگ برساتے لہجے میں دھاڑے......

آن واحد میں مہمان خانے کی فضا "اسمبلیانہ" سی ہو چلی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں دیگر نفوس صورت حال کی سنگینی بھانپ کر ششدر سے بیٹھے رہ گئے۔

"اوہ مائی گاڈ! صدمے سے بولتی ہوئی سونیا یکدم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "یعنی آپ کا تعلق "عین پارٹی" سے ہے؟"

"ہاں......" حبیب اللہ فخریہ سینہ تان کر بولے۔

"آپ یقیناً اس نام نہاد "انقلابی پارٹی" کی حامی ہیں جس کے لیڈر کا انقلاب محض اپنی شادیوں تک محدود ہے۔" وہ حقارت سے کہتے چلے گئے تو سونیا بھپر کر چلائیں۔

"آپ میرے لیڈر کی ذاتیات پر حملہ ہرگز نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟ کیا وہ کوئی مقدس گائے ہے؟ اوہ ہو میں بھی کیا کہہ گیا۔ کہیں کوئی گائے برا مان کر دھرنا دینے ہی نہ بیٹھ جائے" وہ انہیں مزید بھڑکانے کی خاطر اپنی بات پر از خود ٹھٹھا لگا کر بولے۔

"گائے کے برا مان جانے کی بڑی فکر ہو رہی ہے۔" سونیا دانت پیس کر بولیں" اوہ کیوں نہیں ہوگی۔ وہ چونکیں، "گائے کے پجاریوں سے دوستانہ جو گانٹھ رکھا ہے آپ کے نام نہاد اصولی قائد جمہوریت نے۔"

"سونیا پلیز......" صورت حال کی سنگینی کا احساس دلانے کی خاطر جاوید صاحب منمناتی آواز میں بولے۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں، بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔"

"تم چپ رہو......" وہ غرا کر ان کی جانب پلٹیں تو وہ بے بسی کی تصویر دکھائی دینے لگے۔

"ہاں جاوید صاحب!" حبیب اللہ مضحکہ اڑانے والے لہجے میں بولے" آپ چپ رہیں۔ یوں بھی اب بولنے کا کیا فائدہ پہلے ہی لگا میں کس کے رکھنا تھیں نا۔"

''بس بہت ہو گیا۔'' اور اس سے قبل حبیب اللہ کے تازہ ترین حملے کا جواب تلملاتی ہوئی سونیا دیتیں، اتنی دیر سے ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے ثناء اللہ صاحب کی برداشت جواب دے گئی۔

''خدا کا واسطہ ہے۔ خاموش ہو جاؤ تم دونوں وہ اپنے عصا کو تھام کر اٹھنے لگے۔ ''کچھ تو شرم کرو...... کیا کرنے بیٹھے تھے اور اور اب کر کیا رہے ہو۔''

''شرم تو ملک و قوم کا پیسہ لوٹنے والوں کو کرنا چاہیے۔'' یعنی ثناء اللہ صاحب کی سرزنش کا یہ اثر ہوا تھا سونیا بیگم پر۔

''ہم تو انقلابی ہیں۔ ہمیں کس بات کی شرم کرنی ہے بھئی۔''

''بس سن لیا آپ نے ابا جی۔'' حبیب اللہ چبا چبا کر بولے، پھر اب تک صوفے پر گم صم سی بیٹھی اپنی بے چاری سی زوجہ محترمہ کی جانب رخ کر کے چلّانے لگے۔

تم اب تک اس طرح کیوں بیٹھی ہوئی ہو۔ فوراً اٹھو، اب میں ایک منٹ بھی مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔''

''ارے حبیب اللہ صاحب......'' جاوید بے طرح بوکھلاتے ہوئے بولے، ''ایسے کیسے ارے بات تو سنیں۔''

''اب کہنے اور سننے کو کچھ باقی نہیں بچا جاوید صاحب!''

''ارے جانے دیں انہیں جاوید۔'' سونیا ہاتھ ہلا کر بے پروائی سے بولیں، ''ان جیسے لوگوں کو میں اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ نہ دوں...... بیٹی تو بہت دور کی بات ہے۔''

☆☆☆

نازک اندام بڑی بڑی خوابناک آنکھوں والی سرو قد نحل اور خوبرو، خوش لباس کسرتی بدن والا اسد اللہ یونیورسٹی ہی میں ملے تھے۔ ادھر نہ ملے ہوتے تو کہیں اور ٹکرا جاتے کہ قسمت میں ان کی ایک دوسرے کی محبت میں گوڈے گوڈے بلکہ ناک تک غرق ہونا درج تھا...... لہٰذا ہونی ہو کر رہی...... اور اب تک تو راوی چین ہی چین لکھے چلا جا رہا تھا کہ نجانے کہاں سے نحل نیازی کے لیے ایک عدد درجہ معقولیت سے تجاوز کرتا رشتہ ٹپک پڑا۔ اور اس گھمبیر و پریشان کن صورت حال میں ان محبت کے ماروں نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ اپنے لیے اس سے بھی بڑا مسئلہ پیدا کر لیا اپنے اپنے گھر والوں کے سامنے جرم محبت کا اعتراف کر کے۔

پہلے پہل تو گھر والوں کی جانب سے تھوڑی سی روایتی ناراضی تشویش و سوالات کا سامنا رہا تاہم ایک دوسرے کے خاندان کے متعلق تفصیل جاننے کے بعد ،ملاقات کرنے کی ہامی بھر لی گئی۔ یوں دیکھا جائے تو اس رشتے کے ہونے میں ایسی کوئی خاص رکاوٹ درپیش نہیں تھی سوائے اس بات کے کہ ان کی برادری ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات تو نہ تھی۔

سماجی حیثیت دونوں گھرانوں کی ہم پلہ تھی...... شرافت بھی تھی اور خاندانی نجابت بھی! پس اسی لیے معاملات اتنی تیزی اور خوش اسلوبی سے آگے بڑھے کہ خود لیلیٰ مجنوں بھی حیران رہ گئے۔

یعنی کہ کوئی ظالم سماج نہیں...... کوئی ولن نہیں...... ارے کوئی تو ہنگامہ کھڑا ہوتا ارے یہ تو حد ہی ہو گئی۔ ہاؤ بورنگ!

اور اب ان کی ''بوریت'' دور کرنے کا کیسا شاندار انتظام لیلیٰ کی والدہ اور مجنوں کے والد کر بیٹھے تھے کہ آن واحد میں ان کے تمام شکوے دم توڑ گئے۔

''آخر تو نے کیا سوچ کر مجھے اس دھرنا ڈانس پارٹی کی ورکر کے ہاں رشتہ لینے بھیجا، بول بتا...... جواب دے۔''

اور اس وقت جو گھر والوں کے منگنی کی تاریخ لے کر لوٹنے کا خاص بے تابی سے منتظر تھا اور اس عرصے میں فارغ رہ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے خیالوں

ہی خیالوں میں جذباتی رومانوی گیت بھی گا چکا تھا......محبوب کے گھر سے واپسی پر بپھرے ہوتے والد گرامی کے روئے مبارک سے ایک قطعی غیر متوقع سوال سن کر ایک لمحے کے لیے تو سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ پوچھنا کیا چاہ رہے ہیں؟؟

''میں کچھ سمجھ نہیں سکا......'' اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے شعلہ و جوالہ بنے والد محترم کی سمت دیکھ کر'' کہ آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں......آپ لوگ تو نحل کے گھر میری منگنی کی تاریخ لینے گئے تھے نا۔''

''بھاڑ میں گئی تیری منگنی کی تاریخ......'' وہ زور سے چلائے۔''

''اب یہ شادی ہرگز نہیں ہوسکتی......''

''وہاٹ؟'' یہ الفاظ نہیں کروز میزائل تھے جو حبیب اللہ صاحب نے اس پر گرائے تھے۔

''مگر کیوں ڈیڈی جی ...... آخر ایسا کیا ہوگیا وہاں......کوئی مجھے کچھ بتائے گا جی ......'' اس نے صدمے سے فرداً فرداً سب کو دیکھا......

''کیوں کہ نحل کی والدہ کا تعلق ایک ایسی پارٹی سے نکل آیا ہے میرے لخت جگر......جن سے سرتاج کی پارٹی والوں کا اینٹ کتے کا سا بیر ہے......اور تم اس امر سے بخوبی واقف ہو کہ یہ دونوں پارٹیاں ہی بزعم خود اینٹ ہیں اور ان کا مخالف ...... خیر چھوڑو......'' حلیمہ نے اپنی منمناتی آواز میں، اسداللہ کو معاملے سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اور اپنی بات درمیان سے ادھوری چھوڑ کر ایک ڈرامائی سی ٹھنڈی آہ بھر کر اپنا سر دوبارہ جھکا لیا۔

''او نو......'' اسداللہ اپنی والدہ ماجدہ کی ادھوری بات سے مکمل معنی اخذ کرتے ہوئے بے یقینی سے دل تھام کر صوفے پر بیٹھتا چلا گیا۔

''او یس بیٹا جی ......'' حبیب اللہ چبا چبا کر بولے......

''مگر حبیب اللہ ......'' ثناء اللہ صاحب نے جو اسداللہ کو یوں صوفے پر ڈھیر ہوتے دیکھا تو ناچار

بول ہی اٹھے۔ ''اگر اسلامی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس رشتے کو جوڑنے میں ایسی کوئی قباحت بھی نہیں۔''

''مگر اباجی!'' حلیمہ نے اپنا جھکا سر اٹھاتے ہوئے دبی دبی سی آواز میں نکتہ اٹھایا۔ ''سوال یہ ہے کہ یہاں اسلامی نکتہ نظر سے دیکھ ہی کون رہا ہے...... سرتاج تو ہر معاملہ اپنی پارٹی اور اس کے نکتہ نظر بلکہ نکتہ ہاتھ، نکتہ پاؤں کے علاوہ نکتہ دماغ سے دیکھنے کے عادی ہیں...... اور ان کے دماغ نے اگر یہ کہہ ہی دیا ہے کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی تو ہرگز نہیں ہوسکتی...... چاہے انکے اکلوتے عزیز و جان سپوت کا ارمانوں بھرا دل ٹوٹ ہی کیوں نہ جائے۔'' اب وہ اس کے جذبات کا خیال کرنے کے چکر میں اپنی پارٹی سے غداری کے مرتکب تو نہیں ہوسکتے نا...... کیوں سرتاج میں نے درست کہا نا؟'' وہ اپنے چہرے پر دنیا جہان کا بھولپن اکٹھا کرتے ہوئے ازحد سادگی سے حبیب اللہ کے کرخت چہرے کی جانب دیکھ کر بولیں تو حبیب اللہ ان کی بات کی تائید کرنے کے بجائے سوچ میں پڑ گئے۔

''مگر یہ تو سراسر زیادتی ہے حلیمہ بیٹی......'' ثناء اللہ صاحب اپنی ہی دھن میں ان کی بات سن کر پریشانی سے پھر بول اٹھے۔ ''کیا ہمارا دین ہمیں یہی کچھ سکھاتا ہے؟''

''دین جو کچھ سکھاتا ہے اس کو تو رہنے ہی دیں نا......'' وہ کن انکھیوں سے حبیب اللہ کا کشش و پنج میں پڑا چہرہ دیکھ کر بولیں۔ ''کرتے تو ہم سب اپنے دل کی ہی ہیں۔''

''مگر ڈیڈی جی......'' اسد بھی اس دوران صدماتی کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ اسی لیے روہانسے لہجے میں احتجاجاً بولا۔ ''اس تمام قصے میں میرا اور نحل کا کیا قصور ہے؟''

''نہ...... نہ......'' حبیب اللہ طنزیہ بولے۔ ''تیرا نہیں...... سارا قصور میرا ہی تو ہے کہ میں نے تجھ جیسی نالائق اولاد پیدا ہی کیوں کی؟ ارے او بے شرم...... بجائے باپ کی موقف کی حمایت کرنے کے تو میرے مخالف گروپ کی لڑکی کی محبت میں آہیں بھر رہا ہے۔''

وہ خون آشام نگاہوں سے اسے گھورنے لگے تو وہ بچوں کی طرح منہ بسور کر ثناء اللہ کے قریب آبیٹھا اور کہنے لگا۔

''دادا جی...... آپ اپنے بیٹے کو سمجھاتے کیوں نہیں...... انہیں سمجھائیں نا کہ ایسا ظلم نہ کریں......''

''اب بہت دیر ہوچکی ہے میرے بچے......''

حلیمہ دوبارہ نہایت دھیمی آواز میں بول پڑیں۔ ''اب تمہارے والد سمجھنے سمجھانے کی حدود سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔''

''بیٹے کو کیا پٹیاں پڑھا رہی ہو...... ذرا زور سے تو بولو۔'' حبیب اللہ کمرے کے دوسرے کونے سے چیخے۔

حلیمہ نے چونک کر سہمی سہمی نگاہوں سے انہیں دیکھا......

''کک...... کچھ نہیں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے صفائی دینے لگیں۔ ''میں نے کیا پٹی پڑھانی ہے...... آپ جانیں اور آپ کا بیٹا، میں تو چلی باورچی خانے میں۔'' وہ کہہ کر سرعت سے اٹھیں اور جھپاک سے کمرہ عبور کرگئیں۔

''دادا جی......'' اسد نے گم صم بیٹھے ثناء اللہ کا گھٹنا دوبارہ ہلایا۔

''کیا دادا جی...... دادا جی کی رٹ لگا رکھی ہے خوامخواہ۔'' حبیب اللہ بھنا ہی تو گئے اس کی بالک ہٹ دیکھ کر۔ ''میں نے جب کہہ دیا کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی تو بس نہیں ہوسکتی...... کیونکہ ایک بار جو میں کمٹ منٹ کرلوں تو خود کی بھی نہیں سنتا۔'' وہ اپنی مونچھوں کو پرغرور انداز میں تاؤ دے کر بولے۔

''آپ سلمان خان نہیں ہیں ڈیڈی جی......'' اسد نے آس بھرے لہجے میں یاددہانی کروائی کہ شاید وہ اس بات کا ادراک ہونے پر اپنے بے ہودہ کمٹ منٹ (جو نجانے انہوں نے کس ذات شریف سے کر رکھا تھا) کو توڑ ڈالیں مگر نہ جی...... حبیب اللہ اپنے

نام کے ایک تھے، اسی لیے جھٹ بولے۔

"ارے وہ کالے ہرن کا شکاری ہمارے سامنے کیا بیچتا ہے۔ ہم تو شیر کے شکاری ہیں۔ شیر کے۔"

"نہیں ڈیڈی جی! آپ بھول رہے ہیں۔ شیر کا شکاری تو کوئی اور ہے..... آپ تو بذات خود شیر ہیں۔" وہ سادگی جو اسے والدہ محترمہ کی جانب سے ورثے میں بدرجہ اتم ملی تھی، اس کے تحت وہ بول اٹھا۔

"ہاں..... ہاں" حبیب اللہ گڑبڑا سے گئے۔ "ہم شیر ہیں شیر اور اسی لیے کسی گیدڑ کے ہاں رشتہ جوڑنا اپنی توہین سمجھتے ہیں اور اس لیے تیرے لیے بھی یہی بہتر ہوگا کہ کسی شیرنی سے دل لگا لے اور چھوڑ دے اس دھرنا پارٹی والی کی بیٹی کا پیچھا۔"

"ڈیڈی جی..... دل پر تو بڑے بڑے راجوں، مہاراجوں کا زور نہیں چلا۔ میں تو پھر عام انسان ہوں۔"

"ہاں تو حشر بھی تو دیکھ نا پھر ان کا کیا ہوا۔" وہ چمک کر اسے باز رکھنے کی خاطر بولے۔

"یہ تم دونوں کسی لایعنی بحث میں پڑ گئے ہو۔" اس بار ثناء اللہ صاحب نے لب کشائی کی۔ "میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم دونوں کوئی درمیانی راہ نکال لو تو بہتر ہے۔ یوں بھی بچی تو وہ بہت اچھی ہے مگر وہ اپنی ماں تو تبدیل کرنے سے رہی۔"

"اور کیا....." ان کی معقول تجویز پر اسد اللہ نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلو....." حبیب اللہ نے احسان کرنے والے لہجے میں اپنا سر یوں ہلایا گویا بات ان کے بھیجے میں سما گئی ہو۔ "یہاں تک تو آپ کی بات درست مان لیتے ہیں کہ وہ اپنی ماں تبدیل نہیں کر سکتی۔ مگر اس کی ماں اپنی دھرنا پارٹی تو تبدیل کر سکتی ہے نا..... وہ کر لے..... تب مجھے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں..... بس اب اور بحث نہیں..... اگر اس کی ماں اپنی پارٹی چھوڑ دے تب مجھے بتانا..... میں سر کے بل وہاں جا کر اس لڑکی کو بیاہ کر ــــ یہاں لے آؤں گا۔"

☆☆☆

"آخر تمہیں کیا ضرورت تھی اس جلسے کا ذکر ان لوگوں کے سامنے کرنے کی۔"

جانے والے جا چکے تھے مگر جاوید صاحب تاحال بے چارگی، طیش اور ناراضی کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر اپنا سر تھامے بیٹھے تھے۔ سامنے بیٹھی نحل کی الگ رو رو کر ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ مگر سونیا کی صحت پر کوئی اثر پڑنا تو درکنار انہیں تو بگڑ جانے والی صورت حال کی نزاکت اور معاملے کی حساسیت کا جیسے رتی برابر بھی اندازہ ہی نہ تھا۔ اسی لیے بھڑک کر بولیں۔

"کیوں کیا میں کوئی گناہ کر رہی ہوں جو چھپاتی؟"

"بات گناہ و ثواب کی نہیں ہے سونیا۔" وہ زچ ہو کر بولے۔ "وہ تمہاری بیٹی کے ہونے والے سسرالی تھے۔ تمہیں خیال کرنا چاہیے تھا۔"

"خیال کرنے کو کچھ چھوڑا تھا اس بدتمیز آدمی نے۔" وہ میں نہ مانوں والے انداز سے بولیں..... نحل ان کا انداز سمجھ کر اور زور زور سے رونے لگی تو وہ مزید ــــ چڑ کر اس پر چڑھ دوڑیں۔

"اب تم کیوں اس طرح بیٹھی رو رو کر خوامخواہ میرا بی پی ہائی کرنے پر تلی ہوئی ہو..... ارے تمہیں تو شکر گزار ہونا چاہیے میرا کہ میرے انقلابی پارٹی میں ہونے کی بدولت تم اس کرپٹ ترین انسان کی بہو بننے سے بال بال بچ گئیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم کہ انکل کرپٹ ترین ہیں؟" نحل نے رونے کا شغل ایک لمحے کے لیے ترک کر کے از حد حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں تو اس پارٹی کی حمایت سوائے کرپٹ لوگوں کے اور کرتا ہی کون ہے؟" وہ نخوت سے ناک چڑھا کر قطعیت سے بولیں۔

جاوید صاحب نے گہرے تاسف سے انہیں دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا تو کچھ نہیں ہوسکتا سونیا..... مگر مجھے خود پر بہت شرمندگی ہے کہ میں بھی اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔"

"تمہیں نحل کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولیں۔ "میں ہوں نا......" پھر آنسو بہاتی سرخ چہرے والی نحل کی جانب دیکھ کر پچکارتے لہجے میں کہنے لگیں۔ "ارے زندگی کوئی اس لڑکے پر ختم تھوڑا ہی ہوگئی ہے۔ میرے سرکل میں ایک سے ایک ...... بڑھیا سے بڑھیا خاندان کا لڑکا موجود ہے۔ یہ تو تمہاری ضد تھی جو میں نے ان لوگوں کو یہاں لاکر بٹھالیا تھا ورنہ تمہارے لیے تو پہلے بھی لڑکوں کی کمی نہیں تھی اور نہ ہی اب ہے۔ بس اب تم دیکھنا...... میں کیا شاندار لڑکا تلاش کروں گی تمہارے لیے۔" وہ تنجی میں یقیناً کچھ زیادہ ہی بول گئی تھیں۔

"کوئی کیسا بھی ہیرا صفت اور شاندار ہی کیوں نہ ہو ممی...... مگر وہ اسد تو نہیں ہوگا......" وہ لرزتی آواز میں بولی اور ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر بھاگتی چلی گئی۔

اک لمحے کے لیے تو سونیا بھی اس کے ردعمل پر چپ کی چپ رہ گئیں۔

"مل گیا تمہیں جواب......" جاوید صاحب کچھ دیر بعد سنجیدگی سے بولے۔

"آپ تو کچھ نہ ہی بولیں تو بہتر ہے۔" وہ ان کے جتانے پر خوامخواہ کی شرمندگی محسوس کرکے مارے کھسیاہٹ کے ان ہی کو نوچنے لگیں۔ (ظاہر ہے کوئی کھمبا تو نزدیک تھا نہیں) "بجائے اسے عقل کی بات سمجھانے کے، الٹا مسلسل اس کے ساتھ مل کر مجھے ہی برا بھلا کہے چلے جارہے ہیں۔ سچ ہے بھئی، بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں...... خیر...... میں سونے جارہی ہوں۔ صبح پارٹی آفس میں میری میٹنگ ہے...... میں لیٹ ہوکر پارٹی کی نظر میں اپنا امیج برباد نہیں کرنا چاہتی...... ایک دفعہ ایم این اے بن گئی تو دیکھنا...... اس علاقے کی تقدیر بدل کر رکھ دوں گی...... تب تم لوگ میری قدر پہچانو گے۔ ابھی تو مجھ پر بہت تنقید کرتے ہو نا...... تب میرے نام سے ہر جگہ شو مارتے پھرو گے۔" وہ آنے والے (یا شاید "کبھی نہ آنے والے") دونوں کے ہوش ربا تصور میں کھو گئیں۔

"بیگم صاحبہ......" کچھ دیر بعد نوری کی کرخت آواز ان کی سماعت سے متصادم ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر حال میں واپس لوٹیں...... نظر سامنے خالی صوفے پر پڑی یعنی کہ جاوید صاحب کبھی کے وہاں سے جاچکے تھے۔ ان کی اس درجہ جرأت پر جی بھر کر انہیں تاؤ چڑھا اور دل ہی دل میں ان کی جزیے کا معصوم ارادہ بھی باندھ لیا۔

"بیگم صاحبہ......" نوری نے بے زاری سے پھر آواز دی۔ "وہ جی، میں سونے جارہی ہوں...... آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ کچھ چاہیے تو نہیں......"

"جاؤ دفع ہو جاؤ۔" انہوں نے گھرکا۔ "میں کوئی تمہاری محتاج نہیں ہوں...... جو چاہیے ہوگا خود لے لوں گی۔"

(مل کر پانی تو پیا نہیں جاتا...... بڑی آئی خود لے لوں گی)

ان کی گھرکی کا یہ جواب نوری کے دل نے دیا تھا البتہ لبوں نے زبردستی مسکرا کر بڑے ادب سے کہا۔

"اچھا جی۔" اور مڑ کر جانے ہی لگی تھی کہ سونیا جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا رکو...... میں اپنے روم میں جارہی ہوں...... تم یہاں کی لائیٹیں آف کرکے، دروازہ بند کرکے جانا۔"

☆☆☆

نہ تم بے وفا ہو...... نہ ہم بے وفا ہیں
مگر کیا کریں اپنی راہیں جدا ہیں......

یونی کے کیفے ٹیریا میں اس وقت خاصی گہما گہمی تھی...... نسبتاً کونے والی میز پر ماس کام والوں کا ایک گروپ خاصے شوخ چنچل موڈ میں بیٹھا خوب ہلا گلا کررہا تھا...... اور لتاجی کا یہ دردناک گانا ان ہی کے گروپ کا ایک منحنی وجود اور لمبے بالوں والا، اپنی جی بھر کے بے سری آواز میں گا گا کر غالباً بے سروں کا کوئی ایوارڈ اپنے نام کرنا چاہ رہا تھا...... باقی سارے اسے چپ کروانے کی اپنی سی ناکام کوشش کیے چلے

جا رہے تھے۔ الغرض ان لوگوں نے ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ اس وقت یہاں موجود سارے ہی افراد اس صورت حال سے اچھے خاصے لطف اندوز ہو رہے تھے اور اس خوش باش اور بے فکرے ماحول میں اگر کوئی منحوس چہرہ موجود تھا تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے وہ اسد اللہ ہی تھا اور اگر کوئی رونی صورت تھی تو بلاشبہ نحل نیازی ہی تھی۔ وہ دونوں ہی ماحول سے کٹ کر اداس بلبل بنے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"مگر کیا کریں...... ہمارے "پیرنٹس" کی "سیاسی پارٹیاں" جدا ہیں ...... اسے یوں گانا چاہیے۔" وہ مردوں والے لہجے میں بولا۔

"دو دل ٹوٹے...... دو دل ہارے۔" لمبے بال والے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان اٹھائی۔

"دھرنا پارٹی والوں...... صدقے تمہارے" اسد اللہ نے گلوگیر آواز میں اگلا مصرعہ مکمل کیا تو اتنی دیر سے خاموش بجھی بجھی سی بیٹھی نحل نے چونک کر اس کی اتری صورت دیکھی۔

"کیوں نکالا پارٹی والوں...... صدقے تمہارے۔" اس نے سلگتے لہجے میں کہا۔ "تم یہ بھی تو کہہ سکتے ہو نا......"

"میں یہ کیوں کہوں......" وہ ابرو چڑھا کر بولا۔

"شروعات تو تمہاری ممی کی طرف سے ہوئی تھی نا۔"

"جی نہیں!" نحل چڑ کر منہ بناتے ہوئے بولی۔

"وہ تو تمہارے ڈیڈی، ڈکٹیٹرز کی طرح اتوار والے دن کے پیچھے ہی پڑ گئے تو ممی کو مجبوراً بتانا پڑا کہ وہ اس روز جلسے میں جانے والی ہیں۔" اسے جاوید صاحب نے تفصیلاً اس روز ڈرائنگ روم میں گزرنے والے "سانحے" کی بابت بتا رکھا تھا۔

"تم کچھ بھی کہو......" پریشان تو وہ بھی تھا اسی لیے ذرا تیز ہو کر بولا۔ "ہمارے گھرانے میں یہ بات سخت معیوب تصور کی جاتی ہے کہ کوئی عورت سیاسی جماعت سے وابستہ ہو...... اور پھر کوئی ڈی سینٹ سی پارٹی ہو تو الگ بات ہے۔ وہ دھرنا ڈانس پارٹی...... لاحول ولاقوۃ......" اسے خود علم نہیں تھا کہ وہ اس وقت مکمل طور پر اپنے والد بزرگوار جناب حبیب اللہ صاحب ہی کا خالص اوتار لگ رہا تھا۔

"اچھا......!" نحل نے بھنا کر طنزاً "اچھا" کو خوب ہی لمبا کھینچا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے...... تمہاری والدہ بھی تو اس پارٹی کی ورکر رہی ہیں اپنے زمانے میں جنہیں "منزل نہیں رہنما چاہیے" ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ زہرخندی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر بولی۔ اسد اللہ گڑبڑاہٹ کا شکار ہو گیا کہ یہ راز کی بات اس نے خود نحل کو بتا رکھی تھی کہ اس کی والدہ شادی سے قبل جب کراچی کے ایک مقامی کالج میں زیر تعلیم تھیں تو اپنے کالج میں خاصی متحرک سیاسی ورکر کے طور پر اپنی علیحدہ پہچان رکھتی تھیں۔

اب جو بھی تھا...... یہ اہم بات نحل کو خاصے غلط اور خطرناک وقت پر یاد آئی تھی...... اس نے تو سوچا تھا کہ وہ نحل کو اس کی ممی کے متعلق تھوڑا بہت بدظن کر کے اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھ کر اس پر زور ڈالے گا کہ وہ اپنی ممی سے ہر حال، ہر صورت میں وہ پارٹی چھوڑنے کا کہے۔ جو دراصل سارے فساد کی جڑ اور ان کے ملن میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

"مگر جیسا سوچا جائے ویسا ہو بھی جائے...... ایسا عموماً ہوتا ہی تو نہیں...... تو پھر کیسا ہوتا ہے؟" بالکل ایسا ہی جیسا ابھی یہاں ہو رہا تھا۔

"ہاں تو......" وہ خود پر قابو پا کر ڈھٹائی سے بولا۔ "وہ تو پرانی بات تھی مگر اب ان کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ انہیں وہ رہنما اب نہیں چاہیے جو منزل کا نشان نہ دے سکے۔"

"جھوٹ مت بولو خوامخواہ......" نحل اس کی ڈھٹائی پر برہمی سے بولی۔

یہ بات بھی تم ہی نے بتائی تھی کہ وہ اب بھی چھپ چھپ کر یوٹیوب پر اپنے قائد کے بصیرت افروز بیان، نم آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر اپنا سر دھنتی ہیں اور پورے دل سے اس نعرے پر یقین رکھتی ہیں کہ ہم نہ ہوں ہمارے بعد......"

"ہاں ٹھیک ہے......" وہ مشتعل ہو کر تیز تیز اپنا سر اثبات میں ہلانے لگا۔

"وہ کرتی ہیں ایسا......تو پھر؟"

"تو پھر یہ مسٹر اسد اللہ کہ اگر تمہاری امی کا کوئی سیاسی نقطہ نظر ہو سکتا ہے تو میری ممی کا کیوں نہیں...... اس میں تمہارے ڈیڈی جی کو کیا مسئلہ ہے؟ جو وہ اتنی غیر اہم بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر وہاں میرے گھر میں میرے والدین سے خوب بدتمیزی کر کے آئے ہیں۔" نحل کو حقیقتاً حبیب اللہ صاحب کے غیر مہذب رویے نے اچھا خاصا مایوس کیا تھا۔

"اور جو تمہاری ممی نے ہمارے ساتھ کیا...... اسے تمہاری زبان میں کیا کہتے ہیں؟ ہم تو اسے گھر آئے مہمانوں کی توہین سمجھتے ہیں۔" اسد نے بھی ادھار نہ رکھا۔

"بس۔" نحل یکدم ہاتھ اٹھا کر قطعی لہجے میں بولی۔ من چلے گروپ کی شرارتیں تاحال جاری تھیں۔ نحل نے ایک سرسری سی نگاہ ان پر ڈال کر اپنا مکھڑا دوبارہ سامنے غصیلے تاثرات سے اپنا اچھا خاصا خوبرو چہرہ سجائے بیٹھے اسد کی جانب کرتے ہوئے از حد سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"جو ہونا تھا...... وہ ہو چکا۔ اب اس پر بحث کر کر کے ایک دوسرے کے والدین کو قصور وار گردانے کا فائدہ...... اب تم یہ بتاؤ کہ اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"آہم......" دراصل اس نکتے پر تو اتنی دیر سے اسد آنا چاہ رہا تھا۔ اس لیے اپنا گلا کھنکھارتے ہوئے یکدم سیدھا ہو بیٹھا۔ پھر جیسے بہت سوچ سوچ کر الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے بولنا شروع ہوا۔

"دیکھو نحل...... میں تمہیں پہلے بھی بارہا بتا چکا ہوں کہ میرے ڈیڈی جی بہت ضدی آدمی ہیں۔ ہمارے گھر ہی کیا پورے خاندان پہ ان کا رعب ہے یوں کہہ لو کہ سب ڈرتے......" بولتے بولتے اسے نحل کے چہرے پر ابھرتی عجیب سی مسکراہٹ دیکھ کر اپنے الفاظ کے غلط ہونے کا شدید احساس ہوا تو ایک لحظہ توقف کرنے کے بعد یوں بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ سب بہت عزت کرتے ہیں ان کی۔ اور میں تو انہیں دکھ دینے یا ان کی بات رد کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ (ہمت ہی نہیں ہے تجھ میں سالے) دل بڑی زور سے چلایا۔ مگر اس نے اپنے بدتمیز دل کی اس طنزیہ بات پر قطعاً کان نہ دھرے اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک سچ یہ بھی ہے کہ میں تمہیں بھی کھونا نہیں چاہتا۔" اب کی بار اس کی آنکھوں میں ایک نرم سا تاثر ابھرا۔

"تو اب......" نحل اس کی آنکھوں سے مترشح ہوتے جذبات سے مکمل انجان بنتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو تم۔"

"تم اپنی ممی کو سمجھاؤ کہ وہ اپنی پارٹی چھوڑ دیں۔ ڈیڈی جی نے بس یہ ہی شرط رکھی ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں جلدی سے یوں بولا گویا اب نہیں تو کبھی نہیں۔

"اوہ......آئی سی۔" نحل کی سمجھ میں جیسے سارا معاملہ آ گیا......اس نے سر ہلاتے ہوئے بڑی مصنوعی نرمی سے کہا۔ "اگر ہماری ملن کی یہی صورت ہے تب تم یہی بات اپنے ڈیڈی جی کو کیوں نہیں سمجھا دیتے...... پارٹی تو وہ بھی چھوڑ سکتے ہیں نا اپنی۔"

"یار۔" اسد بری طرح چڑ کر بولا۔ "تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ وہ نہیں چھوڑیں گے اپنی پارٹی...... تم نہیں جانتیں...... وہ اپنے لیڈر سے اندھی محبت کرتے ہیں۔" وہ بے چارگی سے بولا۔

"اور ممی نہ صرف اندھی، بلکہ مکمل طور پر اپاہج محبت اپنے لیڈر سے کرتی ہیں۔ تب وہ کیوں ماننے لگیں میری بات۔" وہ جیسے اس بحث سے عاجز آ چکی تھی۔

"تم میری خاطر اتنی سی بات اپنی ممی سے نہیں منوا سکتیں۔" اسد اسے شرمندہ کرنے والے لہجے میں ناراضی سے بولا۔ مگر نحل نے بجائے شرمندہ ہونے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے طنزیہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر اس کی ہی بات اسے واپس دے ماری۔

"منوا تو تم بھی سکتے ہو...... شاباش! تھوڑی سی ہمت کر دیکھو۔"

"مجھے طعنے مارنے کی ضرورت نہیں......" اس نے طیش میں آکر میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ نحل ڈر کر بے ساختہ پیچھے ہوئی۔

"میں اپنی بات منوا سکتا ہوں۔ بالکل منوا سکتا ہوں۔ لیکن میں منوانا ہی نہیں چاہتا۔ اور ویسے بھی میرے ڈیڈی جی مرد ہیں۔ انہیں ایسی ایکٹیویٹیز سوٹ کرتی ہیں۔ خیال تو تمہاری ممی کو ہونا چاہیے اپنی نسوانیت کا۔ ارے ایک بیٹی کی ماں ہیں وہ، کسی اور کا نہیں تو تمہارا ہی خیال کر لیں کہ لوگ کیا سوچیں گے تمہارے بارے میں۔" اسے اس بار واقعی غصہ آ گیا۔ اسی لیے بلا سوچے سمجھے جو الٹا سیدھا منہ میں آیا بکتا چلا گیا۔

"کیا سوچیں گے مسٹر اسد اللہ بٹ......" نحل کے کانوں سے اس کی بکواس سن کر دھواں نکلنے لگا۔ "ذرا میں بھی تو سنوں۔"

"تم اپنی ماں کی طرح ایک بے انتہا ضدی اور زبان دراز عورت ہو......" وہ آپے سے باہر ہو کر بولا۔ "کیا ہوا اگر تم کتر کتر زبان چلانے کے بجائے میری بات مان جاؤ......"

"میری ممی کے بارے میں اب اگر تم نے ایک اور لفظ اپنے گندے اور پنک پینتھر۔ جیسے منہ سے نکالا تو میں ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر یہیں "ابھی" اور اسی وقت تمہارا منہ توڑ ڈالوں گی۔" کہنا تو نحل نے از حد غصے سے چبا چبا کر مدھم آواز ہی میں شروع کیا تھا مگر کیا کیا جائے۔ جوں جوں اس کے اندر بھڑکتے شعلوں کا گراف بلند ہوتا گیا توں توں اس کی آواز بھی اونچی ہوتی گئی۔ اور آخری جملے پر تو اس کی آواز کا لیول اتنی بلندی پر جا پہنچا کہ جملہ حاضرین نے بے حد حیرت اور دلچسپی سے یکدم خاموش ہو کر چونکتے ہوئے ان کی میز کی جانب دیکھا تھا۔

تقریباً سبھی کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر ایک لحظہ اسد کھسیایا سا گیا۔

"بہت افسوس ہے مجھے خود پر۔" دوسرے ہی لمحے وہ اپنی کھسیاہٹ پر قابو پا کر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "کہ میں نے تمہیں اپنی محبت کے قابل سمجھا...... حالانکہ تم تو میری نفرت کے بھی لائق نہیں تھیں......" ظاہری بات ہے نحل کے زیرنہ ہونے والے رویے نے اس کی مردانہ انا کو بڑی کاری ضرب لگائی تھی ایسے میں وہ جتنا بھی تلملاتا کم تھا۔

دوسری طرف نحل کا خیال یہ تھا کہ چونکہ وہ درست موقف پر ہے لہٰذا وہ کیوں خوامخواہ اسد کا بے جا زیادتی کا مطالبہ تسلیم کرتی پھرے۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اب سے کچھ دیر قبل چاہے دباؤ میں آ کر یا غصے میں ہی اس نے جو جملے سونیا بیگم کے لیے کہے تھے وہ قطعی نازیبا اور حقیقتاً قابل گرفت اور اچھے خاصے نرم مزاج انسان کو بھی بھڑکانے کے لیے کافی تھے۔ اب ایسی صورت حال میں یہی کچھ ہو سکتا تھا جو ہو چکا تھا۔

"تمہیں تو خیر کیا افسوس ہوگا خود پر......" نحل کی زبان جو کبھی پھوار بن کر اسد پر برسا کرتی تھی اس وقت شعلے اگل رہی تھی۔

"ہاں شرمندگی تو مجھے خود پر ہو رہی ہے جو اتنے دن تمہارے پیچھے اپنی ممی کا دل دکھاتی رہی۔"

"تو اب کر لینا نا ان کی دل آزاری کا مداوا' ان کے ساتھ ان کی دھرنا ڈانس پارٹی جوائن کر کے۔" وہ بڑی تیزی سے اپنی نشست سے اٹھا اور دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اس کی جانب جھک کر بڑے طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

"مشورہ دے ہی رہے ہو تو ایک میرا بھی سن لو۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول اٹھی۔ "تم بھی فوراً سے پیش تر اپنے ڈیڈی جی کو جوائن کر لینا۔ شاید اسی بہانے تم جیسا پھسڈی ڈرپوک 'شیر بن جائے۔'"

"لگ جا گلے کہ پھر یہ حسین رات......"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

وہ منحنی، لمبے بالوں والا، ان کی لڑائی سے اکتا کر دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔
دیگر نفوس بھی چند ثانیے ان دنوں کی جانب دیکھنے کے بعد اپنی اپنی سرگرمیوں میں دوبارہ مصروف ہو گئے۔ کچھ دبی دبی آواز میں ان کے مابین ہوتے جھگڑے کو ڈسکس کرنے لگے۔ سب ہی واقف تھے کہ وہ "پریمی پنچھی" ہیں۔ ابھی لڑ رہے ہیں تو کیا ہوا۔ بہت جلد صلح بھی کر لیں گے اور شاید اس لیے کسی نے درمیان میں کود کر صلح صفائی کرانے کی کوشش نہیں کی۔
اور اچھا ہی ہوا کہ نہیں کی۔ کیونکہ اس بار ان کے درمیان دوستی نہیں ہر حال میں جنگ ہونا مقدر تھی۔

☆☆☆

"اوہ مائی چائلڈ......" سونیا جو اس وقت لاؤنج کے صوفے پر براجمان کوئی گرما گرم ٹاک شو دیکھنے میں مصروف تھیں' نے اپنے قریب آکر ابھی ابھی بیٹھنے والی نخل کی بات پہلے پہل تو بے توجہی سے سنی مگر پھر مارے جوش کے جیسے اپنی جگہ سے اچھل ہی تو پڑیں۔
"کیا کہا تم نے...... ذرا پھر سے کہنا۔" انہوں نے والیوم بند کرتے ہوئے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھ کر استفسار کیا۔
"وہ ہی جو آپ نے سنا ممی...." ان کے اس درجہ والہانہ ردعمل پر نخل خوامخواہ شرمندگی محسوس کرتی ہوئی بولی۔ "میں واقعی آپ کی پارٹی جوائن کرنا چاہتی ہوں۔"
"واؤ...... زبردست گریٹ!!" وہ بے ساختہ اس کا گال فرط مسرت سے چوم کر بولیں تو وہ جھینپ سی گئی کہ سونیا کی جانب سے بے ساختہ محبت نچھاور کرنے کے یہ مظاہرے اس کے حصے میں شاذ و نادر ہی آتے تھے۔
"بہت اچھا فیصلہ ہے تمہارا...... ارے میں تو بہت عرصے سے یہی چاہ رہی تھی کہ تم بھی اس طرف آکر اپنی صلاحیتیں آزماؤ، مگر چلو، وہ کیا کہتے ہیں دیر آید درست آید میں کل ہی تمہیں اپنے ساتھ پارٹی آفس لے جا کر باقاعدہ رجسٹر کروا دوں گی...... اس کے بعد یہ تم پر منحصر ہے کہ پارٹی میں اپنی جگہ کیسے بناتی ہے۔" انہوں نے تو فٹافٹ لائحہ عمل طے کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔
"ٹھیک ہے ممی۔" اور نخل جو لاشعوری طور پر ان کی جانب سے اپنے اس غیر معمولی اور غیر متوقع فیصلے کے محرکات کی بابت سوال کیے جانے کی منتظر تھی۔ ان کا جوش و خروش دیکھ کر مزید بجھ سی گئی۔
"تو پھر چلتے ہیں کل۔"
"او کے ڈیئر......" انہوں نے کہا اور ریموٹ سے آواز "ان میوٹ" کرتے ہوئے چٹخارہ لے کر اسے بتانے لگیں۔ "ابھی تو تم ذرا یہ دیکھو میرے ساتھ' ہمارا کھلاڑی کیسے اس پٹواری کی طبیعت صاف کر رہا ہے۔ دیکھو...... دیکھو ارے دیکھو نا......"
مگر نخل نے بجائے اس دنگل کو ملاحظہ کرنے کے بے دلی سے سر جھکاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے اپنے فون کی اسکرین دیکھنا شروع کر دی۔
شاید ...... معذرت کا کوئی پیغام، یا ایف بی اسٹیٹس۔
"اوں ہوں" اس نے مایوسی سے فون واپس پٹخ دیا۔ اسے اس لمحے بڑی شدت سے اپنی اس "لیلانہ" (ظاہر ہے مجنویانہ تو ہونے سے رہی) کیفیت اور انتظار پر خود پر بے طرح غصہ آیا۔ اب وہ سینے پر ہاتھ باندھے سامنے اسکرین پر دکھائی دیتی زبانی کلامی "ہاتھا پائی" کی جانب متوجہ ہو کر اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرنے لگی۔
اب یہ علیحدہ بات کہ ذہن و دل جیسے آج صبح ہوئی اس لڑائی ہی میں کہیں اٹکا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"شاواشے میرے شیر جواناں...... کیا ستھرا جواب دیا ہے۔" اور ٹھیک اسی وقت (یعنی آٹھ بجے) جب سونیا بیگم اپنے من بھاتے "لال گلابی" چینل پر کھلاڑیوں کے ہاتھوں پٹواریوں کی تذلیل ہوتے

دیکھ دیکھ بغلیں بجارہی تھیں۔ یہاں اپنے گھر کے ٹی وی لاؤنج میں موجود حبیب اللہ صاحب اپنے پسندیدہ "نیلے پیلے" چینل پر اپنی پارٹی کے متوالوں سے ان دھرنا ڈانس پارٹی والوں کی درگت بنتے دیکھ کر از حد محظوظ ہورہے تھے۔ اب اس سارے قصے میں غلط صحیح' اخلاقی قدروں' متوازن سماجی رویوں، مخالف کی رائے کی اہمیت وغیرہ وغیرہ جیسی قطعی غیر اہم اور خشک قسم کی باتوں میں کون پڑتا ہے۔

اپنی اپنی پارٹی ...... اپنا اپنا نظریہ بس یہ ہی کافی ہے۔

"وہ جی میں کہہ رہی تھی ......" حلیمہ چائے کا کپ ادب سے ان کے آگے رکھتے ہوئے اپنی مخصوص دبی دبائی، منمناتی آواز میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بولیں۔

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے اسد اللہ کے بارے میں۔" وہ سامنے کرسی پر ٹک گئیں اور جواب طلب نگاہوں سے ٹاک شو دیکھ کر شدت جذبات سے حبیب اللہ کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"ہیں ......" حبیب اللہ نے ذرا کی ذرا چونک کر انہیں دیکھا۔" اس کے بارے میں مجھے کیا سوچنا ہے؟" وہ الٹا ان ہی سے پوچھنے لگے۔

"کیسا مرجھا گیا ہے میرا بچہ ......" وہ نجانے کہاں سے یکدم آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اور آواز میں سوز بھر لائیں۔" اس کا چہرہ دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے ......"

"یہ جو کلیجہ تیرے منہ کو آرہا ہے نا۔" حبیب اللہ ان کی تمہید بھانپ کر گرجے۔" وہ تیرے منہ سے نکال کر میں چبا ڈالوں گا۔ سمجھی۔"

"ہاں ...... ہاں جانتی ہوں۔" وہ دل گیر ہو کر بولیں۔" کہ آپ میں ماشاء اللہ سے یہ کوالٹی بھی موجود ہے۔"

"کون سی کوالٹی؟" حبیب اللہ کے پہلے سے کھڑے کان مزید کھڑے ہو گئے۔" ذرا مجھے بھی تو بتانا۔"

"یہی کلیجہ چبانے ...... یعنی ڈائنوں والی۔" وہ از حد معصومیت سے بتاتی گئیں۔

"میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں حلیمہ!" حبیب اللہ ڈائن کا خطاب ملنے پر تلملا کر بولے۔" یہ جو تیری مشہور زمانہ سادگی ہے نا ...... یہ ڈاکٹر شاہد مسعود والی قیامت ہے۔"

"جی کیا مطلب؟" وہ اپنے نادیدہ آنسو خشک کر کے بچوں کی سی معصومیت سے ان کی جانب دیکھ کر آنکھیں جھپکانے لگیں۔

"یعنی نہیں ہے۔" وہ بھڑک اٹھے۔

"آپ جو بھی کہیں ......" وہ قطعی برا منائے بغیر دھیمے سے مسکرا کر بولیں۔" وہ آپ کی مرضی ٹھہری ...... مگر میں تو اس وقت اسد اللہ کے متعلق بات کرنے ......"

"کیا بات ہو رہی ہے میرے متعلق ......" ابھی ان کا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ اسد لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے ان کی بات درمیان سے اچکتا ہوا بولا ...... اور بڑے خوش گوار موڈ کے ساتھ حبیب اللہ کے برابر میں براجمان ہو گیا۔

"اچھا ہوا تم بھی آ گئے۔" حلیمہ کے انداز میں یک گونہ اطمینان سا اتر آیا۔" میں بھی سرتاج سے تمہارے اور نحل کے متعلق ہی بات کرنے لگی تھی۔"

"کون سی بات؟" اس سے قبل کہ حبیب اللہ کوئی سخت بات جواباً کر پاتے، اسد نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے یوں پوچھا گویا بات کی نوعیت سے ناواقف ہو۔

حلیمہ تو حلیمہ، خود حبیب اللہ اس کے غیر معمولی انداز پر بے طرح چونک کر متوجہ ہو گئے ...... پروگرام میں اب وقفہ آ گیا تھا ...... اس لیے اس کی آواز بند کرتے ہوئے وہ پوری طرح اپنا چہرہ موڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

"تمہاری اور نحل بیٹی کی شادی کی بات۔" حلیمہ یوں بولیں گویا اسے یاد دلا نا چاہ رہی ہوں۔

حبیب اللہ نے چڑ کر حلیمہ کو بری طرح گھورنے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پر اکتفا کیا۔

''یہ شادی اب کبھی نہیں ہو گی امی۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کیا۔'' حلیمہ کو اس کے منہ سے یہ سن کر جھٹکا سا لگا۔ ''مگر کیوں؟''

وہ اس کی جانب از حد تحیر سے دیکھ کر بے ساختہ استفسار کر بیٹھیں۔ حبیب اللہ بھی متعجب ہوئے مگر ظاہر نہ کیا۔

''کیوں کہ میں......'' وہ اتنا کہہ کر یوں رکا گویا جو کچھ آگے کہنے کا ارادہ رکھتا ہے اس انہونی پر خود یقین نہ کر پا رہا ہو۔ ''میں ڈیڈی جی کی پارٹی جوائن کر چکا ہوں۔''

''ہیں'' حلیمہ نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''شاواشے بھئی...... جی آیا نوں'' حبیب اللہ کا لہجہ کھل اُٹھا ــــــ وہ اپنی نشست سے اٹھے اور بے ساختہ اسے خود میں بھینچ لیا۔

وہ تذبذب جو اسد کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا اس کی جگہ یکدم ڈھیروں طمانیت نے لے لی۔

''اب دیکھنا نحل بی بی...... کہ میں محض نام ہی کا نہیں...... اصلی والا شیر ہوں۔'' وہ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

''ساڈا لیڈر...... آوے ای آوے۔''

جوں جوں انتخابات نزدیک آ رہے تھے توں توں مختلف سیاسی جماعتوں کی جانب سے عوامی رابطہ مہم شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ آج ایسے ہی کسی سلسلے میں مقامی سیاسی جماعت کے کسی نمائندے نے ان کی یونی کو رونق بخش رکھی تھی...... اپنے متوالوں، جیالوں، پیاروں وغیرہ وغیرہ کا لہو گرماتی، اور مستقبل ''قریب'' کے سہانے سپنے دکھاتی ان کی یہ جوش و جذباتیت پر مشتمل تقریر ــــ پچھلے آدھے گھنٹے سے جاری و ساری تھی۔ وہ دم لینے کو ذرا ٹھہرتے تو اس وقفے میں کوئی متوالا جذبات سے مغلوب آواز میں بھرپور نعرہ مار کر ماحول پر چھائی گرمی کو کم ہونے نہ دیتا...... اور ایسے میں وہی اسد اللہ جسے ان سارے معاملات سے ہمیشہ ہی بے رغبتی رہی تھی، آج خود اسی ماحول کا حصہ بنا کھڑا تھا اور بڑی خاموشی اور زیادہ بے زاری سے بادل نخواستہ انہیں سن رہا تھا۔

''ہم ایک بار اقتدار میں آ گئے تو عوام کو بجلی دیں گے۔''

''تو اب تک دی کیوں نہیں، ابھی بھی تو آپ ہی کی حکومت ہے۔''

کوئی بڑی زور سے چلایا...... سب بری طرح چونک پڑے...... اور آواز کی سمت کا تعین کرنے لگے۔ چونکہ مجمع بہت زیادہ تھا...... اسی لیے سب ہی ناکام رہے۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم اس بار عوام کو پانی پانی کر دیں گے۔'' ایم این اے صاحب سنبھل کر پھر اسی عزم سے بولے۔

''حالانکہ شرم سے پانی پانی تو خود آپ کو ہو جانا چاہیے۔'' نامعلوم سمت سے آواز پھر سنائی دی۔

''اوئے...... یہ کون بیچ بیچ میں بکواس کر رہا ہے۔''

کسی پوپی، گلو یا بلا ٹائپ خدائی فوجدار نے للکارا۔

مجمعے میں بے چینی پھیل گئی۔

''ہم آپ کو سستی روٹی فراہم کریں گے۔'' وہ یک لحظہ ٹھہر کر دوبارہ بولے۔

''اور خود امپورٹڈ برانڈ کے پیزے، برگر اڑائیں گے۔ وہ بھی ہمارے پیسوں سے...... لکھ دی لعنت۔''

''اوئے...... وہ دیکھو، پکڑو اسے۔''

اور اس بار نہ صرف آواز کی سمت بلکہ جس مبارک منہ سے یہ آواز برآمد ہو رہی تھی اس کا بھی بہ آسانی تعین کر لیا گیا۔

یہ مخالفین کا ایک گروپ تھا جو دراصل یہاں کرنے ہی یہ بیٹھا تھا (یعنی بدمزگی پھیلا کر شور مچانے) اور اسد کی آنکھیں یہ دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ محترمہ نحل نیازی بھی اس گروپ میں شامل

تھیں کہ جس کی شامت ان کے گروپ کے ہاتھوں اب آیا ہی چاہتی تھی...... ہر چند کہ ان لوگوں نے پکڑے جانے پر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی مگر بے سود۔

آن واحد میں وہاں غدر سا مچ گیا...... کرسیاں الٹ گئیں...... قالین پلٹ گئے۔ ڈنڈے، لاٹھیاں، مکے، لاتیں، تھپڑ...... ان سب کا آپس میں وہ فراخ دلانہ استعمال کیا گیا کہ بس۔

ایم این اے صاحب تو فوراً سے پیش تر وہاں سے کھسک لیے (عقل مند جو ٹھہرے) حواس باختہ مخمل نے یہاں تک تو کھلی آنکھوں سے دیکھا...... اس کے بعد کیا گزری...... اسے کچھ خبر نہیں...... کیونکہ دھڑا دھڑ چلنے والی لاٹھیوں میں سے ایک اس کے سر پہ برس کر اسے عالم خرد سے بیگانہ کر گئی تھی۔

☆☆☆

''آہ...... میں کہاں ہوں۔'' بڑی دقت سے اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو چند لمحے واقعی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ یعنی جنت میں یا پھر دوزخ میں کیونکہ اپنی دانست میں تو وہ فوت ہو چکی تھی۔

''تم اپنے گھر میں...... اپنے روم میں ہو بیٹا۔'' اسے ہوش میں آتا دیکھ کر جاوید صاحب جو اس تمام عرصے میں بھوک و پیاس سے بے نیاز یہیں اس کے سامنے دھرے صوفے پر بے قراری سے بیٹھے رہے تھے لپک کر اس تک آئے۔

''اچھا...... تو میں زندہ ہوں۔'' وہ بدقت اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے نقاہت زدہ آواز میں بولی۔

''اوہ بیٹا...... اٹھ کیوں رہی ہو لیٹی رہو۔'' وہ اس کے نزدیک براجمان ہوتے ہوئے اس کا پٹی بندھا ماتھا چھو کر بولے۔

''میں تو یونی میں تھی نا...... وہاں ہنگامہ ہو گیا تھا۔'' اسے جیسے سب یاد آنے لگا...... سب کچھ...... دفعتاً اپنے بالکل مقابل آ جانے والا وہ دشمن جاں بھی...... جو اس نازک لمحے میں بھی مکمل اجنبی بنا کھڑا تھا۔

یہ بات یاد آنے پر اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے۔

''کیا بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔'' جاوید صاحب جو اس کا چہرہ بغور دیکھ رہے تھے' نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''جی ڈیڈ......'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''بہت، بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔''

''آخر تمہیں کیا ضرورت تھی اس ہنگامے میں پڑنے کی۔'' اس کی بھیگی پلکیں دیکھ کر جاوید صاحب کو بے بسی سے غصہ آ گیا۔

''تم گئی ہی کیوں تھیں وہاں۔''

''وہ ہماری پارٹی کے لوگوں کا پلان تھا وہاں جا کر ان لوگوں کو ڈسٹرب کرنے کا...... تو وہ مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئے تھے۔'' اس نے سر جھکا کر مجرمانہ لہجے میں بتایا۔

''پارٹی...... پارٹی...... پارٹی۔'' جاوید صاحب سخت برافروختہ ہو کر بولے۔

''میں تنگ آ چکا ہوں اس منحوس لفظ سے...... تمہاری ممی ہی کیا کم تھیں جو تم بھی ان کے نقش قدم پر چل نکلی ہو اور پھر تمہیں ضرورت ہی کیا پڑی تھی آخر ان معاملات میں پڑنے کی' جبکہ تمہارا ایسا کوئی رجحان بھی نہیں۔''

اب ان سوالوں کا جواب تو خود اس کے اپنے پاس بھی نہیں تھا تو انہیں کیا دیتی؟ ہاں...... البتہ وہ ان کے مزید سوالات سے بچنے کے لیے ان کا دھیان ضرور دوسری جانب موڑ سکتی تھی سو اس نے یہی کیا۔

''مجھے گھر کس نے پہنچایا تھا؟'' اس نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا...... دل کو موہوم سی امید تھی کہ اس کی اتنی فکر ماسوائے اسد کے اور ہو کسے ہو سکتی تھی؟ مگر......

''کون لاتا؟'' جاوید صاحب وہ لمحہ یاد کر کے رنجیدگی سے بولے۔ ''جائے وقوعہ سے ریسکیو والوں ہی نے تمہیں اسپتال پہنچایا تھا، وہیں سے تمہارے یونی کے کسی دوست نے یہاں گھر پہ فون کر کے

اطلاع دی تو میں وہاں پہنچا۔"

"اوہ......" وہ اپنے غلط گمان پر گویا خود کو دل ہی دل میں ملامت کرنے لگی۔

"تمہاری ممی کو تو اپنے فضول قسم کے جلسے، جلوسوں سے فرصت نہیں ملتی۔" جاوید صاحب برہمی سے بولے۔ "لیکن آج آنے دو اسے گھر...... اچھی طرح پوچھوں گا اس سے کہ وہ خود تو ان چکروں میں خوار پھرتی ہی تھی...... یہ آخر تمہیں اپنے ساتھ خوامخواہ گھسیٹنے کی اسے کیا سوجھی؟"

"ڈیڈ پلیز......" وہ ان کا غصہ دیکھ کر ملتجی ہوئی۔

"ان کا اس سارے معاملے میں کوئی قصور نہیں...... یہ تو میں خود ہی۔ آپ پلیز انہیں کچھ مت کہیے گا۔"

"اچھا خیر...... جاوید صاحب نے اس کا اترا چہرہ دیکھ کر خود کو سنبھال لیا ورنہ آج تو دل چاہتا تھا کہ اچھی طرح سونیا بیگم کی خبر لی جائے۔

"چلو...... تم فکر مت کرو...... بس آرام کرو۔ میں نوری کے ہاتھ فریش ایپل جوس بھجواتا ہوں۔" وہ شفقت آمیز محبت سے اس کا گال تھپتھپا کر بولے۔ نحل نے پھیکے سے انداز میں مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو اسد اللہ......" جاوید صاحب کے کمرے سے جاتے ہی نحل نے وہ آنسو جوان کا لحاظ کر کے اپنی پلکوں تلے روک رکھے تھے آزاد کر دیے۔ "آج تم نے اپنے اس قدر مخاصمانہ رویے سے اپنا کہا ثابت کر ہی دیا...... اور مجھے دیکھو۔" وہ جیسے خود اذیتی کی انتہا پر پہنچ کر اپنا مضحکہ خود ہی اڑاتے ہوئے بولی۔ "میں آج تک اسی انتظار میں رہی کہ شاید تمہیں تمہارے بدترین رویے کا احساس ہو جائے اور...... اور تم لوٹ آؤ...... مگر چلو اچھا ہی ہوا جو آج یہ لاحاصل انتظار بھی اپنے انجام کو پہنچا۔" اس کی سسکیاں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئیں۔

☆☆☆

"اوئے آج تو نے ناک کٹادی تو اپنے باپ دادا کی یوں تھانے میں بند ہو کر۔" حبیب اللہ گرج کر بولے تو ان کے سامنے مجرمانہ انداز سے سر جھکائے کھڑے اسد کی گردن نے ان کے شرم دلاتے الفاظ کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے کچھ مزید جھک جانا مناسب خیال کیا۔ ثناء اللہ الگ افسردہ، رنجیدہ و سنجیدہ سے بیٹھے ملامت آمیز نگاہوں سے اسے تک رہے تھے...... ایسے میں وقتاً فوقتاً ابھرنے والی حلیمہ کی "سوں، سوں" نے ماحول کو ایک عجب ہی منحوس سا رنگ دے رکھا تھا۔

"مجھے دیکھو......" وہ سینہ پھلا کر ایک وقفے کے بعد دوبارہ اسی آہنگ سے گویا ہوئے۔

"تیس سال سے اس میدان کا کھلاڑی ہوں مگر مجال ہے جو کبھی تھانے کا منہ بھی دیکھنا پڑا ہو۔"

"آپ ٹھہرے تعلقات والے آدمی۔" حلیمہ نے سوں سوں روک کر جتانا شروع کیا۔

"اس میں تعلقات کی بات کہاں سے آ گئی؟" حبیب اللہ نے بھنّا کر اپنی معصومیت سے لبریز زوجہ محترمہ کی جانب دیکھا۔ "اول تو بندے کو ایسی جگہ پر جانا ہی نہیں چاہیے جہاں لڑائی جھگڑے کا اندیشہ ہو...... اور اگر بحالت مجبوری جانا پڑ ہی گیا تھا تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس لڑائی جھگڑے میں پڑا بھی ضرور جائے...... ایسے موقعوں پر عقل مند لوگ وہاں سے فرار ہونے میں منٹ نہیں لگاتے۔"

"آپ جیسا عقل مند نہیں تھا نا میرا لال۔" حلیمہ نے منہ بسورا۔ "بس اسی لیے مفت میں دھر لیا گیا۔"

"اوئے کوئی مفت میں نہیں دھرا گیا۔" حبیب اللہ نے چمک کر ہاتھ نچایا۔

"دھوبی کے کپڑے کی طرح دھویا ہے اس نے اس وچارے کو...... وہ تو مولا نے کرم کیا کہ اس کی جان نہیں چلی گئی ورنہ تیرے لال نے تو اسے جنت مکانی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"مانا کہ وہ تمہارا ایسا ہی مخالف رہا ہوگا۔" ثنا اللہ نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے تیزی سے پھیرتے ہوئے از حد تاسف سے کہا۔ "مگر بیٹا

......بحیثیت مسلمان، تمہیں اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا کچھ تو خیال کرنا چاہیے تھا۔"

"وہ میرا سیاسی مخالف نہیں تھا۔" اسد نے سر جھکائے جھکائے ہی مدھم لہجے میں ایک ماورائے عقل بات بتائی۔

"یعنی؟" ثنا اللہ کے تسبیح پھیرتے ہاتھ دفعتاً ٹھہر گئے۔

"اوہ......" حلیمہ بھی رونا دھونا بھول کر اسے دیکھنے لگیں۔ "مطلب تم نے اپنے ہی ساتھی کو پیٹ ڈالا ......مگر کیوں؟"

"ارے اتنی دیر سے میں یہی تو پوچھنا چاہ رہا ہوں اس بے عقلے سے کہ بھلا ایسے ایسی ذلیل حرکت کرنے کی ضرورت ہی کیا پڑی تھی......ادھر سارے لوگ اس کی اس واہیات حرکت پر اس سے شدید ناراض تھے......کوئی میری صفائیاں سننے پر تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کن جتنوں سے اسے وہاں سے چھڑا کر لایا ہوں، مجھ سے پوچھو۔"

"آپ سے بعد میں پوچھ لیں گے......" حلیمہ بولیں۔ "پہلے ہم اسد ہی سے کیوں نہ پوچھ لیں کہ اس کی اس عجیب و غریب حرکت کی آخر وجہ کیا تھی؟" وہ استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"جانتے بھی ہو۔" ثناء اللہ سرزنش کرنے لگے۔ "کس قدر خطرناک حرکت کی ہے تم نے......؟"

"ہاں......ہاں جانتا ہوں۔" اتنی دیر سے خاموش رہ کر ان سب کی اپنی اپنی طرز کی لعن طعن سنتا اسد یکدم ہی اپنا جھکا سر اٹھا کر وحشت سے چیخا......اس کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ پڑ رہا تھا......وہ بھی اس کے تاثرات دیکھ کر یک لخظہ گڑبڑا سے گئے......

"تب پھر تم نے یہ حماقت کی ہی کیوں بیٹا؟" اس بار ثناء اللہ صاحب نے نرمی و حلاوت سے اس کا پھر انداز قابو کرنے کی سعی کرتے ہوئے پوچھا۔

"مارا تھا اس نے نحل کو......" وہ یکدم دیوانگی سے پھٹ پڑا۔

"نحل کو؟" حلیمہ نے بے ساختہ حیرانی سے پوچھا۔ "مگر تمہارا اب اس سے کیا لینا دینا......تم تو اپنا ہر تعلق توڑ چکے تھے نا اس سے؟"

ہائے رے ان کی معصومیت!

"ہاں......" اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے ان کی جانب دیکھا۔

ثناء اللہ تاسف سے لب بھینچے بیٹھے تھے جبکہ حبیب اللہ کے پھولتے پچکتے نتھنے اس بات کا مظہر تھے کہ وہ اپنا شدید غصہ ضبط کرنے کے کڑے مراحل سے گزر رہے ہیں۔

"آپ لوگوں کی خواہش پر میں ہر تعلق توڑ چکا ہوں اس سے......مگر ایک رشتہ اب بھی جڑا ہوا ہے ......مگر چھوڑیں، آپ لوگ نہیں سمجھیں گے۔" اس نے مزید کوئی وضاحت دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرہ عبور کر گیا۔

پیچھے رہ جانے والوں کو اپنی اپنی جگہ سوچ میں غلطاں چھوڑ کر......

☆☆☆

"وہ وہاں آئی ہی کیوں......کیوں آئی وہ ادھر۔" اسد وہاں سے نکل کر سیدھا گھر سے باہر چلا آیا۔ اور تب سے اب تک۔ یوں ہی بے مقصد اپنی گاڑی کو سڑک پر دوڑائے پھر رہا تھا اور ذہن تھا کہ جیسے اس روز والے واقعے ہی میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ یہ پریشانی تھی، فکر مندی یا غصہ......اس وقت جیسے سارے ہی جذبوں نے ذہن پر یلغار کر رکھی تھی۔

اس نے کالی جینز کے اوپر تیز رنگوں کا پرنٹڈ کرتا پہنے، چھوٹے سے بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے نحل کو اس دن اتنے لوگوں کے درمیان اور اس قدر فاصلے پر ہونے کے باوجود بڑی آسانی سے پہچان لیا تھا......اور اسے یہ دیکھ کر کہ نحل ان کے مخالف گروپ کے ساتھ تھی۔ ایک انجانا سا شدید صدمہ پہنچا تھا......اگر اس نے نحل کی دلخراش باتوں کے جواب میں اپنے ڈیڈی جی کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی تو پیچھے وہ بھی نہیں رہی تھی۔

"ٹھیک ہے جو چاہے کرتی پھرے......آخر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے نا ایک ضدی ماں کی بیٹی۔'' اس نے سلگ کر سوچا۔

''لیکن آخر اسے ضرورت ہی کیا پڑی تھی اس دن ہمارے پروگرام میں آنے کی؟'' اس نے بے چینی سے سوچا۔ ''جلسے جلوسوں میں جانے کا اگر اسے اتنا ہی شوق تھا تو اپنی پارٹی کے جلسوں میں جاتی...... خواہ مخواہ وہاں ان لوگوں کے ساتھ آئی اور ......اور۔''

اس سے آگے مارے تکلیف کے اس سے سوچا نہ گیا...... اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کی اور پھر سڑک کے کنارے روک دی...... اس کی نگاہوں کے سامنے یکدم ہی وہ منظر گھوم گیا کہ جب اس نے نحل کو بے دم ہو کر گرتے دیکھا تھا۔

بس پھر کیا تھا...... کوئی جنون سا تھا جو اس کے سر پہ سوار ہوگیا تھا...... اس نے واقعی نحل کو زخمی کرنے والے شخص کو بہت مارا تھا...... اور اسی دوران دھر لیا گیا ...... پھر نحل کا کیا ہوا؟ وہ جان نہیں سکا...... مگر جاننا چاہتا تھا...... اسی لیے اپنے ایک کلاس فیلو کے توسط سے اس کی خیریت معلوم کر چکا تھا...... اسے بروقت طبی امداد مل چکی تھی...... وہ اب پہلے سے قدرے بہتر تھی۔ یوں بھی اس واقعے کو بیتے پورا ہفتہ ہو چکا تھا۔

اور اب رمضان کی آمد کے سلسلے میں یونی دو ہفتہ قبل ہی بند ہو چکی تھی...... اب ایسے میں اس کا دل شدید بے چین تھا۔

وہ کرے تو کیا کرے...... اسے دیکھے تو کہاں دیکھے...... اس نے عالم اضطراب میں ڈیش بورڈ پر پڑا اپنا فون اٹھایا...... اور ڈائل پر موجود نحل کا نمبر یونہی کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا...... اس نے آخری بار نحل کو کال اسی روز ملائی تھی کہ جس دن اس نے اپنے گھر والوں کو وہاں بھیجا تھا...... اس کے اندر سے غصے کی ایک تیز لہر ابھری...... اس نے فون ساتھ والی سیٹ پر یوں ہی پھینک دیا...... اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے سڑک پر لے آیا۔

اس بار اس کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

☆☆☆

''انسان کو اتنا بھی خود غرض نہیں ہونا چاہیے سونیا بیگم۔'' جاوید صاحب اپنے منہ پر بڑی تندہی سے نائٹ کریم کے رگڑے لگاتی سونیا بیگم کو دیکھ کر بے تحاشا ناراضی سے بولے...... انہوں نے نحل کو پرسکون رکھنے کی خاطر اس کے سامنے یہ کہہ تو دیا تھا کہ وہ سونیا بیگم سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے مگر کیسے نہ کرتے...... کہ یہ معاملہ ان کی عزیز از جان، اکلوتی، نازوں پلی لاڈلی کا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ اب جا کر انہیں صحیح معنوں میں یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا کہ انہوں نے سونیا کو کچھ زیادہ ہی آزادی دے رکھی تھی۔

''کیوں اب کیا پرابلم ہوگئی تمہیں؟'' ان کے رگڑا لگاتے ہاتھ ذرا کی ذرا تھمے، چتون تیکھے ہوئے اور آواز بگڑ گئی۔

''بیٹی تمہاری گھر میں زخمی ہو کر پڑی ہے...... مگر تمہیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں؟'' وہ ملامتی لہجے میں بولے۔

''اچھا......'' وہ پوری کی پوری ان کی جانب گھوم گئیں۔ ''تمہیں کیسے معلوم کہ مجھے۔ اس کا ذرا بھی احساس نہیں؟'' ان کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

''اگر ہوتا، تو اس کے ساتھ اس موقع پر تم گھر میں رہنے کو ترجیح نہ دیتیں......؟'' ان کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔

''کیسے اپنے گھر میں رہنا شروع کر دوں؟'' انہیں جاوید صاحب کی احمقانہ بات پر بہت خار چڑھی۔ ''الیکشن سر پہ ہیں۔ باہر ہزاروں کام پڑے ہیں میرے کرنے والے۔''

''اور اپنی اکلوتی اولاد کا خیال رکھنا۔'' جاوید صاحب کا لہجہ تلخی سے لبریز ہوگیا۔ ''یہ تمہارا کام نہیں۔''

''یہ آج اچانک تمہیں کون سا دورہ پڑ گیا بھئی۔'' وہ جاوید صاحب کے دبنگ لہجے پر متحیر سے بولیں۔ ''تم نے آج سے پہلے تو کبھی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی۔''

''کاش کہ کر لیتا......'' جاوید صاحب پچھتاتے ہوئے بولے۔ ''تو آج یوں تمہارے ہاتھوں اپنی

اولاد کا یہ حال نہ دیکھنا پڑتا۔"
"ہیں؟" سونیا بیگم کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"آخر میں نے ایسا کیا کر دیا ہے اس کے ساتھ جو تم مجھے یوں الزام دے رہے ہو۔" وہ مشتعل ہو گئیں۔
"تمہاری ہی ہٹ دھرمی اور بے جا ضد نے اسے ان حالوں کو پہنچایا ہے۔" وہ نہ دبنے والے لہجے میں بولے......

وہ ہمیشہ ہی اپنی میں کو مار کر گھر کے سکون کی خاطر خود پر جبر کر کے اس ضدی اور گھمنڈی عورت کے ساتھ نباہ کرتے آئے تھے۔ اب بھی کر لیتے اگر جو بات ان کی بیٹی کی جان پر نہ بن آئی ہوتی تو۔
"میں دیکھ رہا ہوں اسے۔" وہ رنجیدگی سے بولے۔ "وہ اداس ہے، مضمحل ہے، غم زدہ ہے......کوئی چیز ہے جو اسے اندر ہی اندر کھا رہی ہے......تم ماں ہو اس کی، کیا تمہیں اس کا اترا چہرہ اور ویران آنکھیں دکھائی نہیں دے رہیں......؟" وہ سونیا بیگم کی بھوری آنکھوں میں براہ راست دیکھ کر گمبھیر لہجے میں بولے۔ تو اس بار وہ کسی بحث میں الجھنے کے بجائے سوچ میں پڑ گئیں۔

☆☆☆

ماہ مقدس کا پُرنور چاند امت مسلمہ کے لیے رب رحیم کی بے پایاں رحمتوں کا پیامبر بن کر افق پر نمودار ہو چکا تھا......اور اس کے ساتھ ہی جیسے کوئی پاکیزہ سا طلسم چہار اطراف چھا گیا تھا۔
اور بڑے اہتمام سے مغرب کے وقت اپنے گھر کی چھت پر جا کر، ماہ صیام کے چاند کے دیدار کے بعد مسنون دعا کے علاوہ ڈھیروں ڈھیر دعائیں بڑ ذوق و شوق سے مانگنا نخل کا ہر سال کا معمول تھا' اسے یہ عادت اپنے دادا، دادی کو دیکھ کر پڑی تھی......سچ تو یہ ہے کہ اس کی بنیادی تعلیم و تربیت میں ان دونوں کا بڑا حصہ تھا۔

اس وقت بھی وہ سر پہ دوپٹا اوڑھے، دونوں ہاتھ بلند کیے دعا مانگنے ہی لگی تھی کہ نجانے اتنے ڈھیر سارے آنسو اس کی حسین خوابناک آنکھوں میں

کہاں سے کیوں چلے آئے۔
"اب اپنے لیے کیا مانگوں؟" اس کا دل پگھلنے لگا۔ وہ یکدم پلٹی......اور تیزی سے نیچے بھاگتی چلی گئی......اور ٹھیک اسی لمحے کوئی بڑی شفقت سے اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

☆☆☆

"اسد کہاں ہے؟" حلیمہ کو اپنے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر جو بیٹھتے دیکھا تو حبیب اللہ پوچھے بنا بغیر نہ رہ سکے۔ "کیا وہ روزہ نہیں رکھے گا؟"
"ماشاءاللہ جب سے روزے فرض ہوئے ہیں اس پُرتب سے رکھتا آیا ہے تو اب کیوں نہیں رکھے گا۔" وہ قدرے برامان کر بولیں۔ اور پراٹھوں کی چنگیر اپنے آگے کر کے حبیب اللہ صاحب کے لیے پراٹھا پلیٹ میں منتقل کرنے لگیں۔
"تو پھر سحری کرنے کیوں نہیں آیا؟ جگا تو دیا ہے نا تم نے اسے۔" ثنا اللہ صاحب نے بھی تشویش سے پوچھا۔
"کہہ رہا ہے سحری نہیں کرے گا۔" حلیمہ نے نرم تازہ پھلکا اور دہی کی کٹوری میز پر ثناء اللہ صاحب کے سامنے مودبانہ انداز سے رکھتے ہوئے دھیرے سے بتایا۔ ثناء اللہ صاحب کے ضعیف چہرے پر تفکر پھیل گیا۔
"رات کھانا بھی نہیں کھایا تھا اس نے۔"

حبیب اللہ قدرے فکر مند سے ہو کر بولے "اور اب سحری بھی نہیں کر رہا......میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر یہ لڑکا چاہتا کیا ہے؟"
"واقعی!" حلیمہ نے پراٹھے کی پلیٹ اپنے مجازی خدا کے سامنے دھرتے ہوئے نرم لہجے میں جیسے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے ورنہ ہم سب تو خوب واقف ہیں اس کی چاہت سے۔"
"یہ تو جو گھما پھرا کر میری ساری باتوں کو اپنے مطلب کی طرف موڑ لیتی ہے نا......" حبیب اللہ ان

کے جملے میں مضمر طنز کو بھانپتے ہوئے بھنّائے تو خوب ہی لیکن لہجہ ان کا معتدل ہی رہا۔ غالباً دسترخوان (مطلب کھانے کی میز) کے تقدس کا خیال رہا ہو گا...... وگرنہ حبیب اللہ اور اعتدال دو متضاد باتیں تھیں۔

''جی...... جی؟'' حلیمہ نے نوالہ توڑتے ہوئے از حد اشتیاق کا مظاہرہ کیا اور بڑی دلچسپی سے سرتاج کے اکھڑے تاثرات کے حامل چہرے کو دیکھنے لگیں۔

''تیری یہ عادت مجھے زہر لگتی ہے۔'' انہوں نے دانت پیس کر اپنی بات مکمل کی......

''تم لوگ پھر اپنی بے سروپا بحث میں الجھ گئے۔'' ثناء اللہ صاحب نے ازحد ناگواری سے ان دونوں کو دیکھا...... پھر اپنی نشست سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے مزید بولے۔ ''میں ہی بلا کر لاتا ہوں اسد کو...... شاید میری بات مان کر آ جائے۔''

''آپ خواہ مخواہ تردّد نہ کریں اباجی۔'' حلیمہ انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں۔ ''میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں آئے گا۔''

ثناء اللہ نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔ ''کیوں نہیں آئے گا؟''

''کیونکہ وہ حبیب اللہ کا بیٹا ہے۔'' انہوں نے عجیب انداز سے، بے نیاز بننے کی کوشش کرتے ہوئے سحری تناول فرماتے اپنے شوہر نامدار کو مسکرا کر دیکھا۔

''تو......؟'' حبیب اللہ ان کے مسکرانے (یوں مسکرانے) پر برداشت کی طنابیں ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ قریبی مسجد سے ''سحری ختم ہونے میں محض پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں۔'' کی صدا سنائی دی۔

یوں انہوں نے فی الحال سب کچھ پرے رکھتے ہوئے اپنی ساری توجہ سحری کی جانب مبذول کر لی...... اور ان کی طبیعت اچھی طرح صاف کرنے والا ٹاسک بعد کے لیے اٹھا رکھا...... حلیمہ بھی سر جھٹک کر اپنے سامنے رکھے چائے، پراٹھے کی جانب متوجہ ہو گئیں...... ثناء اللہ تو خیر پہلے ہی خاموش ہو چکے تھے۔

☆☆☆

''تم ایک جیسی روٹین سے بیزار نہیں ہو جاتیں؟'' آج سونیا گھر میں تھیں تو سوچا اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ وقت گزار لیا جائے...... بس یہی سوچ انہیں اس کے کمرے تک کھینچ لائی...... یہاں آئیں تو دیکھا...... وہ سر جھکائے بڑے ادب، بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ تلاوت قرآن پاک میں مصروف تھی...... دل کو تھوڑی بہت شرمندگی بھی محسوس ہوئی کہ ان دنوں ان پر کام کا اس قدر دباؤ تھا کہ انہیں تو روزہ ہی رکھنے کا ''موقع'' نہیں مل پا رہا تھا (دراصل ان کے ذمے اپنی پارٹی کا منشور مختلف انتخابی حلقوں میں جا کر گھر گھر پہنچانا تھا۔ یہ تھا تو بہرحال نیم ورک مگر نجانے کیوں سارا بار سونیا بیگم کو اپنے ہی ناتواں کاندھوں پر محسوس ہوتا...... اب ایسا سخت ''فیلڈ ورک'' روزہ رکھ کر کرنا کم از کم ان کے بس کی تو بات ہرگز نہیں تھی)

کجا کہ تلاوت یا تسبیحات وغیرہ جیسی ''ایکٹیویٹی'' کے لیے وقت نکالنا......

بہرحال...... وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں...... اور بڑی گہری نظروں سے ہل ہل کر تلاوت کرتی اپنی معصوم و حسین سی بیٹی کا ہلکے گلابی دوپٹے میں لپٹا چہرہ دیکھنے لگیں۔

چند ثانیے یوں ہی گزر گئے...... پتا نہیں اس کے کمرے میں کیا فسوں اور ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی کہ سونیا بیگم کے اعصاب پرسکون ہونے لگے...... طبیعت میں بشاشت آنے لگی...... تب ہی اس نے تلاوت ختم کر کے قرآن پاک بڑے ادب سے بند کیا...... پھر اسے نیلے پھول دار جزدان میں لپیٹا اور سامنے دیوار کے ساتھ جڑے کتابوں کے ریک کے سب سے اوپر والے حصے میں احترام سے رکھ کر واپس پلٹی...... دوپٹا کھولتے ہوئے خود پر دم کیا۔

سونیا جو اسے بغور دیکھ رہی تھیں، اس کی اس بے ساختہ حرکت پر دھیرے سے مسکرا دیں اور دل ہی دل میں اسے ''دادی اماں'' کے لقب سے بھی نوازا۔
وہ ان کے نزدیک آئی..... ان پر بھی ''پھونک ماری'' اور مسکرا دی۔ پھر ان کے ساتھ ہی جڑ کر بیٹھ گئی..... تبھی انہوں نے اپنے ذہن میں آنے والا سوال اس سے پوچھا۔
''کیسی روٹین ممی؟'' وہ انہیں دیکھنے لگی۔
''یہی گھر میں بند رہ کر نماز، روزہ وغیرہ کرنا..... تب پھر تمہارے پارٹی جوائن کرنے کا فائدہ ہی کیا ہوا؟''
''وہ تو میں نے بس یونہی شغل میں جوائن کی تھی ممی۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر بولی۔ ''ورنہ آپ جانتی تو ہیں مجھے ایسے کاموں میں کوئی انٹرسٹ نہیں اور جہاں تک گھر میں بند رہ کر نماز، روزہ کرنے والا آپ کا سوال ہے.....'' وہ ذرا توقف کرنے کے بعد دوبارہ بولی۔ ''ان دنوں گھر میں بند میں اس لیے ہوں کیونکہ یونی بند ہے اور رہا روزہ، نماز تو ممی یہ میں کون سا انوکھا کام کر رہی ہوں..... یہ روٹین تو ہر مسلمان کو فالو کرنا چاہیے۔''
''ہاں کرنا تو یقیناً چاہیے مگر۔ اب کیا کریں۔''
وہ تیزی سے اپنا سر اثبات میں ہلا کر مجبور سا چہرہ بناتے ہوئے مزید بولیں۔ ''دنیا کے بھی اپنے تقاضے ہوتے ہیں..... اب ہم انہیں چھوڑ تو نہیں سکتے نا۔''
''پتا ہے ممی.....'' وہ بولی۔ ''دادی کہا کرتی تھیں کہ دنیا داری کا کوئی بھی تقاضا ایسا نہیں جو دین کے آڑے آتا ہو..... یہ تو آدمی کے من کا کھوٹ ہے جو اسے ایسی بوگس تاویلیں گھڑنے پر مجبور کرتا ہے..... ورنہ دین بھی دنیا کے ساتھ ہی ساتھ ہے۔''
اس نے من وعن اپنی دادی محترمہ کے الفاظ سونیا کے سامنے دہرا کر انہیں خواہ مخواہ طیش دلا دیا۔
''منع کرتی تھی۔'' وہ برہمی سے بولیں۔ ''میں منع کرتی تھی جاوید کو کہ نحل کو اپنی بیک ورڈ اماں جان کے اتنا کلوز مت ہونے دو..... دیکھ لو..... آخر انہوں نے بنا ہی چھوڑا نا تمہیں اپنی طرح کنویں کا مینڈک۔''

''اوہ ہو ممی.....'' نحل ان کا خراب لہجہ بھانپ کر جلدی سے بولی۔ ''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں..... میں ہائی ٹیک دور کی ماڈرن اور پریکٹیکل لڑکی ہوں..... بولیے..... آخر کیا ثبوت چاہیے آپ کو اس بات کا۔'' وہ شریر ہو کر بولی۔
''گھر سے باہر نکلو..... ہنسو، بولو..... تم زندہ ہو تو زندہ لوگوں کی طرح بی ہیو کرو..... ایسے تو تمہیں دیکھ دیکھ کر خواہ مخواہ تمہارے ڈیڈ نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے کہ ہونا ہو تمہارا یہ حال میری ہی وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ ایسے لہجے میں بولیں گویا جیسے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہوں۔
''آپ کی وجہ سے؟'' نحل نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔
''پچ پچ بھئی.....'' اس کی کج فہمی نے انہیں بے مزہ کیا۔ ''وہ کہہ رہے ہیں کہ شاید تم اس لڑکے سے رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے اپ سیٹ ہو..... اور وہ اس کا قصوروار مجھے گردان رہے ہیں۔''
''اوہ..... اوہ'' نحل نے خفیف ہو کر نچلا لب دانتوں میں دبا لیا۔
اس نے تو اپنی دانست میں اپنے مجروح جذبات اور ٹوٹا ہوا دل سات پردوں میں چھپا رکھا تھا تب پھر یہ ڈیڈ ـــــ اس کے من کی اداسی بھلا کیوں کر بھانپ گئے؟
''تم بتاؤ نا.....'' سونیا بے چاری سی بن کر بولیں۔ ''کہ اس سارے قصے میں میری کیا غلطی ہے..... جو تمہارے ڈیڈیوں.....''
''چھوڑیں نا ممی اس تذکرے کو.....'' نحل نے رنجیدہ لہجے میں ان کی بات درمیان سے قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''بس آپ بتائیں کہ اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' وہ انہیں جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی.....
سونیا کو اس کے بجھے بجھے سے انداز پر کچھ محسوس

تو ضرور ہوا مگر یہ "کچھ" کیا تھا۔ اس وقت وہ سمجھ نہ سکیں۔ اسی لیے سر جھٹک کر بولیں۔

"بس میں یہ چاہ رہی ہوں کہ تم اپنی نارمل روٹین کی طرف واپس لوٹ آؤ..... فرینڈز سے ملو..... شاپنگ کرو..... آؤٹنگ پہ جاؤ بلکہ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ کل سے میرے ساتھ پارٹی آفس چلی چلو..... یوں بھی رمضان کے حوالے سے وہاں کرنے کو بہت کچھ ہے..... تمہارے اندر کے سماجی خدمت گار کو بھی قرار آ جائے گا۔"

بالآخر ان کی تان مرغے کی ایک ٹانگ پر آ کر ٹوٹی۔

نحل بے ساختہ مسکرا دی۔ یک لحظہ ان کی آفر پر غور کیا..... پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

"اوکے..... ڈن، چلتے ہیں پھر کل آپ کے آفس۔"

"دیٹس لائک آ مائی ڈاٹر۔" اور سونیا اس اقرار پر کھل اٹھی تھی۔

☆☆☆

"یہ تم نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے میرے بیٹے....." ثناء اللہ صاحب نے اپنے سامنے والے صوفے پر آڑے ترچھے اس کو، کھوئے کھوئے سے انداز سے سامنے دیوار پر نصب ایل ای ڈی دیکھتے پایا، تو ٹوکے بنا نہ رہ سکے..... وہ ابھی ابھی ہی مسجد سے تراویح پڑھا کر لوٹے تھے۔ حبیب اللہ انہیں گھر کے باہر اتار کر اپنے کسی ضروری کام سے چل دیے تھے۔ حلیمہ اپنے کمرے میں غالباً عبادات وغیرہ میں مصروف تھیں۔

"کیوں دادا جی؟" وہ ان کی آواز پر بے طرح چونک پڑا "کیا ہوا ہے میرے حلیے کو۔" وہ سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ زبردستی مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

"یہی تو میں پوچھ رہا تھا۔" ثناء اللہ بڑی محبت سے اسے دیکھ کر نرمی سے بولے۔ "کہ میرا ٹنک سک سے درست رہنے والا شہزادہ، یہ مجنونانہ حلیہ کیوں بنائے پھرتا ہے آج کل.....؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے مصنوعی بشاشت خود پر طاری کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے دادا جی..... دیکھیے مجھے۔" اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے۔ "بالکل بھلا چنگا تو ہوں۔"

"ہمیں بنا رہا ہے پگلے....." ثنا اللہ کو اس کی زبردستی کی مسکراہٹ نے مزید رنجور کر دیا..... "ارے گودوں میں کھلایا ہے تجھے تیرے مزاج کا ہر رنگ پہچانتے ہیں۔" انہوں نے خفگی سے جتایا تو وہ قدرے شرمندہ سا ہو گیا۔

"تو اور کیا....." حلیمہ اچانک ہی کہیں سے نمودار ہوئی تھیں۔ "نہ سحری ڈھنگ سے کرتا ہے، نہ افطاری پر پہلے کی طرح فرمائشیں کر کر کے نت نئے پکوان ہی پکواتا ہے..... اور رات کا کھانا تو عرصہ ہوا"۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ "میرا بچہ مجھ سے مانگنا چھوڑ ہی چکا ہے..... اب آپ ہی بتایئے ابا جی!" وہ ان سے قدرے فاصلے مگر اسی صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولے گئیں۔ "کیا اسے یوں اپنی جان جلاتے دیکھ کر ایک ماں کا دل نہیں کڑھتا ہو گا۔"

"افوہ....." اسد بے طرح جھلا گیا۔ "جب میں کہہ رہا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں..... تب آپ لوگ کیوں خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"ایسے کیسے کوئی بات نہیں بیٹا....." ثناء اللہ صاحب پریشانی سے بولے۔ "تم دن بدن، بیزار، چڑچڑے اور تنہائی پسند ہوتے چلے جا رہے ہو اور یہ کوئی اچھی علامت تو نہیں۔"

"اور کیا۔" حلیمہ نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا، "ورنہ تو تم ہر سال ابا جی کے ساتھ بڑے ذوق وشوق اور اہتمام سے باقاعدہ تراویح پڑھنے جایا کرتے تھے..... رمضان تو تمہارا پسندیدہ مہینہ تھا نا..... تو پھر اس برس کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" وہ اس کی جانب غور سے انداز میں دیکھے گئیں۔

''وہ اسد کہیں مر گیا...... کھو گیا، گم ہو گیا کہیں۔''
ان کے آگے بھلا وہ کب تک مزاحمت کرتا...... بالآخر پھٹ پڑا۔
''اسد......!'' اس کے الفاظ اتنے سنگین اور بے رحم تھے کہ حلیمہ بے اختیار رو پڑیں...... اور دل تو خیر اس کے خنجر الفاظ نے ...... ثناء اللہ کا بھی کچھ کم زخمی نہیں کیا تھا۔
''لیکن ہوا کیا ہے......'' اسی لیے وہ دکھی سے لہجے میں پوچھ بیٹھے۔
''ساری بات آپ کے سامنے کی ہے۔ پھر بھی آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ ہوا کیا ہے...... اور یوں بھی...... اب یہ سوال پوچھنے کا فائدہ ہے بھی کیا ...... جو ہونا تھا ہو ہی چکا...... میرے دل کی قسمت میں اُجڑنا لکھا تھا سو اُجڑ کر ہی رہا۔'' وہ بولا...... اور سرعت سے کھڑا ہو کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاؤنج عبور کر گیا۔
''آپ نے بھی انہیں کچھ نہیں سمجھایا ابا جی'' اس کے جانے کے بعد ٹاپ ٹاپ اپنی آنکھوں سے آنسو گراتی حلیمہ سسر محترم کی جانب دیکھ کر شاکی سے لہجے میں بولیں۔
''میرے شوخ و شنگ...... زندگی سے بھرپور بیٹے کو محبت کا روگ لگ گیا۔'' ہائے یہ اب نہیں سمجھے گا...... نہیں سمجھے گا یہ۔'' وہ بین ڈالنے لگیں۔
''تم جانتی ہو بیٹی۔'' گم صم وافسردہ سے ثناء اللہ بولے'' کہ وہ بھی کسی کی نہیں سنتا...... شادی کے ساتویں برس بڑی منتوں، مرادوں سے پیدا ہوا تھا ...... تمہاری پھوپھی (یعنی والدہ حبیب اللہ) کی تو جان تھی اس میں...... اوپر سے ابھی چھ ماہ ہی کا تھا کہ ڈبل نمونیہ بھی ہو گیا...... لگتا تھا اس کملے سے پہلے اس کی جھلی ماں کی جان نکلے گی مگر رب کا کرم ہو گیا...... جاتے جاتے واپس لوٹ آیا۔ اور ہماری قسمت ......'' انہوں نے ایک طویل ٹھنڈی آہ بھری، ''کہ اس کے بعد کوئی اور اولاد بھی نہ ہوئی...... یوں اس کی ہر جائز، ناجائز مان مان کر تمہاری پھوپھی نے اسے اس قدر سر پہ چڑھا لیا کہ پھر اس نے وہاں سے نیچے اتر کر ہی نہ دیا......''

وہ کوئی نئی کہانی تو نہیں سنا رہے تھے...... اس ساری رام کہانی سے تو حلیمہ پہلے ہی واقف تھیں...... ہاں مگر یہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ ساری گفتگو اس وقت دروازے کی دوسری جانب چپ چاپ کھڑے حبیب اللہ بھی سماعت فرما رہے ہیں اسی لیے بڑے جرات مندانہ بلکہ کسی حد تک گستاخانہ لہجے میں بولیں۔
''لاڈ راجی بھر کر انہیں پھپھی اماں نے اور بھگتتے ساری زندگی ہم رہے...... مگر اب اور نہیں ابا جی۔'' ان کے لہجے سے معاً چٹانوں کا سینہ شق کرنے والا عزم جھلکنے لگا۔
''ایک بیوی بے شک کمزور ہو سکتی ہے...... مگر ایک ماں اپنے بیٹے کا مقدمہ ضرور لڑے گی...... بس اب بہت ہو گیا...... اب میں انہیں دکھا دوں گی کہ میں بھی کبھی...... ''پتنگ باز'' ہوا کرتی تھی نہ ڈرنے والی...... نہ جھکنے والی...... آئی آئی، حلیمہ آئی۔''
ان کے اندر چھپی بیٹھی سیاسی جیالی نے اچانک بیدار ہو کر بڑی بھرپور انگڑائی لی۔
ثناء اللہ صاحب نے ان کے اس جرات مندانہ بیان پر چونک کر انہیں تعجب سے دیکھا۔ اور مصلحتاً خاموش ہی رہے۔
دوسری جانب یہ ''بکواس'' سن کر حبیب اللہ صاحب کے کان کی لوئیں مارے غضب کے سرخ ہو گئیں۔
''آئی...... آئی حلیمہ آئی۔'' انہوں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا بچو...... تو، آ تو سہی...... پھر دیکھیں گے کہ کس میں کتنا دم ہے۔''

☆☆☆

''یار...... یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟'' اس کے قریبی دوست اور یونیورسٹی فیلو سعد نے بڑی حیرت سے اس کا حلیہ دیکھا۔
''کیوں۔'' وہ چڑ کر الٹا اسی سے پوچھنے لگا......
''کیا ہوا ہے مجھے...... جسے دیکھو آج کل مجھ سے یہی سوال پوچھے چلے جا رہا ہے۔''

"نہ پہلے کی طرح ہماری گیدرنگ جوائن کرتے
نہ فون اٹھاتے ہو......اور آج جب میں تم سے
ملنے یہاں تمہارے گھر آ ہی گیا ہوں تو مجھ سے اس
قدر روکھائی سے پیش آ رہے ہو......اور پھر بھی سوال کر
رہے ہو کہ کیوں، مجھے ہوا کیا ہے؟" سعد نے برہمی
سے لتاڑا تو وہ کچھ خفیف سا ہو کر وضاحت کرنے لگا۔
"دراصل میری طبیعت کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں۔"
"کب سے ٹھیک نہیں......" سعد پراسراریت
سے مسکرایا۔"جس دن سے تمہاری اور نحل کی آپس میں
لڑائی ہوئی ہے......کیا اس دن سے؟"
"تمہیں اس بات کے بارے میں کیسے پتا؟"
اسد نے بے ساختہ چونک کر پوچھا۔
"مجھے ہی کیا۔" وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔"پوری یونی
کو معلوم ہے کہ تم دونوں کے مابین جھگڑا چل رہا
ہے......بھول گئے کیا؟ تم دونوں یونی کے کیفے ہی
میں تو لڑے تھے......اس کے بعد سب ہی نے دیکھا
کہ تم "عین غین" والوں کو پیارے ہو گئے اور نحل
"انقلابیوں" کو......مگر میرا سوال یہ ہے کہ تم دونوں
کے مابین آخر ایسا کیا ہو گیا جو تم دونوں ایک دوسرے
سے بات کرنا تو درکنار، ایک دوسرے کی شکل تک
دیکھنے کے روادار نہیں۔"
"بس......کیا بتاؤں یار۔" اس نے یہ سب سن
کر بے حد دل گرفتی سے کہا۔" آ جاتے ہیں کبھی ایسے
حالات بھی زندگی میں......جس کا حل شاید کسی کے
پاس نہیں ہوتا۔" وہ یقیناً بہت زیادہ مایوس تھا۔ تب ہی
یہ بات کرتے سے وہ کاتب تقدیر کو یکسر فراموش
کر گیا۔
"چل یار......فکر نہ کر۔" اگر وہ اصل بات سے
سعد کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا تھا تو سعد نے بھی زیادہ
اصرار نامناسب خیال کرتے ہوئے بات پلٹ دی۔
"ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا......اچھا
خیر......میں یہ پوچھ رہا تھا کہ پھر تو چل رہا ہے نا کل
ہمارے ساتھ؟"
گو کہ ان دنوں اسد کا دل ہر شے سے اچاٹ
تھا......مگر اس کام سے وہ پیچھے کیسے ہٹ سکتا
تھا......پس اسی لیے ہولے ہولے سے سر اثبات میں ہلاتے
ہوئے بولا۔
"ہاں......کیوں نہیں......اب میں اتنا بے
عقل تو نہیں جو اپنے دل کے چکر میں پڑ کر نیکیاں
کمانے کا یہ سنہری موقع اپنے ہاتھوں سے جانے
دوں......یوں بھی اس دل کا کیا ہے......اس نے تو
جلد یا بدیر......بہل ہی جانا ہے۔" وہ یاسیت سے
بولا۔ اسی لمحے ملازم چائے لے آیا تو وہ خود کو سنبھال
کر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

"شادی سے پہلے پھپھی اماں نے بڑے پیار
سے مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر اک روز کہا تھا کہ میرا
حبیب اللہ ضدی ہے، اڑیل ٹٹو ہے......منہ زور ہے،
اکھڑ ہے، زبان کا کڑوا مگر دل کا بہت ہی بھلا ہے
حلیمہ!" یہ اگلی صبح کا منظر تھا......حبیب اللہ لان میں
بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے کہ جب حلیمہ ان کے
نزدیک جا بیٹھیں۔
آسمان! کو اودے بادلوں نے ڈھانپ رکھا
تھا......اور نرم ہوا سبک خرامی سے چل رہی تھی......
حلیمہ کے ہاتھوں میں موتیا کے سفید، خوشبودار اور
حد درجہ خوب صورت پھولوں سے لبریز تنکوں والی
ٹوکری تھی......جو انہوں نے سامنے کین کی میز پر
دھرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔
"یہ میری ماں نے میرے بارے میں تم سے کہا
تھا؟" حبیب اللہ نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ اور
بڑے مشکوک انداز سے ان کا سادہ مگر حسین چہرہ دیکھا۔
"ہاں تو......" حلیمہ تنک کر بولیں۔"یہی کہا تھا
اب کیا روزے میں، میں آپ سے جھوٹ بولوں
گی۔" ان کی دلیل وزنی تھی لہٰذا حبیب اللہ اس بات
پر کوئی تبصرہ نہ کر سکے۔
"وہ مجھے سمجھانا چاہ رہی تھیں کہ انہوں نے مجھ
جیسی دھیمے مزاج کی معاملہ فہم، خوش اخلاق و خوش اطوار،
سگھڑ، تعلیم یافتہ اور سمجھ دار لڑکی کا انتخاب۔ اپنے حبیب

اللہ کے لیے دراصل کیا ہی اسی لیے ہے کہ......"

"خدا کی قسم کھا کر بتا......" حبیب اللہ پہلو بدل کر بولے۔" کہ یہ الفاظ انہوں نے واقعی تیرے لیے کہے تھے؟"

"خواہ مخواہ قسم کھا کر میں خود کو جھوٹا کیوں ثابت کروں؟" وہ خشمگیں نگاہوں سے انہیں گھور کر بولیں۔" مجھے بہو بنا رہی تھیں تو ظاہر ہے ان کے یہ الفاظ بھی میرے لیے تھے۔"

"تجھے مکھن لگا رہی ہوں گی تا کہ تو مجھ سے شادی کے لیے ہاں کر دے۔"

"ماشاء اللہ...... جس قدر فضول آپ بولتے ہیں نا۔" وہ زہر میں ڈوبا تبسم لبوں پر سجا کر بولیں۔

"آپ کا نام حبیب اللہ نہیں...... رانا ثناء اللہ ہونا چاہیے تھا۔"

"اوئے انہیں کچھ نہ کہنا، سمجھی۔" حبیب اللہ نے بڑھک لگائی۔"میری آئیڈیل پرسنالٹی ہیں وہ۔"

"اوہ...... اچھا...... اچھا۔" حلیمہ نے جیسے معاملہ سمجھ میں آ جانے پر سر ہلایا۔"تب ہی تو۔"

"تب ہی تو کیا؟" انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

"کچھ نہیں۔" وہ جلدی سے بولیں۔" ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ انہوں نے کہا تھا کہ۔"

"نہ بہتان باندھ میری بہشتن ماں پر۔" وہ یقین نہ کرتے ہوئے بولے۔"اور سیدھا سیدھا یہ بتا کہ تو آخر یہاں مجھ سے کہنے کیا بیٹھی ہے؟" وہ بھی کم چالاک نہیں تھے جان گئے کہ حلیمہ تمہید باندھ رہی ہیں۔

"اپنی بے کار کی ضد چھوڑ دیں سرتاج۔" حلیمہ پہلے تو یکدم چپ ہوئیں پھر جلدی سے بول پڑیں۔ "میرا وہی ہنستا، کھلکھلاتا، فرمائشیں کرتا، مجھ سے اپنے لاڈ اٹھواتا...... میرا نٹ کھٹ سا بیٹا مجھے لوٹا دیں سرتاج!"

حلیمہ نے دیکھا، حبیب اللہ کے چہرے پر سختی سی آ گئی تھی اس تذکرے پر مگر انہوں نے اپنی بات ابھی نہیں تو کبھی نہیں کے مصداق جاری رکھی۔

"ساری زندگی آپ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتی آئی ہوں، آپ کی خاطر اپنی پسند، ناپسند کو پس پشت ڈالتی آئی ہوں...... مگر اس بار آپ کی بیوی نہیں، ایک ماں آپ سامنے فریاد کر رہی ہے...... کہ اپنی ضد چھوڑ کر میرے بیٹے کو اس کی خوشیاں واپس کر دیں...... اس کے علاوہ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے...... کچھ بھی نہیں چاہیے۔" وہ سراپا التجا بن گئیں۔

اور حبیب اللہ پر اس التجا کا کیا اثر ہوا؟ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ خط غربت سے کہیں نیچے زندگی گزارنے والوں پر مشتمل ایک مضافاتی بستی تھی...... ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے، اونچی نیچی غلاظت سے اٹی گلیوں میں ننگ دھڑنگ کدکڑے لگاتے بچے، ناگوار حلیے والے مرد و عورتیں۔ یہاں زندگی کی ہر ضرورت ناپید تھی مگر زندگی بڑی ڈھیٹ واقع ہوئی ہے...... یہ پھر بھی یہاں موجود تھی۔

نحل کا حساس و درد مند دل یہاں والوں کی خستہ حالی دیکھ کر بھر آیا۔

اس نے واقعی دوسرے دن ہی سے سونیا کے ساتھ ان کے آفس جانا شروع کر دیا تھا...... وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذات کی وجہ سے اس کے والدین کے بیچ کوئی تناؤ جنم لے...... بہرحال سونیا نے واقعی یہ سچ ہی کہا تھا کہ ان دنوں یہاں نحل کے کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

ایک تو رمضان جیسا مقدس مہینہ اس پر مستزاد انتخابات کی آمد آمد...... ایسے میں ہر کوئی خود کو عبدالستار ایدھی ثانی ثابت کرنے پر تلا بیٹھا تھا...... تاہم ان موقع پرستوں کی بھیڑ میں معدودے چند مخلص بھی تھے...... اور ان ہی لوگوں کی کاوش و تعاون سے رمضان کے حوالے سے کچھ راشن کے کارٹن، کپڑے، پھل وغیرہ یہ لوگ حسب توفیق و استطاعت اپنا اپنا حصہ ڈالتے ہوئے ایسے دوسرے علاقوں میں پہنچا سکے تھے۔

اور آج اس علاقے کی باری تھی...... نحل کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

علاوہ، تین لڑکیاں، اور دو لڑکوں پر مشتمل گروپ تھا یہ......اور تحمل ان کی سپروائزر تھی......ابھی بھی وہ بڑے مگن سے انداز میں اپنے آئی فون میں سامان کی لسٹ کا جائزہ لے رہی تھی کہ معاً کسی جانب سے کوئی شور سا اٹھا......اس نے بے ساختہ اپنا فون پہ جھکا سر اٹھا کر دیکھا......اس سے قدرے فاصلے پر موجود لوفر ٹائپ لڑکوں کا ایک گروپ ان کی جانب سے دیے جانے والے سامان کو لوگوں سے چھین چھین کر دور سڑک پر پھینک رہا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ سرعت سے ان کے نزدیک پہنچ کر غصے سے بولی۔ "کون ہو تم لوگ......اور کیوں پھینک رہے ہو یہ سامان۔"

"یہ ہمارا علاقہ ہے۔" ان میں سے ایک لفنگا، جو یقیناً ان کا سرغنہ تھا، جوشیلے انداز سے بولا۔ "تم لوگ ادھر کیا لینے آگئے ہو۔"

"علاقہ......کیسا علاقہ۔" وہ ناسمجھی سے بولی، "یہ سب ہمیں نہیں پتا......ہم تو صرف یہ سامان ادھر دینے آئے ہیں۔"

"یہی تو اتنی دیر سے میں اسے سمجھا رہا ہوں۔" اس کے ساتھ آیا نبیل قدرے غصے سے بولا۔ "مگر یہ اسٹوپڈ سمجھ ہی نہیں رہا......خوامخواہ سین کری ایٹ کر رہا ہے۔"

"اوئے بند کر اپنی بکواس......" دوسرے لفنگے نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ تحمل اور اس کی لڑکیاں گھبرا گئیں۔

"دیکھو پلیز......بات سنو تم لوگ۔"

"گریبان چھوڑو میرا۔" نبیل بپھر گیا۔

"پہلے سامان دو گے......پھر ووٹ مانگو گے اپنی پارٹی کے لیے۔" مخالف گروپ میں سے ایک اور مزید زور سے چلا کر بولا۔ "پاگل سمجھ رکھا ہے کیا ہمیں۔" "اوئے فیقے......" اس نے مڑ کر اپنے ہی طرح کے کسی شخص کو پکارتے ہوئے کہا "یہ ایسے نہیں مانیں گے......چل شاواش" اس نے پچکار کر کہا۔ "دھکے مار مار کر نکال انہیں یہاں سے۔"

"ہمیں دھکے مارو گے" نبیل کے ساتھ ساتھ فاروق بھی بھڑک اٹھا۔ "آؤ......مارو مار کر دکھاؤ۔"

"اونو......پلیز......ڈونٹ فائٹ!" تحمل نے متوحش ہو کر کہا۔ مگر ان غصے سے ابلتے نوجوانوں کے پاس اس کی انگریزی میں کی گئی التجا سننے کا قطعی وقت نہیں تھا......آن واحد میں دیکھتے ہی دیکھتے وہ آپس گتھم گتھا ہو گئے۔

سدرہ، آمنہ تو بھاگ کر اپنے سامان والے ٹرک کے پاس جا پہنچیں اور وہیں کھڑے کھڑے اطمینان سے تھر تھر کانپنے لگیں......اور رہی تحمل ......اس کے تو حواس ہی یہ نازک صورت حال دیکھ کر مختل ہو گئے۔

"تحمل......تم......ادھر؟" اور ابھی وہ بے ہوش ہونے کی تیاری کر ہی رہی تھی کہ نجانے کہاں سے، بالکل اچانک اسد نمودار ہوا اور اسے اپنے روبرو پا کر ششدر رہ گیا۔

"تم؟" تحمل نے اپنے تیزی سے سن ہوتے دماغ کو یکدم جیسے برقی جھٹکا لگتے محسوس کیا۔ "تم یہاں کیسے؟" اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر جملے ادا ہوئے۔

"یہی سوال تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں احمق لڑکی۔" صورت حال اتنی تیزی سے بگڑ رہی تھی کہ اسد نے زیادہ دیر ششدر رہنا مناسب خیال نہ کیا اور جلد ہی اپنی جون میں لوٹ آیا۔

"تم نے کیا کوئی قسم اٹھا رکھی ہے اس سیزن میں ہونے والے ہر ہنگامے میں حصہ لینے کی۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "اب جلدی چلو یہاں سے......ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ لوگ تمہیں بھی ان لڑکوں کی ساتھی ہونے کی پاداش میں کوئی نقصان پہنچا دیں۔" وہ اس کے نزدیک تر آ کر فکرمندی سے بولا۔

"اچھا!" وہ طنزیہ مسکرائی، "آج بڑی فکر ہو رہی ہے میری، اس دن کیا ہوا تھا جو مجھے یوں ہی بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنی پارٹی والوں کی ساتھ چل دیے تھے۔"

"بے کار کی بحث مت کرو۔ دیکھو، یہ لوگ بہت خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ تم میری بات۔" اور ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ فضا میں گولیوں

کی تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔نحل کا چہرہ فق ہو گیا.......
اس نے فوراً سے پیشتر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
"چلو۔" اب پتا نہیں نحل اپنے حواس کھو بیٹھی تھی یا اب بھی ضدی پن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ خیر جو بھی تھا وہ باوجود اسد کے گھسیٹنے کے اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔
"پاگل ہو گئی ہو کیا؟" وہ وحشت سے چلایا
"چلو.......نحل.......آہ!"
مگر اس کی یہ ساری عجلت اکارت گئی کہ ہونی ہو کر رہی۔
نامعلوم سمت سے ــــ آنے والی گولی اپنا کام کر گئی......نحل نے پورے قد سے اسد کو نیچے گرتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

"میرے لال ......میرے بیٹے ......میرے لخت جگر۔" حبیب اللہ بالکل چھوٹے بچے کی طرح بار بار اس نجی ہسپتال کے شان دار سے کمرے میں موجود اپنے بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر چوم رہے تھے۔
سامنے صوفے پر حلیمہ نماز کے انداز میں دوپٹا اوڑھے بیٹھیں، بڑی طمانیت سے اسے دیکھ رہی تھیں......جبکہ ثناء اللہ وقفے وقفے سے اپنی ضعیف آنکھوں میں در آئے آنسو پونچھنے کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی آیت پڑھ پڑھ کر اس پہ پھونکتے نہ تھکتے تھے۔
کیسی جان لیوا آزمائش تھی جو رب کریم کی خاص الخاص مہربانی سے آتے آتے ٹل گئی......وہ تو اس دن اپنے دوستوں کے ساتھ کسی گھرانے کی مالی مدد کرنے کے لیے گیا تھا کہ یہ ان دوستوں کا معمول تھا......اب اسے کیا معلوم تھا کہ وہاں اس دشمن جاں سے ایسے خطرناک حالات میں سامنا ہوگا......کہنے سننے کو باتیں تو بہت سی تھیں مگر یہ بھی کوئی موقع تھا؟ مگر یہ عقل کی بات اس نحل نیازی کو کون سمجھاتا؟
الغرض ان تشویشناک حالات میں وہ ہوا جس کا اندیشہ تھا......کسی جی دار نے انہیں وہاں سے بھگانے کو فائرنگ تو ہوائی ہی کی تھی مگر اب یہ اسد اللہ کی قسمت کہ اس کے نام کی "گولی" اسے ہی آ لگی......
صد شکر، اندھی گولی اس کا بایاں کندھا ہی اُدھیڑ پائی تھی باقی وہ سالم رہا......وہ جھٹکا کھا کر گرا ضرور تھا......مگر ہوش و خرد سے بیگانی نحل بی بی ہو گئی تھیں......ان دونوں کے علاوہ "دیگر زخمیوں" کو بھی ریسکیو والوں کی مدد سے سعد ہی نے اسپتال پہنچایا تھا۔
"کچھ کھانے پینے کا جی چاہتا ہو تو بتا دے؟ چاکلیٹ لا دوں؟" حبیب اللہ صاحب کی تو ساری اکڑفوں ان تین اذیت ناک دنوں نے ناک کے راستے نکال دی تھی......ظاہر ہے اپنے جوان بیٹے کو یوں خون میں لت پت دیکھنا کوئی آسان بات تھی کیا؟
"اوہو ڈیڈی جی......" وہ ہلکا سا چڑ گیا۔ "میں کوئی بچہ ہوں جو چاکلیٹ سے بہل جاؤں گا۔"
اس کے انداز پر بے ساختہ حلیمہ نے ممتا لٹاتی نگاہوں سے اس کا نقاہت زدہ چہرہ دیکھا۔
"آپ بھی کمال کرتے ہیں سرتاج!" پھر سوچ میں غلطاں حبیب اللہ کا چہرہ دیکھ کر معنی خیز لہجے میں بولیں۔ "سمجھا کریں نا......واقعی وہ بچہ تھوڑی رہا ہے اب......چاکلیٹ سے کہاں خوش ہوگا۔"
"ٹھیک ہے......ٹھیک ہے" اور حبیب اللہ جیسے ان کا اشارہ سمجھ کر تیزی سے سر اثبات میں ہلا کر مسکراتے ہوئے بولے۔ "سمجھ گیا......میں سمجھ گیا......بس چلو بیٹا جی......اب گھر چلنے کی تیاری شروع کرو۔"
ان کا انداز ایسا تھا کہ ثناء اللہ بھی زیر لب مسکرا دیے۔ اسد الجھ کر ان سب کے چہروں پر کھلتی معنی خیز مسکراہٹ دیکھے گیا۔

☆☆☆

"آپ کا مجرم آپ کے سامنے بیٹھا ہے بہن جی......" آج وہی گھر تھا......وہی مہمان خانہ اور وہی افراد......ہاں مگر منظر ذرا مختلف تھا......اور حبیب اللہ انتہائی شریفانہ انداز سے اپنی نشست سنبھالے، سر کو ذرا سا خم کیے، اپنے مقابل سنجیدگی سے بیٹھی سونیا بیگم سے شرمسار سے لہجے میں گویا تھے۔

"مجھے چاہے مارلیں، برا بھلا کہہ لیں یا گھر سے دھکے دے کر نکال باہر کریں۔" وہ جذباتیت سے بولتے گئے۔

"آہم..... آہم" ان کے بالکل نزدیک براجمان ان کی نصف سے "کچھ زیادہ ہی بہتر" نے دھیرے سے کھنکارتے ہوئے انہیں ان کے الفاظ کے انتہائی لغو ہونے کا احساس دلایا مگر نہ جی..... وہاں جوشِ خطابت میں پرواہ ہی کسے تھی؟

"مجھے گالیاں دے لیں..... یا پھر پولیس بلوالیں۔"

"اگر واقعی سونیا بیگم تے اس بیان پر یقین کر کے عمل کر ڈالا تو؟" اس مرتبہ نہ صرف انہوں نے اپنے مجازی خدا کو کہنی ماری بلکہ مدھم لہجے میں متنبہ بھی کر ڈالا۔

وہ چونک کر یکدم خاموش ہو گئے۔

"پتا نہیں اس نمانے کو بات کرنے کا ڈھنگ کب آئے گا" ثناء اللہ صاحب نے ان کے خاموش ہو جانے پر دل ہی دل میں کلمہ شکر ادا کیا۔

"آپ کو معافی مانگنے کی ہر گز ضرورت نہیں بھائی صاحب....." چند ثانیے کی خاموشی کے بعد بالآخر سونیا نے اپنے لبوں کو زحمت دی۔ "دیکھا جائے تو غلطی میری بھی برابر کی تھی..... گھر آئے مہمان..... اور وہ بھی سدھیانے سے ایسا سلوک ہر گز بھی مناسب نہیں تھا۔" وہ کھلے دل سے بولیں اور ان کا یہ "دل" یوں ہی نہیں کھل گیا تھا۔

نجل بہتر گھنٹے بے ہوش رہی تھی..... پورے بہتر گھنٹے..... اسد کو گولی لگتے دیکھ کر اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا..... یہ تو خیر گزری کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن نہیں ہوا..... اور یوں نجل کی بہتر گھنٹوں کی خاموشی اور غیر موجودگی نے سونیا بیگم جیسی گھمنڈی اور خود کو عقل کل تصور کرنے والی عورت کو وہ سبق سکھایا جواب انہیں ساری زندگی یاد رہتا۔

"جبکہ یہ بات ظاہر ہے۔" جاوید صاحب دھیرے سے مسکرا کر از حد طمانیت سے بولے۔

"کہ غلطی دونوں جانب سے ہوئی..... اور صد شکر کہ دونوں ہی کو بروقت اپنی حماقت کا احساس بھی ہو گیا۔ تو بس میرا خیال ہے کہ اب اس بات کو یہیں اسی جگہ پر ختم بھی کر دینا چاہیے..... کیوں محترم؟" انہوں نے تائید طلب نگاہوں سے ثناء اللہ صاحب کی جانب دیکھا۔

وہ فوراً تائیدی انداز سے اپنا سر ہلاتے ہوئے نرمی سے مگر ناصحانہ بول اٹھے۔

"دیکھو میرے بچوں، اپنے نظریے پر کاربند رہنا اچھی بات ہے مگر اس سے بھی عمدہ بات یہ ہے کہ دل میں دوسروں کے لیے بھی گنجائش رکھی جائے کہ اسی سے ایک صحت مند اور مثبت معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔"

"چلیں شکر۔" ثناء اللہ خاموش ہوئے تو حلیمہ چہکنے لگیں۔ "یہ معافی تلافی کا سین بہ احسن و خوبی اپنے اختتام کو پہنچا۔ میرا خیال ہے کہ اب آگے کا لائحہ عمل طے کر لیا جائے تو بہتر ہے..... اور میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اگر چاند رات ہی کو نکاح کی سنّت ادا کر دی جائے تو اچھا ہے..... کیوں آپ کیا کہتی ہیں؟" انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے سونیا بیگم کو دیکھا۔

"نہیں بھئی....." سونیا یکدم بوکھلا کر "قطعیت سے بولیں۔" چاند رات کو تو بالکل بھی پاسیبل نہیں۔"

"لیکن کیوں نہیں جی۔" حبیب اللہ ابرو چڑھا کر ٹوہ لینے والے انداز سے مستفسر ہوئے۔ "کیا اس رات بھی آپ کا کوئی جلسہ شلسہ ہے کہیں؟"

حبیب اللہ کے استفسار پر جملہ حاضرین نے قدرے پریشانی سے سونیا بیگم کی جانب دیکھا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں۔" سونیا تے جلدی سے نفی میں سر ہلایا، "وہ..... دراصل میں چاہ رہی تھی کہ اب اگر یہ شادی ہو ہی رہی ہے تو کیوں نہ ہم اسے ذرا سیاسی سا رنگ دیدیں..... یونو..... آخر "عین غین" والوں کے لڑکے سے "انقلابیوں" کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے..... یہ کوئی معمولی واقعہ ہے؟"

"اوہ نو ممی..... یہ کیا کہہ گئیں آپ؟" اور ڈرائنگ روم کے دروازے سے چیخی، سابقہ ناخوشگوار تجربے کے پیش نظر ساری کاروائی بذات خود سماعت کرتی نجل نے یہ سن کر بے ساختہ اپنا سر پکڑ لیا۔

"کک ...... کیا ہوا ؟ اور اپنے گھر کے وسیع ٹیرس پر موجود مگر بذریعہ فون کال اس سارے ماحول سے جڑے اسد نے نحل کی یہ بات سن کر اپنا سانس سینے میں اٹکتا محسوس کیا۔

"اب کیا کر بیٹھیں تمہاری ممی......" وہ بوکھلا کر بولا۔ "یار......تم فوراً سے پیش تر اندر جا کر انہیں سمجھادو......مجھے اب بار بار گولی تھوڑا ہی لگے گی......وہ تو اس روز قسمت یاوری کر گئی تھی۔"

ابھی اسد کا واویلا فون کے دوسری جانب جاری ہی تھا کہ اندر سے موصوف کے والد بزرگوار کی تحسین آمیز بے ساختہ قسم کی آواز سنائی دی۔

"واہ! کیا شاندار اور نیا نکور آئیڈیا آیا ہے آپ کے دماغ میں......بھئی واہ۔" وہ سر دھننے لگے۔

"اوہ بھائی جی......یو گوٹ مائی پوائنٹ۔" سونیا فرط انبساط سے اچھل ہی تو پڑی تھیں گویا۔

"یعنی......؟"

دو سیاسی شخصیات تو ایک دوسرے کا نکتہ نظر بہ آسانی سمجھ چکے تھے مگر باقی ماندہ غیر سیاسی افراد کی چھوٹی سمجھ لیں یا باریک بات سمجھ نہیں سکی تھی اس لیے ہونق پن سے سوال داغا گیا۔

"یعنی......" حبیب اللہ صاحب باچھیں چیر کر بولے۔ "ملک کے وسیع تر مفاد میں اسد اور نحل کی شادی پکی۔"

"ہاں۔" سونیا نے بھی ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ بھی عید کے بعد......کیونکہ عید پر تو سب ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں مصروف ہوتے ہیں نا۔"

"تم دونوں نہیں سدھرو گے۔" ثنا اللہ صاحب نے ان کا موقف سن کر بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا......جبکہ باقی سب ہنس پڑے تھے۔

"یاہو!" تب ہی باہر کھڑی نحل مارے خوشی کے اچھل پڑی۔

"کیا ہوا......کیا ہو گیا......اب کیا ہوا......کچھ بتاؤ نا۔" دوسری جانب نحل کی چیخ نے اسد کی جان سولی پہ لٹکا دی۔

"اوفوہ......" وہ خود پر قابو پا کر ہنستے ہوئے بولی۔ "مبارک ہو اسد اللہ! ملک کے وسیع تر مفاد میں ہمارے سیاسی پیرنٹس نے ہماری شادی عید کے بعد پکی کر دی ہے۔"

"ہیں؟" وہ اس عجیب منطق پر اس قدر حیران ہوا کہ ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو پایا۔

"یہ ہماری شادی سے ملک کے وسیع تر مفاد کا بھلا کیا تعلق؟"

"تم سیاسی ہو؟" نحل نے چڑ کر پوچھا۔

"تھوڑا بہت......" وہ روانی سے بولا۔

"جانے دو......" نحل دوبارہ ہنس پڑی، "تب نہیں سمجھو گے......اور پھر سمجھ کر کرنا بھی کیا ہے......ہمیں جو چاہیے تھا وہ رب نے بن مانگے دے دیا ہے......اب سوال کرنے کے بجائے جا کر اس مہربان کا شکر ادا کرو......میں تو چلی خدا حافظ۔"

"ارے......رے......رے......سنو تو۔" وہ کہتا ہی رہ گیا مگر نحل نے اپنی کہہ کر فون کھٹ سے بند بھی کر دیا۔

"سن لوں گی تمہاری بھی......" اور ابھی وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اسے ایک خفگی بھرا واٹس ایپ پیغام ارسال کرنے ہی لگا تھا کہ اس سے قبل ہی اسے نحل کا واٹس ایپ موصول ہو گیا۔

"ہم مل رہے ہیں ناں بریک کے بعد۔" آگے ایک زبان چڑاتی ایموجی بنی تھی۔ وہ اس پیغام پر ہنس پڑا۔

واقعی اب کہنے سننے کو تو ساری عمر پڑی تھی لیکن اگر شکرانے کا یہ موقع وہ تاخیر کر کے گنوا دیتا تو خوامخواہ اپنا نام ناشکروں کی فہرست میں درج کروا لیتا......بس اسی لیے مڑا......اور وضو کرنے اندر چل دیا۔

اب آسمان پر پھیلی رات بھی مسکرانے لگی تھی......ان دونوں کا ملن ممکن جو ہو گیا تھا۔

یہ ڈیڑھ سو سال پہلے......

سفید دوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپاتی مہر' مشہور گائیک میاں غلام علی غلام کی حویلی کے چوبارے سے سیڑھیاں پھلانگتی' پھاٹک سے باہر نکلتی' تیزی سے چھوٹی بڑی گلیاں عبور کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ چلتی قمرالنساء بے چاری کا سانس پھول رہا تھا۔ لیکن مہر کے پیروں میں جیسے پر لگے ہوئے تھے۔ وہ تو اُڑتی پھر رہی تھی۔

وہ ہرنی...... وہ سریلی...... وہ مہرالنساء......

''خدا کے لیے رک جاؤ۔ ہوا کا گھوڑا نہ بنو۔ میرا سانس پھول رہا ہے۔'' آگے بڑھ کر قمرالنساء نے اس کی کلائی پکڑ لی اور روک کر کہا۔ وہ دونوں اب بازار میں آچکی تھیں۔

''لو ہم تو بازار آ گئے......'' مہر نے اترا کر کہا۔

''چلو آؤ کچھ خرید لیں۔''

''اگر دیر ہو گئی تو......؟''

''تو خالہ کی جوتیاں تم کھانا...... کیا لو گی؟''

''تمہاری آواز سن کر میاں غلام نے کیا کہا؟''

قمرالنساء بے چاری ڈر کے مارے نیچے دالان میں ہی بیٹھی رہی تھی۔ مہر اکیلی ہی اوپر گئی تھی جہاں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

مکمل ناول

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

کھلے آسمان کے نیچے غلام علی غلام ریاض کر رہے تھے۔ ستار اور غلام علی کی آواز ایک ہو کر نیچے تک آرہی تھی۔ قمرالنساء کو ایسے ہر انسان سے بہت ڈر لگتا تھا جس کا مغل دربار میں آنا جانا ہوتا تھا۔ وہ تو اپنے نواب باپ اور نواب بھائیوں سے بھی بہت ڈرتی تھی۔

"انہوں نے تیوری نہیں چڑھائی مہر! پوچھا نہیں کہ کہاں منہ اٹھائے چلی آرہی ہو۔ نکلو یہاں سے......" قمر کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ ڈری کیوں نہیں، وہ ڈری کیوں نہیں۔

مہر نے سفید انارکلی کا گھیر نیم دائرے میں لہرایا اور پلٹ کر اپنی کم عقل خالہ زاد کو دیکھا۔ اس کا ابھی تک خوف کے مارے دم نکلا ہوا تھا۔ مہر کو ہنسی آگئی اور وہ کھلکھلا اٹھی۔ غلام علی کے ستار کے تار اس کی ہنسی کا ساز بن گئے۔ بڑی مدھر آوازیں آئیں۔ شانوں پر پالکی کا بوجھ اٹھا کر چلتے پالکی بانوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ آگے والے کا پاؤں ذرا ڈگمگا گیا۔

"سب مرد تمہیں دیکھ رہے ہیں مہر! ذرا شرم کرو۔ دیکھو کیسے بیچ بازار ہنس رہی ہو۔" قمرالنساء نے اس کا ہاتھ کھینچ کر ذرا دور لے جانا چاہا لیکن اس نے لاڈ سے اپنا ہاتھ جھٹک کر الگ کیا اور وہیں کھڑی رہی۔

"سچا استاد اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے تیوری نہیں چڑھائی بلکہ بہت خوش ہوئے۔ مجھے کھانے کے لیے شیرینی بھی دی۔ استاد کھانے کے لیے میٹھی چیز دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نے ان کا دل جیت لیا ہے۔ میں انہیں اپنی آواز سنانے نہیں گئی تھی نہ ہی ان سے سروں کا بھید لینے گئی تھی۔ میں تو بس یہ پوچھنے گئی تھی کہ خوف سے آواز بیٹھ جاتی ہے یا سُر...... انہوں نے کہا۔ "آواز" اگر کسی کے گلے میں سچے سر ہوں تو وہ کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ جو ڈرو گی تو گاؤ گی نہیں۔ سہم اور سُر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یا سہم کو رہنے دو یا سروں کو۔ ڈر کو دبا کر آواز تو نکل سکتی ہے لیکن سر نہیں۔ ڈر کو پھلانگ لیا تو آواز ختم ہو جائے گی اور "سر" باقی رہ جائیں گے۔" اس نے قریب سے گزرتے گٹے والے سے گٹا لیا اور دانت سے کتر کر قمر کی طرف بڑھا دیا۔

"ویسے ہی تم کیا کم دلیر تھیں جو اب میاں غلام علی نے تمہیں یہ سبق بھی پڑھا دیا ہے۔"

مہر اب چاندی کی پازیبیں دیکھنے لگی تھی۔ ایک اس نے اپنے لیے لی اور ایک مہر کی طرف بڑھا دی۔

"یہ لو...... کیا یاد کرو گی۔ مہر النساء نام ہوتا ہے میرا......"

"جو ڈومنیوں کی طرح گاتی ہے اور بنجارنوں کی طرح تانیں لگاتی ہے۔" قمر کو گٹا بڑا پسند آیا تھا۔

"ناں ناں۔ اُستاد جی نے کہا ہے کہ گنی کی عزت سب پر واجب ہے۔ میری عزت کرو......" گردن اکڑ کر انگلی لہرا کر جب اس نے "ناں ناں" کیا تھا تو کلیجے جھٹکتے نانبائی کے ہاتھ تھم سے گئے۔

"عزت تو تمہاری بہت ہوگی جب میرے نواب باپ کو تمہارے سریلے گلے کے بارے میں معلوم ہوگا۔" قمر نے نان بائی لڑکے کی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ مہر کا ہاتھ کھینچ کر تیز تیز قدم اٹھاتی بازار سے باہر جانے لگی۔

"نواب ہوں یا شہنشاہ میں اپنے دل میں کوئی خوف نہیں بیٹھنے دوں گی۔" مہر اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی۔ اب وہ بتاشے کھا رہی تھی۔

"سارا عالم تمہیں دیکھ رہا ہے۔" قمر کو بس اسی عالم کی فکر تھی۔

"تو تم انہیں نہ دیکھو......" ایک ہاتھ میں بتاشے پکڑے دوسرے ہاتھ سے اب وہ لڈو خرید رہی تھی۔

"تم کیا کیا کھاؤ گی مہر! بس کرو، جلدی کرو۔ سب ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

"ویسے دنیا بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ دیکھو ذرا اس بازار کو۔ کیسی خوب صورت آوازیں آرہی ہیں یہاں سے۔" ایک پیر پر گھوم کر مہر نے کہا۔ قمر

نے اسے ستائش کی نظروں سے دیکھا۔

"میری والدہ اور تمہاری خالہ۔ وہ ہمارے انتظار میں خوف صورت ہو چکی ہوں گی۔ سانس بھی مشکل سے لے رہی ہوں گی۔"

مہر نے آنکھوں کو مٹکایا۔ "تمہارا جی بھی محل واپس جانے کو نہیں چاہ رہا نا...... سچ بول دو......"

قمر نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرنے کی کوشش کی لیکن پھر نچلا ہونٹ لٹکا کر دائیں آنکھ کو شرارت سے دبا کر وہ ہنس دی۔ "نہیں...... جی چاہتا ہے تمہارا ہاتھ پکڑوں ایک پیر سے چلوں ایک سے اچھلوں اور شہر کا ایک چکر لگا ڈالوں......"

"تو چلو آج ساری بے ایمانیاں کر لیتے ہیں۔ بازار کا ایک چکر لگا لیتے ہیں۔ وہ دیکھو وہاں...... گورے جو کاڑھا پیتے ہیں۔ وہ وہاں ملتا ہے...... چل کر وہ پیتے ہیں۔"

قمر نے سہم کر اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا۔ وہاں سے ایک گورا نکل رہا تھا اور چند سپاہی۔

"وہاں تو صرف مرد جاتے ہوں گے مہر! میں شرارت کر رہی تھی۔ آؤ چلو واپس چلیں۔ یہ نہ ہو میرا نواب بھائی اپنی فوج لے کر ہمیں ڈھونڈنے کے لیے آجائے۔"

"تمہارے سب نواب بھائی ریاست سے باہر ہیں۔ ڈرو نہیں...... چلو میرے ساتھ......" مہر نے اس کا ہاتھ گھسیٹا۔

جس وقت وہ گوروں کا کاڑھا لینے کے لیے چائے گھر میں داخل ہوئیں سب کی گردنیں حیرت سے ان کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ اس چائے گھر کا پہلا واقعہ تھا کہ دو لڑکیاں وہاں چائے پینے آئی تھیں۔ یہ اس ریاست کا بھی پہلا واقعہ تھا۔

"ہمیں وہ چاہیے جو گورے پیتے ہیں......" مہر کی آواز کانپ کر رہ گئی تھی۔ ایک گورا جو کھڑکی کے پاس کونے میں بیٹھا تھا اس نے ذرا سی گردن موڑ کر ان

دونوں کی طرف دیکھا اور زیرلب ہنس دیا۔ اس دنیا کی کوئی چیز اتنی عجیب نہیں ہے جتنی ہندوستان کی عورتیں۔

"گورے تو بہت کچھ پیتے ہیں......" چائے گھر کے مالک نے سوچا کہ موقعے کا فائدہ اٹھا کر تھوڑی شرارت اسے بھی کر لینی چاہیے۔

قمر کو پسینہ آگیا لیکن مہر نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ سیدھا ہو گیا۔

"چ...... چائے...... چائے پیتے ہیں وہ......" گھگھیا کر کہتے اس نے ان کے لیے چائے کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔

مہر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے قمر النساء کو گھورا۔

"خوشیوں کی مدت مختصر کیوں ہوتی ہے؟"

گوروں کا کاڑھا (چائے) وہ ایک گھونٹ پی چکی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے دوسرا گھونٹ بھی پی لیا تو وہ یہیں فوت ہو جائے گی۔

"خوشیوں کی نہیں آزادی کی مدت مختصر ہوتی

ہے...... چلو اب......" چائے سے جلے اپنے حلق کو ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے قمر اٹھی اور اس کا ہاتھ کھینچ کر چائے گھر سے باہر لے آئی۔

☆☆☆

ہر فن آزادی مانگتا ہے، ہر فن کار آزاد کلامی۔

قمر النساء کی والدہ اور اس کی خالہ بے چاری کو ایک پل چین نہیں آیا تھا۔ اس کی روز روز کی منت درخواستوں سے تنگ آکر انہوں نے اسے چپکے سے جانے دیا تھا لیکن اب وہ پچھتا رہی تھیں۔

"تم نے اتنی دیر کردی مہر! اگر کسی کو معلوم ہو جاتا تو......؟" جیسے ہی وہ آئی انہوں نے سختی سے پوچھا۔

مہر نے آس پاس دیکھا۔ وہ بھنے چنے کھا رہی تھی۔

"کسے معلوم ہو جاتا خالہ! نواب محل کے اس زنانہ حصے کو؟ یہ سب جانتی ہیں کہ میں کہاں گئی تھی۔ یا پھر نواب محل کے مردان خانے کو؟ جہاں تک یہ بات پہنچ بھی جاتی تو آپ کوئی زیور دے کر ملازموں کا منہ بند کروا دیتیں۔ اتنا ڈرتی کیوں ہیں آپ......؟" اس نے چنے خالہ کی طرف بڑھائے۔

"تم کیوں نہیں ڈرتیں......؟ کس چیز نے تمہیں اتنا جرات مند بنا دیا ہے......؟" خالہ نے اس کا ہاتھ پرے جھٹکا۔

"اس نے......" اس نے حلق پر ہاتھ رکھا۔ "استاد جی نے کہا ہے کہ اگر یہاں خوف ہو گا تو سر نہیں ہو گا۔ سُر رکھوں یا سر......؟ بتائیں خالہ؟"

"پہلی ملاقات میں ہی یہ سبق پڑھا دیا انہوں نے۔ دوبارہ سوچنا بھی مت کہ وہاں جانے دوں گی۔"

"انہوں نے کہا، مجھے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی کہا کہ کچھ لوگ پیدائشی سریلے ہوتے ہیں۔ ان کے سر پکے ہوتے ہیں۔ شدھ...... سا اور پا کی طرح...... میں بھی شدھ (خالص) ہوں۔"

"زہر کا جو پیالہ پینے کے لیے ملے گا اس کا اثر بھی "شدھ" ہو گا۔" قمر النساء نے بلند آواز میں کہا۔

نواب کی بیویاں اور بیٹیاں اور کچھ ملازمائیں جو جھروکوں میں ادھر ادھر بیٹھی، کھڑی، ٹہل رہی تھیں ہنسنے لگیں۔ دور سامنے دریا بہہ رہا تھا، ادھر ان کے نقرئی قہقہے۔

"زہر اور وہ بھی شدھ...... سا اور پا کی طرح......"

نواب کی دوسری بیوی نے خالہ کے شانے پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر مذاقاً کہا۔

"کیا سیکھ کر آئی ہو...... سنا دو ہمیں بھی کچھ......"

نواب کی پہلی بیوی نواب بیگم تخت پر بیٹھی سونے کے پانی میں سونے کے زیور دھو رہی تھیں۔

"ابھی...... اس وقت......؟" مہر نے ایڑی کے بل گھوم کر نواب بیگم کی طرف دیکھا۔

نواب بیگم نے بہت محبت سے مہر کو دیکھا۔

"تمہیں باہر کی ہوا لگ گئی ہے اور تم بڑی پیاری لگ رہی ہو۔ کسی چڑیا کی طرح پھدک رہی ہو۔ کوئل کی طرح چہک رہی ہو۔ نظر نہ لگے......"

"باہر کی ہوا اور بازار کا نمک۔ اس نے ساری بچوں والی چیزیں خرید خرید کر کھائی ہیں۔"

"بچی ہے تو بچوں والی چیزیں ہی کھائے گی۔ کچھ تم بھی کھا لیتیں یا تم صرف مرچیں چباتی رہی ہو۔" نواب بیگم نے ہنس کر کہا۔

مہر منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ قمر نے گھور کر اسے دیکھا۔ "ہم نے گوروں کا جوشاندہ بھی پیا...... بڑا بد مزہ تھا......" قمر نے راز نہ رکھا اور سب اگل ہی دیا۔

سب کی سب حیرت سے دونوں کو دیکھنے لگیں۔

"تم وہاں بھی گئی تھیں...... کوئی گورا دکھا......؟"

"ہاں ایک دکھا لیکن پشت سے...... ہم آرہے تھے، وہ جا رہا تھا......" قمر نے جل کر کہا۔

"وہ سننے سنانے والی بات تو رہ ہی گئی۔ اتنے بڑے گائیک سے مل کر آئی ہو۔ اب کچھ سنا بھی دو......" قمر کی چھوٹی بہن نے کہا۔

"راگ کلیان سنا دوں...... پر یہ رات کا راگ ہے۔" وہ نواب بیگم کے ساتھ تخت پر بیٹھ گئی اور سونے کے پانی سے دھلا ہار اٹھا کر اپنے گلے کے ساتھ لگا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لیا۔

"اچھا چلو، رات کوئی نہیں ......" نواب بیگم نے جھومر اس کی پیشانی پر لٹکا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

رات...... ہر رات کی طرح ...... ورنہ چاندنی رات کی طرح......

کچھ لوگ پیدائشی سریلے ہوتے ہیں اور کچھ سر ان پیدائشیوں کے لیے بڑے کٹیلے ہوتے ہیں۔ زہر کے پیالے میں رکھے ہوئے ملتے ہیں۔ موت کی طاق پر تان سے تان ملاتے ہوئے ...... ایسے ہی سر اس کے گلے میں تھے...... شدھ لیکن کٹیلے......

☆☆☆

رات کلیان راگ تھی...... جس نے ہر ساعت پر اپنی چوکڑی جما دی تھی......

دن راگ ساز گری تھا...... امیر خسرو کے راگ کا ہم جولی......

اسے صبح سے اس لیے بھی بہت پیار تھا کہ وہ نیم گرم پانی سے گلے کو تر کر کے، مور محل کے سب سے بلند جھروکے میں بیٹھ کر دور بہتے ہوئے دریا کو دیکھ کر گانے لگتی تھی۔ اسے دریا کی روانی بہت پسند تھی۔ اُڑتی ہوئی چڑیاں، اور دریا کی موجوں کی گنگناہٹ۔ اس کے کالے سیاہ بالوں کی لٹیں صبح کی تازہ ہوا کے ساتھ ساتھ لہراتیں اور اس کی سریلی سانسیں سروں کی ہم جولی ہو جاتیں......

اس کی آواز کی کوک، سنگ مرمر کے احاطوں کو پار کرتی، دالانوں سے ہوتی، چقوں اور پردوں سے ڈھکے کمروں میں بستروں پر دراز نواب زادیوں کے کانوں تک جاتیں اور وہ خواب ناک کروٹیں بدلنے لگتیں۔ روشنی سے پہلے اس کے سر جاگ اٹھتے تھے۔

اس کے سر ان کے خواب جگا دیتے تھے۔

وہ نواب محل کے اس مور محل کی کوئل تھی۔ پرکھا رت...... دل کی ترنگ...... من کی امنگ......

جتنا بڑا یہ مور محل، نواب محل اور دریا کا پاٹ تھا، اس سے کہیں بڑے اس کے سر تھے۔

وہ نواب کی تیسری بیوی عصمت کی رشتے کی بھانجی تھی۔ یتیم اور مسکین۔ اس کے والد مغلوں کی فوج میں تھے۔ ایک چھوٹی سی جھڑپ میں مارے گئے تھے اور ماں کو باپ کے غم نے مار دیا تھا۔ خالہ اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ خالہ کی تین بیٹیوں کے ساتھ پل کر وہ بڑی ہوئی تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ مدرسے جا چکی تھی۔ بہت فرماں بردار اور سمجھ دار بچی رہی تھی۔ مور محل میں سب اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اس کے بات کرنے کا انداز اور آواز کا اتار چڑھاؤ سننے والوں کو اس کی محبت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

وہ بدتمیزی، تکرار، لڑائی جھگڑا بھی کچھ اتنے سریلے انداز میں کرتی تھی کہ اسے داد دینے کو دل چاہتا تھا۔ گلے سے اتار کر موتی مالا، انگلی سے اتار کر کوئی انگوٹھی۔ شروع سے ہی وہ سونے چاندی میں تُلنے لائق رہی تھی۔ سب کا ماننا تھا کہ چونکہ وہ اس محل میں پیدا نہیں ہوئی، اس کی رگوں میں نوابی خون نہیں ہے، اس لیے وہ سب الگ ہے۔ کچھ نڈر اور کچھ حوصلہ مند ہے۔

ایک دن نواب بیگم کے سر میں درد سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ بے چاری رات سے ہی رو رہی تھیں۔ اگلے دن ان کی والدہ کی برسی تھی اور سسکیاں بھر بھر کر انہوں نے خود کو بے حال کر لیا تھا۔ وہ ان کے سرہانے بیٹھ کر خالہ والی لوری سنانے لگی۔ ایک ہاتھ سے ان کے سر کو تھپکنے لگی۔ ماں کی یاد کی تڑپ پر ٹھنڈی پھوار پڑ گئی تھی یا غم کو سہارا مل گیا تھا۔ کچھ بھی ہوا تھا، وہ اس کی لوری سے بچوں کی طرح سو گئیں۔ تب ہی سے وہ نواب بیگم کو بہت پیاری ہو گئی تھی۔ اب جب جب وہ آہیں بھرتیں، سسکیاں لیتیں، اس کی لوری سنتیں۔ خالہ ماں کی جان البتہ حلق میں آ گئی تھی۔

"تم نے لوری کیوں گائی مہر! آئندہ چپ رہنا۔ کوئی شکایت ہو گئی تو شامت آ جائے گی۔ میرا شوہر اس ریاست کا نواب ضرور ہے

لیکن میں "نواب بیگم" نہیں ہوں۔ اس محل میں میری حیثیت "نواب بیگم" کی حیثیت سے بہت کمتر ہے۔ شکر کرو کہ تمہیں یہاں رہنے کی اجازت ملی ہوئی

ہے۔ دیکھو، یہاں کوئلوں کو کوک کی اجازت ہے نہ لڑکیوں کو چہکار کی۔ بس چپ رہا کرو......"

وہ چپ ہو گئی۔ اتنی چپ ہو گئی کہ یقین ہونے لگا تھا کہ وہ گونگی ہو چکی ہے۔ حکیم جی نے آ کر دیکھا۔ اس کے گلے میں زخم ہوا تھا۔ انہوں نے دوا دی۔ زخم اور گردن دونوں پھول گئے۔ جو دیکھتا ڈر جاتا۔ نواب بیگم نے اسے اپنے پاس بلا کر بٹھایا۔ کھانے کے لیے مٹھائی دی۔ وہ اس کا چہکنا' پھدکنا سب بہت پسند کرتی تھیں۔ بار بار کہتی تھیں۔

"آکاش کی کوئل' اس محل کے پنجرے میں آ کر بند ہو گئی ہے۔"

آکاش کی کوئل اپنی آواز گم کر بیٹھی تھی۔ بہت حکیمی نسخے آزمائے' جوشاندے بنا بنا کر دیے لیکن اس کے حلق کا زخم بڑھتا ہی گیا۔ ایک دن رات گئے وہ بستر میں منہ دیے کر رو رہی تھی۔

قمر النساء نے سنا کہ سسک رہی ہے۔ منہ پر سے چادر اٹھا کر دیکھا' ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اسے لے کر دھوبی گھر آ گئی۔ یہاں دن میں ملازم کپڑے دھویا کرتے تھے۔

"یہاں گاؤ۔ دُور دُور تک کوئی نہیں ہے' تمہیں کوئی نہیں سن سکے گا۔ سنے گا نہیں تو خفا بھی نہیں ہو گا۔ خفا نہیں ہو گا تو شکایت بھی نہیں کرے گا۔ گا لو مہرا لنساء! تمہارے حلق کا زخم دیکھا نہیں جاتا۔"

مہر النساء کو ہنسی آ گئی۔ اس نے گانے کی کوشش کی تو آواز بڑی مضحکہ خیز سی نکلی۔ حلق میں درد کی ٹیسیں بھی اٹھیں۔

قمر النساء نے اس کی کمر پر ایک دھموکا دیا۔ "اب گاؤ نا۔ رو رو کر مری جا رہی تھیں۔ وہی گاؤ جو سب دھوبی اور ساری دھوبنیں گاتی ہیں۔"

رات کے اس پہر بھی قمر آنکھیں مٹکانا نہیں بھولی تھی۔

دھوبی گھر میں کپڑے دھوتے ہوئے وہ سب کچھ گیت گاتے تھے۔ اس جیسی ساری بچیوں کو وہ گیت آتا تھا۔ جب دھوبی کپڑوں کو جھٹک جھٹک کر پتھر پر مارتے جاتے اور گاتے جاتے تو دیوار کی کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ میں کھڑی وہ سب بھی گاتی جاتی تھیں۔ یہ سب ان کے بچپن کا ایک کھیل تھا۔

وہ پتھر کے ایک حوض کے کنارے بیٹھ گئی۔ لمبی سی سانس لے کر' آنکھ بند کر کے دھوبی گھر کے گیت کو پوری طرح سے یاد کیا اور پھر دھیمی آواز میں گانا شروع کیا۔

سر اگر اتنے ہی برے ہوتے تو کوئل سریلی نہ ہوتی......

دور اندر' محل کے کمروں میں سوتی نواب زادیاں' خالہ بی' نواب بیگم اور بیس بائیس ملازمائیں شاید جانتی تھیں کہ وہ دونوں یہاں ہیں۔ شاید کبھی وہ بھی یہاں آنا چاہتی تھیں۔ پانی کے حوض میں پاؤں ڈبو کر بیٹھنے' چودھویں کے چاند کو حوض کے پانی میں جھلمل دیکھنے اور تھوڑا بہت گنگنانے کے لیے۔ پھر وہ جوان ہو گئیں۔ ان کی شادیاں ہو گئیں۔ کوئی نواب بیگم بن گئی' کوئی بوا' کوئی خالہ' کوئی چچی' اور کوئی ماں بن......

اتنا کچھ بننے کے بعد وہ حوض تک کیسے آ سکتی تھیں۔ ان کے اندر کی عورت نواب محل کے کے مردانے کی دہلیز پر دفن ہو چکی تھی۔ مور محل ان کا پنجرہ بن چکا تھا۔ انہیں دریاؤں کو محل کی چھتوں اور جھروکوں سے دیکھنا تھا۔ آسمان کو احاطوں سے۔ زمین کو سنگ مرمر سے اور خود کو روایتوں کے آئینوں میں۔

"روز یہاں آ جایا کریں گے۔ ورنہ تہہ خانہ بھی تو ہے......" قمر النساء نے حوض کے پانی میں پیر سے بھنور بنانے کی کوشش کی۔

وہ تہہ خانے میں جانے لگی۔ ایک ایک کر کے مور محل کی ساری بچیاں اس کے ساتھ آ کر مل گئیں۔ اگر یہ کھیل تھا تو وہ سب اس کھیل سے بہت خوش تھیں۔ اگر یہ فن کی قدر دانی تھی تو وہ سب قدر دان بن گئیں۔ مہر کو سروں کی ملکہ بنا کر وہ بہت خوشی سے اس کی رعایا بن گئیں۔

دس پندرہ دن بعد' سب رات کو اٹھتیں اور تہہ

خانے میں باقاعدہ محفل لگا لیتیں۔ کبھی کبھار وہ اپنی ماؤں کے رنگین دوپٹے' زیور' اور غازے بھی چرا کر خود کو سجا لیتیں۔ مہر النساء پرانے قالین پر درمیان میں بیٹھ جاتی تھی۔ باقی سب خیالی گاؤ تکیے سے کمر جوڑ لیتی تھیں۔ اپنے باپ اور بھائیوں کی نقل اتارتی تھیں۔ نین تارا نے تو حقے کی نے تک منہ میں دے لی تھی۔

اس محفل کو چلتے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اوپر والوں کو معلوم ہو گیا۔ کچھ دن ان کا کھانا پینا بند کیا گیا لیکن پھر مہر النساء کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ نواب بیگم مہر النساء پر کیا سختی کرتیں۔ معصوم صورت اور میٹھی آواز۔ وہ گاتی ہے تو گائے بس بات مور محل سے باہر نہ جائے۔ ویسے بھی محل کی ہر عورت کو نواب محل کے ایک ایک مرد سے بڑے شکوے تھے۔ انہیں پنجروں میں بند کر کے' وہ خود آزاد پنچھی کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔ انہیں ریشم اور کمخواب کے ڈھیر میں دبا کر خود وہ اس زمین اور پورے آسمان پر راج کرتے تھے۔

"اسے یہ اجازت نہ دیں۔ کسی کو معلوم ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔" خالہ ماں کے دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔

"اس جگہ اچھا ہوتا کیا رہا ہے عصمت! تین مہینے ہو گئے' نواب کی شکل دیکھی ہے نہ بیٹوں کی۔ نواب سراج اپنی بیوی کو بھول گئے ہیں' مان لیا لیکن بیٹے ماں کو' یہ ماننے کو دل نہیں مانتا۔ سب یاد رکھنے کو ہم ہیں۔ قاعدے بھی اور قانون بھی۔ ہم سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اٹھیں اور سورج ڈوبتے ہی سو جائیں اور وہ سورج ڈوبتے ہی جو چاہیں کریں۔ محفلیں لگائیں' شکار کے لیے جائیں' میلے دیکھیں اور ہم کھڑکیوں اور چوباروں کی اوٹ میں کھڑے ہو کر آہیں بھر بھر کر ان کا انتظار کریں۔ دل کی چاندی کو کھوٹا کر لیا ہے۔ خوابوں کے کندن کو زنگ آلود..... اب اور بتاؤ کیا کیا کریں....."

"صدیوں سے یہی سب چلتا آیا ہے آپا!"

"ہاں تو چلے۔ مجھے مہر النساء کی آواز پسند ہے۔ وہ گاتی ہے تو میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رو بھی دیتی ہوں۔ ہمیں یہ بھی میسر نہیں کہ کوئی گائے اور ہم رو دیں..... جواب دو..... راگ اور راگنیاں' ملہار اور بہاگ..... کوئی گائے اور ہمیں بھی سنائے....."

"کیا کریں گی وہ کر کے جو نواب کرتے ہیں۔"

خالہ ماں نے گہرا سانس لیا۔

"جہنم میں جائیں سب نواب۔ یہ ریاست' یہ انتظام۔ میرا دل تو دہائیاں دیتا ہے۔ اتنی بھی اجازت نہیں کہ بنجاروں کو بلا کر سن لوں۔ بنجارنوں سے ہاتھوں پر مہندی لگوا لوں۔ ان جیسی جھمکا بالی ہی کان میں ڈال لوں۔ انگریزوں کی دعوتوں میں یہ تو میموں کی کمروں میں ہاتھ ڈال ڈال کر ناچتے ہیں۔ ہمیں مور ناچ دیکھنے سے بھی پرہیز ہے۔ واہ....."

سب کھی کھی کرنے لگیں۔ "سنا ہے وہاں کوئی نہ ناچے تو اس کی سبکی ہوتی ہے۔"

"اچھا ہے..... اور ہو سبکی۔ ہمارے سامنے تو مونچھوں کو بل دیتے ہوئے ہاتھ نہیں تھکتے۔ وہاں ایڑیوں کے بل ٹھمکتے ہوں گے..... تاتھیاں..... تھیاں..... تھاں....." نواب بیگم نے دونوں ہاتھوں کی تھاپ بجا کر نقل اتارتے ہوئے کہا۔

سب کے بلند بانگ قہقہوں سے مور محل کی دیواریں گونج اٹھیں۔

"ان نوابوں کے تو بس کیا کہنے۔ جوناگڑھ کے نواب مہابت خان رسول کو اپنے کتوں سے اتنی محبت ہے کہ انہیں الگ کمرے دیے ہیں۔ ملازموں کی فوج دیکھ بھال کے لیے موجود ہے۔ نواب کا چہیتا کتا "روشنارا" کی تو باقاعدہ نواب نے شادی کی تقریب بھی کی ہے۔ شادی کی دعوت میں کئی لوگوں کو بلایا۔ کسان کھیتوں' کھلیانوں میں خون پسینہ ایک کر رہے ہیں اور یہ کتوں کی شادیاں کروا کر دعوتیں اڑا رہے ہیں..... رعایا بھوکی مرے ان کی بلا سے....."

"مانا کتا وفادار ہے' لیکن انسان ایسا بھی بے وفا نہیں کہ اس پر جانور کو فوقیت دی جائے۔"

نواب بیگم نے گہرا سانس لیا۔ "یہ بات تم کسی نواب کے سامنے کہہ کر تو دیکھو۔ اندھیری کوٹھڑیاں بنوا کر رکھی ہیں۔ ایسے کٹیلے سچ بولنے والوں کو اٹھا کر ان کوٹھڑیوں میں پھنکوا دیتے ہیں۔ بہت اچھا ہوا جو گورا یہاں حکمران بن کر آ گیا۔ اب وہ ہش ہش بھی کرتا ہے تو یہ واہ واہ کرتے ہیں۔"

سب ایک بار پھر سے ہنسیں۔ نواب بیگم کا حس مزاح بھی کمال کا تھا۔

"ہم اس چار دیواری میں گائیں یا ماتم کریں۔ یہ ہماری آپس کی بات ہے...... بس...... نہ کسی کا دل لبھانا ہے نہ داد لینی ہے۔ جو ہے وہ ہمارے لیے ہے۔ سن لو سب...... کیا نواب کی محفلیں ہوتی ہوں گی جو اب مور محل میں ہوں گی۔ دیکھتی ہوں میں کہ نواب اور اس کے چہیتے ملازم میرا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔"

"مہر تم نے نواب ماں کو بھڑکا دیا ہے۔" قمر نے مہر کو کہنی سے ٹھوکا۔

"ٹھنڈے پانی کی پھوار ہے میرے پاس۔ سنیں گی تو ٹھیک ہو جائیں گی۔ اور تم مجھے نہ بھڑکاؤ۔ سمجھیں۔" اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔

☆☆☆

ریشم کے رنگین آنچلوں، گوٹا کناری لگے غراروں، اور چاندنی کی پازیبوں، سے سجی بنی نواب زادیوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ ان کی محفل نواب کی محفل سے کسی طرح کم ہو جائے۔ چاندنی رات میں، دریا کے رخ پر وہ قالینوں پر بیٹھ گئیں کہ رات بیت گئی اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔

کبھی دن چڑھے کبھی دن ڈھلے۔ کبھی پہلے پہر، کبھی آخری پہر۔ مور محل میں مہر النساء بہت ضروری ہو گئی تھی۔ نواب بیگم کو یہ غرور تھا کہ کیا نواب سراج کی محفلیں ہوتی ہوں گی جو ان کے یہاں ہوتی ہیں۔ دنیا جہاں کے گائیکوں کو ہاتھی گھوڑے بھیج کر بلوانے والا نواب، اصل گائیک کی گرد سے بھی دور ہے۔ نواب صاحب کے نصیب میں تھا ہی کیا۔ کچھ وہ جو سالوں سے ریاض کر رہے تھے اور کچھ وہ بے سرے جو تان سین کی قبر کے کنارے لگی املی کو چبا چبا کر کھا گئے تھے اور سریلے بن کر گائیک بن بیٹھے تھے۔ نواب صاحب کو وہی مبارک ہوں۔ سچی، سریلی، شدھ آواز انہیں کبھی نصیب ہونے والی نہیں تھی۔

جیسے عورتیں اپنا زیور سنبھال کر رکھتی ہیں، ایسے ہی انہوں نے مہر کی آواز کو سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ اس کی آواز ہر دل اور ہر دھڑکن کو بھا گئی تھی۔ وہ سب کے دلوں کو جا لگی تھی۔ ساون کے جھولوں اور شام کی لالی کی طرح، وہ ضروری ہو گئی تھی۔ دریا رخ بنے جھروکوں اور بے وجہ کے قہقہوں کی طرح...... وہ عام ہو گئی تھی...... پریم راگ کی طرح، سب کی دل پسند اور منہ چڑھی۔

مور محل کی ایک ایک عورت، ملازمہ، بوا، ماسی، چچی، کو اس پر ناز تھا۔ اس کی ہم عمر ساری لڑکیوں اور اس کی عمر سے بڑی ساری عورتوں کو۔ وہ ان کے لیے ہنسنے اور رونے کا سامان تھی...... وہ ان کی برہا اور بہاگ بھی۔

بات نواب محل کے خاص ملازموں تک بھی پہنچ چکی تھی لیکن انہوں اسے ایسے کسی وقت کے لیے اٹھا رکھا تھا کہ کسی کی جان سولی تلے آ جائے تو وہ یہ راز اگل کر اپنی جان بخشی کرا لیں۔

ایک بار نواب سراج کے کان میں اڑتی اڑتی خبر پہنچی تھی کہ مور محل میں کوئی گاتا ہے۔ نواب سراج نے مور محل کی ایک ایک ملازمہ کو بلا کر پوچھا تھا۔ کچھ سختی سے کچھ نرمی سے۔ کچھ لالچ دے کر، کچھ سزا سے ڈرا کر لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اتنی ساری عورتیں ایسے مصمم ارادے کے ساتھ لاعلم نہیں ہو سکتی تھیں۔ کوئی نہ کوئی ڈر جاتا، ورنہ لالچ میں تو ضرور آ جاتا۔ نواب سراج کو بہت حیرت ہوئی۔

"کس چیز کی تلاش میں ہیں آپ؟ کب تک یہ پوچھ پڑتال ہوتی رہے گی۔" نواب بیگم نے اپنا غصہ دبا کر نواب صاحب پر ہلکا سا طنز کیا۔

"مور محل سے کوئی آواز باہر نکلی تو سب کی قبریں اندر بنیں گی۔" نواب صاحب کے ہاتھ اب تک کوئی

سرا نہیں آیا تھا۔ انہوں نے ہوا میں تیر چلایا۔

"آپ کو موسیقی سے نفرت ہے یا گانے والوں سے...." نواب بیگم پر اب کوئی تیر اثر کرنے والا نہیں تھا۔

"گانے والوں سے نہیں.... گانے والی سے...."

"ایک ہی کام ایک پر جائز اور دوسرے کے لیے ناجائز کیسے ہو سکتا ہے۔ حرام اور حلال میں جنس کا فرق نہیں آتا۔ خنزیر مادہ بھی حرام ہے اور نر بھی...."

گلابی بنارسی کرتے پر کندن کا یہ ہار انہوں نے آج ہی پہنا تھا۔ نواب بیگم سے زیادہ وہ ملکہ ہندوستان لگ رہی تھیں۔ ان کی آواز میں ایسی کاٹ تھی جو تلوار کی میان سے نکلتے وقت ہوتی ہے۔

نواب سراج نے لب بھینچ لیے۔ بیگم کے تیور کو تیورا کر دیکھا۔ "تو یہاں کوئی گانے والی ہے....؟ آپ چھپا رہی ہیں۔"

"میں تو پوچھ رہی ہوں۔ بلکہ جاننا چاہتی ہوں کہ اگر یہاں سے ایک گانے والی نکلی تو ہم سب اپنی جان سے جائیں گی۔ آپ کے ہاں سے تو ہر چودھویں کے چاند گانے والے نکلتے ہیں.... وہاں کون جان سے جاتا ہے؟"

نواب سراج نے اپنی چہیتی کے رویے کو غیر معمولی باغی پایا۔ "عورتیں سوال پوچھتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔"

"مرد سوال نظر انداز کرتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ اگر میرے سوال کا جواب آپ کے پاس نہیں ہے تو مجھ سے کیوں جواب طلب کرتے ہیں؟ میں آپ کی بیوی ہوں یا باندی ہوں؟"

نواب سراج نے بیوی کے انداز کی بغاوت کو صاف صاف محسوس کر لیا تھا۔ "میں سختی کا قائل نہیں لیکن یہ بات یاد رکھی جائے کہ میں زبان سے نہیں پھر سکتا۔ قانون نہیں توڑ سکتا۔ اس محل کے جو قانون میرے باپ دادا نے بنائے ہیں ان پر ہر حال میں عمل ہوگا۔ آپ انہیں توڑیں یا مسخ کیے بغیر چپ چاپ ان پر عمل کرتی اور کرواتی رہیں۔ یہی ہم سب کے لیے اچھا ہوگا۔"

"کوئی قانون آپ کے لیے بھی تو بنا ہوگا؟ جس وقت آپ پیانو اور والٹز پر کسی لارڈ کی بیوی یا جنرل کرنل کی گوری میم کا ہاتھ پکڑ کر رقص کرتے ہوں گے اس وقت کے لیے کوئی قانون تو بنا ہوگا۔ اگر نہیں بنا تو بنا لینے میں کیا حرج ہے؟"

وہ چھالیہ نہیں کھاتی تھیں لیکن اشارے سے انہوں نے اپنے لیے چھالیہ منگوائی اور انہیں ایسے چبانے لگیں جیسے لفظ چبا رہی تھیں۔

"عورت کاف سے کثاری ورنہ بے سے باندی ہوتی ہے بیگم! میں ان دو قسموں کے علاوہ کوئی تیسری قسم نہیں جانتا۔" نواب سراج نے پورے جلال سے جتایا۔

"مجھے باندی کہہ رہے ہیں...." وہ سمجھ گئیں کہ انہیں کثاری تو سمجھا نہیں گیا۔ ان کا دل اتنا دکھا کہ آواز رندھ گئی۔

نواب صاحب نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور چلے گئے اور کیوں دیتے۔ انسان نواب ہو تو اس کا تجربہ اور خیالات حرف آخر ہوتے ہیں۔ ریاست ہو رعایا ہو محل ہوں گھوڑے بگھیاں ہوں تو انسان ویسے ہی صرف انسان نہیں رہتا۔ دیوتا بن جاتا ہے۔ وہ قربانی وصول کرتا ہے ورنہ قربان کر دیتا ہے.... تیسری کسی قسم کو وہ جانتا نہیں....

مہر نے نواب صاحب کے یہ الفاظ اپنے کانوں سے سنے تھے۔ وہ بھی اس سختی کی وجہ نہیں سمجھ سکی تھی۔ نواب سراج خود گائیکوں کے فن کے مداح تھے۔ کتنے ہی گائیک تھے جن کے باقاعدہ وظیفے مقرر تھے۔ چند ایک کو تو جاگیریں تک دے دی گئی تھیں۔ نواب سراج کو البتہ طوائفوں سے چڑ تھی۔ کہتے تھے عورت گائے تو سُر بھوسروں میں کھانڈ پڑ گئی۔

وہ سات سروں کو سات دیویاں نہیں سات مہاراج مانتے تھے۔ انہیں راگ پسند تھے راگنیاں نہیں۔ جہاں سر کومل ہو جاتے وہاں ان کی تیوری پر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بل پڑنے لگتے تھے۔ ساتوں سر شدھ تھے۔ جب تک انہیں ایک مردگا نیک گائے نا کہ عورت گا نیک۔ ایسی صورت میں محل میں کسی ایسی آواز کا پایا جانا جو "سا" اور "پا" کے ساتھ باقی کے پانچ سروں کی بھی ملکہ تھی کیسے ممکن تھا کہ ناپسند نہ کی جاتی۔

شاید نواب سراج کا اندر کہیں یہ مانتا تھا کہ جب "سُر" عورت کے حلق سے نکلے تو اس کا سر اتار دو۔

"سن لی ناں آپ نے نواب کی باتیں۔ اب یہ سب یہیں روک دیں آپا!"

خالہ بڑی بے چارگی سے نواب بیگم کو دیکھ رہی تھیں۔ محل کی ایک ایک عورت نے نواب صاحب کی باتیں سن لی تھیں اور ٹھوک دینے کے انداز سے اپنے سر کو جھٹکا تھا۔ اب انہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ سانس کیسے لیں۔ رات کو کس کروٹ سوئیں۔

"مجھے نواب صاحب سے ڈرانے کی کوشش نہ کرو عصمت! عمر کے پینتالیس سال نواب باپ، نواب بھائی، نواب شوہر اور نواب بیٹوں سے ڈرتے ہوئے گزار دیے۔ عمر کی چالیس ساعتیں ان سے ڈرے بغیر گزارنا چاہتی ہوں۔"

"محل میں رہنے والی عورتیں ایسی باتیں نہیں کرتیں آپا! ایسی باتیں تو مظلوم رعایا کا نصیب ہیں۔"

"ظلم تب ہی ظلم کہلائے گا جب وہ جان پر ہو گا یا پیٹ پر؟ بولو...... جو روح پر ہوں وہ بھی ظلم ہی ہوتے ہیں۔ سارے قاعدے قانون ہمارے لیے بنا دیے بس۔ میری والدہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اکیلی مر گئیں، اور میرا نواب باپ ریاست کے جشن میں مصروف رہا۔ میں بھی ایسے ہی مر جاؤں گی، تم بھی ایسے ہی مرو گی۔ تو ٹھیک ہے۔ مرنا ہی طے ہے تو طریقے سے مرتے ہیں۔"

پردے کی اوٹ سے مہر نے نواب بیگم کی بھیگی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ جب بھی کوئی اداس گیت گاتی تھی تو نواب بیگم پہروں روتی رہتی تھیں۔ دل کا کرب آنسوؤں سے ڈھل جائے تو یہ بھی بڑی نعمت ہے۔ ورنہ کرب ناسور بن جاتا ہے۔ زخموں کی دوا مل جاتی ہے، زخموں کو دعا لگ جاتی ہے...... ناسور کو دوا ملے نہ دعا لگے......

☆☆☆

مہر نے کسی خاص تان، پکڑ، تان، اندولن، خیال گائیکی وغیرہ کی تربیت نہیں لی تھی لیکن اگر وہ کسی استاد کے سامنے پیش ہو جاتی تو وہ اس سے ضرور پوچھتے کہ مور محل میں ایسے بند رہتے ہوئے اس نے سروں میں ایسا کمال کیسے حاصل کر لیا ہے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ سارے گاما پا دھانی سا کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ جانتی تھی اس کے اندر لہر سی اٹھتی ہے تو وہ اپنی سانس کے ستار سے آواز ملا کر سُر جگا لیتی ہے۔ راگ باندھ دیتی ہے۔ کومل کو تیور میں اور تیور کو اندولن بنا لیتی ہے۔

پھر اگر صرف وہ آ...... آ کی تان کرتی رہتی ہے تو سب کو رلا دیتی ہے، سب کو ہنسا دیتی ہے۔ کسی کو ماہی اور کسی کو رانجھا یاد دلا دیتی ہے۔ کوئی ہیر، کوئی جوگن ہو جاتی ہے...... کوئی جل جاتی ہے، کوئی جلا دیتی ہے...... اگر وہ صرف...... آ...... آ...... کی خیال گائیکی کر لیتی ہے تو گیت اور میت ایک کر دیتی ہے۔

اپنے گیت وہ محل کی ملازماؤں کے ذریعے اکٹھے کرتی تھی۔ ان کا شہر اور بازار میں آنا جانا تھا۔ وہ اسے کچھ نہ کچھ لکھ کر لا دیتی تھیں۔ کبھی ساتھ دھن بھی مل جاتی تھی۔ کبھی اسے دھن خود بنانی پڑتی تھی۔ کبھی کوئی راگ بھی ہاتھ آ جاتا تھا۔ کبھی کوئی لوک گیت، ٹپہ، ٹھمری اور کبھی ہیر...... ایک بار ملازمہ نے اسے بنجارن کا گیت گا کر سنایا۔ اسے وہ اچھا لگا۔

"گیت ادھورا ہے۔ تم نے ٹھیک سے نہیں سنا۔ بنجارن کو ڈھونڈ کر گیت ٹھیک سے لکھ لینا۔"

انعام کے لالچ میں ملازمہ نے بڑی مشقت سے بنجارن کو ڈھونڈ ڈھانڈ گیت گانے کے لیے کہا تو وہ بڑا تڑخ کر بولی۔

"کس لیے؟"

"نام نہیں بتا سکتی۔ وہ پردے میں ہیں...... تم بس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گا دو' میں بول لکھ لوں گی۔"

"میرا گیت بھی پردے میں ہے۔ دوبارہ مجھے ایسے سرِ راہ روک کر گانے کے لیے نہ کہنا۔ ہم اپنی خوشی اور مرضی سے گاتے ہیں۔ ہمارے گیت آزاد پنچھی ہیں۔ سب بیچ دیں گے اپنی آزادی نہیں۔ گردن پر ہاتھ چلتا ہے' حلق پر حکم نہیں۔"

ملازمہ کو بنجارن کی بدتمیزی پر بہت طیش آیا۔ مہر النساء نے سنا تو ہنس دی۔

"فنکار کو پہلے عزت دو پھر عرضی۔ تم نے دھونس جما کر کہا ہوگا کہ سنا دو۔ فنکار مشہور و معروف ہو یا غیر معروف۔ وہ بنجارا ہو یا گوالیار کا گائیک۔ اپنے فن میں بادشاہ ہوتا ہے۔ اور بادشاہ کے حضور پہلے آداب بجالاؤ۔ دوبارہ ملے تو یہ دے دینا۔ کہنا میں نے گرو دکشنا دی ہے۔ پھر وہ سنا دے گی۔ پھر بھی نہ سنائے تو کہہ دینا' "جو اپنے فن کو صرف اپنی میراث سمجھتا ہے' وہ پاگل اور دیوانہ ہوتا ہے۔"

ملازمہ نے اگلی بار دل پر پتھر رکھ کر اس گندی سندی' گلی گلی پھرنے والی بنجارن کو روک کر بہت تمیز سے گرو دکشنا میں چاندی کے زیور دیے۔ مسکرا کر عزت' اور تمیز سے عرضی۔ بنجارن کچھ متاثر ہوئی۔ نیم والبوں سے مسکرا دی۔

گیت جوگی تھا...... بول بنجارے......

اس رات چودھویں کے چاند میں' فوارے کے سامنے قالین پر بڑے ادب سے بیٹھے اس نے سب نواب زادیوں اور نواب بیگموں کے دلوں کو مٹھی میں لے لیا تھا۔ کوئی زیرلب بڑبڑا رہا تھا' اور کوئی زیر دل......

دل بنجارا...... دل کا نگر نقارہ......

یہ جہاں سارا...... وہ جہاں سارا...... تم پر وارا...... تم پر وارا......

نواب بیگم نے جیسے اپنی سانسیں روک لیں۔ عشق تو کبھی ان پر بھی وارد ہوا تھا۔ یہ الگ رہا کہ وہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ محبت کے سر تال ان کے دل کے ستار پر بھی بجے تھے' یہ الگ بات کہ گیت پورا نہ ہو سکا۔ ہر راگ کو گائیک کہاں نصیب ہوتا۔ ہر محبت کو منزل کہاں ملتی ہے...... پھر بھی...... محبت اور محبوب بھلائے نہیں بھولتے......

"تمہارے بنجارے سروں نے میرا دل بہاراں کر دیا ہے مہرا!" ہاتھ کی ایک انگوٹھی اتار کر انہوں نے مہر کے سامنے رکھی۔ وہ جتنی خوش تھیں اتنی ہی آب دیدہ بھی۔

"تمہارے گیت نے مجھے پھر سے یاد دلا دیا ہے کہ نوابوں کے گھر پیدا ہونے کی کتنی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ نواب بیگم بننے کے لیے پہلے دل مارنا پڑتا ہے پھر درد دل......"

مہر نے کچھ حیرت سے نواب بیگم کو دیکھا۔ پھر اس نے گردن موڑ کر ایک نظر آس پاس ڈالی۔ بوا اختر جو جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ اور زیرلب بڑبڑا رہی تھیں۔

"محبت بیت گئی...... اب جدائی بتا رہی ہوں۔"

☆☆☆

گورنر جنرل لارڈ سمتھ کی' گوری میم کیتھرین مور محل دیکھنا چاہتی تھیں اور وہاں رہنے والیوں کے ساتھ ایک دن گزارنا چاہتی تھیں۔ نواب سراج نے کافی ٹال مٹول سے کام لیا لیکن آقا' آقا ہی ہوتا ہے اور آقا کی بیوی اس سے بڑا آقا۔ اس لیے انہیں انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ کیتھرین کو محل میں آنے سے کوئی نہیں روک سکا تھا۔ وہ بے چاری بڑی خوش تھی۔ سفید فراک' سفید ہی ہیٹ' جالی کے کہنی تک دستانوں' چھوٹی سی چھتری اور ہاتھ پنکھ لیے جب وہ آئی تو اسے دیکھ کر سب کا دل خوش ہو گیا۔ تھوڑی بہت اردو بول لیتی تھی۔ سمجھ تو ساری ہی لیتی تھی۔

پہلے تو اسے محل دکھایا گیا۔ پھر اسے خوب کھلایا پلایا گیا۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر اس نے روٹی تک پکائی۔ پھر ان کے لیے کاڑھا (چائے) بنایا اور انہیں بہت شوق سے پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن وہ سب سارا لحاظ مروت ایک طرف دیکھ کر اس کے سامنے ہی تھوکتی رہیں۔ ایک بس نواب بیگم نے پوری

چائے ختم کر لی تھی۔ لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ضبط کے کس امتحان سے گزری ہیں۔

دریا رخ بنے جھروکوں میں کتنی ہی دیر تک کھڑی واؤ واؤ کرتی رہی۔ یہ سب حیرت سے ''ہائیں..... ہائیں.....'' کر کر کے کھی کھی کرتی رہیں۔ سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھ کر اس نے سب کو انگریزی میں گانا سنایا۔ نواب بیگم کو اس پر بڑا رشک آیا۔ کیسی میٹھی آواز تھی اس کی۔ کیسا دل موہ لینے والا انداز تھا اس کا۔ کیسی خوش باش روح تھی۔

''محل بہت پیارا ہے..... یہاں سے دریا کا نظارہ تو اور بھی خوب صورت ہے.....''

سب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ انہیں یہ تو یہاں' وہاں' کہیں سے بھی کچھ خوبصورت نہیں لگتا تھا۔

''چہل قدمی کے لیے روز جاتی ہوں گی آپ دریا تک.....؟'' وہ نواب بیگم سے پوچھ رہی تھی جو ان کے ساتھ ہی تخت پر بیٹھی تھیں اور نواب بیگم کے اطراف میں کھڑی محل کی زنانہ فوج کھی کھی ہنسنے میں مصروف تھی۔

''ہمیں کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے.....''

نواب محل نے کچھ ایسے کہا کہ کیتھرین سب سمجھ بھی جائے اور ان پر الزام بھی نہ آئے۔

''کیا مطلب.....؟'' اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''ہم جن چار دیواروں میں پیدا ہوتے ہیں' ان ہی میں مر جاتے ہیں۔ ہم کیا جانیں مینار اور باغ..... دریا اور آبشار۔ نام ہی سنے ہیں بس۔ سنا ہے دنیا میں پانی کے جہاز نام کی بھی کوئی چیز ہے؟'' نواب بیگم نے کچھ ایسی معصومیت سے کہا کہ سب دوپٹوں میں منہ دے کر اپنی ہنسی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

کیتھرین سر جھکا کر کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ پھر وہ مسکرا کر لڑکیوں سے پوچھنے لگیں۔

''اوپیرا تو جاتی ہوں گی..... تھیٹر..... ناچ گھر.....؟؟''

''یہ بڑے عجیب و غریب سوال نہیں کر رہی؟ پاگل لگتی ہے.....'' قمر النساء مہر کے کان میں گھسی کہہ رہی تھی۔ باقی سب تان میں سر ہلا رہی تھیں۔ وہ تو ان سب چیزوں کے نام پہلی بار سن رہی تھیں۔

''یہ میمیں یہ ہاتھ میں پنکھ کیوں پکڑ کر رکھتی ہیں..... اتنی گرمی تو نہیں ہے.....''

''یہ پنکھ اس نے ہوا کے لیے نہیں پردے اور لحاظ کے لیے پکڑا ہے۔ جالی کے دستانے' ہاتھ کا پنکھ' ہیٹ پر لگی جالی اور ہیٹ' یہ سب ان کے لیے ہمارے دوپٹے جیسا ہے۔ ہیٹ کی جالی سے ان کا چہرہ نظر آ رہا ہے لیکن یہ جالی اس بات کی نشانی ہے کہ ان سے فاصلہ رکھ کر طریقے سلیقے سے بات کی جائے۔ انہیں پورا پورا احترام دیا جائے اور ان سے بے تکلف نہ ہوا جائے۔ اسی لیے تو یہ کچھ مردوں کو دیکھ کر جالی الٹ دیتی ہیں کچھ کے لیے چہرے پر ڈال لیتی ہیں۔'' مہر نے کان میں گھس کر جواب دیا۔

''تمہیں یہ سب کیسے پتا ہے.....؟؟''

''خالہ ماں کافی بار بتا چکی ہیں.....''

''تو تم اس محل میں قید ہو.....'' وہ بے چاری کتنی ہی دیر تک افسوس سا کرتی رہی پھر صاف صاف پوچھ لیا۔

سب چپ رہیں۔ نہیں وہ قید تو نہیں تھیں۔ کھانا پانی' کپڑا' زیور' مٹھائی' سب مل رہا تھا۔ ایک بنا بنایا محل' کھانے کو زعفران تک اور پہننے کو کمخواب بھی۔ ریشم کے بستر اور منقش تخت۔ سونے کے زیور' چاندی کے برتن۔ یہ قید کہاں ہوئی۔

''کیسا لگتا ہے یہاں رہ کر؟'' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ محل سے باہر نہیں جاتیں تو کرتی کیا ہیں۔ مر نہیں جاتیں۔

لڑکیوں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس کے سر سے ہیٹ اتار کر اسے دوپٹہ اوڑھایا۔ کچھ بھاری زیور پہنائے اور لے جا کر کوٹھری میں بند کر دیا اور خود باہر

نکل کر ہنسنے لگیں۔ وہ اندر انگریزی میں پتا نہیں کیا کیا کہتی رہی۔

"پاگل ہوگئی ہو..... لاؤ اسے باہر....." نواب بیگم نے اپنی ہنسی چھپا کر ذرا ڈانٹ کر کہا۔

"ان گوروں کو ہر چیز کی بڑی کھوج رہتی ہے نا..... لگا دیجئے دیں اسے کھوج کہ ہم یہاں کیسے رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلی تو بہت چپ چپ تھی۔

"ایسا لگتا ہے ہمیں یہاں رہ کر....." قمر النساء نے مصنوعی بے چارگی سے سر کو جھکا کر کہا۔

اس نے سر اٹھا کر قمر کو دیکھا اور پھر اس کے گال پر پیار کیا۔ اس نے نواب بیگم کے گال پر بھی پیار کیا تو نواب بیگم اپنا ہاتھ اپنے گال تک لے جا کر حیرت زدہ رہ گئیں۔ وہ شرم سے سرخ تو ہوئیں لیکن انہیں محبت اور احترام کا یہ انداز بڑا اچھا لگا۔ رات ہونے سے پہلے وہ چلی گئی۔ رات ہونے کے بعد نواب سراج غصے میں آگ بگولہ محل آئے۔

"کیا کیا کہا ہے آپ نے کیتھرین سے.....؟"

"جو جو وہ پوچھتی گئی، ہم بتاتے گئے....." بڑی بے نیازی سے کہا۔

"ہمارے رواج اور قانون یہ لوگ نہیں سمجھتے۔ کہا تھا آپ سے، مصلحت کے تحت جھوٹ بول دیجیے گا۔ کچھ پردہ رکھ لیجیے گا۔"

"ایک تو جھوٹ جھوٹ ہوتا ہے، کتنا بھی مصلحت کے تحت بولا جائے۔ پھر پردے تو بہت رکھے۔ اب اس نے یہی پوچھ لیا تھا کہ نواب صاحب کی کتنی بیویاں ہیں تو ہم خاموش رہیں۔"

"آپ نے کہا آپ اس محل میں قید ہیں....."

"قیدی اور کیا کہے گا؟" ان کے پاس ان کے ہر سوال پر الٹا جواب طنز موجود تھا۔

"ہمارے باپ دادا کے اصول ہیں یہ سب۔ با عزت اور شریف عورتیں گھروں سے باہر نہیں نکلا کرتیں۔"

"تو گورنر لارڈ کی یہ بیوی شریف اور با عزت نہیں ہے۔ انہیں تو آپ جھک کر سلام کرتے ہیں۔"

"ان کی روایات اور ہیں....."

"ہونہہ! روایات..... ہر بات کا جواب قانون، روایت اور باپ دادا۔ یہ جو گورے ہیں، یہ ہیٹ اتار کر، سر کو جھکا کر اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں کو احترام کیوں دیتے ہیں؟ لچے لفنگے تو یہ بھی نہیں۔ باپ دادا تو ان کے بھی ہوں گے۔ ہمیں کوئی ہاتھ اٹھا کر پیشانی تک لے جا کر سلام کر لے تو ہم بے حیا ہو جاتی ہیں۔"

"ہمارا مذہب....."

"مذہب سے بات نکلی تو بہت دور تک جائے گی نواب صاحب! پھر اتنی کڑیاں ملیں گی کہ سزا میں آپ کو سنگسار ملے گی۔"

نواب سراج کا چہرہ کچھ ایسا ہو گیا جیسے کسی نے پتھر دے مارے ہوں۔ "کیا کمی ہے اس محل میں۔ ناشکری ہیں آپ۔"

"جائیں پھر..... آئے کیوں ہیں سوال جواب کرنے کے لیے۔ کہہ دیتے گورنر کی بیوی کو کہ ہم سب تو یہی سب کرتے ہیں۔ ڈرتے کیوں ہیں ان سے؟"

نواب سراج کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "اس نے کہا ہے کہ میں آپ سب کو شہر میں گھومنے پھرنے کی اجازت دوں۔"

"ہاں تو دے دیں۔ اگر نہیں دل مانتا تو نہ دیں۔ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" نواب کے غصے اور جھنجلاہٹ سے وہ بہت خوش ہو رہی تھیں۔

"کل تیار رہیے گا۔ دریا کنارے گھوم آیئے گا....." نواب سراج نے جانے کس دل سے کہا۔

نواب بیگم زیر لب ہنس دیں۔

اگلے دن وہ سب دریا کنارے سیر کے لیے گئیں۔ کیتھرین بھی ساتھ تھی۔ وہیں انہوں نے بنجاروں کے گیت سنے۔ بنجارنوں سے کچھ زیور خریدے۔ ہاتھوں پر مہندی لگوائی۔ بس اتنی سی بات

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھی اور نواب اور سارے نوابوں کو یہ لگتا تھا کہ اگر وہ گھروں سے باہر نکل گئیں تو ان کے تخت الٹ دیں گی۔ غدر مچا دیں گی۔ بغاوت کھڑی کر دیں گی۔
غدر تو ویسے مچا ہی۔
"کیتھرین نے اس لڑکی کو دعوت میں لانے کے لیے کہا ہے جس نے کل اسے گیت سنایا تھا...... کون ہے وہ......؟" نواب کو سراہاتھ آ ہی گیا تھا۔
نواب بیگم نے لاعلمی سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔
"لڑکی نہیں لڑکیاں۔ وہ کوئی انگریزی گیت گا رہی تھی' لڑکیوں نے بھی پیچھے گا دیا۔ بس...... اب سب لڑکیوں کو بھیجنا ہو گا وہاں......؟" کمال انداز تھا ان کا۔
"اسے نام یاد نہیں۔ لیکن وہ بار بار کہتی تھی کہ ایک لڑکی کی آواز بہت خوب صورت ہے۔ اس کا گیت پیانو پر سننا چاہتی ہے اور اپنے مہمانوں کو بھی سنانا چاہتی ہیں۔ مجھے بتا دیں وہ کون ہے؟"
نواب نے بیوی کی دلیری پر طیش میں آ کر دیوار پر لگی تلوار کو کھینچ کر بیگم کی گردن پر رکھ دیا۔ تلوار کند تھی...... لیکن عورت کو ڈرانے کے لیے کندن تلوار ہی کافی ہوتی ہے۔
نواب بیگم نے تلوار کو گردن پر ہی رہنے دیا۔ آنکھ اٹھا کر نواب صاحب کو دیکھا۔ "میں مر جاؤں گی تو سب ماتم کریں گی۔ تب آ کر دیکھ لیجئے گا کون کتنے سر میں روتی ہے......"
نواب سراج نے بیگم کا کبھی ایسا روپ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ششدر رہ گئے۔
"اگر بچیوں کو گورنر جنرل کی دعوت میں بھیجنا ہے تو بتا دیں۔ میں ان کی کچھ تیاری کروا دوں......"
نواب سراج نے وہاں سے چلے جانا ہی مناسب سمجھا۔
"نواب ہوں گے تو اپنی ریاست کے۔ ان کی تلوار اور تیوروں سے ان کی رعایا ڈرے...... ہم کیوں......"
ہونہہ کا ہنکارا ابھر کر انہوں نے کہا تھا۔

☆☆☆

نواب سراج کو ریاست کے کاموں سے کم ہی فرصت ملا کرتی تھی۔ وہ اچھے انسان کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ کام کے دھنی اور رعایا کے حامی۔ ان کے شوق کے بارے میں سب جانتے تھے کہ جب وہ ریاست کے کاموں سے تھک جاتے تھے تو کسی گنی گائیک کو اپنا مہمان بنا کر سنا کرتے تھے۔
ایک گائیک تھے گوالیار کے...... "زیام منصور" سنا تھا کہ ان کے سروں میں وہ تاثر ہے کہ انسان سانس لینا بھول جاتا ہے۔ ایک سال سے نواب نے انہیں بلاوا بھیجا ہوا تھا۔ لیکن جو جتنا بڑا فن کار ہوتا ہے' وہ اتنا ہی زیادہ نخریلا اور من مرضی کا مالک ہو گا۔ ویسے بھی فنکار لوگ عام انسانوں جیسا نہ سوچتے ہیں' نہ کرتے ہیں۔ ان میں ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔ نواب سراج کی بار بار کی گئی درخواست کے جواب میں کچھ دستاویزات آئی تھیں اور ساتھ ایک نمائندہ بھی۔ محفل کیسی اور کہاں ہو گی۔ لوگ کتنے اور کس کس عہدے کے ہوں گے۔ محفل کا وقت اور دن۔ وغیرہ وغیرہ۔ کہ اگر نواب سراج کو یہ سب شرائط منظور ہیں تو زیام منصور آنے کے لیے تیار ہیں ورنہ......
ورنہ...... نواب سراج کو عادت تھی ایسی ناز برداریوں اور فرمائشوں کی۔ وہ مسکرا دیے۔ ہاں میں سر ہلایا اور دستاویزات پر مہر لگانی چاہی کہ......
"استاد زیام منصور اس محفل میں اپنی ایک خاص بندش پیش کریں گے۔ جیسے تان سین نے درباری راگ بنایا تھا۔ ایسے ہی زیام منصور نے ایک راگ بنایا ہے۔ یہ راگ صرف نواب صاحب اور چند خاص لوگوں کو سنایا جائے گا۔ نواب صاحب کو مہر اس وعدے پر دینی ہو گی کہ اگر نواب صاحب کے علاوہ یہ راگ کسی اور کان نے سنا تو نواب صاحب بغیر اجازت سننے والے کی "سماعت اور زبان دیں گے۔ کانوں میں سیسہ' زبان پر خنجر۔"
نواب سراج کا چہرہ غصے اور شرمندگی سے سرخ ہوا۔ کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ان کی اجازت کے بغیر وہاں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کوئی اور موجود ہو اور سننے کی جرأت کر سکے۔ بہر حال نواب سراج نے یقین دہانی کے لیے سر ہلا دیا۔ وہ بھی ایسا راگ سننا چاہتے تھے' جو گوالیار کے زیام منصور کے علاوہ کوئی نہیں گا سکتا تھا۔ انہیں آدھی فوج بھی اس گائیک کو لانے کے لیے بھیجنی پڑی تو ضرور بھیجیں گے۔ اور زیام کو بلا کر رہیں گے......

''زیام منصور......''

مورمحل کی ایک ایک عورت نے چپکے سے زیام منصور کو مہمان خانے میں دیکھ لیا تھا۔ مرد ملازموں کو تھوڑی رشوت ہی تو دینی پڑی تھی۔ گائیک تو بہت آتے جاتے تھے لیکن جس گائیک نے ایسے اپنی دستاویزات بھیجی تھیں، وہ پہلی بار آیا تھا۔ انہیں یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ اس میں کیا لکھا تھا لیکن ان تک یہ خبر آ چکی تھی کہ وہ کوئی ایسا راگ گائے گا جو اس کے علاوہ کوئی اور نہیں گا سکتا۔ اب کوئی نہ کوئی اسے دوربین لگا کر دیکھتا رہتا تھا۔ وہ بارہ دری میں بیٹھا ریاض کر رہا ہے۔ باغ میں ٹہل رہا ہے۔ دیوان میں بیٹھا ستار بجا رہا ہے۔ گوروں کی ایجاد بڑی اچھی تھیں۔ وہ اسے دیکھ تو لیتی تھی لیکن سن نہیں سکتی تھیں۔

''ایسا بھی کیا ہوگا اس راگ میں بھلا......'' نواب بیگم کو بڑا تجسس سا ہو رہا تھا۔

''سنا ہے کہ راگ کی بندشیں ہوتی ہیں۔ کوئی اس بندش (رکاوٹ۔ توڑ) کو نکال لے تو راگ اس کا ہو جاتا ہے۔''

ہاں تو کون سی ایسی بندش ہے جو اس نے نکال لی ہے۔ سنا ہے عمر بھی کوئی یہی ستائیس اٹھائیس سال ہے۔ اتنی سی عمر میں اس نے کیسے بندش نکال لی۔ جو کام اس کے باپ دادا نہیں کر سکے' اس نے کیسے کر لیا؟''

''بس جس کو اللہ ہنر دے دے۔''

نواب بیگم کو مہرالنساء پر بہت ناز تھا۔ لیکن جیسے ہی زیام آیا، ان کا فخر جاتا رہا۔ اب ایسا بھی کیا ہے جو صرف وہ گا سکتا ہے۔ جو صرف اس کے پاس ہے۔ اگر راگ اس کا ہے' تو کیوں ہے۔

''مہرالنساء یہ راگ سنے گی' اور پھر آ کر ہمیں سنائے گی......'' ہر کوئی چاہتا تھا کہ وہ راگ سنے۔ ورنہ نہ مر جائے۔

مہرالنساء نے اب تک بہت کچھ کیا تھا۔ وہ استاد غلام علی کی حویلی جا کر ان سے مل چکی تھی۔ بنجارنوں' جوگیوں' ڈومنیوں کے گیت گا چکی تھی۔ تہہ خانے اور چاندنی رات میں سب کو اپنے گیت اور راگ سنا چکی تھی۔ لیکن خالو نواب سراج کے محل میں جانے کی جرأت نہیں کر سکی تھی۔ نہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھی زیام منصور کو سننے کے لیے...... جس کی خالی خولی شہرت ہی سنی تھی۔ کیا پتا اصل شہرت سے کم ہو۔

خالہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ''یہ نہیں جائے گی آپا! ایسا نہ کریں......''

''میں سارا انتظام کر دوں گی عصمت مہر! تم بھی فکر نہ کرنا۔ سارے ملازم ویسے ہی میرے اشاروں پر ناچتے ہیں۔''

''پر ضرورت ہی کیا ہے آپا! چھوڑیں یہ راگ واگ۔ ہمیں کیا لینا دینا ان سے۔ جتنا مہر سنا دیتی ہے کافی ہے......''

''پر جو وہ سنائے گا، وہ مہر کو کہاں آتا ہے۔ وہ راگ تو کبھی کسی نے سنا ہی نہیں۔ تم سب کیا کہتی ہو؟'' نواب بیگم نے دوسروں سے رائے لی۔

''مہر سے پوچھیں......'' سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ جس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر جانا تھا' فیصلہ بھی اس کا ہی ہونا چاہیے۔

نواب بیگم نے گہرا سانس لیا۔ ''ہم سب غلام بھی ہیں اور ڈرپوک بھی۔ غلام اگر ڈرپوک نہ ہو تو وہ آقا ہوتا ہے۔''

مہرالنساء نے ایک نظر نواب بیگم اور مورمحل کی دوسری عورتوں پر ڈالی۔ وہ جان گئی تھی کہ بات صرف راگ کی نہیں رہی تھی۔ بات یہ بھی تھی کہ زیام منصور اور اس راگ کے اتنے چرچے تھے کہ وہ سننے کے لیے مری جا رہی تھیں۔

''میں جاؤں گی......'' اس نے کول آواز لیکن تیور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سرد لہجے میں کہا۔
غلام اگر ڈرپوک نہ ہو تو وہ آزادی کو دعوت دیتا ہے ورنہ موت کو......
سُر ہیں گے یا سر......''میں جاؤں گی'' کا اعلان کرتے ہوئے وہ جان جاتی تو کبھی نہ جاتی......

☆☆☆

جو حساس نہیں ہے وہ فنکار نہیں ہے۔ زیام منصور اب صاف صاف یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جس مہمان خانے میں اسے ٹھہرایا گیا ہے، وہاں چھپ کر کوئی اسے سنتا ہے۔ یہ مرد ملازم نہیں ہیں۔ یہ کوئی ایسا ہے جو اس کے فن سے واقف ہے اور اس کا مداح ہے۔
یہ صبح کا وقت تھا اور وہ صبح کے راگ، راگ بھیرویں کا ریاض کر رہا تھا۔ اکا دکا مرد ملازم بارہ دری سے کچھ دور ٹہل رہے تھے۔ یہ وہی تھے جنہیں نواب بیگم رشوت دے کر منہ بند رکھنے کے لیے کہہ چکی تھیں۔
مہر النساء مہمان خانے میں آچکی تھی۔ بارہ داری سے کچھ دور، اوٹ میں کھڑی وہ راگ بھیرویں سن رہی تھی۔ اس نے آج تک ایسی آواز، ایسا سر اور تان نہیں سنی تھی۔ محل کی ساری عورتیں اسے سریلا کہتی تھیں، اب وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگی کہ وہ سریلی ہے۔ اس نے اصل سر سن لیے تھے۔ وہ اس راگ کی قید میں کچھ ایسی جکڑ گئی کہ اوٹ سے نکل کر بارہ دری کے قریب اور قریب ہوتی گئی۔
کچھ دنوں سے وہ اور قمر، زیام منصور کو دور دور سے سن رہی تھیں۔ ان تک آواز تو صاف نہیں آتی تھی لیکن بس ہلکا سا تاثر آتا تھا۔ وہ بھی مہر کو ہی سمجھ میں آتا تھا۔ آج وہ قریب سے سن رہی تھی۔ وہ آواز کی سمت کھنچی چلی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ اتنی قریب چلی گئی کہ جب زیام نے سر اٹھایا تو سامنے اسے کھڑا پایا......
وہ وہیں رک گیا......اس کا شک صحیح تھا......روز اسے کوئی سنتا ہے......
جیسے ہی راگ کی تان ٹوٹی مہر النساء ہوش میں آگئی۔ وہ زندگی میں کبھی اتنی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی، جتنی اس وقت ہو چکی تھی۔ وہ زیام منصور کے غصے سے کھنچے ہوئے اعصاب کو باآسانی دیکھ سکتی تھی۔
زیام نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا۔ مرد ملازم وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ وہ جان گیا کہ یہ لڑکی ان ملازموں کی اجازت سے اندر آئی ہے۔ وہ طنز سے زیر لب ہنس دیا۔ یہ اس کے ساتھ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ جس مغل دربار سے ہو کر آیا تھا وہاں بھی کم و بیش اس کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس کی شہرت محل کی چار دیواری میں ڈنکے کی طرح بجتی تھی۔ زنان خانے کی عورتیں اسے دیکھنے کے لیے، مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتی تھیں۔ جس کے چہرے پر فن کی سنہری چمک تھی اور آنکھوں کے تیور بڑے جان لیوا سے تھے......
زیام منصور......اگر وہ بڑا گائیک نہ ہوتا تو بڑے تخت کا تخت نشین ہوتا۔ اس کے گھنگھریالے بال شانوں تک تھے اور بائیں کان کی لو میں چاندی کی بالی تھی۔

☆☆☆

ڈیڑھ سو سال بعد......آج......
اپنا گٹار باکس سنبھالتی ہوئی میراں مالی کی لمبی سڑک سے بھاگتی ہوئی الحمراء کی طرف آرہی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ٹھنڈ کی شدت بڑھ گئی تھی۔ اس کا رکشہ ٹریفک میں پھنس گیا تھا۔ گاڑی دو دن سے ورکشاپ میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے وقت سے پورے سات منٹ لیٹ ہو چکی تھی۔ اسٹیج پر تین بار اس کا نام پکارا جا چکا تھا۔ مین گیٹ پر سیکیورٹی ٹیم اس کا گٹار باکس چیک کرنا چاہتی تھی۔
''سنگر ہوں میں، دہشت گرد نہیں۔ کوئی بم نہیں ہے اس میں......''
وہ ارے ارے کرتے رہ گئے اور وہ ان کے ہاتھ جھٹک کر تیزی سے سیکیورٹی گیٹ پار کرتی ہوئی لان کی طرف بھاگی جہاں دور سامنے اونچا سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ درمیان میں وہ ایک ایلیٹ ہی سے ٹکرائی۔ جس

نے غصے سے لپک کر اس کے گٹار باکس میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچ کر روکا۔
''تمہاری جرأت کیسے ہوئی......'' وہ انگلش میں چلایا۔
اس نے کمر کو جھٹکا دے کر اپنا گٹار اس کی گرفت سے آزاد کرایا۔ ایک ٹکر ہی تو لگی تھی۔ وہ بھی ہلکی سی۔ وہ ایسے بھڑک رہا تھا جیسے وہ کوئی بھینسا تھی اور اسے سینگ مار کر زخمی کر دیا تھا۔
''سوری......بیل وبھینسے......'' بیل وبھینسے اس نے زیر لب کہا تھا۔ ویسے اسے یقین تھا اس دیسی انگریز کو ان دونوں لفظوں کا پتا ہی نہیں ہوگا۔
وہ پھر سے پختہ روش پر بھاگنے لگی۔ لان میں بکھرے یہاں وہاں کھڑے لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا کہ وہ آچکی ہے۔ وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اسٹیج پر کھڑی الٹرا ماڈرن کمپیئر اسے دیکھنے کے باوجود نظر انداز کر رہی تھی اور کسی دوسرے گلوکار کا نام پکار کر رہی تھی۔
وہ جلدی سے ہجوم کو دھکیل (دھکے دے کے) کر اسٹیج تک آئی۔ ''میں آگئی ہوں......'' اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔
''یہ میوزک میٹ ہے' ٹی وی شو نہیں جہاں تم دیر سے آؤ گی تو بھی چل جائے گا......'' لمبے ناخنوں' پھٹے بم سے متاثرہ بالوں اور میک اپ کی سات تہوں میں دھنسے اعضاء کو مزید بگاڑتے ہوئے اس نے کہا۔ اس نے کچھ اتنی چست ٹی شرٹ اور جینز پہنی ہوئی تھی کہ اس سے پوچھنے کو دل چاہتا تھا کہ اس نے آکسیجن کا آلہ کہاں چھپا رکھا ہے۔ جس سے وہ سانس لے کر زندہ ہے۔
''تم نے دیکھ بھی لیا ہے کہ میں آچکی ہوں پھر بھی تم کسی دوسرے' تیسرے کا نام اناؤنس کر رہی ہو۔'' وہ اپنے کھلے' بکھرے بالوں کو تھوڑا بہتر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''میری دُور کی نظر کمزور ہے۔ ویسے بھی مجھے آرڈر تھا کہ اسٹیج پانچ منٹ سے زیادہ خالی رہنے نہ دوں۔ کسی دوسرے سنگر کو بلالوں۔ یہاں آنے والوں کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ وہ یہاں میوزک سننے آتے ہیں وقت ضائع کرنے نہیں۔''
''اتنا میک تھوپا ہے' نظر کے دو لینز بھی ٹھونک لینے تھے اور ہٹو یہاں سے۔ وقت قیمتی ہوتا ہے کی کچھ لگتی۔ جیسے یہاں میڈونا اور بیونسی آئی ہیں جنہیں سانس لینے کی بھی فرصت نہیں۔ سارے ویلے آتے ہیں یہاں......سمجھیں......جیسے میں تو اس ملک میں رہتی ہی نہیں۔''
''اتنا لمبا لیکچر ایسے دے رہی ہو جیسے جل کر کوئلہ ہو چکی ہو کہ میں آ کیوں گئی۔ راستے میں ہی مر کیوں نہیں گئی۔ لاہور میوزک میٹ ہو یا پاکستان میوزک میٹ' مجھے سب سے پہلے بلایا جاتا ہے۔ تم جلو یا جلے بغیر مر جاؤ' کمپیئر کی حیثیت سنگر سے اُوپر نہیں ہو سکتی۔ اسٹار تو تم بالکل نہیں بن سکتیں۔ اتر واب اسٹیج سے یا میرے ساتھ کھڑی رہ کر سیلفی لینی ہے۔ پتا نہیں خود کو کیا سمجھتی ہو۔''
اس نے بھڑک کر مس روزی ڈوزی' کوزی کی طبیعت ایسے صاف کر دی جیسے تیزاب ڈال کر فرش صاف کر دیا جاتا ہے۔
''میری فکر چھوڑو......تم خود کو کیا سمجھتی ہو...... سیلینا گومزیا کے پاپ (کورین پاپ)؟'' وہ واقعی تیزاب تھی بھئی۔
اس نے اس جل ککڑی کو نظر انداز کر کے مائیک ہاتھ میں لیا اور کہا۔ ''دو منٹ کی بریک......آپ کے اور میرے لیے......''
اس بریک کا اعلان صرف وہی کر سکتی تھی۔ میوزک میٹ کی انتظامیہ نے پہلو بدلے۔ کالے کوٹ میں' ہاتھ میں واکی ٹاکی لیے' اور کان پر بلوٹوتھ ایئر فون ٹھنسائے میٹرکس فلم کے ولن جیسے حلیہ والا اس کی طرف غصے سے بڑھا تھا کہ اس نے ہاتھ کو بلند کر کے اسے وہیں روک دیا۔
''اچھا اچھا بس۔ وہیں رہو......دو منٹ کا کہا ہے دو سال کا نہیں۔ یہ لاہور میوزک میٹ ہے' ورلڈ

میوزک میٹ نہیں۔ زیادہ اچھلنے اور رعب ڈالنے کی ضرورت نہیں۔"

میٹرکس کے ولن کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے گٹار کا ٹوٹا، مڑا تڑا تار۔ وہ اس کی طرف طیش سے بڑھا لیکن اسے دوسرے ولن نے آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کے لیے کہا۔

وہ اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔ الحمرا کے لان میں لاہور میوزک میٹ کے لیے بڑا ہجوم جمع تھا۔ شام رات میں ڈھل چکی تھی۔ آس پاس گیس کے ہیٹر رکھے تھے۔ وہ ایک ہیٹر کے پاس کھڑی ہو کر ہاتھ گرم کرنے لگی۔ اسے گٹار بجانا تھا۔ ہاتھ ٹھنڈ سے سن ہو رہے تھے۔ انگلیوں کو حرارت کی ضرورت تھی۔

"دو گھونٹ کافی پی لو......"

اس کے سامنے کافی کا ڈسپوزیبل کپ آیا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ اس کا کالج فیلو تھا۔ شوٹر کے نام سے مشہور تھا۔

"تمہیں اپنی انرجی ویسٹ کرنے کی عادت ہو چکی ہے۔ اسٹیج پر چڑھ کر بھی تم کوئی کمال نہیں دکھا سکو گی۔" شوٹر اسے اپنے طنز سے شوٹ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

"کالج فیلو ہوں یا کلاس فیلوز۔ سب کو آگ لگ جاتی ہے جب کوئی ان سے آگے نکل جائے۔" کافی لے کر اس نے دو گھونٹ پی لیے تھے۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ "اس سال میں یہ تمہاری پندرویں پرفارمنس ہے۔ دسمبر کا اینڈ ہو چکا ہے، لیکن تمہاری اسٹرگل کا اینڈ ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ تم اتنی ضدی کیوں ہو۔ چھوڑو یہ سب۔ کوئی اور کام پکڑو۔ بلکہ ایسا کرو شادی کر لو۔" اس نے آنکھ مار کر کہا۔

"تم سب کی خواہشیں حسرتیں ہی رہ جائیں گی کہ میراں گھر بیٹھ گئی ہے۔ اس نے میوزک چھوڑ دیا ہے۔ وہ ناکام اور فلاپ ہو چکی ہے۔"

"ہٹ تو تم ابھی بھی نہیں ہو......"

"اور فلاپ بھی نہیں ہوں۔ ذرا دور ہو کر کھڑے ہو پلیز۔ کتنی بدبو آ رہی ہے تم میں سے۔ سردیاں آ گئیں نہیں کہ تم پر پانی حرام ہو گیا۔"

اسے ہاتھ سے پرے کر کے وہ اسٹیج پر چڑھ گئی۔ اپنا گٹار، باکس میں سے نکالا، اس کے تار چیک کیے اور مائیک کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی آواز اچھی تھی...... گانے بھی اچھے ہوتے تھے...... لیکن جو سب سے اچھا ہوتا تھا وہ دھن ہوتی تھی۔

وہ اچھی دھنیں بناتی تھی، لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ اسے بس دھنیں ہی بنانی چاہییں، گانا نہیں گانا چاہیے۔ جینز پر کرتا پہن کر وہ پاپ اسٹار نہیں بن سکتی تھی۔ جیسے الجھے بالوں اور الٹی سیدھی جیولری پہن کر وہ سلینا گومز کو کاپی تو کر سکتی تھی لیکن سلینا گومز نہیں بن سکتی تھی۔ سلینا گومز کی آواز اچھی تھی، اور وہ اچھی آواز ایک بہت اچھے اسٹوڈیو میں ریکارڈ ہوتی تھی۔ ایسے اسٹوڈیو میں جہاں بھدی آوازیں بھی سریلی ہو جاتی تھیں۔ بڑی میوزک کمپنیوں کے ساتھ کام کر کے، چھوٹے سنگر بھی بہت بڑے اسٹار بن جاتے ہیں اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ جی ان میں تو ٹیلنٹ ہی بہت ہے۔

سو فیصد ٹیلنٹ کو بھی ہزار گنا بڑا پلیٹ فارم درکار ہوتا ہے۔ ورنہ بنجارنیں جن کی آوازوں کا اسکیل اونچا ہوتا ہے، سروں میں پوری اور تان میں کامل ہوتی ہیں، بھی ٹیلنٹ میں شمار ہو کر اسٹار بن جاتیں۔ ان کا تو سانس بھی نہیں ٹوٹتا۔

وہ اسٹار نہیں تھی۔ وہ ٹاواں ٹاواں تارا تھی۔ اس کی روشنی بھی کوئی چند ہزار لوگوں تک پہنچی تھی۔ کچھ سوشل میڈیا کے ذریعے اور کچھ یوٹیوب چینل کے ذریعے۔ کل ملا کر چند ہزار لوگ اسے باقاعدہ سنتے تھے۔ ان چند ہزار میں سے کئی سو لوگ یہ پیش گوئی کر چکے تھے کہ اگر اسے بڑا پلیٹ فارم مل جائے تو وہ راتوں رات اسٹار بن سکتی ہے۔ کیونکہ اس کا ٹیلنٹ نایاب ہے۔ لیکن ٹیلنٹ کا ہونا اور اس ٹیلنٹ کا نکل کر اسٹارڈم میں بدل جانا دو الگ الگ باتیں ہیں۔

ٹاواں ٹاواں اسٹار گانا شروع کرنے ہی والی

ہے۔

☆☆☆

''ہیلو ہیلو...... چیک ان...... میراں ہیر......'' وہ مائیک پر کہہ رہی تھی۔

بہت جوش سے تالیاں بجائی گئیں۔ سب کی گردنیں اس کی طرف سیدھی ہوگئیں۔ الحمرا کے لان میں رات پوری طرح سے اتر چکی تھی۔ رش بہت بڑھ چکا تھا۔ لاہور کے ایلیٹ پپی (انگلش ملنگ) اور جہاز پپی (دیسی ملنگ) وہاں جمع ہو چکے تھے۔ کچھ سیڑھیوں پر بیٹھے تھے' کچھ کھڑے ہو کر ہو ہا کر رہے تھے اور گانا شروع ہونے سے پہلے ہی ماڈرن ٹھمکے لگا رہے تھے۔ کچھ اسٹیج کے سامنے نیچے گھاس پر چوکڑیاں مار کر ایسے بے نیازی سے بیٹھے تھے جیسے انہیں دنیا سے کچھ لینا دینا نہیں۔ وہ تو شدھ ملنگ ہیں ورنہ خالص جھلے، پگلے اور دیوانے......

اس نے گٹار کے تاروں پر ہاتھ مارا تو کتنی ہی دیر تک ہجوم کے شور سے کان پڑی آواز سنائی دینا بند ہو گئی۔ سب جوش سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اس کا استقبال ایسے ہی بڑے جوش و خروش سے کیا جاتا تھا۔ جیسے وہ وہاں صرف اور صرف اسے ہی سننے آئے تھے۔ جیسے وہ نہ آتی تو وہ بے چارے مایوسی اور اداسی سے مر مرا جاتے۔

''جھوٹے اور بے ایمان...... سارے کے سارے۔'' ان سب کے جوش کو دیکھ کر وہ جل کر زیر لب بڑبڑائی۔

وہ اسے پسند کرتے تھے لیکن بس مفت میں۔ لاہور میوزک میٹ بھی مفت کا شو تھا۔ وہاں سب گانے والوں کو بہت جوش سے سنا جاتا تھا۔ آج تک کسی آرگنائزر نے اسے پیسے دے کر نہیں بلایا تھا۔ اس کے مفت کے شو ہی ہٹ ہوتے تھے۔ کہیں کوئی ٹکٹ والا شو اسے ملا ہی نہیں تھا۔ اگر ٹکٹ والا شو مل بھی جاتا تو بھی مشکل سے ہی کوئی ٹکٹ خرید کر اسے سننے آتا۔ کیونکہ وہ اچھا گاتی تھی لیکن ''اسٹار'' نہیں تھی۔ اور لوگ صرف اسٹارز کے لیے پیسے خرچ کرتے تھے۔ وہ بے سرا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایسا گائے یا ویسا۔ کان پکا دے یا جان کا عذاب بن جائے...... لیکن...... خیر......

اس نے گانا شروع کیا...... دیسی اور بدیسی ملنگوں نے جھومنا......

گاتے گاتے اس نے دور سامنے دیکھا۔ جہاں مفت چائے اور کافی کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ وہاں بہت رش تھا۔ مفت کے چپس بھی۔ مفت کی سب چیزوں پر رش ہوتا ہے۔ دو روپے کی ٹافی اور پانچ روپے کے بسکٹ پر بھی......

گہرا سانس لے کر اس نے اپنی نئی دھن' سب مفت خوروں کے گوش گزار کی۔ اسے غصہ بھی آیا کہ یہ چائے' کافی' چپس وغیرہ کی کمپنیاں اپنے مفت کے اسٹال میوزک میٹ میں ہی کیوں لگا لیتی ہیں۔ تاکہ جو چار چھ لوگ انہیں سننے آتے ہیں وہ بھی انہیں نہ سنیں اور ان کی مفت کی چیزوں کو کھانے میں مشغول رہیں۔ اتنے پیسے خرچ کیے تھے اس نے آج کی رات کے لیے...... پورے نو ہزار...... جی ہاں...... جینز کے علاوہ جوگرز اور بلیو شرٹ کے ساتھ وائٹ شرگ پہن کر۔ اس نے کے پاپ کی گلوکارہ کی نقل کرنے کی پوری (بھونڈی) کوشش کی تھی۔ ویسے اسے سب بھول کر بھی یاد تھا کہ کہاں کے پاپ کہاں لاہور پاپ۔ جہاں لنڈے کی چار سو کی جینز کو نکال کر اس کے لباس کی قیمت نو ہزار بنتی تھی' وہاں کے پاپ گرل سنگر کے لباس کی قیمت کم سے کم ساٹھ ہزار ڈالر تھی' جو پاکستانی پیسوں میں تقریباً سات لاکھ بنتے تھے۔ پھر بھی وہ ان کی نقل کر رہی تھی۔ حد تھی۔ پھر کے پاپ کو ڈانس بھی آتا ہے اور ایسا ڈانس آتا ہے کہ گانا نہ بھی چلے تو ڈانس سے کام چل جاتا ہے۔ جبکہ وہ اسٹیج پر تھوڑا بہت جو اچھل لیتی تھی' اس سے ہی اس کی ٹانگیں دکھنے لگتی تھیں۔ گھر جا کر اسے ٹانگوں پر کس کر پٹیاں باندھنا پڑتی تھیں۔ کوئی آسان کام تھا اسٹیج پر چڑھ کر گانا......

اس کا تعلق پاکستان کی میوزک انڈسٹری سے تھا۔ جو نہ خود پیروں پر کھڑی ہو رہی تھی نہ کسی اور کو ہونے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دے رہی تھی۔ وہ کے پاپ جتنی مقبول ہونے کے خواب تو دیکھ سکتی تھی لیکن تعبیر حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

اس کا گانا لاہور میوزک میٹ میں بڑے دھڑلے سے بج رہا تھا۔ اس نے حاضرین کو کھڑے ہو کر تالیاں بجانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسٹیج کے دائیں طرف سیڑھیوں پر بیٹھے بہرام نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھلے بنا کر چھوڑا اور دھویں کے مرغولے میں سے جھانک کر اسے دیکھا۔

"یہ کبھی اسٹار نہیں بن سکتی۔ جس دن یہ اسٹار بن گئی' اس دن میں اپنی کمپنی بند کر دوں گا۔" گردن موڑ کر اس نے جنید سے کہا۔

"تمہیں اس کی قابلیت پر شک ہے؟" وہ اپنی سگریٹ سلگا رہا تھا۔

"شک نہیں یقین ہے کہ اسے اس کی قابلیت ہی لے ڈوبے گی۔ جس کے پاس اصل ہوتا ہے' وہ نقل حاصل نہیں کر سکتا۔ ہماری میوزک انڈسٹری کو نقالوں کی ضرورت ہے۔ اس جیسوں کی نہیں۔ دو چار سال یہ اسٹیج پر دکھائی دے گی' پھر دیکھنا گوگل بھی اسے ڈھونڈ کر نہیں دے سکے گا کہ یہ گئی کہاں......"

جنید نے چونک کر بہرام کو دیکھا۔ "تو تم کچھ......؟"

بہرام نے قہقہہ لگایا۔ "اسے اسٹوڈیو میں جاب آفر کر دو۔ پھر دیکھتے ہیں یہ کب تک زندہ رہتی ہے......" کہہ کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہجوم میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عین میراں کے سامنے کھڑا تھا لیکن ذرا سا دور۔ وہ گا رہی تھی...... اچھا گا رہی تھی...... لیکن اس کی دھن...... وہ کمال کی تھی......

اسٹیج پر اس کی پرفارمنس کا دورانیہ ایک گھنٹہ تھا' لیکن چالیس منٹ بعد ہی اسٹیج دھڑام سے نیچے آگرا۔ اس کا سر پیچھے کسی سخت چیز سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ بغیر ٹکٹ کے شوز میں یہی ہوتا تھا۔ یا ساؤنڈ سسٹم کام نہیں کرتا تھا یا اسٹیج گر گرا جاتا تھا۔

بہرام زیر لب ہنس دیا۔ "کچھ لوگ بلندی پر چڑھ کر نیچے گرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں' میرا خیال ہے تم بھی ان ہی میں سے ایک ہو میراں!"

☆☆☆

پاکستان بننے سے پہلے اس کے دادا ہیر گایا کرتے تھے۔ لوگ ان کے مداح تھے۔ بہت شوق سے انہیں بلاتے تھے۔ پھر جب موسیقی "موت کی سسکی" بن کر مردہ ہو گئی تو ہیر رانجھے' سوہنی' سسیاں' سب چپ چاپ اپنی موت آپ مر گئے۔ سارے راگ آلاپ گونگے ہو گئے اور سارے گویے بے زبان۔

میراں بھی اسی دور کی پیداوار تھی' لیکن کلاسیک کے ساتھ ماڈرن مکس تھی۔ وہ اچھے گانے گاتی تھی' لیکن وہ گانے اچھی طرح سے ہٹ نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ ایک تو وہ اچھے اسٹوڈیو میں ریکارڈ نہیں ہوتے تھے۔ دوسرا وہ بڑے پیمانے پر پروموٹ نہیں ہوتے تھے۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ کہ اس کی ساری قابلیت کے باوجود کوئی بھی میوزک کمپنی اسے لانچ کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

یہ وہ دور ہے جس میں اگر تان سین بھی آجاتے' تو میوزک کمپنیاں انہیں بھی لینے سے انکار کر دیتیں۔ کیوں...... کیونکہ انہیں سر اور سریلا نہیں چاہیے۔ انہیں ہٹ گانے چاہئیں تھے۔ ان سنگر نہیں چاہیے' انہیں اسٹار چاہیے تھے۔ سب کچھ بنا بنایا۔

بے حد امیر اور خوب صورت۔ جو سوشل میڈیا پر کسی نہ کسی بہانے آگ لگا کر رکھنے کی ساری ترکیبیں جانتے ہوں۔ کبھی نامناسب ڈریس میں تصویریں وائرل کر کے' کبھی سگریٹ ہاتھ میں پکڑ کر' کبھی کسی سے منگنی ہو کر' اور کبھی کسی کے خلاف بیان دے کر۔ انہیں ایک لاکھ طریقے آنے چاہئیں خبروں میں رہنے کے۔ جب ہی وہ کانٹریکٹ کرنے کے لیے تیار ہوتی تھیں۔

سارا آرٹ اب پیسے کے گرد گھومنے لگا ہے۔ ورنہ نہ تو ان کی عزت ہو گی' نہ انہیں شہرت نصیب ہو گی۔ پیسہ اور پی آر ہونی چاہیے بس۔ ٹیلنٹ کو کون پوچھتا ہے۔ اب یہ وہ سسٹم بن چکا ہے جہاں جسے ایکٹنگ نہیں آتی اسے بیسٹ ایکٹر کا ایوارڈ ملتا ہے۔ جسے گانا نہیں آتا۔ ان انڈسٹریوں پر اب گدھے راج

کرتے اور الوارڈان بھرتے ہیں۔ ٹیلنٹڈ

میراں خوب صورت تھی' لیکن خوب صورت تو جانے والا ابھی تھا تو اس کا کیا ہوا۔ ٹیلنٹڈ تو محمد عاشق بھی تھا' جس سے بڑا پورے پاکستان میں کوئی سائیکلسٹ نہیں تھا اور جو ستر تمغے جیت چکا تھا۔ وہ اب کراچی کی سڑکوں پر رکشہ چلاتا تھا۔ یہاں کام' ایوارڈ' چانس' سب پیسے اور پی آر کے بازار میں سرعام بک رہے ہیں۔ جو اچھا خریدار ہے' وہی اسٹار ہے۔

تو پھر...... جب سارے پیمانے ہی الٹے ہیں تو سب سیدھا کیسے ہوگا......

وہ چند ایک پرائیویٹ شوز کر چکی تھی۔ سالگرہ وغیرہ کے فنکشن۔ ایسے ہی کچھ اسکول اور کالج کے لیے شوز۔ اس کے علاوہ اس کے کریڈٹ پر کچھ اور نہیں تھا۔ ایک بار ایک اسکول نے اسے کڈز سنگر کمپیٹیشن کے لیے جج کی حیثیت سے بلایا تھا' وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ دن بھر جج کے فرائض سرانجام دینے کے بعد' شام کو اسے ونر کی لسٹ تھمادی گئی تھی۔ اسکول تو پہلے سے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ کون کون ونر قرار دیا جائے گا۔ تو اس کی حیثیت شوپیس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اس نے پرنسپل کو کچھ ایسے گھور کر دیکھا تھا کہ وہ سہم سا گیا تھا۔

''جو لسٹ آپ مجھے دے رہے ہیں نا' اس میں ایک بھی بچہ ونر بننے کے لائق نہیں ہے۔ بے سرے ہیں وہ سب۔''

''ہمیں بچوں کا دل نہیں توڑنا چاہیے...... بس اسی لیے......''

''ہمیں ٹیلنٹڈ بچوں کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ اور ان بچوں کا نام اس لسٹ میں آپ نے شامل ہی نہیں کیا۔''

بہت بحث و تکرار ہوئی اور پرنسپل صاحب صرف ایک ''ٹیلنٹڈ'' بچے کو لسٹ میں شامل کرنے پر تیار ہوئے...... چوتھے نمبر پر......

گھر والے بے چارے اس کی منت کر کر کے تھک چکے تھے کہ وہ یہ سب چھوڑ کر اپنی پڑھائی مکمل کرنے کی کوشش کرے۔ جو اس نے گریجویشن کے بعد چھوڑ دی تھی۔ کسی اور فیلڈ میں اپنا کیریئر بنائے لیکن یہ کام چھوڑ دے۔ لیکن سچے فنکار کی طرح اسے بھی یہ یقین تھا کہ ایک دن آئے گا اور وہ اپنے خواب پالے گی۔ ہر فنکار کو ایسے ہی پاگل دیوانہ کہا جاتا ہے پھر جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو وہی لوگ اس پر فخر کرتے ہیں۔

''کہاں کہاں دھکے کھاتی پھرتی رہتی ہو۔'' مستقبل میں فخر کرنے والے لوگوں میں سے ایک نے کڑے تیوروں سے اس سے پوچھا۔ جھٹکے سے پردوں کو پرے کیا۔ دھوپ سیدھی اس کی آنکھوں میں گھسی۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور کمبل کو منہ تک گھسیٹ لیا۔

''جواب تو دے دو اپنے باپ کو......'' باپ نے تیکھے سروں میں کمبل کھینچ کر پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنکھیں رگڑنے لگی۔ اس کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔ جگہ جگہ بینڈیج لگی ہوئی تھی۔

''اسٹیج گر گیا تھا' تو میں بھی گر گئی۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔ اس کے چہرے کے زخم دیکھنے کے باوجود پاپا کا لہجہ نرم نہیں ہوا تھا۔ کیسے کمبل کھینچ کر چلا رہے تھے اس پر۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میراں! تم کیا بننے کی کوشش کر رہی ہو؟ مرنا ورنا ہے تو ویسے ہی مر جاؤ۔ گھر میں مر جاؤ۔ ہمیں بھی آسانی رہے گی۔''

''میری اتنی مشکل جدوجہد کو آپ بس اپنے لیے آسان کرنا چاہتے ہیں۔ میرے زخم دیکھ رہے ہیں پھر بھی کیسے ظالم بنے ہوئے ہیں۔ آپ نے ہی کہا تھا کہ ہر انسان کو اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے جان جوکھم میں ڈالنی پڑتی ہے۔ میں بھی وہی کر رہی ہوں۔''

''خواب...... کون سا خواب...... ہٹ ہونے کا خواب؟ شہرت اور پیسے کا خواب؟ اسے تم منزل کہتی ہو؟''

وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی کہ کیسی عجیب و غریب بات کر رہے ہیں وہ۔

''اس نسل کا سارا مسئلہ ہی یہ ہے..... پیسہ اور شہرت..... پھر کہتے ہیں ہمیں تو اپنی منزل چاہیے۔ کون سی منزل؟ تم چاہتی ہو کہ دنیا تمہارے گانوں کی دیوانی ہو جائے۔ اور تم کہتی ہو کہ یہ تمہاری منزل ہے۔ تم چاہتی ہو کہ تم کو بڑے بڑے کنسرٹ میں بلایا جائے۔ لوگوں کا ہجوم تمہیں سننے کے لیے آئے..... یہ منزل.....؟؟ ہونہہ..... یہ منزل نہیں لالچ ہے..... شہرت اور ستائش کا.....

تمہارے دادا ہیر گانے میں بہت مشہور تھے۔ لوگ انہیں دیسی گھی اور چاول کے بدلے میں ہیر گانے کے لیے گاؤں اور چوپالوں میں بلا لیتے تھے۔ وہ کئی دنوں کا سفر طے کر کے وہاں جاتے' اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور کسی روپے پیسے اور شہرت کے لالچ کے بغیر واپس لوٹ آتے۔ جب ان کا آخری وقت آیا تو انہیں یہ دکھ نہیں تھا کہ وہ گمنام مر رہے ہیں۔ انہیں یہ دکھ تھا کہ ان کے ساتھ ان کا فن بھی مر رہا ہے.....''

''میں بھی اپنے فن کے لیے.....'' اس کی زبان اٹک سی گئی۔

''جھوٹ بولنا بند کرو میراں! خود کو مزید دھوکے میں نہ رکھو.....''

''تو کیا میں اچھی سنگر نہیں ہوں۔ میری دھنیں بے کار اور ناکارہ ہیں۔'' وہ چلا اٹھی۔ جھٹک کر کمبل کو دور پھینکا۔

''اچھا سنگر اور اچھا موسیقار لوگوں کی داد کے لیے تڑپتا نہیں ہے۔ وہ اس پر بے چین نہیں ہوتا کہ کوئی اسے سن کر تالی کیوں نہیں بجا رہا ہے۔ اس کے آگے پیسے کیوں نہیں پھینک رہا.....''

وہ خاموش ہو گئی۔ اب وہ اپنے باپ کو کیا سمجھاتی کہ وہ سچی گلوکارہ ہے' لیکن اس سچ میں تھوڑا جھوٹ بھی شامل ہے کیونکہ یہ وقت کا تقاضا ہے۔ اپنے دادا کی طرح وہ اپنے فن میں باکمال ہونے کی پوری کوشش کرتی ہے' لیکن اسے کمرشل بھی ہونا ہے۔ اسے بڑے بڑے کنسرٹ میں جانا ہے۔ البم نکالنا ہے۔ پچھلے لوگوں کی طرح' چند لوگوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے وہ مطمئن نہیں ہو سکتی۔ وہ ٹکے اور آنے کے دور کی پیداوار نہیں ہے۔ وہ ڈالر اور یوروز کے دور کی نسل ہے۔ وہ تب ہی کامیاب مانی جائے گی جب اس کے پاس سب کچھ ہوگا۔ چار سو کروڑ روپے اور آٹھ سو کروڑ سامعین۔

بس..... اتنی سی بات..... اور وقت کا تقاضا.....

☆☆☆

''تمہارا گھر اچھا ہے لیکن کچھ چھوٹا نہیں ہے بلکہ بہت چھوٹا؟'' بہرام اس کے گھر آ چکا تھا اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ تین بار اسے آفس میٹنگ کے لیے بلایا جا چکا تھا اور وہ تینوں بار ملنے سے انکار کر چکی تھی۔ اب وہ خود اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔

تم جوس پیو۔ جوس کا گلاس کافی بڑا ہے' تمہارا پیٹ اور نیت دونوں بھر جائے گی۔'' پاپا کی کل جمع پونجی' اس گھر پر اس نے ایک نظر ڈالی۔

''تمہیں سچ کا برا نہیں ماننا چاہیے میراں۔''

''یہ دس مرلے کا ڈیڑھ کروڑ کا گھر تمہیں چھوٹا لگ رہا ہے.....؟؟'' وہ طنز سے بولی۔

''دس کنال کے گھر کے مقابلے میں تو چھوٹا ہی لگ رہا ہے۔ میرا تو آفس بھی تمہارے گھر سے بہت بڑا ہے۔''

''تم یہاں اپنی دولت اور آسائشوں کے بارے میں بات کرنے آئے ہو؟''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''تم سے ٹیون خریدنے نہیں' تمہیں اسٹوڈیو میں جاب آفر کرنے آیا ہوں۔''

''کیوں دھنیں چرانے کا کام تم نے چھوڑ دیا ہے یا وہ کام ٹھپ ہو گیا ہے۔''

''تمہاری ایک یہ بھی بری ہے کہ تم پرانی باتیں بھولتی نہیں ہو۔ جو سوال پوچھا ہے اس کا جواب دو؟؟''

"تم مجھے اپنے اسٹوڈیو میں جاب کیوں دینا چاہتے ہو؟؟"

"اگر تم شک کرنا چھوڑ دو تو وہاں کام کرنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے؟؟"

"تمہارا میرے فائدے سے کیا فائدہ ہے؟؟"

اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "دیکھو تم جانتی ہو کہ ہم نئے سنگرز کو گانے بنا کر دیتے ہیں......"

"نئے نہیں بے سرے سنگرز کہو......"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ ہم بے سرے سنگرز کو گانے بنا کر دیتے ہیں۔ دھنیں' بول وغیرہ سب ہمارا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے تم اپنا بیسٹ نہ دینا' لیکن تم اپنی عام سی معمولی دھنیں تو دے ہی سکتی ہو نا...... تمہیں فی دھن کے حساب سے چارج کیا جائے گا۔"

"یہ عام سی دھنیں کیا ہوتی ہیں؟؟"

"دیکھو! تم بولتی ہو سنگرز والی زبان' وہ زبان ہم بزنس مینوں کو نہیں آتی۔ اگر میری زبان میں سننا چاہتی ہو تو وہ کچھ یہ ہے کہ سب سے عام دھن ہوتی ہے ساٹھ سے اسی ہزار کی۔ اس سے تھوڑی سی اچھی دھن ہوتی ہے ڈیڑھ سے دو لاکھ کی۔ ہماری زبان میں یہ دونوں کاپر ٹونز کہلاتی ہیں۔ سلور دھن ہوتی ہے چھ لاکھ کی اور گولڈن دھن کو کم ہی لوگ افورڈ کرتے ہیں اس لیے اس کی قیمت رہنے دو۔ ڈائمنڈ دھن ہوتی ہے منہ مانگی قیمت کی دھن۔ وہ زیادہ تر غیر ملکی کمپنیوں کو بیچی جاتی ہیں۔ سمجھ گئیں...... تو تمہیں کاپر ٹون پر کام کرنا ہے۔ چاہو تو سلور' گولڈن پر بھی کام کر سکتی ہو۔ ایک اور بات' ساٹھ ہزار والی دھنیں مشکل سے ہی ہٹ ہوتی ہیں لیکن اگر تمہارا اور سنگر کا چانس لگ گیا تو تمہیں کمیشن دیا جائے گا۔"

"مجھے نہیں کرنا یہ سب واہیات کام......" وہ بالکل متاثر نہیں ہوئی تھی۔

"تمہارا کام یہی ہے...... دھنیں بنانا...... تمہیں یہی کام کرنا آتا ہے اور تمہیں یہی کام کرنا بھی ہے۔ دیکھو تم اسٹوڈیو میں کام کرو گی تو تمہارا بھی چانس بن سکتا ہے۔ پورے پاکستان میں میرے اسٹوڈیو جیسا اسٹوڈیو نہیں ہے۔ ایک مہینہ پہلے کچھ نئی مشینری انسٹال کروائی ہے۔ اپنے کتے کی آواز میوزک کے ساتھ ریکارڈ کی تھی۔ اب کیا کہوں کہ کتنے سر میں بھونکتا ہے میرا کتا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اتنا سریلا "بھوں' بھوں" کرتا ہے۔ آنا تو تمہیں سنواؤں گا۔"

"تم نے گدھے کی آواز ریکارڈ کر کے نہیں سنی...... اپنی آواز......" اس نے دانت پیس کر کہا۔

بہرام نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "مجھے تمہارا منہ پھٹ ہونا پسند ہے...... لیکن ایک حد تک...... کتنا اچھا ہو اگر تم حد میں رہنا سیکھ جاؤ۔ اینی وے...... دیکھو، ایک تو تم اچھے خاصے پیسے کما لو گی۔ ہمارے تعلقات بھی بننے لگیں گے۔ پھر ہو سکتا ہے ہم تمہیں لانچ کرنے کے بارے میں سوچیں۔ اچھا چلو لانچ نہیں بھی کیا تو بھی کم سے کم تم میرے اسٹوڈیو میں اپنا گانا ریکارڈ کرا سکتی ہو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ بہرام نے جو ساؤنڈ ریکارڈنگ اسٹوڈیو بنوایا تھا اس کی بہت دھوم تھی۔ اسٹوڈیو اتنا جدید طرز پر بنا تھا کہ غیر ملکی سنگرز بھی وہاں آ کر اپنی دھنیں ریکارڈ کروا رہے تھے۔ پچھلے سال اس کی کمپنی نے تین نئے گانے والوں کو متعارف کرایا تھا اور تینوں ہی اسٹیج پر آگ لگا رہے تھے۔ وہ ان تینوں گلوکاروں کی آوازوں کو جانتی تھی' خالص بے سرے تھے۔ لیکن اس کے اسٹوڈیو کا کمال تھا' ان کا بے سرا پن' سریلے پن میں بدل دیا گیا تھا۔ باقی اندر کی کہانی جاننے میں کسی کو دلچسپی ہی کہاں تھی۔

"میں کچھ عرصہ کام کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میں کانٹریکٹ نہیں کروں گی۔ کسی بھی وقت کام چھوڑ دوں گی۔"

بہرام اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "جو مرضی کرنا' بس اسٹوڈیو آ جانا۔ لوگ سنگر بننے کے لیے مرے جا رہے ہیں۔ انہیں خالی خولی مرنے نہ دینا۔ مرنے سے پہلے ایک بار گانا گا لینا تو ان کا حق بنتا ہے نا۔ کوئی دھن بگڑ جائے تو بھی پریشان نہ ہونا' تیس چالیس ہزار میں یہ

دھنیں بھی نکل جاتی ہیں۔ تم جانتی ہی ہو سب...... اپنی وے میں چلتا ہوں اب۔ تمہارے اس ڈربے نما گھر میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

میراں نے سختی سے لب بھینچ لیے۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ بہرام جتنا کمینہ انسان پوری میوزک انڈسٹری میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اور بہرام سے بڑا کوئی گاڈ فادر بھی نہیں تھا۔ وہ جس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا تھا' اسے اسٹار بنا کر ہی چھوڑتا تھا۔ لیکن اس سر پر ہاتھ رکھنے کے وہ پورے پورے پیسے لیتا تھا۔ بلکہ سالوں لیتا رہتا تھا۔ سنگر کو کم سے کم پانچ سال تک اسے اپنی کمائی کا چالیس فیصد دینا ہوتا تھا۔ جہاں اس کا متعارف کروایا گیا گلوکار اپنی حیثیت کھونے لگتا ہے وہ کوئی نہ کوئی متنازعہ بحث شروع کر کے گلوکار کو زندہ کروا دیتا تھا۔ وہ اپنے گلوکار کو اور اس کے بے سرے گانوں کو ہٹ کروانا جانتا تھا۔ ویسے بھی سر اور سریلا...... موسیقی اور اچھا گانا...... لوگوں کو اب ان کی ضرورت ہی کہاں رہی تھی۔

وہ رات اس نے سوچتے ہوئے گزار دی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بہرام کا اس میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس کے اسٹوڈیو میں پہلے سے ہی کچھ اچھے موسیقار موجود تھے۔ وہ اچھی دھنیں بنا رہے تھے۔ اسے اب میراں سے کیا لینا دینا تھا۔ پہلی بار وہ اسے میوزک اکیڈمی میں ملا تھا۔ دوسری بار تب جب اس نے اپنا پہلا گانا یوٹیوب پر لانچ کیا تھا' اور وہ طیش سے بھری ہوئی اس کے آفس میں گئی تھی۔ اس نے اس کے آفس کا شیشے کا دروازہ دھکا دے کر کھولا تھا۔

"تم نے میری دھن چرا کر اپنی کمپنی کے نام رجسٹرڈ کروالی ہے۔ اتنی ہی شرم کر لیتے کہ ہم دونوں نے ایک ہی میوزک اکیڈمی سے کلاسز لی ہیں۔"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "دراصل ایک سنگر کو تمہاری دھن پسند آگئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے ایک ایسی دھن بنا دو۔ میں نے تمہارے یوٹیوب چینل پر پرویوز دیکھے۔ کل ملا کر دس ہزار تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ ایسی کیوں...... تم یہی لے لو......"

اس نے لب بھینچ لیے۔ "تم اتنی آسانی سے یہ سب نہیں کر سکتے۔"

"آسانی سے نہیں کرتا میراں! بہت وقت اور پیسہ لگتا ہے یار! پہلے تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ تمہاری دھن' اپنی دھن میں تبدیل کی۔ پھر تمہارا یوٹیوب چینل ڈیلیٹ کروایا۔ اب تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ دھن تمہاری ہی ہے۔ ویسے تم ان مقدمے وغیرہ کے چکروں میں نہ پڑنا۔ بہت گھٹیا نظام ہے یہاں کی عدالتوں کا۔"

وہ دانت پیس کر رہ گئی تھی۔ "ایسی بھی اندھیر نگری نہیں ہے بہرام! سسٹم کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو انصاف مل ہی جاتا ہے۔"

اسے اٹھارہ ماہ لگے تھے یہ ثابت کرنے میں کہ وہ دھن اس کی ہے۔ ان دونوں کے مشترکہ کلاس فیلوز اور میوزک انڈسٹری کے سنجیدہ حلقوں نے باقاعدہ بہرام کو ذلیل کیا تھا۔ سوشل میڈیا پر بھی ایک عرصہ بحث چلتی رہی تھی۔ جس سنگر کو اس کی دھن دے دی گئی تھی' اتنی بدنامی مول کر اس نے ہی سچ کا اعتراف کر لیا تھا کہ یہ دھن میراں کی ہے' اور اس نے بہرام کی کمپنی سے خریدی ہے۔

بہرام کی بدنامی تو ہوئی لیکن لوگوں کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے۔ وہ اچھی باتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بری باتیں بھول جاتے ہیں۔ ویسے بھی امیر انسان کے نقص یاد رکھنا کون چاہتا ہے۔ سب کو با اثر اور امیر انسان کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ کوئی وزیر ہو' سیاست دان' یا کھلاڑی...... میدان میں چیٹنگ کی ہو یا سیاست میں کرپشن۔ ہاتھ میں ٹرافی ہو' پشت پر کرسی تو عوام سب بھول جاتی ہے...... سب یہ واقعہ بھی سب بھول چکے تھے۔

وہ میوزک انڈسٹری کا گاڈ فادر بنتا چلا گیا تھا۔ کبھی اس کی' کبھی اس کی' وہ دھن پر دھن چراتا جا رہا تھا۔ کوئی تھوڑا بہت شور کرتا تو وہ پیسے سے چپ کروا دیتا تھا۔ پیسہ اس صدی کا سب سے بڑا سچ ہے۔ اس سچ کے آگے سب "سچے سچ" جھوٹ ہیں۔

☆☆☆

اس صدی کا سب سے سچا بندہ رات گئے سوئمنگ پول کے باہر بیٹھا ایک اور سچ کہہ رہا تھا۔

''جو جوہری ہیرے کی پرکھ نہیں رکھتا وہ کانا ہوتا ہے۔ اور جو ہیرے کو پرکھ کر بھی اسے ہاتھ سے پھسل جانے دیتا ہے وہ آنکھوں اور عقل دونوں کا اندھا ہوتا ہے۔' کچھ دیر پہلے اس کے پاس میراں کا فون آیا تھا کہ وہ کل سے باقاعدہ اسٹوڈیو جوائن کر رہی ہے۔

''تو یہ ثابت ہوا کہ تم اندھے نہیں ہو......''

''بالکل۔ وہ اسٹوڈیو آئے تو اسے کھل کر کام کرنے دینا۔ پوری آزادی دینا لیکن اس پر ظاہر نہ کرنا کہ تم نے اسے آزادی دی ہے۔ اسے انسٹرومنٹس سے کھیلنے دینا۔ وہ زیادہ دیر تک خود کو روک نہیں سکے گی۔ بہت جلد وہ وہاں رات رات بھر کام کرے گی۔ دن کو ہمارے لیے' رات کو اپنے لیے......''

''اور پھر......؟؟''

''مجھے اس کا رات کا کام ہی چاہیے......اس کا اصل کام......کیا سمجھے!''

''تھوڑا تھوڑا سمجھ رہا ہوں۔''

''تم تھوڑا تھوڑا ہی سمجھ سکتے ہو کیونکہ تم بہرام نہیں ہو۔''

وہ سب پوری طرح سے سمجھتا تھا......بہرام...... جس کے لمبے گھونگریالے بال ہیں۔ جن کی وہ پونی بناتا ہے۔ اور بائیں کان کی لو میں سفید سونے کی ایک بالی......

☆☆☆

زیام منصور......اگر وہ بڑا گائیک نہ ہوتا تو بڑے تخت کا تخت نشین ہوتا۔

مہر النساء نے سوچا کہ اسے فوراً بھاگ جانا چاہیے۔ پھر جب وہ بوکھلا کر واقعی میں بھاگ جانے والے انداز سے پیچھے پلٹی تو ایک دم سے رک گئی۔ ایسے ایسے عظیم استاد کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ پلٹ کر واپس آئی۔ زیام سینے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ کو سننے کے لیے آئی تھی......'' اس نے گھگھیا کر کہا۔

زیام طنز سے کچھ ایسے ہنس دیا کہ اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ ''اور......؟؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''اور......اور......میں بھی گائیکی ہوں۔ آپ جتنا سریلا تو نہیں لیکن......وہ......میاں غلام علی غلام نے کہا تھا کہ مشرق اگر خیموں کی سرزمین ہے' تو میرے سر اس کے باشندے ہیں۔'' اس نے بڑی معصومیت سے بتایا۔ صرف اس لیے بتایا کہ وہ اسے معمولی ملازمہ سمجھ کر بھگا نہ دے۔ اسے بھی گائیک ہی سمجھے۔ معمولی سی ہی سہی۔

زیام کے اعصاب کھنچ گئے۔ وہ بارہ دری کے کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ کنارے سے باہر کچھ قدم دور سامنے کھڑی تھی۔

''غلام علی غلام......'' زیام نے زیرلب نام دہرایا۔ انہیں کون نہیں جانتا تھا۔ وہ تو ان سے مل بھی چکا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اتنی بڑی بات انہوں نے اس لڑکی کے لیے کہی ہوگی۔

''میں ایک بار ان سے مل چکی ہوں۔ انہوں نے کھانے کے لیے مجھے شرینی بھی دی تھی۔'' اس نے یقین دلانا چاہا۔

''ایسے جھوٹ بول کر تم مجھے متاثر نہیں کر سکتیں۔ یہ بتاؤ' مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''کچھ مجھے بھی سکھا دیں......سنا ہے آپ ایک ایسا راگ گاتے ہیں جو کوئی اور نہیں گا سکتا۔'' اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

کھڑے کھڑے اس نے ارادہ بنا لیا تھا کہ کیا ضرورت ہے نواب خالو کے محل میں چھپ کر جانے کی۔ اگر زیام منصور اسے ایک بار راگ سنا دیتے ہیں تو وہ مور محل جا کر سنا دے گی۔ ایسے سب خوش......وہ بھی خوش......

زیام کی سانسیں حیرت سے بے قابو سی ہو گئیں۔ کیا وہ کوئی چنے بیچنے والا تھا۔ کیسی واہیات

بات تھی یہ۔ وہ ڈیڑھ سال کا تھا جب سیکھنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔ چھبیس سال وہ سروں کو استاد بنا کر خود ان کا شاگرد بنا رہا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھی کہ اگر مشرق خیموں کی سرزمین ہے تو اس کے سر ان خیموں کے باشندے ہیں...... تو پھر وہ کیا تھا...... زنگ آلود ستار؟

"مجھ سے سیکھو گی......؟" اس کا غرور تلوار کی طرح کھنچ گیا۔ بے یقینی سے مہر سے پوچھا۔ "راگ سننا چاہتی ہو؟"

اس نے فوراً ہاں میں سر ہلا دیا اور مسکرا بھی دی۔

"میری گرو دکشنا دے سکو گی؟"

"ضرور دوں گی...... جو کہیں گے وہ دوں گی؟"

"پہلے گرو کو آزمائش دو......" زیام نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ اور پلٹ کر قالین پر کمر سیدھی رکھ کر مشرق کی سمت منہ کر کے بیٹھ گیا۔ سامنے اسے بٹھا لیا۔

"سر اور سانس کو جانتی ہو؟"

وہ نہیں جانتی تھی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

"کسی بھی سر کی تان کھینچو...... دیکھتے ہیں تمہارے سر کا کہاں سانس ٹوٹتا ہے۔"

مہر النساء مسکرا دی۔ بس اتنی سی بات۔ سات سر...... ارھوی امرھوی...... سب سے اُونچا سر ساتواں سر "سا" ہے۔ اگر یہ حلق سے نکلے تو جان کھینچ لیتا ہے۔ اگر پھیپھڑوں سے نکلے تو سانس کھینچ دیتا ہے لیکن اگر یہ سانس اور پیٹ سے الگ 'اندر سے نکلے تو سارے جہاں کو "سا" میں سمیٹ لیتا ہے۔

اس نے کمر کو سیدھا کیا۔ دونوں پیر موڑ کر پیچھے کیے۔ استاد کے سامنے کمر اور پیر نکال کر نہیں بیٹھتے۔ پیٹ کا ایک بل سر کے سات بل ہوتے ہیں۔ نہ سر میں خم ہو نہ پیٹ میں بل۔ دل میں زعم ہو نہ تکبر کی جڑ۔ سر تب ہی باہر آتا ہے...... "سا"...... سارا جہاں سا ہو جاتا ہے۔

زیام نے ریت گھڑی الٹ کر رکھ دی اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ گاؤ......

اس نے...... آ...... آ...... کو سا میں جکڑ لیا......

آواز بارہ دری سے نکلی' باغ کے کونے کونے سے ہوتی' محل کے جھروکوں تک جا پہنچی۔ اس کے سا کی گونج نے بارہ دری کی سانس کو روک دیا تھا۔ صبح کی اولین لہر کی طرح تازگی دیتی ہوئی...... سر "سا" میں "آ" کی گونج نے زیام کو پسینے پسینے کر دیا تھا۔ اس کی ریت گھڑی اپنا وقت پورا کر چکی تھی۔ لیکن مہر النساء نے اپنا سانس نہیں توڑا تھا۔ اس کے "سا" نے سارے جہاں کو جکڑ لیا تھا۔ صبح نکھر آئی تھی۔ دن روشن ہونے کو تھا۔ سب "سا" میں کہیں مقید ہو چکا تھا۔ سا نے اپنے سارے بھید کھولنے شروع کر دیے۔ ہاں اب زیام نے شدھ "سا" کو پا لیا تھا۔

جب اس نے اپنی سانس کو روکا تو زیام کو سانس لینا یاد آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ پورے چھبیس سال اسے یہ بتایا جاتا رہا تھا کہ اس جیسا گائیک نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ پیدا ہو گا۔ تو یہ گائیک اس محل میں بنا سیکھے کیسے پیدا ہو گیا تھا۔ تان سین کی قبر پر لگی ساری املی چاٹ کر یا پھر کسی عظیم گائیک کا جھوٹا نکل کر۔ وہ کسی عظیم گائیک کا خون تھی...... یقیناً......

"نواب سراج تمہارے کیا لگتے ہیں؟" اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ اس نے اپنے استاد کو متاثر کر لیا ہے۔ "میرے رشتے کے خالو ہیں۔"

اس کا وہم یقین میں بدلنے لگا تھا۔ "تمہارے والد؟ والدہ؟"

"والد فوج میں تھے۔ دونوں اب اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"تم کسی گائیک کی بیٹی نہیں ہو؟ تمہارے خاندان میں کوئی گائیک نہیں گزرا؟ تم نے کسی سے سیکھا بھی نہیں۔"

"نہیں......" اس نے سر بھی ناں میں ہلایا۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی جو مور محل سے آئی ہے۔ اس کا دُور دُور تک کسی گائیک خاندان

سے تعلق نہیں ہے۔ نہ خون میں' نہ ریاض میں۔ نہ کوئی اس کا استاد رہا نہ اس نے کسی کی شاگردی کی۔

"نہیں......آپ مجھے سکھائیں گے۔ مجھے اپنا شاگرد بنالیں۔ آپ جب تک یہاں ہیں مجھے کچھ نہ کچھ سکھا دیں گے؟"

زیام نے سر ہلا دیا اور اپنا دامن جھٹک کر چلا گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ شوق سے اپنے استاد کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ان کے احترام میں ہاتھ باندھ کر کھڑی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ واپس آ گئی۔

"کیا کہا انہوں نے؟" قمر پوچھ رہی تھی۔ وہ مہمان خانے کے پھاٹک پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اور ڈر کے مارے سفید ہو رہی تھی۔

"وہ مجھے راگ سکھانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ آؤ چل کر سب کو بتائیں۔"

وہ خوشی سے ایک پیر چلتی' ایک پیر اچھلتی محل کی طرف بھاگی۔ وہ سب کو بتانا چاہتی تھی کہ جس راگ کی اتنی دھوم مچی ہے' وہ راگ جلد ہی وہ بھی سیکھ لے گی۔ جلد ہی مور محل میں بھی ایک محفل لگے گی۔ نواب خالو نے تو اتنے جتن کیے ہیں' وہ صرف "سا" پر سانس ٹھہرا کر سب کچھ لے آئی ہے۔

"دل تو نوابوں کے پتھر کے ہوتے ہیں۔ یہ استاد لوگ تو بہت بھلے مانس ہوتے ہیں۔" نواب بیگم نے سنا تو خوش ہو گئیں۔

"بھلا مانس ہے تو ہی اللہ نے اتنا فن دیا ہے۔ وہ کیا کہا تھا تمہارے استاد غلام علی نے کہ دل کالا ہو یا سخت تو سروں سے سانس نہیں دھواں نکلتا ہے۔ ایسے ہی تو نواب زیام منصور کے دیوانے نہیں ہوئے جا رہے۔ دل ہرا بھرا ہے ان کا......" پہلی بار خالہ خوش ہوئی تھیں۔

"سچے فن کار کا دل معصوم بچے کی طرح ہوتا ہے۔ اس میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہوتا۔ نہ چالاکی نہ مکاری۔ نہ حسد نہ لالچ۔ اگر ہو تو پھر وہ سچا نہیں ہوتا یا پھر فن کار نہیں ہوتا۔ کاش کوئی فن ہمیں بھی نصیب ہوتا۔ ہمیں بھی ہاتھی گھوڑے بھیج کر بلایا جاتا۔ سلامیاں دی جاتیں۔" نواب بیگم نے چہک کر کہا۔

"کڑے تیوروں سے نواب آپ کو سلامیاں دیتے تو رہتے ہیں۔ وہ تو آپ کو ہضم نہیں ہوتیں۔" بوا نے اپنی اب تک زندگی میں پہلی بار کوئی پر مزاح بات کی تھی۔ سب خوب دل کھول کر ہنسیں۔

☆☆☆

کچھ سوچ بچار ہوئی اور مہر کو نواب محل کی محفل میں بھیج دینے کا انتظام کیا جانے لگا۔ دیپ محل جہاں محفل ہوتی تھی' اس کے عین پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس کا ایک دروازہ دوسری طرف باغ میں بھی کھلتا تھا۔ مہر کو اسی باغ سے ہو کر اس ہال میں جانا تھا۔

سر شام ہی مہر کو کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ کمرے کے چراغ گل کر دیے گئے تھے۔ رات ہوئی تو وہ لکڑی کے دروازے کی درزوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اب زیام اس کی نظروں کے عین سامنے تھا۔ سیدھ میں دور......لیکن سامنے...... دائیں طرف نواب صاحب بیٹھے تھے اور دوسری نشستوں پر ریاست کے خاص لوگ۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو ہوا تو......

"اکبر کے دربار میں میاں تان سین نے کانہڑے کی گندھار اور دھیوت کو اندولن بنایا تو ایک نیا تاثر پیدا ہوا تھا۔ شہنشاہ اکبر کو یہ نیا تاثر بہت پسند آیا تھا۔ اسے درباری راگ کانہڑہ......"

مہر نے دروازے کی جھری سے زیام کو اتنا کہتے ہوئے سنا۔ وہ جس رعب سے بیٹھا تھا' وہ انداز وہاں کسی اور کو نصیب نہیں تھا۔

زیام نے الاپ شروع کیا......اس کے بالوں کے کنڈل بڑے کٹیلے ہو چکے تھے......زہریلے سانپ کے پھن کی طرح۔

گندھار اور اندولن جھولنے لگے اور دل ڈولنے لگے۔ کمرے میں بند مہر نے اپنے دل کو شدت سے سمٹتا ہوا پایا۔ اکلاپا ٹھہر کر بہنے لگا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر جھکتی جا رہی تھی۔ اور پھر اس نے بے اختیار

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ راگ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا......

تاریکی' اور اکیلے پن کی شدت کے بہاؤ کا راگ ہے...... ایسے یہ رات کا راگ ہے......

مہرو نے خود کو کبھی اتنا بے خود اور بے بس نہیں پایا تھا۔ اندھیرے کمرے میں دیکھنے کے لیے اسے روشنی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ صاف صاف دیکھ رہی تھی کہ اس کی روح کہاں سے کہاں سے زخمی ہے۔ کون کون سے دکھ اس کی جان کا روگ بن چکے ہیں۔

کوئی جان کا روگی ہو یا دل کا......

راگ درباری اس کا ہم جولی ہے......

لکڑی کے منقش دروازے سے پشت جوڑ کر زمین پر سب کچھ ہار چکی بے خودی میں جھکی مہر نے دھیمی آواز میں زیام کی آواز سے آواز ملانا شروع کی۔ اس کا اندر کورا تھا' اس راگ کی بوندیں' اس پر انمٹ نقش ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ اس راگ کے ساتھ سانس لینے لگی۔ راگ ختم ہوا تو اسے لگا اس کی سانس بھی ختم ہو گئی۔ وہ زمین پر ادھ موئی بیٹھی رہی۔ ایک ہاتھ دل پر اور ایک زمین پر۔

کوئی دکھ سے تڑپتا ہو...... اداسی میں جیتا ہو......

تاریکی سے نکل کر ہمیشہ اجالا ملتا ہے۔ اسے لگا اس کی روح تاریکی میں بہہ کر نکھر گئی ہے۔ اپنی ہتھیلی سے گیلی آنکھیں پونچھ کر اس نے کھڑے ہو کر زیام کو دیکھا۔ اس کے گھونگھریالے بالوں کے کنڈل اور کٹیلے ہو گئے تھے۔ کالے سیاہ ناگ......

رات کا دوسرا پہر شروع تھا...... راگ بہاگ کا پہر......

پھر ٹھمری اور پھر...... راگ زیام...... یہ وہ راگ تھا جس کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ جس کی بندش زیام نے کھولی تھی۔ کئی سالوں کی ریاضت کے بعد زیام اسے مکمل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

''نواب صاحب کی اجازت سے ہمیں پھر سے دیپ محل کی تسلی چاہیے۔''

نواب نے سر سے اشارہ کیا اور دیپ محل میں کھڑے ملازم باہر جا کر اتنی دور کھڑے ہو گئے کہ ان تک آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ دروازے بند کر دیے گئے۔ زیام کے نمائندے نے دروازوں کی طرف اشارہ کیا۔ نواب کے خاص ملازم نے ایک ایک کر کے باہر سے ہال کی طرف کھلنے والے دروازوں کو کھول کر اندر جھانکا۔ اس دروازے کے اندر بھی جہاں پیچھے مہر کھڑی تھی۔

مہر دروازے کے پیچھے دیوار سے لگ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ اوٹ میں نہ بھی ہوتی تو بھی یہ وہی ملازم تھا جس نے اسے وہاں چھپایا تھا۔ مور محل کی عورتوں اور صرف ایک اس ملازم کے علاوہ کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ وہاں موجود ہے۔

وہ وہاں موجود ہے...... اپنے سارے سر اور بچے کھچے سانس لیے......

وہ وہاں موجود ہے...... راگ زیام کو ''راگ مہر'' میں بدلنے کے لیے......

☆☆☆

نواب صاحب کا وہی خاص ملازم بس اندر رہ گیا اور زیام نے زہر خند انداز سے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے' گردن کو ایک جھٹکا دے کر کمر کو پھر سے سیدھا کیا اور راگ شروع کیا......

زیام کی آواز دیپ محل کے اونچی چھت والے ہال میں' جا بجا لگے فانوسوں کے گرد گھومتی جگنوؤں جیسی روشنیاں سمیٹ رہی تھی۔ مہر نے اپنے دل کی دھڑکن کو رک رک کر چلتے سنا۔

ٹھمری سے لگی اس کی آنکھ جھپکنا بھول گئی۔ سب سننے والے پہلو تک بدلنا بھول گئے۔ زیام منصور نے ٹھیک کہا تھا' اس نے سالوں ریاضت کی ہے۔ وہ یہ کہنا بھول گیا تھا کہ سالوں سانس اور سر ایک تال پر رہے ہیں۔ دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ ساری اداسی جاتی رہی۔

جیسے کوئی خیال دل میں آتا ہے اور وہ کلام بن جاتا ہے۔ جیسے امیر خسرو کو سنتے' کوئی فن کار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک لمحہ لگا اور مہر نے راگ زیام پا لیا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ساری بندش کھول کر اس نے پورے راگ کو روشن ستارے کی طرح دیکھ لیا۔ وہ زیام کے ساتھ ساتھ گانے لگی۔ اتنا کہ وہ زیام سے بس ایک سانس پیچھے رہ گئی...... بس ایک سانس......

وہ کمرے میں اکیلی تھی اور بے خود بھی۔

دروازے کی جھری سے اس نے اپنی آنکھ ہٹالی اور دونوں آنکھیں بند کر کے راگ کو محسوس کرنے لگی۔

پھر وہ کمرے میں دروازے کے پاس پاس لہرانے سی لگی۔ اس کے پیروں میں پازیب نہیں تھی۔ ہوتی تو وہ ایسی چھن چھن کرتی کہ آگ کو گل زار کر دیتی۔

ادھر زیام منصور آنکھیں بند کیے سانسوں میں دل دھڑکا رہا تھا۔

ادھر مہر' زیام کی سانس سے پہلے اپنے سر نکال رہی تھی۔ اور پھر بس بے خودی میں' کچھ بہک کر' کچھ لہک کر' کچھ آزادی سے' کچھ بغاوت سے اور کچھ سب کچھ پالینے کے جنون میں...... اُدھر زیام نے آخری انترے میں اپنی جان لگا دی۔ ادھر مہر نے دروازے کے اس پار اپنی جان لگادی......

دو آوازیں دیوار کے اس اور اس پار گونجنے لگیں۔ یہ دونوں آوازیں ایک دوجے میں ایسے مدغم ہوئیں کہ فرق جاتا رہا کہ دو ہیں...... ایک عورت اور ایک مرد کی...... ایک راگ ہے اور ایک راگنی......

بس سر تھے...... شدھ تھے......

پلٹے میں زیام نے ایک سانس ٹھہرایا تو اس نے جانا کہ جو سانس اس نے ٹھہرالیا ہے وہ کسی اور نے نہیں ٹھہرایا۔ پلٹہ وہیں رہ گیا۔ زیام نے ہاتھ کھڑا کیا۔ سازندے وہیں رک گئے...... لیکن دیوار کے دوسری طرف......

راگ کی ساری بندشیں کھول چکی مہر...... پلٹے کے آخری سر نکال رہی تھی......

سارا عالم ہو کا عالم ہو گیا۔

اپنی بے عزتی اور سبکی کے خوف سے نواب کی پیشانی پر پسینے کی ایک باریک لکیر ابھر آئی۔ سب کی گردنیں دروازے کی طرف مڑ گئیں۔ خون نواب کی کنپٹیوں میں لاوا بن گیا۔ آنکھوں کے شرارے اور ضبط کی چنگاریاں سب کچھ جلا دینے کے درپے ہو گئیں۔

''کون ہے وہاں؟'' نواب کی آواز مور محل تک سنی گئی ہو گی۔

زیام نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ایک طنز بھری نظر نواب پر ڈالی۔ نواب کی ساری نوابی وہیں ڈھیر ہو گئی۔

''کون ہے وہاں؟ سارے جہاں کے سامنے یہ تماشا اسے بہت مہنگا پڑے گا۔''

نواب کے خاص ملازم نے جان لیا۔ ''موت دونوں طرف کے لیے لکھی جا چکی ہے۔''

☆☆☆

زیام خاموش رہا۔ سازندے دم سادھے بیٹھے رہے اور نواب کے چہرے کی سرخی بڑھتی گئی۔

مہر نے پلٹے کے آخری سر کو چھوڑا تو آنکھیں کھولیں۔ اس کی سانسیں معطر تھیں۔ وہ زندگی میں اتنی خوش کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہوئی تھی۔ اگر اسے کوئی استاد مل جاتا تو وہ ایسے کئی راگ بنا سکتی تھی۔

اس نے راگ زیام کے پہلے سروں سے راگ کے باقی سروں کی بندشیں نکال لی تھیں۔ اس نے راگ کا وجود پالیا تھا۔ جیسے پھول خوشبو کو پالیتا ہے اور خوشبو پھول کو...... یہ کوئی ایسا راز نہیں' بس جو جس کا ہوتا ہے' وہ اس سے آملتا ہے...... مہر سے اس کا راگ آملا تھا۔

اس نے راگ زیام' پورا عیاں ہونے سے پہلے عیاں کر لیا تھا۔

اور کچھ اس لیے بھی زیام کا چہرہ سرخ تھا۔

جس وقت جھٹکے سے دروازہ کھلا اس وقت بھی وہ راگ کے محسوسات میں گھری کھڑی تھی۔ باہر سارا عالم کس عالم میں ہے' وہ بے خبر تھی۔ وہ بہت خوش تھی کہ آئندہ رات وہ مور محل کی محفل لوٹ لے گی۔

نواب بیگم اس پر نازاں ہوں گی اور نواب زادیاں اس پر نثار۔ بے خودی کا ایسا راگ انہوں نے بھی کہاں سنا ہو گا۔

ہاں تو پھر جس وقت دروازہ کھلا' اس وقت وہ دروازے کے عین درمیان میں کھڑی تھی۔ پٹ باہر کی طرف وا ہوئے تو وہ پیچھے کی طرف گرتے گرتے بچی۔ جب وہ سنبھل کر اٹھ کر کھڑی ہوئی تو اس نے ساری محفل کو آگ پایا۔ ایک ایک نظر خود پر...... اس کا دوگز کا گھونگھٹ بھی اسے کسی نظر سے نہ بچا سکا......

''کون ہے؟ باہر لاؤ اسے......''

ملازم کی زبان پر سانپ پھر گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ حکم مانے یا حد پہچانے۔ مور محل کی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے کیسے لے آئے۔ دوگز کا گھونگھٹ نکال کر کھڑی اس لڑکی کے درمیان دو سو میل کا فاصلہ بھی آ گیا تب بھی وہ بہت کڑا وقت کاٹے گی۔

''کیا تمہیں سنائی نہیں دے رہا۔'' نواب پوری قوت سے دھاڑا اور ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا۔

''وہ......وہ مور محل س......س......سے......''

رات کے تیسرے پہر کا راگ' رات کے پہلے پہر کے راگ میں بدل گیا۔ اس کے دل نے رات کی ساری تاریکی نگل لی۔ اس کا حلق سوکھ کر صحرا ہو گیا۔ ایک ایک کر کے اس نے کتنے ہی سروں کو دم توڑتے دیکھا۔ ملازم کی جان پر رحم کرتے ہوئے' مہر نے اپنے قدم خود ہی آگے بڑھا دیے۔ دروازہ نواب کی پشت کی طرف تھا۔ وہ چلتی ہوئی نواب کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ہال کے درمیان میں۔ سب کے سامنے......زیام منصور سے بائیں رخ......

دوگز کے گھونگھٹ میں نواب نے اسے پہچان لیا تھا۔ ایسی لڑکیوں کو سہارا دینے کا یہی نقصان ہوتا ہے۔ ایک دن وہ باندی سے کٹاری بن جاتی ہیں اور گردنیں کاٹ ڈالتی ہیں......ورنہ کٹوا لیتی ہیں......

زیام اٹھا اور نواب کو پشت دکھا کر' سازندوں کو اشارہ کر کے جانے لگا۔ جانے سے پہلے اس نے بس اتنا کہا۔

''نواب صاحب کو تحائف واپس کر دیے جائیں۔ وظیفے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ دستاویزات جلا دی جائیں۔ ہم اسی وقت واپس جائیں گے۔ جہاں زبان کا پاس نہیں وہاں فن کو ہوا راس نہیں۔''

مہر نے جھٹکے سے سر اٹھا کر زیام منصور کو دیکھا۔ وہ مشکل سے سترہ سال کی تھی' لیکن اتنی بے وقوف بھی نہیں تھی۔ زیام......پھر تو وہ رہا تھا اپنی زبان سے......

''آپ کو زبان چاہیے یا سانس؟''

نواب پسینے میں بھیگ چکے تھے۔ بھری محفل میں ایک گائیک نے انہیں پشت دکھائی تھی۔ طنز کیے تھے۔ زبان سے پھرنے کا طعنہ دیا تھا۔ نواب نے ساری زندگی ایسی بے عزتی کا مزا نہیں چکھا تھا۔

مہر نے بے یقینی سے اپنے رشتے کے خالو کو دیکھا۔ وہ کتنے بھی سخت مزاج اور پتھر دل ہوں لیکن ایسے نہیں تھے۔

''زبان لیں گے یا سانس......؟'' نواب نے سوال پھر سے دہرایا کہ وہاں بیٹھا ایک ایک شخص سن لے۔ وہ اپنی زبان کی لاج' قیمت کسی کی جان دے کر بھی چکا سکتے ہیں......سب سن لیں......

زیام نے ایک نظر مہر کو دیکھا۔ زیر لب ہنسا اور پھر ہنسی چھپا لی......اور پھر کہا......

''سانس......''

مہر نے کچھ ایسے جھٹکے سے سر اٹھایا کہ اس کا گھونگھٹ گر گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم سے اتنے آنسو سمٹ آئے کہ مور محل کے سامنے بہتا دریا سوکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔

''سانس......''

اس کے سارے سر عظیم گائیک زیام منصور کی بے اعتباری اور ظلم پر دم بخود رہ گئے......

نواب کے اشارے پر ملازم نے مہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا۔ نوابوں اور نظاموں سے ہال خالی ہونے لگا۔ ایک ایک کر کے فانوس گل ہونے لگے۔ اس میں جلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ملازم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹنے پر مجبور تھا۔

اور وہ گردن پیچھے موڑے زیام کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ملازم سے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بت بن کر کھڑی رہ گئی۔ زیام نے دوسرے دروازے سے مہمان خانے جانے کا اپنا ارادہ ترک کیا اور چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"تم نے کہا تھا تمہیں کچھ سکھا دوں۔ میں نے تمہیں یہ راگ سکھا دیا ہے۔ اب گرو دکشنا میں تمہاری جان لے رہا ہوں...... تمہاری سانس...... تمہارے سارے سر......" وہ ہنسا...... گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اکڑ الیا۔

☆☆☆

گھر والے خوش تھے کہ وہ جاب کرنے لگی ہے۔ اس کے تینوں بھائی' ماما اور پاپا۔ اب وہ فقیروں کی طرح چھوٹے موٹے کنسرٹ کے لیے بھاگ دوڑ نہیں کرے گی۔ جاب کی اپنی ہی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ کتنا بھی آزاد ہو کر کام کیا جائے' جاب، جاب ہوتی ہے۔

چند دن تو وہ اسٹوڈیو کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ دراصل وہ اسٹوڈیو کا پورا سسٹم دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہاں ایسے ایسے تکنیکی آلات موجود تھے کہ چھوٹی موٹی دھنیں تو وہ بیٹھے بیٹھے بنا سکتی تھی۔ اسٹوڈیو کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد اس نے وہاں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے پاس کافی دھنیں تقریباً تیار رکھی تھیں۔ کچھ ادھوری تھیں۔ کچھ کو تبدیل کرنا تھا۔

پندرہ دنوں کے اندر اندر اس نے کل ملا کر پانچ دھنیں اسٹوڈیو کے حوالے کر دی تھیں۔ بہرام کمپنی کے آفس سے اٹھ کر اسٹوڈیو اس سے ملنے آیا تھا۔

"واؤ...... کیا کمال کی رفتار پکڑی ہے تم نے میراں! میں بہت خوش ہوا ہوں۔"

وہ بیس سالہ، نئے گانے والے لڑکے کو دھن پر بولوں کی پریکٹس کروا رہی تھی۔ مسکرا کر بہرام کو دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ دل میں کچھ ایسے الفاظ دہرا رہی تھی' جو اگر زبان سے باہر نکال دیتی تو بہرام اسے کرسی سمیت اٹھا کر باہر پھنکوا دیتا۔

"میرے آفس میں کام شروع کرتے ہی تمہاری زبان کی رفتار کچھ سست نہیں پڑ گئی۔ صرف مسکرا رہی ہو۔" بہرام نے اس کی خاموشی کو نوٹ کر لیا تھا۔

"تم ہمیں ڈسٹرب کر رہے ہو بہرام! ویسے تم اتنا مسکرا کس لیے رہے ہو۔ بڑوں سے سنا نہیں کہ خواہ مخواہ مسکرانے والا پاگل لگتا ہے۔ پنجابی میں اسے "جھلا" کہتے ہیں......"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "اگر میں جھلا ہوں تو دعا کرو کہ ساری دنیا میری طرح جھلی ہو جائے۔"

"مجھے ساری دنیا کے تمہاری طرح جھلا ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن وہ تمہارے جیسی کمینی نہیں ہونی چاہیے......" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"اب ٹھیک ہے میری زبان کی رفتار؟؟" اب مسکرا کر چڑ کر پوچھا۔

"کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے ساتھ کسی جھیل کے کنارے بیٹھ کر کافی پیوں۔ کافی میں بچھو کا زہر اور جھیل میں مگرمچھوں کا ہجوم ہو۔ اگر تم کافی سے نہ مرو تو مگرمچھوں کے نوکیلے جبڑوں میں آ کر مر جاؤ......" وہ واقعی میں چڑ کر بھڑک چکا تھا۔

"مگرمچھوں کے درمیان کام کر تو رہی ہوں۔ جو نوکیلے بھی ہیں اور بھڑکے ہوئے بھی۔ اچھا کیا بتا دیا' اب اس اسٹوڈیو سے کبھی کافی نہیں پیوں گی۔" وہ اچھے گانے ہی نہیں گاتی تھی' اچھی طرح سے طبیعت بھی صاف کر دیتی تھی......

تالیاں میراں کے لیے......

مسکرا کر بہرام اسٹوڈیو سے باہر چلا گیا۔ گاڑی تک جاتے جاتے' اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ گاڑی کے دروازے کو دھاڑ سے بند کیا کہ کھڑکی سے دیکھتی میراں کے لب وسل بجانے کے لیے کھل گئے......

"الو تے نالے پٹھا......" اس نے کی بورڈ پر میوزیکلی بجایا۔

بے سرا تے نالے نخریلا......

جتنا لوگوں نے میوزک کو آسان حلوہ سمجھ لیا تھا' اتنا

ہی اس جیسے لوگوں کا جینا محال ہوتا جارہا تھا۔ مشکل سے سولہ سال کی سوشل میڈیا کوئین نے تقریباً تقریباً اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ اپنے یوٹیوب چینل کے لیے ایک عدد گانا ریکارڈ کروانا چاہتی تھی۔ عام بول چال میں بھی وہ ناک میں بولتی تھی تو گاتے ہوئے وہ کس قدر "ناکوں ناک" ہوسکتی تھی اس کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

"دیکھو! جو بھی انسان ناک میں گاتا ہوا سے تھوڑی سی پریکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں کافی سنگر ناک میں گاتے ہیں۔ یہ ایسا کوئی بڑا نقص نہیں ہے۔ تم گانے کے بولوں کو عام بول چال کی طرح پڑھنے کی مشق کرو اور منہ سے الفاظ نکالو۔"

"عاطف اسلم بھی تو ناک میں گاتا ہے۔ میں بھی گالوں گی۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"عاطف کی آواز کا اسکیل جانتی ہو کیا ہے؟ جہاں ہم جیسوں کی آواز ختم ہوتی ہے وہاں سے اس کی شروع ہوتی ہے۔ اس کی آواز کی کوالٹی اور پچ چند خاص آوازوں میں سے ایک ہے۔ ایسی آوازیں خدا کا تحفہ ہوتی ہیں۔ وہ سارے سرناک سے نکالے تو بھی وہ سریلا ہی رہے گا..... کیا سمجھیں؟"

وہ پوری طرح سے سمجھ کر اسے گھور رہی تھی......

"اینی وے! تم چند ہفتے اس کی پریکٹس کرو گی تو معاملہ کافی حد تک ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اس کی گھوری سے خائف ہوئی۔

اس نے ناک چڑھا کر ناک میں کہا۔ "چند ہفتے..... لیکن پانچ دن بعد میرے یوٹیوب چینل کی سالگرہ ہے۔ پورا ایک سال ہونے والا ہے اسے۔ مجھے یہ گانا اسی دن ریلیز کرنا ہے۔"

میراں نے منہ بنالیا۔ اب جس جگہ موسیقی کے ساتھ ایسے بھدے مذاق ہونے لگیں گے وہاں اور بچے گا ہی کیا۔ یعنی جس کا دل چاہے گا اٹھ کر گانا گانے لگے گا۔ نہ اپنی عمر دیکھے گا نہ سرتال۔ یوٹیوب چینل کی برتھ ڈے منائی جائے گی تو وہ بھی موسیقی کی ناک مروڑ کر۔

"اگر یہ گانا ہٹ ہو گیا تو ہوسکتا ہے میں سنگر ہی بن جاؤں....." کوئین صاحبہ کہہ رہی تھیں۔

"سنگر بننے کے لیے تھوڑا سریلا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے مس کوئین۔" وہ اس کے ارادوں سے خوف زدہ ہوگئی تھی کہ اگر واقعی میں وہ پکی والی سنگر بن گئی تو..... تو یا اللہ مجھے موت دے دینا......

"سریلا..... وہ کیا ہوتا ہے؟..... لوگ تو کہتے ہیں میری آواز بہت اچھی ہے......"

"اچھی آواز اور سریلی آواز میں بہت فرق ہوتا ہے۔ سریلی کا مطلب ہوتا ہے' سر والی۔ جو سر میں ہو۔ اچھی آواز اسے کہتے ہیں جو سننے میں اچھی لگے۔ ضروری نہیں کہ اچھی آواز "سر" میں بھی ہو۔ ویسے تمہیں 'سات سروں' کے بارے میں معلوم ہے کسے کہتے ہیں؟؟"

وہ بس یہ کوشش کر رہی تھی کہ لڑکی سنگر بننے کا خواب چھوڑ دے۔ ایک آدھ گانا گالے لیکن سیریس نہ ہو۔

لڑکی نے منہ بنالیا۔ "سر..... مائی فٹ..... مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے یوٹیوب چینل کے بیس لاکھ سبکرائبر ہیں۔ میں صبح اٹھ کر دانت برش کرنے کی ویڈیو بھی اپ لوڈ کر دیتی ہوں نا تو دس گھنٹے کے اندر اندر کم سے کم نو لاکھ لوگ دیکھتے ہیں۔ ایک بار میں نے گندی جرابوں کو ٹشو میں فولڈ کر کے اپنے بھائی کے منہ میں ٹھونسنے کا پرانک کیا تھا۔ میری یہ ویڈیو ٹرینڈ ونگ میں گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں آیا......"

"ہاں! سب سمجھ میں آگیا ہے کہ تم نے اب تک بس ایسے گھٹیا' فضول' اور واہیات کام ہی کیے ہیں۔ یہ گانا بھی ان میں سے ایک بننے والا ہے۔ میں اس گانے کے ساتھ اپنا نام جوڑ کر خود کو خود ہی ذلیل اور رسوا نہیں کرسکتی۔ جگ ہنسائی کے لیے مجھے یہ ذریعہ منظور نہیں ہے۔"

اس نے حیرت سے اسے دیکھ کر منہ بنایا۔ لمبی ہیل والا چھوٹا پاؤں گھمایا اور اُٹھ کر چلی گئی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

"یار میراں! کیا کر رہی ہو۔ کیوں میرا بزنس بند کروانا چاہتی ہو۔ کوئی ناک سے گاتا ہے یا دانت سے۔ تمہیں اس سے کیا؟" تین منٹ بعد ہی اس کے پاس بہرام کی کال آئی۔

"وہ میری دھن کا ستیاناس کر رہی تھی۔ اتنا سا مشورہ دیا تھا کہ تھوڑی سی مشق کر لو۔"

"وہ کیوں کرے مشق؟ ہمیں تو پورے پیسے دے رہی ہے نا وہ......"

"فن سے انصاف بھی کوئی چیز ہوتی ہے بہرام!"

"انصاف؟؟ میراں پلیز ایسی مزاحیہ باتیں نہ کیا کرو۔ ٹھیک طرح سے بلکہ ڈھیٹ بن کر کام کرو۔ میں اسے واپس بھیج رہا ہوں۔ گانا ریکارڈ کروا دو اس کا...... بھیج دوں اسے......؟؟"

"ہاں! بھیج دو اس چڑیل کو......" اس نے جل کر فون کو سائیڈ پر پٹخا۔

☆☆☆

یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ جو دھنیں اس نے بے کار سمجھ کر دی تھیں، وہ دھنیں تھوڑی سی ہٹ ہو گئی تھیں۔ اگر یہی دھنیں وہ گا لیتی تو مجال ہے جو ہٹ کی حد کو ذرا سا بھی چھو لیتیں۔ یہی فرق ہوتا ہے بڑی کمپنی کے ساتھ کام کرنے میں۔ بہرام کی پروموشن ٹیم کام ہی ایسے کرتی تھی کہ واقعی سے بے سروں کی عید ہو گئی تھی۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ دھنیں ہٹ ہو جائیں گی تو میں انہیں سلور میں سیل کرتا۔ لیکن اینی وے اب کیا ہو سکتا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا۔ کاپر میں ایسی ہٹ دھنیں نہ دینا۔" بہرام کہہ رہا تھا۔

"تم ہر وقت بس پیسے کے بارے میں سوچتے رہتے ہو......؟" اسٹول کو گھما کر وہ اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"صرف میں نہیں، ہم سب صرف پیسے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہم شہرت اور کامیابی بھی اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہماری قیمت بڑھ جائے۔ اس زمین کا ہر انسان اپنی قیمت بڑھانے میں لگا ہوا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میراں پہلی بار اس کی کسی بات سے اتفاق کر رہی تھی۔

"اگر میں تمہیں ڈائمنڈ دھن دوں تو کیا تم مجھے اس دھن کے ساتھ لانچ کرو گے؟؟ ہٹ ہونے والے سنگرز تمہیں اپنی انکم کا چالیس فیصد دیتے ہیں میں ساٹھ فیصد دوں گی...... بولو...... منظور ہے۔"

بہرام نے اپنی ٹھوڑی کھجائی اور غور سے اسے دیکھا۔ "منظور ہے۔ اگر سچی سنگر ہو تو وعدے سے مکر نہ جانا۔ سنا ہے سچا سنگر جھوٹ بولے تو اس کے سر بے سرے ہو جاتے ہیں۔"

میراں نے طنزیہ اس کی طرف دیکھا۔ "سچے سنگر کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہو تو اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے موت کیوں آنے لگتی ہے......؟"

"تم ایک خیالی دنیا میں رہتی ہو میراں! تم کچھ نہیں جانتیں۔ سچے انسان کی کہیں کوئی مانگ نہیں۔ کم سے کم یہاں تو بالکل نہیں ہے۔ پچھلے سال تم نے اپنے چینل پر جو گانا ریلیز کیا تھا، بہت پیارا گانا تھا وہ۔ لیکن ایک سال گزرنے کے بعد بھی اسے کتنے لوگوں نے سنا؟ صرف ایک لاکھ چار ہزار لوگوں نے۔ ایک آدھ ایپ نے اس پر ٹون بنائی۔ چند ایک اخباروں نے اس کا ذکر اپنی چھوٹی سی خبر میں کیا۔ نئے سنگرز پر ایک انگلش میگزین نے فیچر لکھا اور تمہیں بھی تھوڑی سی جگہ دے دی۔ چند ہفتے ریڈیو سے نشر ہوتا رہا۔ کچھ میوزک چینلز نے آن ایئر کیا...... بس......

اگر وہی گانا میرے پاس ہوتا، تو میں دھوم مچا دیتا۔ وہ گولڈن ٹون میں آرام سے نکل جاتا۔ اس گانے پر سنگر کو اتنے کنسرٹ ملتے کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر تمہارے اس ڈربے جیسے گھر سے بڑا گھر خرید لیتا۔ ہم کچھ غیر ملکی میوزیشنز کے ساتھ بھی کام کرتے ہیں۔ ان کے پاس بھی اپنی دھنیں بھیج دیتے ہیں، او کے ہونے پر منہ مانگی قیمت پر انہیں سیل کر دیتے ہیں۔ تمہاری وہ دھن بھی وہی دھن تھی۔ لیکن دیکھ لو تم

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

نے اسے ضائع کر دیا۔ ہمیں دے دی ہوتی تو چند لاکھ کما لیتیں۔"

"اور تم کتنا کما لیتے......؟؟"

وہ سب سچ کہہ رہا تھا۔ دھن بہت منفرد تھی پھر بھی گانا ہٹ نہیں ہوا تھا۔ وہ میوزک انڈسٹری کا ڈان ایسے ہی نہیں بن گیا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز پر نظر تھی۔

"میری کمائی کا گراف تمہاری سوچ کے گراف سے کہیں زیادہ ہے۔ پر میراں تم جانتیں ہی نہیں کہ گاڈ فادر بننے کا اپنا ہی مزا ہے۔ طاقت سے بڑا کوئی نشہ نہیں ہوتا۔"

"ہونہہ...... تمہیں خود کو ڈان کہنا چاہیے۔ تمہیں گاڈ فادر کے نام کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ ہنسا۔"تم لوگ نیک نامی اور بدنامی میں ہی الجھے رہتے ہو......اور دنیا میرے جیسے لوگ فتح کر لیتے ہیں......کچھ سیکھ لو مجھ سے میراں! شاید تمہارے کام آجائے۔"

"بہت کچھ سیکھ چکی ہوں تم سے۔ اسے کام میں بھی ضرور لاؤں گی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

وہ بہرام کے اسٹوڈیو میں کام کر رہی ہے' اس بات پر اس پر کافی تنقید کی گئی تھی۔ اس کے دوست احباب اس سے ناراض بھی ہوئے تھے۔ وہ اسے خبردار بھی کر چکے تھے کہ وہ انسان کسی کا نہیں بنتا' اس کا کیا بنے گا۔ لیکن وہ سب سن کر بھی خاموش رہتی تھی۔ وہ کیا کرتی۔ میوزک سے محبت کرتی' یا بہرام جیسے انسان سے نفرت۔ یہ اسٹوڈیو اس کی ضرورت تھا۔ اس کی دھنوں کو اس اسٹوڈیو کے تکنیکی آلات کی ضرورت تھی۔

وہ دن بھر اسٹوڈیو کے لیے کام کرتی تھی۔ رات کے دو گھنٹے اپنے لیے کام کرتی تھی۔ شروع میں اس بات کا بہت برا مانا گیا تھا۔ پھر اسٹوڈیو کے اسٹاف کے ساتھ اس کی انڈرسٹینڈنگ ہو گئی تو انہوں نے اسے کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس جیسے مہنگے اسٹوڈیو میں کام کے لیے دو گھنٹے میسر آجانا بھی بہت بڑی نعمت تھی۔

"یار میراں! تم آخر کب سمجھو گی؟ سلور ٹون تم نے کار پر میں نکال دی......" بہرام فون پر ناراض ہو رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کا لیکچر دے کر فون بند کر چکا تھا۔

اسے اب تک پتا نہیں چل پاسکا تھا کہ کون سی کار' کون سی سلور' اور کون سی گولڈن ٹون ہے۔ اپنی فضول اور بے کار ترین دھنیں وہ نکال نکال کر دے رہی تھی۔ اور اسی پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو سلور تھی۔ اب اسے اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا کہ واقعی میں میوزک انڈسٹری دن بدن کیوں برباد ہوتی جا رہی ہے۔ جو چیز جتنی گھٹیا تھی اتنی ہی مقبول تھی۔

آج صبح سے ہی وہ واہیات الاپ سن رہی تھی۔ اس کا دماغ گھوما ہوا تھا۔ جو لو پاپ سنگر بننے جا رہا تھا وہ دن بھر ان سب کا دماغ چاٹتا رہا تھا۔ اس نے گانے کی لائن کے چھ بول سارا دن کی ریکارڈنگ کے بعد گائے تھے۔ ریکارڈنگ سسٹم پر بیٹھے لڑکے اسے زیر لب گالیاں دے رہے تھے۔ ہیڈ فون کو کانوں پر چڑھائے چڑھائے' اس کے دماغ کو بخار چڑھ گیا تھا۔ وہ تین بول ٹھیک بول لیتا تھا تو اگلے تین بول پچھلے سے بے سرے ہو جاتے تھے۔ انہیں پورا دن لگ گیا تھا اور ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ پانی پی پی کر وہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے......اور پھر بالآخر......

"اگر میرے پاس اس وقت ڈیڑھ لاکھ ہوتے' تو میں تمہارے منہ پر دے مارتی۔ اتنا ذلیل ہونے کی ضرورت نہیں تھی مجھے۔ گدھے' تم سے یہ چھ لفظ نہیں گائے جا رہے۔ اسٹیج پر کسی نے بلا لیا تو کیا کرو گے......؟" میراں چلتی ہوئی اس کے پاس گئی۔

"لپ سنکنگ......" گدھے نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

"جو انڈیا جا کر جسٹن بیبر نے کی تھی......اب تک گالیاں کھا رہا ہے وہ......"

"جو اچھا گاتے ہیں' گالیاں تو وہ بھی کھاتے ہیں۔ میں بھی کھا لوں گا۔ گالیاں کوئی گولیاں تھوڑی ہوتی ہیں' جو ٹھا ٹھا لگیں اور بندہ مر جائے۔ میں اس سب کو اتنا سیریس نہیں لیتا۔" اس نے ہپ ہاپ بوائے کی طرح پانچ انگلیاں لہرا کر' کچھ اچھل کر زیادہ

ناچ کر کہا۔

''وہ نظر آرہا ہے۔ چھ لفظ گانے میں تم نے پورا دن لے لیا۔ باقی کے ساتھ لفظ گانے میں کتنا وقت لو گے؟''

''وقت تو بہت ہے میرے پاس......کتنا چاہیے آپ کو؟؟'' ڈھیٹ ہونا آسان نہیں ہوتا۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

''واہ......ویسے میوزک کا ستیاناس کرنے پر ہی کیوں تلے ہو......کوئی اور فیلڈ دیکھ لو۔'' وہ بھنا گئی۔

''دھرنوں اور ہڑتالوں نے اکانومی اور ملک کے امیج کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اگر میں میوزک کا کر دوں گا تو ایسا کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا......'' وہ کافی نان سیریس بندہ تھا' لیکن کچھ سیریس باتیں بھی کر لیتا تھا۔

''جتنی تیز زبان چل رہی ہے' اس کے ذرا سے قریب بھی سُر چلتے تو تمہارا گانا اب تک ریکارڈ ہو چکا ہوتا۔''

''اب ایک وقت میں ایک ہی چیز چل سکتی ہے......'' وہ سیریس ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے بھانڈ بننا تھا' کسی نے اس کا رخ میوزک کی طرف موڑ دیا......غلطی سے ورنہ مذاق میں۔

عاجز آ کر اس نے بہرام کو فون کیا۔

''اس نے دھن کے پیسے الگ دیے ہیں اور وقت کے الگ سے۔ جتنا بھی وقت لگے گا یہ اس کا الگ سے ادا کرے گا۔''

فون کو کان سے ہٹا کر اس نے حیرت سے ہپ ہاپ گدھے کو دیکھا۔ یعنی وہ اتنا پیسہ برباد کر رہا تھا' لیکن گھر بیٹھ کر یا کسی میوزک اکیڈمی میں جا کر کچھ سیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پاپا ٹھیک کہتے تھے اس نسل کا ایک ہی مسئلہ ہے...... پیسہ اور شہرت...... بیٹھے بٹھائے سب مل جائے بس...... ہاتھ پیر نہ ہلانے پڑیں، جان جوکھم میں نہ ڈالنی پڑے۔

رات بارہ بجے وہ گھر واپس آئی تھی۔ اس کی ڈانٹ اور پھٹکار کو اس نے تھوڑا سا سیریس لے لیا تھا' اور آدھا گانا ریکارڈ ہو گیا تھا۔ باقی کا آدھا اسے کل ریکارڈ کروانا تھا۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ کھانا گرم کر کے لائی تو تھوڑی دیر کے لیے صوفے پر دراز ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو دو بج رہے تھے۔ کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پاپا اسے کمبل اوڑھا رہے تھے۔

''کیوں اتنا خوار ہو رہی ہو......'' وہ محبت سے اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ اس کے بکھرے بال سمیٹنے لگے۔

''کسی کو تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ دادا بھی تو ہوتے ہوں گے......'' وہ کچی پکی نیند میں بڑبڑائی۔

''تب زمانہ اور تھا۔''

''زمانہ بدل جاتا ہے، فن نہیں بدلتا......کبھی فن جوکھم میں ڈالنا پڑتا ہے۔ کبھی جان' کبھی سانس......''

☆☆☆

کبھی جان......کبھی سانس......

''تم نے کہا تھا تمہیں سکھا دوں۔ میں نے تمہیں یہ راگ سکھا دیا ہے۔ اب گرو دکشنا میں تمہاری جان لے رہا ہوں...... تمہاری سانس......تمہارے سارے سر......'' وہ ہنسا۔ گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اکڑا لیا۔

''مجھے یہاں آنے کے لیے آپ نے ہی کہا تھا۔'' اس کی آواز پہلی بار کپکپائی تھی۔

''اچھا......تو تم نے حکم سمجھ کر مانا یا درخواست جان کر؟'' وہ طنز سے ہنس رہا تھا۔

اس کا سانس کھینچ کر وہ مسکرا کیسے سکتا تھا۔ وہ تو گائیک تھا۔ سات سر تھے اس کے اندر۔ وہ حاسد' مکار' چال باز کیسے ہو سکتا تھا۔ گائیک کا دل شفاف نہیں ہو گا تو سر سچے اور خالص کیسے ہوں گے۔ ایسے تو راگ زہریلے ہو جائیں گے۔ اسے اس کمرے تک وہی لایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں موجود ہے......وہ جانتا تھا......اسی لیے تو ایک سانس رکا تھا......تاکہ اس کا سانس پکڑ لے۔ سب کے سامنے اسے پکڑوا دے۔

پہلی ملاقات کے بعد ملازم کے ذریعے اس نے اسے مہمان خانے بلایا تھا۔

''تم مجھ سے سیکھنا چاہتی تھیں......'' اس کی آواز بہت نرم تھی۔

مہر نے بڑا خوش ہو کر ہاں میں سر ہلایا......

”جی......“

”آج رات نواب سراج کے یہاں محفل ہے۔ وہاں آجانا۔“

”میں وہاں......لیکن آپ نے تو کہا تھا آپ الگ سے مجھے سنادیں گے۔“

”کل میں یہاں سے جارہا ہوں۔ جانا بہت ضروری ہے۔ جو ہے، وہ آج ہی ہے......“

مہر تذبذب کا شکار تھی۔ ”خالو کو معلوم ہو گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ بہت سختی کریں گے وہ ہم سب پر۔“

”جس دل میں خوف ہوتا ہے‘ اس دل کی آواز میں سر نہیں رہتے۔“ زیام نے گردن اکڑا کر کہا۔ مہر نے بہت شرمندگی محسوس کی۔ یہی بات اسے میاں غلام علی نے کہی تھی۔ سب سچے استاد یہی کہہ رہے تھے۔

”میں بزدل نہیں ہوں لیکن......“

”پھر آجاؤ۔ مجھے سن لینا۔ وہ میری محفل ہے‘ نواب کی نہیں۔ وہاں جتنے لوگ شریک ہوں گے سب میری اجازت سے ہوں گے۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ نواب سراج بھی نہیں۔“

وہ خوش ہو گئی اور سر ہلا دیا۔ آکر نواب بیگم سے کہا تو انہوں نے کچھ دیر غور کیا۔

”اگر انہوں نے زبان دے دی ہے تو ٹھیک ہے مہر! نواب صاحب تو ویسے ہی ان گائیکوں کے فن پر مرتے ہیں۔ کیا مجال ہے ان کی جو اس زیام منصور کی کسی بات کو رد کر سکیں۔ بلکہ اگر وہ یہ کہہ دیں کہ محفل میں محل کی عورتوں کو بھی شامل کیا جائے تو نواب صاحب انکار نہیں کر سکیں گے۔“

نواب بیگم اور خالہ ماں نے زیام منصور پر اعتماد کر کے اسے بھیج دیا تھا......لیکن کوئی نہیں جانتا تھا......کوئی بھی نہیں......

مہر لپک کر زیام کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جو بہت بے نیازی سے مہمان خانے کی سمت جا رہا تھا۔

”جس کے اندر فن ہوتا ہے اس کے اندر ”ڈنک“ نہیں ہوتا۔ اگر تم نے یہ وار چلنے دیا تو یاد رکھنا‘ سارا فن گندی نالی میں بہنا پسند کرے گا‘ تمہارے اندر رہنا نہیں۔“

خوف تو اب ختم ہوا تھا۔ مہر نے پوری آن بان شان سے زیام سے بات کی۔ آپ کے بجائے تم سے۔

ملازم نے لپک کر اس کا ہاتھ کھینچا اور کوٹھری کی سمت گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ مہر گردن موڑے زیام منصور کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ جس کے اندر سے ایسے راگ نکلیں‘ اس کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکل سکتے۔ اس نے اس کہاوت کو جھوٹ پایا کہ ”جس کا من صاف ہوتا ہے‘ سر تال اس پر مہربان ہوتے ہیں۔“

اس نے اس حقیقت کو مانا کہ ریاضت سے کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے‘ کسی کی سانسیں بھی۔

مہر پچھتائی......اس لیے نہیں کہ اسے زہر کا پیالہ پینا ہو گا۔ صرف اس لیے کہ اس نے ایسے استاد کے راگ سن لیے تھے‘ جو خزانے پر کنڈلی مارے بیٹھے زہریلے سانپ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

اس نے ایسے انسان کو گرو مانا اور احترام دیا تھا جو اس لائق ہی نہیں تھا۔ وہ گرو دکشنا میں اس کی جان لے رہا تھا۔ وہ گرو کی اصلیت کو چاک کر کے اس کا نام لے لے گی......

☆☆☆

مور محل میں کہرام برپا ہو چکا تھا۔ نواب بیگم نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ نواب کو پیغام پر پیغام بھجوائے جا رہے تھے۔

”میں نے کہا تھا نا جس کی آواز باہر نکلی‘ اس کی قبر اندر بنے گی......“ نواب سراج اپنی مرضی سے ہی آئے۔ بہت اطمینان سے کہا۔

”ہم سب کی قبریں بنیں گی۔ یہ کہا تھا۔ مجھ سے شروع کریں۔ میں نے اپنا کفن تیار کر لیا ہے۔“

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''آپ کے جذباتی پن کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی! چلیں معاف کیا۔ دوبارہ یہ غلطی مت کیجیے گا۔''

نواب سراج نے لفظوں کو چبا کر کہا۔ وہ جانتے تھے اب دوبارہ ایسی حکم عدولی کبھی نہیں ہوں گی۔ اس مثال کو ایسی دھاک سے بٹھا رہے تھے کہ آنے والی سات نسلیں ڈریں گی۔

''ایک راگ کے لیے اس کی جان لے رہے ہیں۔'' ان کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی۔

''راگ کے لیے نہیں۔ زبان کے لیے۔ میں اپنی ناک نہیں کٹوا سکتا۔''

''تو اپنی گردن کٹوا دیں......'' ان کا جلال لوٹ آیا تھا۔ آواز طبل کی طرح بج رہی تھی۔

نواب سراج سن ہو کر رہ گئے۔ ''میں ہر بار آپ کو معاف نہیں کروں گا۔ میرے ایک اشارے پر آپ کے ساتھ بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔''

''تو وہ سارے اشارے کر دیں...... میں کہتی ہوں کر دیں...... میں مہر کے ساتھ یہ نہیں ہونے دوں گی۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں، اس سے مجھے فرق نہیں پڑے گا۔ ہو گا وہی جو میں چاہتا ہوں......'' ان کا انداز دوٹوک تھا۔

نواب بیگم نے بے یقینی سے ظالم نواب اور پتھر دل شوہر کو دیکھا۔

''نہ وہ مردوں کی محفلوں میں گاتی تھی نہ چوک چوباروں میں نکل کر داد لینا چاہتی تھی۔ وہ ہمارے لیے گاتی تھی۔ محل کی چار دیواری میں...... اس پر ایسی سزا...... بہت اچھا ہوا جو گورا آپ پر آقا بن کر بیٹھ گیا۔ جب آپ جیسے طاقت ور اپنی طاقت کا غلط استعمال کرنے لگتے ہیں تو اوپر والا کسی اور کو آپ سے زیادہ طاقت دے کر حکومت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ آپ جیسوں کو سیدھا کرنے کے لیے۔ جس ملک پر اتراتے تھے' پہلے تو وہ گیا ناہاتھ سے۔ اب جس ریاست' جس رعایا اور جاہ و جلال پر اترا رہے ہیں وہ بھی جائے گا۔ سب خاک ہو جائے گا۔ آنے والی نسلیں تھوکیں گی۔ قبروں کے نشان تک نہیں ملیں گے......'' وہ بلند آواز میں چلا رہی تھیں۔

''گوروں کی بہت حمایت کرتی ہیں آپ۔'' ان کے چلانے سے وہ محظوظ ہو رہے تھے۔

''اپنے زمین دار دوست کے قاتل بیٹے کے لیے جوتیاں اور ناک دونوں رگڑی تھیں آپ نے۔ پھر بھی گورے جج نے کسان لڑکے کا قتل کرنے پر زمیندار کے بیٹے کو پھانسی چڑھا دیا...... بچیں گے آپ بھی نہیں......''

نواب سراج نے کھینچ کر تھپڑ نواب بیگم کے منہ پر مارا۔ سارا مور محل گونج اٹھا۔ ساری عورتیں سہم کر رونے لگیں۔

''جس عورت کی آواز یہاں سے باہر گئی' اس کی لاش دریا میں پھنکوا دوں گا۔'' نواب نے چلا کر کہا۔

''ہم لاشیں ہی ہیں۔ جب چاہے پھنکوا دیں۔'' بوا نے پہلی بار اپنے نواب بھتیجے کے سامنے آواز بلند کی۔

نواب رکے' طنزیہ ہنسے اور چلے گئے...... یہ عورتیں اور ان کا بھڑکنا...... ہونہہ......

☆☆☆

دن اپنا اجالا سمیٹ رہا تھا...... اس کی زندگی بھی اپنا سفر سمیٹ رہی تھی۔

مور محل کے سب پھاٹک بند کر دیے گئے تھے۔ نہ کوئی اندر جا سکتا تھا نا باہر آ سکتا تھا۔ نواب کی بلا سے وہ سب اندر دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائیں یا بلندیوں سے کود کر۔

''مور محل سے کسی کو ملنے کے لیے نہیں بلایا جا سکتا۔'' ملازم اس سے آخری خواہش پوچھنے آیا تھا۔

مہر نے گہری سانس لی۔ ''دریا کنارے بنجارے رہتے ہیں۔ میں کسی بنجارن سے ملنا چاہتی

ہوں۔"

ملازم چپ چاپ سن کر چلا گیا۔ ایک پہر گزرا تو وہ بنجارن کو ساتھ لے آیا۔ خوف سے بنجارن کا رنگ زرد پڑ چکا تھا کہ اسے ایسے کیوں بلایا گیا ہے وہ بھی محل کی کوٹھڑی میں۔

"آنے کے لیے شکریہ۔ تم بنجارے ہو اور تمہارے گیت بھی۔ دونوں ہی کسی کی قید میں نہیں رہتے۔ میرے گیت کو بھی بنجارہ بنا دو۔" کہہ کر وہ رو دی۔

دن ڈھل کر شام سے جاملا......

زیام نے اپنے غرور کا ایک اور مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ وہ اس کے پاس آیا۔ اس کی بے چارگی کا تماشا دیکھ کر خوش ہوا۔

"مجھ سے حسد تمہیں زیب نہیں دیتا۔" مہر نے اسے زیادہ دیر تک خوش نہیں رہنے دیا۔

"حسد اور تم سے...... ہونہہ...... کس لیے؟"

جیسے اس کے سینے میں ایک تیر پیوست ہوا۔

"تم جانتے ہو کس لیے...... میرا "سا" ایک طرف اور تمہاری پوری گائیکی ایک طرف۔ میرے ایک سر نے تمہارے سارے سر ملیا میٹ کر دیے۔ "سا" نے تمہاری سانس روک دی تھی۔ تم جان گئے کہ میں استادوں کی استاد ہوں۔ یہاں کھڑے رہو، میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہارے اس راگ زیام میں کہاں کہاں، کتنے نقص ہیں۔ جس سر کو تیور ہو کر اندولن میں ڈھلنا تھا۔ تم نے انہیں اندولن میں سیدھے سیدھے دھکیل دیا۔ الاپ پر کئی جگہ گرہ لگی ہے اور......

زیام کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "جن سروں نے تمہاری جان لے لی، ابھی بھی ان ہی کی بات کر رہی ہو۔"

"سروں نے میری جان نہیں لی۔ تمہارا بغض، حسد اور غرور لے رہا ہے۔ مجھے سننے سے پہلے تک تم اس گمان میں تھے کہ کوئی تم سے اچھا نہیں گا سکتا۔ مجھ سے مل کر تمہارا یہ غرور خاک میں مل گیا۔"

"چلو ایسے ہی سہی...... تو پھر موت مبارک ہو۔"

"تمہیں بھی گمنامی مبارک ہو۔ کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ کوئی گائیک زیام منصور ہوا کرتا تھا۔" وہ ہنس دی۔

اس کی ہنسی نے زیام کو آگ لگا دی۔ وہ اندھیری کوٹھری میں بندھی تھی پھر بھی۔ وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب آیا۔

"تم موت کے کنارے کھڑی ہو...... یہ شام تمہاری زندگی کی آخری شام ہے......"

"یہ شام تمہاری گائیکی کی آخری شام ہے۔ اب نہ داد ملے گی، نہ محفلیں لگیں گی۔ جس راگ پر تمہیں غرور ہے، وہ راگ ہر کان سنے گا۔ جس راگ کے لیے میری سانس لے رہے ہو، وہ راگ ہر زبان گائے گی۔ یہ اس راگ کے تمہارے نام رہنے کی آخری شام ہے......"

زیام چونکا لیکن چھپا گیا۔ "تمہاری زندگی کے لمحے محدود ہو چکے ہیں۔"

"تم میری زندگی کی فکر نہ کرو۔ میری اس زندگی کی جھلک کسی نہ کسی گیت، ٹپے، ماہیے، ٹھمری، گیت میں زندہ رہے گی۔ میرا نام، خوشی کے گیتوں اور محبت و امن کے ترانوں میں گونجتا رہے گا۔ مہر راگ ہر زبان پر رہے گا، ہر سماعت تک جائے گا۔ تم کس کس کو موت کی نیند سلاؤ گے۔ حسد کا ڈنک کتنا بھی زہریلا ہو، انصاف کا تریاق اسے بے بس کر دیتا ہے۔ وقت انصاف کر دے گا۔ میری سانسیں زہر نچوڑ لے گا لیکن میرے سر وقت سمیٹ لے گا...... اور پھر یہ وقت مجھے بہت دور تک لے جائے گا۔"

اور واقعی وقت اسے بہت دور تک لے جانے والا تھا۔

☆☆☆

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک راگ کے لیے ایک لڑکی کی جان لے کر'
نواب سراج انار کا رس پیتے ہوئے' عظیم گائیک زیام منصور کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ بے چارے شرمندہ تھے کہ اس رات محفل میں ایک معمولی سی لڑکی کی وجہ سے اتنی بدمزگی ہوئی۔ زیام منصور کا مزاج برہم ہوا۔ انہوں نے دل برا کیا۔

"اگر آپ فوراً یہاں سے چلے گئے تو لوگ کہیں گے کہ آپ ابھی تک ہم سے ناراض ہیں۔ دس' پندرہ دن اور رک جائیں۔"

زیام منصور نے کچھ دیر رک کر سوچا اور ہاں میں سر ہلا دیا اور مسکرا بھی دیا۔

"وعدہ کریں کہ آپ جہاں بھی جائیں گے، اس بات کا ذکر ضرور کریں گے کہ میں زبان کا پکا اور ارادے کا اٹل ہوں۔ میں نے آپ کی عزت میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔"

"اس میں تو کوئی شک ہی نہیں رہ گیا نواب صاحب......" وہ پھر مسکرایا۔

وہ مزید پندرہ دنوں کے لیے وہاں مہمان بن کر ٹھہر گیا۔ اس دن وہ چہل قدمی کے لیے محل سے باہر دریا تک گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اسے کچھ دور سے بہت پیاری آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے مزاج پر بہت خوش گوار اثر پڑ رہا تھا۔ وہ قدم بڑھاتا ہوا آوازوں کے قریب جا رہا تھا اور جیسے جیسے قریب جا رہا تھا، اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

دریا کے کنارے ادھر ادھر ٹولیوں میں بکھری بنجارنیں راگ گا رہی تھیں...... اس کا راگ...... لیکن جیسے سونا ڈھل کر نکھر جاتا ہے' ویسے ہی وہ راگ بھی نکھرا نکھرا تھا...... بدلا ہوا اور نیا...... لیکن تھا اسی کا راگ...... وہ سات بنجارنوں کی ٹولی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ...... یہ جو تم گا رہی ہو...... یہ...... کہاں سنا تم نے۔ کیا ہے یہ؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کے پیر زمین میں دھنستے جا رہے تھے۔

عورتوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ادھر ادھر بکھری ٹولیاں بدستور گا رہی تھیں۔ بچے اور کچھ مرد بھی ساتھ دے رہے تھے۔ وہ سب میلے پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اپنا سامان وغیرہ باندھ رہے تھے۔

ایک بنجارن نے ہاتھ اٹھا کر محل کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں کی ایک کوٹھڑی سے۔ ہم تو اسے راگنی مہراں کہتے ہیں۔ میلے میں جا کر گائیں گے۔"

زیام کے قدم لڑکھڑا گئے۔ دریا کا سارا پانی اسے گدلا نظر آنے لگا۔ آسمان کی چھت لرزنے لگی۔ "راگنی مہراں......" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ جس راگ کے سننے والے کے لیے اسے کانوں میں سیسہ اور زبان پر کاٹ چاہیے تھی' وہ راگ سر عام بنجارے گا کر سب کو سنا رہے تھے۔

"میری اس زندگی کی جھلک کسی نہ کسی گیت' ٹپے' ماہیے' ٹھمری' گیت میں زندہ رہے گی۔ میرا نام' خوشی کے گیتوں اور محبت و امن کے ترانوں میں گونجتا رہے گا۔ مہر راگ ہر زبان پر رہے گا' ہر سماعت تک جائے گا۔ تم کس کس کو موت کی نیند سلاؤ گے؟"

☆☆☆

راگ مہراں......

"جب میں نے ان کے منہ سے یہ راگ سنا تو حیران رہ گیا تھا۔ وہ حیران کن راگ تھا۔ گائیکی کی سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی بھی انسان اس راگ کو سن کر دم بخود رہ سکتا ہے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ راگ ان کے بڑوں سے چلتا ان تک آیا ہے۔

یہ دریا کنارے بنے محل میں رہنے والی ایک لڑکی مہر کا راگ تھا۔ جسے اس راگ کی وجہ سے زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے یہ راگ ایک بنجارن کو سکھا دیا تھا۔ اس لیے بھی یہ راگ بہت مقبول ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات جنگل کی آگ

کی طرح پھیل گئی تھی کہ ایک راگ کے لیے لڑکی کی سانسیں لے لی گئیں۔ ہر کوئی یہ راگ سننا چاہتا تھا۔
مہر راگ بنجاروں کو کچھ ایسا راس آیا تھا کہ انہوں نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ اس سے گیت بنائے' ترانے گنگنائے' ٹپے اور ماہیے گائے۔ خوشی کے' ساون کے' محبت کے' آزادی کے۔ جہاں جہاں راگ گیا وہاں وہاں اسے نیا نام ملا۔ مہراں' مہر یہ' مہر ماں' مہر ماہیے' گیت۔
راگ کا الاپ دل ٹھہرا دیتا ہے۔ آزادی اور سکون کی امنگ پیدا کرتا ہے۔ یہ راگ دل کی خوشی اور بے خودی کا راگ ہے۔ اُمید اور متوالے پن کا۔"
میراں اپنے دادا کی یادداشتیں پڑھ رہی تھی۔
یہ چھوٹے بڑے ہر سائز کے صفحات پر مشتمل پلندہ تھا۔ یہ کاغذات وہ پہلے بھی پڑھ چکی تھی لیکن تب وہ اتنی سمجھ دار نہیں تھی۔ وہ اپنی ایک پرانی ڈائری ڈھونڈ رہی تھی' جس میں اس نے کچھ دھنیں لکھی تھیں۔ ڈائری تو ملی نہیں تھی' یہ فائل مل گئی تھی۔ پاپا ان یادداشتوں پر ایک کتاب شائع کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ سوچ کر کہ جب بڑے بڑے عظیم گائیکوں کے جینے مرنے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا تو اس کتاب سے کیا پڑے گا۔ کوئی اسے کیوں پڑھنا چاہے گا۔ انہوں نے ارادہ ترک کر دیا تھا۔
"مہراں...... مہر......" وہ اس راگ کو پڑھ رہی تھی۔
بہرام کے اسٹوڈیو میں مسلسل نو مہینے دھنوں پر کام کرنے کے بعد وہ میوزک کو پہلے سے زیادہ سمجھنے لگی تھی۔ وہ ہشیار ہو چکی تھی۔ اچھے آلات کے ساتھ کام کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ انسان وقت سے پہلے بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ اس نے راگ کو پڑھنا شروع کیا۔
درباری راگ وہ راگ ہے جس میں سب سے زیادہ گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ راگ آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا پہلی بار گانے سے ہوا تھا۔ اب یہ مہر راگ تھا جس سے نکلے کم و بیش بیں گانے دادا نے لکھے ہوئے تھے۔ کچھ لوریاں اور کچھ ماہیے۔
دو تین دن تک وہ راگ پر اچھی طرح سے غور کرتی رہی۔ پھر اس نے اسی راگ سے اپنے لیے دھن بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے بھی اُمید' امنگ' آزادی اور متوالے پن کی ایک دھن چاہیے تھی۔ ڈپریشن کے اس دور میں بے خودی' اور خوش اُمیدی کا داؤ ہی چل سکتا تھا۔
پہلے وہ رات کو دو گھنٹے اسٹوڈیو میں اپنے لیے کام کرتی تھی۔ اب وہ تین چار گھنٹے کرنے لگی تھی۔ جنید جو اسٹوڈیو کا ہیڈ باس تھا' اس نے اسے اسٹوڈیو کی چابی دے دی تھی۔ وہ جب تک چاہے کام کر سکتی تھی۔ باہر ایک گارڈ موجود رہتا تھا۔ وہ گھر کے ماحول کی طرح وہاں کام کرتی رہتی تھی......
وہ جیسے جیسے راگ میں سے دھن نکال رہی تھی' ویسے ویسے بے خود ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا دل منفی جذبوں سے صاف ہو رہا تھا۔ لالچ' حسد' غصہ' طیش اس سے دُور بھاگ رہے تھے۔
دادا کی یادداشتوں میں لکھا تھا کہ سچے راگ اپنا اثر رکھتے ہیں۔ تو کیا اس پر بھی مہراں کا اثر ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی حیران تھی کہ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ اس کے دل سے ہر طرح کا خوف کیسے مٹ رہا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس راگ نے اس لڑکی کی جان کیسے لی تھی۔ لیکن وہ یہ ضرور محسوس کر رہی تھی کہ اس راگ کو پوری شدت سے کالل کیا گیا تھا کہ فن کار نے اپنی جان کھینچ کر سروں میں بھر دی تھی۔
اسے بھی ایک ایسی ہی دھن چاہیے تھی جو جی اٹھے۔ جو کھلی اور مرجھائی ہوئی نہ ہو۔
اس کا رات کا کام کا دورانیہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ہر طرف سے لاپروا ہو کر کام کرنے لگی تھی۔ اس کی نیند اس کے خواب سب "مہر مہراں" ہو چکے تھے۔ اسے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہر طرف دکھائی بھی یہی دے رہی تھی اور سنائی بھی۔
"تمہاری ایک اور کارٹون ہٹ ہو گئی ہے۔"
بہرام اس کا بونس لے کر آیا تھا۔
اس نے بونس لے کر مسکرا کر شکریہ کہا۔
"اب ڈائمنڈ ٹون کب دے رہی ہو......؟"
"جیسے ہیرا ایک لمبے عمل کے بعد ہیرا بنتا ہے ایسے ہی دھنیں بھی بنتی ہیں۔ طے کیے بغیر۔ بے ساختہ۔ بے خودی میں۔"
"کیا بات کی ہے......تو بے ساختگی سے طے کرلو اور بے خودی میں بنا ڈالو......" اس سے شاید اب مزید انتظار نہیں ہو رہا تھا۔
"دس نئے بے سرے تم نے میرے پاس بھیجے ہیں انہیں پہلے پاپ راک ریپ سنگر نہ بنادوں؟"
اس نے قہقہہ لگایا۔ "تم نئے سنگرز پر سختی کرتی ہو پھر بھی وہ خاص طور پر تمہارے پاس ہی آتے ہیں۔ شاید انہیں لگتا ہے کہ تمہاری زبان کی کاٹ سے ان کے گانوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اپنی دے! کام جاری رکھو جلد ہی ہم دوبارہ ملیں گے۔"
بہرام نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ اس نے اپنا شانہ دیکھا اور پھر بہرام کو اور آنکھیں پھیر لیں۔
بہرام نے اپنی آنکھیں نہیں پھیری تھیں۔ اپنی کان کی بالی کو چھوتے ہوئے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

پورے تین مہینے وہ اس دھن پر کام کرتی رہی تھی۔ ایک رات وہ آٹھ بجے سے شروع ہوئی تھی اور فارغ ہو کر اس نے سر اٹھایا تھا تو صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ اسے حیرت ہوئی۔ اسے لگا وال کلاک خراب ہو چکا ہے۔ اس نے تو یہی کوئی دو تین گھنٹے کام کیا تھا......بس۔ اتنا وقت کیسے گزر گیا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آئی تو گارڈ تو صوفے پر کمبل میں خراٹے لے رہا تھا۔ لیکن اس کے پاپا موبائل پر اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ حیران بھی ہوئی اور چونک بھی گئی۔

"آپ......یہاں......کب آئے......؟"
"رات گیارہ بجے ہی آ گیا تھا۔ سوچا دیکھ کر آؤں، تم اتنی اتنی دیر تک کیا کام کرتی رہتی ہو۔" اٹھ کر انہوں نے اسے سینے سے لگایا۔ "میرا بیٹا......"
"گیارہ بجے......تو اندر اسٹوڈیو میں آ جاتے......"
"آیا تھا۔ گیارہ بجے ہی اندر آیا تھا۔ دروازہ کھول کر تمہیں دیکھا تو تم آس پاس سے انجان بے خود ہو کر کام کر رہی تھیں۔ تمہیں میرے آنے کا بھی پتا نہیں چلا تھا۔ میں پورے بیس منٹ تک چپ چاپ پیچھے کرسی پر بیٹھا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر باہر آ گیا......مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم ایسے بھی کام کر سکتی ہو۔ میں بہت خوش ہوں میراں!"
"تو اب میں سچی والی فنکار بن چکی ہوں؟"
اس نے لاڈ سے پوچھا۔
"تم پہلی بھی سچی ہی تھیں لیکن لالچی بھی تھیں۔ اب بھی لالچی ہو لیکن اپنی دھن کی پرفیکشن کے لیے۔"
"میری دھن کیسی لگی آپ کو؟"
"جتنی میں نے سنی ہے اتنی سن کر ہی مجھے تم پر فخر ہونے لگا ہے۔ تم نے کمال کر دیا ہے۔"
"مکمل سنیں گے تو دیوانے ہو جائیں گے۔"
"پھر مجھے کبھی مکمل نہ سنوانا۔ میں دیوانہ نہیں ہونا چاہتا۔" وہ ہنسے۔
فی الحال اس کی دھن تقریباً مکمل تھی۔ یہ دھن اس نے شہرت اور پیسے کے لیے نہیں بنائی تھی۔ یہ دھن اس نے بے خود ہو کر بنائی تھی۔ اپنے لیے۔ اپنے فن کی سربلندی کے لیے۔

☆☆☆

آج سال کا آخری دن تھا۔ ٹھنڈ کی شدت بڑھ گئی تھی۔ دھند بھی بہت تھی۔ شام پانچ بجے تک وہ ایک نئے سنگر کے ساتھ مل کر اس کا گانا ریکارڈ کرواتی

رہی تھی۔ چھ بجے اسٹوڈیو بند ہو گیا تھا۔ صرف وہ تین لوگ اسٹوڈیو کے اندر تھے۔ ایک وہ' دو سسٹم آپریٹر۔ وہ ہیڈ فون پہن کر ریکارڈنگ روم میں آ گئی۔ آج وہ اپنی دھن' اپنا گانا ریکارڈ کروانے والی تھی۔

اس نے دھن پر جتنا بھی کام کیا تھا' اسے ٹکڑے ٹکڑے ہی رہنے دیا تھا۔ درحقیقت اس نے اس دھن پر تین چار طرح سے کام کیا تھا۔ اب صرف وہی جانتی تھی کہ کس ٹکڑے نے کہاں جڑنا ہے۔ کوئی اور ان ٹکڑوں کو سنتا تو کنفیوز ہو جاتا۔ اس نے ملتی جلتی ایک جیسی اتنی دھنیں بنالی تھیں کہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی والی اصل ہے۔ یعنی اس نے ایک گورکھ دھندا بنا لیا تھا۔ اب صرف وہی جانتی تھی کہ اس پہیلی کو بوجھنا کیسے ہے۔

اس نے وقت دیکھا۔ اس کے پاس تین سے چار گھنٹے تھے۔ یہ وقت ایسے ہی تھا جیسے اس نے اسٹاپ واچ ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ اگر اس نے وقت مقررہ پر کام مکمل نہیں کیا تو بم پھٹ جائے گا۔ اور کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔ سب کچھ منتشر ہو جائے گا۔

شیشے کی دیوار کے پار سے آپریٹرز انگوٹھا دکھا رہے تھے۔ اس نے ہیڈ فون کو کانوں پر چڑھایا۔ گہرا سانس لیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ تھا۔ وہ خوف زدہ تھی لیکن اسے اس خوف کو ظاہر نہیں کرنا تھا۔ اسے اس خوف کو کچلنا تھا۔ اندر سے پھر سے او کے کا اشارہ کیا گیا۔ اس گانے کو ایک ٹیک میں جانا تھا۔ جیسے لائیو۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسے ہر حال میں ایک ہی ٹیک میں مکمل کرنا تھا۔

اس نے گانا گانا شروع کیا......

یہ گانا اسے زندگی دے دے گا' یا اس کی زندگی چھین لے گا۔ وہ بارود کے ڈھیر پر کھڑی ہو کر دیپ راگ گا رہی تھی۔ آگ لگنے کے روشن امکانات تھے۔ اس کی تباہی کے اس سے زیادہ تھے۔

دس بجے سے کچھ پہلے اس نے گانے کے آخری بول مکمل کیے۔ اور جیسے ہی دھن ختم ہونے کو ہوئی' ہاتھ بڑھا کر بہرام نے اس کے کانوں سے ہیڈ فون اتار لیا۔

''بس اتنا ہی کافی ہے میراں! ہمیں دھن مل چکی ہے۔ تمہاری آواز تو ویسے بھی کلین کروا دیں گے۔''

میراں نے بری طرح سے چونک کر بہرام کو دیکھا۔ وہ گانے میں اتنی مشغول تھی کہ اسے آس پاس کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا تو آپریٹنگ والوں کے سر پر جنید کھڑا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے آپریٹنگ سسٹم کو خود مانیٹر کر رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''کیا مطلب ہوگا میراں؟ میرے اسٹوڈیو میں کھڑی ہو۔ میرے لیے کام کرتی ہو۔ تمہارے کام سے میرا کیا مطلب ہوگا؟''

''تمہارے لیے میں دن میں کام کرتی ہوں۔''

''تم دن کو کام کرو یا رات کو' سب کام ہمارا ہے۔ میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ تم مجھے بہت بڑا فائدہ دینے والی ہو۔ اس (شناخت) ٹون کے لیے میں نے پورا سال ویٹ کیا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔ یہ میری دھن ہے۔ میرا گانا ہے۔ اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ کی فیس میں تمہیں دے دوں گی۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ دو قدم بڑھا کر وہ اس کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''بے وقوفوں جیسی باتیں نہ کرو میراں! میں نے پورے بارہ مہینے انتظار کیا ہے۔ درمیان میں تم نے کچھ دھنیں اپنے لیے بنا کر سائیڈ پر کر دی تھیں' میں وہ بھی لے چکا ہوں۔ تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم اب البم کی ٹائٹل ٹون پر کام کرو گی۔ تم نے کچھ دیر نہیں کر دی اس ٹون کو مکمل کرنے میں۔ تم سچے فن کاروں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے' جہاں لوگ تین' چار دن میں پورا گانا

تیار کر لیتے ہیں‘ وہاں تم نے تین مہینے لے لیے۔
اینی وے! تم بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہو۔ ڈائمنڈ کو ڈائمنڈ بننے میں وقت لگتا ہے۔ جلد ہی تمہاری یہ دھن بہت بڑے پیمانے پر ریلیز کر دی جائے گی‘ منہ مانگی قیمت پر...... تمہارا شکریہ۔“

”تم یہ سب نہیں کر سکتے بہرام!“ اس کی آواز کپکپا گئی۔

”میں سب کر سکتا ہوں...... سب...... تم دیکھ سکتی ہو......“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسٹوڈیو کے ماحول کی طرف اشارہ کیا۔

میراں نے اس کے اشارے کی سمت نظر دوڑائی۔ تین گارڈ اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ دو گارڈ اسٹوڈیو کے باہر ہوں گے۔ ایک بہرام تھا‘ ایک جنید تھا۔ کل ملا کر اس وقت اسٹوڈیو میں نو افراد موجود تھے۔ وہ یہاں وہاں‘ ہر طرف سے گھری ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔

”تم ڈری ہوئی نظر آ رہی ہو۔ اچھی لگ رہی ہو۔ اب بس ایک بات بتا دو میراں......“

میراں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ اس کے کان کے پاس جھکا۔ ”زبان دو گی یا سانس؟“ اس کی پیشانی اس کی کان کی لو سے ٹکرا رہی تھی۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ ہاتھ سے پیشانی کا پسینہ صاف کیا۔ ”ز...... زبان......“

”زبان......“ بہرام نے گردن کو پیچھے کمر کی طرف جھکا کر قہقہہ لگایا۔ ”دو زبان...... میں سننا چاہتا ہوں۔“

”میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ نہ آج نہ کل۔ میرا لیپ ٹاپ سامنے رکھا ہے۔ جو کچھ ہے اس میں ہے۔ سارا ڈیٹا‘ سب ٹونز۔ بیگ میں موبائل ہے۔ میں یہ ملک ہی چھوڑ دوں گی۔ اسٹڈی کے لیے باہر چلی جاؤں گی۔ تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

بہرام اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتا رہا۔

”تم سمجھدار ہو...... تم جا سکتی ہو۔“

بہرام کے قریب سے گزر کر وہ جانے لگی تو بہرام نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم جیسی قابل لڑکی اب میوزک انڈسٹری کے لیے ڈیڈ ہو جائے گی۔“

وہ چونک کر رکی لیکن پھر تیزی سے باہر کی سمت چلی گئی۔

”ڈیڈ......“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

”ہاں ڈیڈ......“ وہ ہنسا تو اس کے نچلے ہونٹ کا کنارا‘ کان کی سمت کھنچ گیا۔

”وہ مجھے اپنی زبان دے گئی ہے۔ جبکہ مجھے اس کی سانس چاہیے......“ اس نے گردن موڑ کر اپنے گارڈ کی طرف دیکھا۔

”وہ اتنی آسانی سے اپنی زبان بند نہیں کرے گی۔ وہ میوزک کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ میرے لیے کام بھی نہیں کرے گی۔ مجھے جو چاہیے تھا وہ مل چکا ہے۔ اس کی تین گولڈن اور ایک ڈائمنڈ ٹون۔ پھر اس کا زندہ رہنا بے کار ہے۔ اس کی چھوٹی سی کار کو اگر کسی بڑی کار کی ٹکر لگے گی تو وہ الٹ کر گر جائے گی۔ کار الٹے گی تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے انسان کی گردن کو جھٹکا لگے گا...... اور وہ......“

گارڈ باہر کی طرف لپکا تو بہرام نے غصے سے اس کا راستہ روک لیا۔ ”اسٹوڈیو سے باہر روڈ پر سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہیں۔ اسے یہ روڈ کراس کر جانے دینا‘ سمجھے......؟“

☆☆☆

اس کی کار نے مین روڈ کراس ہی کیا تھا کہ پیچھے سے اسے تیز رفتار گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ سمجھ گئی۔ نچلا ہونٹ دانت میں دبا لیا۔ اس کی چھوٹی

سی کار کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی۔ رات گیارہ بجے کا وقت تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ اس کی کار گولی کی طرح سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

وہ جانتی تھی یہ ہوگا۔ وہ ایک بات جانتی تھی۔ یہ بھی کہ بہرام اس کی زبان لینے کے باوجود اس کی سانس لے گا۔ وہ اسٹوڈیو میں اس کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اسٹوڈیو مین سٹی میں تھا۔ وہاں ہر طرف سی سی ٹی وی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ وہ اس کے اسٹوڈیو سے باہر نکل جانے کا انتظار ہی کرے گا۔ وہ انڈسٹری میں کمینہ مشہور تھا' وہ قاتل مشہور ہونا نہیں چاہے گا۔

ہیڈ فون کانوں سے لگا کر بہرام اس کا ریکارڈ کیا گانا سن رہا تھا۔ وہ اس کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے یہ بھی افسوس تھا کہ ایسا قابل انسان آج ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

"اس کی کار نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس نے کار ڈرائیو نہیں کی تھی' کار اُڑائی تھی......"

بہرام کا گارڈ فون پر کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا۔ "گاڑی میں وہ اکیلی تھی؟"

"بالکل اکیلی ہی تھی......"

وہ چونکا اور ایک دم سے چلا اٹھا۔ "الو کے پٹھے! وہ کار میں اکیلی نہیں تھی۔ گاڑی شوٹر نے ڈرائیو کی ہے۔"

گاڑی شوٹر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کالج میں وہ شوٹر کے نام سے اسی لیے مشہور تھا کہ وہ کار ہو یا بائیک' گولی کی طرح چلاتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ گدھے پر بھی بیٹھ جائے گا تو اسے بھی جہاز بنا لے گا۔

سیٹ کے نیچے فولڈ ہو کر بیٹھے بیٹھے میراں کی گردن اکڑ گئی تھی۔ ہڈ پہنے ڈرائیونگ سیٹ پر شوٹر بیٹھا تھا۔ کار کی رفتار ابھی بھی بہت تیز تھی لیکن وہ پیچھا کرنے والوں کو ڈاج دے چکا تھا۔ وہ اسٹوڈیو کے باہر شام چھ بجے سے اس کی گاڑی میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ میراں نے ہی اسے آنے کے لیے کہا تھا۔ جتنا وہ بہرام کو جان چکی تھی' وہ جانتی تھی کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ جیسے ہی بہرام اسٹوڈیو کے اندر گیا تھا' شوٹر تیار ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میراں باہر آ گئی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی لیکن فوراً نیچے ہو کر فرنٹ سیٹ کی طرف نکل ہو گئی تھی۔ پیچھے سے شوٹر ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

جیسا ہڈ میراں نے پہنا ہوا تھا' بالکل ویسا ہی شوٹر نے بھی پہنا ہوا تھا۔ مین روڈ تک گاڑی کی رفتار نارمل رہی تھی...... لیکن پھر......

اگر اس نے شوٹر کو مدد کے لیے بلایا تھا تو اس نے اپنے گانے کا بھی ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کیا ہو گا۔" بہرام بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"وہ جو بھی کرے گی صبح ہی کرے گی۔ یا زیادہ سے زیادہ یوٹیوب چینل پر اپ لوڈ کر دے گی۔"

"نہیں...... وہ یہ نہیں کرے گی۔ وہ کچھ اور کرے گی۔ ہمیں ہر صورت اسی وقت ٹون کو لانچ کرنا ہے۔ میراں سے پہلے ہمیں کچھ کرنا ہے...... آواز ریموو کرو میراں کی۔ مجھے صرف دھن دو......" وہ چلا کر آپریٹرز سے کہہ رہا تھا۔

"تم تو اسے سیل کرنا چاہتے تھے۔ سیل ہونے کے لیے کم سے کم دو دن چاہئیں۔"

"وہ بھی کر لوں گا۔ پہلے اس کے کاپی رائٹ کا مسئلہ حل کر لوں۔ نیو ایئر کا شو جو یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہو رہا ہے۔ ہمارے پاس اس کے کتنے ٹوکن ہیں؟"

"دو...... ایک گیارہ بجے کا...... دوسرا ایک بجے کا......"

جس کمپنی کے پاس نیو ایئر کا ٹوکن ہے ان سے بات کرو۔ ہمیں یہ ٹوکن چاہیے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ مجھے دھن بھجواؤ۔ اس ٹوکن پر میں کھڑا ہوں گا۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''تم اس ٹوکن پر سنگر کی حیثیت سے کھڑے ہو گے؟؟''

''میں ساری دنیا کے گدھے گھوڑوں کو سنگر بنا سکتا ہوں تو خود نہیں بن سکتا۔ جلدی کرو۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے گاڑی کے دروازے کو زوردار آواز میں بند کیا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہونے والا نیو ایئر کنسرٹ سال کا سب سے بڑا کنسرٹ تھا۔ اس کنسرٹ میں بڑی بڑی میوزک کمپنیاں اپنے نئے گلوکاروں کو متعارف کرواتی ہیں۔ کچھ اپنی دھنیں' کچھ اپنے گلوکار۔ اس اسٹیج پر گانے والوں کے لیے کمپنیاں ٹوکن بولی میں خریدتی ہیں۔ سب سے بڑی بولی کا ٹوکن بارہ بج کر ایک منٹ کا تھا۔ نئے سال کے' پہلے منٹ کا پہلا۔ اس ٹوکن پر کھڑے ہونے والے سنگر یا میوزیشن کو signaute مانا جاتا تھا۔ انٹرنیشنل یا بڑی کمپنیاں دنیا بھر میں ہونے والے خاص کنسرٹس میں ایسے ٹوکن خرید لیتی ہیں اور جن سنگرز کے ساتھ انہیں مستقبل میں کام کرنا ہوتا ہے' انہیں اس ٹوکن پر کھڑا کر کے متعارف کروا دیتی ہیں۔

''کس کے پاس ہے ٹوکن......؟'' گاڑی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے وہ جنید سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''ایک انٹرنیشنل کمپنی ہے' اس کے پاس۔ ہم بھی ان کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ لیکن وہ ٹوکن سیل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے سنگر کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو بولی بڑھا دو یار!'' بہرام طیش سے چلایا۔

''وہ کسی صورت نہیں مان رہے۔'' جنید بھی چڑ گیا۔

''سب الو کے پٹھے ہو تم۔ ایک کام نہیں ہوتا تم سے۔ تو پھر کنسرٹ کی انتظامیہ کو خرید لو...... بات کرواں سے......''

گیارہ بج کر سینتیس منٹ ہو چکے تھے۔ جس وقت اس کی کار پارکنگ میں آ کر رکی اس وقت اس کے پاس پھر سے جنید کی کال آئی۔

''انتظامیہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی۔ ان کا کہنا ہے کہ ٹوکن نیلامی میں دیے جاتے ہیں۔ وہ ساکھ خراب نہیں کر سکتے۔''

''ان کی ساکھ خراب ہو یا بزنس۔ ان سے کہو بارہ' ایک کا ٹوکن ہمارا ہی ہے' اور میں جا رہا ہوں اس پر کھڑا ہونے۔ کوئی روک سکتا ہے تو روک لے۔''

جس وقت وہ بھاگتا ہوا پارکنگ سے نکل رہا تھا۔ اس وقت میراں پارکنگ پار کر کے اندر جا چکی تھی۔ جس وقت وہ بیک اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت وہ میک اپ روم میں پہنچ چکی تھی۔ ہڈ اتار دیا تھا۔ کرسی پر کسی کی جینز کی جیکٹ پڑی ہوئی تھی' اسے اٹھا کر وہ پہن رہی تھی۔ جس ٹشو سے کسی نے اپنی لپ اسٹک صاف کی تھی' اس سے وہ اپنی پیشانی کا پسینہ صاف کر رہی تھی......

اور جس وقت بہرام بیک اسٹیج سے بھاگتا ہوا اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا...... اس وقت میراں وہ سیڑھیاں چڑھ چکی تھی......

وہ اسٹیج کے کنارے پر کھڑا تھا...... اور وہ مائیک کے سامنے......

وہ اندھیرے میں کھڑا تھا اور وہ...... وہ......

اسپاٹ لائٹ گھومتی ہوئی آئی اور مائیک کے سامنے کھڑی میراں پر آ کر رک گئی۔ اس کا چہرہ مجمع کو دکھائی دیا تو انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ حلق پھاڑ کر ''میراں' میراں' میراں'' چلانے لگے۔

وہ بہت زیادہ مشہور نہیں تھی لیکن ایسی گمنام بھی نہیں تھی۔ سب اسے جانتے ہی تھے۔ وہ تو یہ بھی جان گئے تھے کہ وہ اتنے بڑے اسٹیج پر آ کر کھڑی ہو گئی ہے تو کوئی عام چیز نہیں لائی ہو گی۔ کچھ خاص

ہی ہوگا اس کے پاس۔ بھولی بسری سی میراں...... وہ اب سب کو اچھی طرح سے یاد ہو جائے گی۔ نئے سال کے نئے لمحے کاٹوکن کمپنی نے میراں کے لیے محفوظ کرلیا تھا...... میراں اور مہراں کے لیے۔

☆☆☆

انسان کو باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ ہوشیار بھی ہونا پڑتا ہے۔ ہر طرح کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ جان چکی تھی کہ بہرام کے اسٹوڈیو کو استعمال کیے بغیر وہ اچھی دھن نہیں بنا سکتی۔ ایسی دھن جو شارپ بھی ہو اور ہٹ بھی۔

اسے مگرمچھوں کے ساتھ کام کرنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے اسٹوڈیو میں لگے کیمروں کے ذریعے مانیٹر کیا جارہا ہے۔ اسٹوڈیو کا اسٹاف اس پر نظر رکھتا ہے۔ چارے کے طور پر رات کے کام کی تین گولڈن دھنیں اس نے بہرام کو ہڑپ کرنے دی تھیں۔ اس نے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ جان چکی ہے کہ بہرام اس کی دھنوں پر قبضہ کر چکا ہے۔ بہرام کو وہ تین دھنیں مل گئیں تو اسے گمان بھی نہیں ہوا کہ وہ جان بوجھ کر اسے پاگل بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ اسے بے وقوف سمجھتا رہا تھا۔ دو آپریٹر لڑکوں کو اس نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

مہراں پر کام کرتے ہوئے اس نے اس کی جڑواں دھنیں بنائی ہی اس لیے تھیں کہ بہرام کنفیوز ہوجائے اور وقت سے پہلے اسے اسٹوڈیو سے نکال باہر نہ کرے۔ اسے نیو ایئر نائٹ کا انتظار تھا۔

اس کی دھن براہ راست اس کمپنی کے اسٹوڈیو میں ریکارڈ ہوتی رہی تھی جس کے ٹوکن پر وہ کھڑی تھی۔ کمپنی کو اس کا بہترین کام چاہیے تھا۔ پھر ہی وہ طے کرنے والی تھی کہ وہ اسے کس ٹوکن پر کھڑا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کانٹریکٹ کرتی بھی ہے یا نہیں۔ جس وقت وہ اسٹوڈیو سے نکل کر گاڑی کی پچھلی نشست کے نیچے دبک کر بیٹھی تھی۔ کمپنی کی طرف سے اسے اس کا ٹوکن نمبر ایس ایم ایس کر دیا گیا تھا۔ اپنا اصل فون وہ کار میں ہی چھپا کر گئی تھی۔

اپنی زندگی کا بہترین کام وہ وقت سے پہلے ریکارڈ کروا دیتی تو جان سے جاتی۔ جان سے نہ جاتی تو بہرام کسی بھی طرح سے اس کے کام کو اپنے نام سے لانچ کر دیتا ورنہ فروخت کر دیتا۔ وہ چیختی اور چلاتی ہی رہ جاتی۔ اسے اس نیو ایئر نائٹ کا ہی انتظار تھا۔ اتنے بڑے کراوڈ اور لائیو براڈ کاسٹنگ کا۔

اب وہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے ہجوم کے سامنے کھڑی تھی۔ رات کا آسمان دن کے اجالے سے زیادہ روشن تھا۔ بارہ بجنے میں تین منٹ تھے۔ گردن موڑ کر اس نے پیچھے بہرام کو دیکھا۔ اور ہنس دی۔ اب وہ ہمیشہ ہنسے گی اور وہ اپنی شکست کو یاد کر کے ہمیشہ روئے گا۔

مائیک پر ہاتھ رکھ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”میں ہوں میراں...... وہ مہراں......“

شور نے زمین کو ہلا ڈالا......

”آپ دس سے الٹا گننا شروع کریں میں ذرا پانی پی لوں۔“

کہہ کر اس نے جھک کر پانی کی بوتل اٹھائی۔ گردن اٹھا کر پانی کی بوتل منہ سے لگائی۔ لوگوں کو اس کی یہ ادا بھی بہت پسند آئی۔ الٹی گنتی شروع ہو گئی۔ ”دو“ پر اس نے مائیک پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”ایک“ کے بعد اپنے حلق کو مہر کے سروں کے ساتھ جوڑ کر...... راگ مہراں سے نکلی دھن میں اتار کر......

گانے کے بول مائیک پر پوری جان لگا کر چھوڑ دیے......

بے خودی اور ترنگ لیے...... آزادی اور متوالے پن سے......

بات نئی بات تھی...... رات ”مہر میراں“ رات تھی......

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آفتاب قرشی
®
صندل کی مہک اور
تازگی کے ساتھ
Aftab Qarshi Dawakhana
Town, 20km Multan Road, Chong Lahore
URL: www.aftabqarshi.com

نمرہ احمد

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکہ ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکہ نکلوا لیتی ہے، مگر سکہ اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو حالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے حالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ حالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

سمیع، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ حالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لا دیتا ہے۔ فاتح، حالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش پہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔

مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے پاپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغواکار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی مسخ شدہ لاش دفنا دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمٰن نے اغوا کرایا تھا۔

ایڈم ملاکہ پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلیٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو سچ بتاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ، فاتح اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حالم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھا رہی ہے اور اس نے تالیہ کے بابا کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنا دے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلیٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پگھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایگنیس تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسٹر ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تا کہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر محل کا اسکیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبدہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آیا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آیا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اسکیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اسکیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا برا سلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھا دیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو "ابوالخیر" نامی آدمی کے کارندے ایک پنجرے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کرا لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغواکاروں کو خبر ہو

جاتی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک "البیتو" قیدی کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جل دے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ پہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بنداہارا کی بیٹی ہے۔ بنداہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدمے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آجاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بنداہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ نیلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاریخ میں اس نے کیا کارنامے انجام دیئے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم "بنگارا یا ملایو" کے رائٹر کا تھیلا چرا لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو "وانگ لی" کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح، سن باؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن باؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاتح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ فاتح کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مورخ تعینات کرتی ہے۔ فاتح تمام غلاموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مورخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ خفیہ طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابوالخیر سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاتح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ فاتح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے لیے بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کانی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔
ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کرواتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔

فاتح کے کہنے پر محمود مرنی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کا بت فاتح کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

راجہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر فاتح کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ راجہ مراد کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کرواتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ لیتی ہے اور فاتح کو خبردار کرتی ہے۔ راجہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔

ملکہ یان سوفو کی کنیز یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔

چودہویں قسط

سلطنت محل میں دربار سے مخالف عمارت میں ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا جس میں فرشی نشست بچھی تھی۔ گاؤ تکیے لگے تھے اور سامنے دو فٹ اونچا چبوترہ بنا تھا جیسے قوالی کے لیے بنایا جاتا ہے۔

اس فرشی نشست پہ حاضرین کی طرف رخ کر کے ایڈم دو زانو بیٹھا تھا۔ سامنے چھوٹی میز پہ قرینے سے سجے صفحات رکھے تھے جن پہ وقفے وقفے سے وہ نظر ڈالتا اور پھر چہرہ اٹھا کے حاضرین کو دیکھ کے ادب سے پڑھتا جاتا۔

سامنے پہلی صف میں سلطان مرسل، بنداہارا اور چند وزراء بیٹھے تھے۔ وانگ لی مرسل کے بائیں جانب تھا۔ پچھلی صفوں میں درباری مرد بیٹھے تھے۔

"اور یہ اسی ماہ کی بات ہے جب وانگ لی کے چائے خانے "جیا" میں.....
ہوئی ایک شام گرم بحثوں کی.....

ایڈم مرسل شاہ کی تعریفوں اور شہزادی تاشہ کے قصیدوں کے بعد اب 'جیا' کے اس قصے پہ آیا تو آواز جوش سے بلند ہونے لگی۔

بنداہارا مراد قدرے چونک کے سننے لگا۔

"ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا رئیسوں اور قاضی کے خلاف...
اور کرنے لگا غلاموں کی حمایت...
جن کو قید کرتے تھے بااثر لوگ اغوا کر کے...."

آخری صف میں دو زانو ہوئے چند خاص سپاہی اور اعلا عہدیدار غلام بیٹھے تھے۔ وان فاتح ان میں سے ایک تھا۔ آنکھیں چندھی کر کے وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ایڈم کو دیکھ رہا تھا۔

"اور بولا وہ بھری محفل میں آواز بلند کر کے...
نہیں ڈرتا میں رئیسوں کی دوستی کے چھن جانے سے..."

مرسل شاہ نے قہوے کی پیالی نیچے رکھی اور دلچسپی سے سننے لگا۔ مراد البتہ چونکا ہوا لگتا تھا۔ تاثرات سنجیدہ تھے۔

"کیونکہ اللہ نے مطمئن کر رکھا ہے میرا نفس شاہوں کی دوستی سے...
گھوماہوں میں اعلا سواریوں میں' رہا ہوں میں اونچے محلوں میں...."

ایڈم کی آواز جیسے کسی مغنی کی طرح فضا میں پھیلتی گئی' حاضرین کا جوش و تجسس بڑھتا گیا۔ قصہ دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ بس سب کو یہ سب کہنے والے جری مرد کا نام جاننے میں دلچسپی تھی۔

''پھرا ہوں میں ملک ملک' اپنے ہاتھوں سے
کھودی ہیں میں نے قبریں...
تو نہ ڈراؤ مجھے ان چیزوں سے' جو مجھے خوفزدہ
نہیں کرتیں...
لڑتا رہوں گا بے کس غلاموں کی آزادی کے
لیے آخر دم تک۔
کیونکہ میں....'' ایڈم نے مسکراتے ہوئے
حاضرین کو دیکھتے ہوئے نظریں کاغذ پہ جھکائیں اور
پڑھا۔
''وا.....'' وہ اٹکا....نظریں اٹھائیں تو یہ نظریں
بدلی ہوئی تھیں۔ تھوک نگلا اور فقرہ مکمل کیا۔
''کیونکہ میں وانگ لی ہوں۔ سن باؤ تائی ژان۔
شاہ چین کا سب سے وفادار غلام!''
اور اس کی پلکیں جھک گئیں۔ منوں بوجھ ان پہ
آن پڑا تھا۔ بدقت اس نے آنکھیں اٹھائیں' تو
دیکھا...سامنے جہاں مرسل شاہ نے خوشگوار حیرت
سے گردن موڑ کے وانگ لی کو دیکھا۔
''کیا واقعی یہ تم نے کہا وانگ لی؟ اتنے خوب
صورت بے باک الفاظ؟''
وہاں مراد راجہ نے اطمینان کی گہری سانس لی۔
''ظاہر ہے' یہ وانگ لی کی اعلا پائے کی تربیت ہی ہے
آقا' جو وہ کسی خوف وخطر کے بغیر اپنے 'اصل' کو رئیس
زادوں کے سامنے بھی یاد کرنے سے نہیں رکتا۔''
پیچھے بیٹھے درباریوں کی بھی توصیفی واہ واہ گونجی۔
وانگ لی جہاں خود قدرے حیران تھا' راجہ کی
بات پہ پھیکا سا مسکرایا۔''آقا...میں....'' وضاحت
دینے کے لیے لب کھولے۔
''ہمارے دل میں تمہاری قدر و منزلت مزید
بڑھ گئی ہے' وانگ لی۔ خوش رہو۔'' مرسل شاہ نے
زور سے اس کا شانہ تھپکا۔ پھر خوشگوار انداز میں واپس
مؤرخ کی طرف گردن موڑی۔
''تم اچھا لکھتے ہو' آدم! آگے پڑھو۔ تمہارا
کلام سننے میں لطف آرہا ہے۔'' اور سامنے چھوٹی میز
پہ رکھے...پھلوں میں سے ایک گچھا اٹھا کے منہ میں
رکھا۔
وانگ لی نے بدقت مسکراتے ہوئے سر کو خم
دیا۔''شکریہ آقا۔'' اور خاموش ہو گیا۔
وہ قدرے حیران سا تھا۔ بار بار ایڈم کو دیکھتا تھا
جیسے اچنبھے میں ہو مگر ایڈم اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔
اس نے بس ایک نظر دور پیچھے بیٹھے فاتح پہ ڈالی۔
فاتح اس کو خود کو دیکھتے پا کے تلخی سے مسکرایا اور
استہزائیہ سر جھٹکا۔ اس کی نظروں کا ملال اور تلخی...ایڈم
کی آنکھیں جھک گئیں۔
محفل برخاست ہوئی اور سلطان' جو چینی امداد کی
خوشی کے نشے میں سرمست تھا' اٹھنے سے پہلے ایڈم کو
شاہی خلعت سے نوازا گیا اور اشرفیوں سے بھری تھیلی
بطور انعام بھی دی۔ ایڈم نے خاموشی سے وہ رکھ لی'
جھک کے سلطان کا شکریہ ادا کیا اور سر جھکائے کھڑا رہا۔
ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے تو وہ
تیزی سے باہر آیا۔ وانگ لی اپنے غلاموں کے ہمراہ
دوسری سمت میں جا رہا تھا۔ ایڈم تیزی سے ان کے
قریب آیا۔ فاتح نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ بس
رفتار آہستہ کر دی۔ وانگ لی اور دوسرے غلام آگے
نکل گئے۔ وہ دونوں پیچھے رہ گئے۔
''سر....'' وہ بے چینی سے بولا۔''میں....میں
شرمندہ ہوں۔ جو میں نے کہا وہ سچ نہیں تھا' میں نے
سچ چھپایا' مگر....''
''یہ خلعت سنبھالو' ایڈم۔ یہ کافی بھاری ہے۔ تم
پہ بوجھ بڑھ گیا ہے۔''
''مگر سر....''
''مجھے کچھ برا نہیں لگا۔ بلکہ اچھا ہوا کہ میرے
خدشات دور ہو گئے۔ میں نے جان لیا کہ اب بس
وہی ہو گا جو بنگارایا ملایو میں لکھا ہے۔ مجھے اسی طرح
پلان بنانا ہو گا۔ شکریہ ایڈم۔''
وہ سپاٹ سا کہہ کے آگے بڑھ گیا۔
ایڈم مٹھیاں بھینچے بے بسی سے دور جاتے وانگ
لی اور اس کے غلام کو دیکھتا رہا۔
وہ بنداہارا کے محل کے باغ میں تھی جب ایڈم

اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا۔
باغ میں ایک جگہ بڑے بڑے پتھروں سے سنگی نشستیں بنی تھیں' جیسے مشروم کے سر کاٹ دیے ہوں اور وہ ایک سر کٹے مشروم پہ بیٹھی' اپنا لباس دائیں بائیں پھیلائے' دور افق پہ دوپہر کے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بادلوں کے پیچھے چھپا آدھی نارنجی ٹکیا جیسا دکھائی دیتا تھا۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا' چے تالیہ؟'' وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے اس کے سر پہ آکھڑا ہوا۔
تالیہ نے چونک کے گردن موڑی۔
''کیا میں نے آپ کو مسودہ اس لیے دیا تھا کہ آپ اس میں وان فاتح کے نام کی جگہ وانگ لی کا نام لکھ دیں؟ اس سے پہلے آپ نے میرا لکھا ایک حرف بھی نہیں بدلا۔ تو یہ کیوں؟'' وہ سخت زخم خوردہ نظر آتا تھا۔ مسودہ سنانے سے قبل ایک دفعہ بھی پڑھ لیتا تو ذہنی طور پہ تیار تو ہوتا مگر اسے گمان تک نہ گزرا تھا کہ وہ یہ کردے گی۔

''کیا وہ خفا تھے؟'' تالیہ کی نظریں سورج پہ تھیں۔
''ظاہر ہے ان کو بُرا لگا ہے۔ کیونکہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ سچ کو چھپایا ہے۔''
''یا شاید اس لیے کہ ہم نے ان سے مزید 'فین' بنانے کا موقع چھین لیا ہے اور...''
''بات فینز کی نہیں ہے' چے تالیہ۔'' وہ بے زار ہوا تو وہ ایک دم سے اٹھی اور اس کی طرف گھومی تو چہرے پہ سختی تھی۔
''ایڈم بن محمد.... میری بات کاٹے بغیر سنو...'' وہ غرائی تو وہ بالکل چپ ہوگیا۔ ''تمہارے فاتح صاحب اکیسویں صدی میں ایک اسٹار سیلبرٹی تھے۔ ان کے لاکھوں فینز تھے۔ وقت کی قید نے ان سے وہ مقام چھین لیا کہ جہاں ان کو صنم بنا کے ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ فینز کو پرستار اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے ستارے کی پرستش کرنے لگ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو پرستاروں کی عادت ہو جائے' ان کے لیے پرستش کروائے بغیر رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حب جاہ اور حب جاہ.... وہ ان دونوں کے بغیر ادھورے ہیں۔ ظاہر ہے ان کو برا لگے گا کہ ہم نے ان سے مزید پرستار بنانے کا موقع چھین لیا۔ ارد گرد دیکھو.... ان کا کوئی فین نہیں ہے یہاں۔''
''چے تالیہ.... آپ نے.... ایسا کیوں کیا؟'' وہ دکھی تھا۔
''کیونکہ.... میں نہیں چاہتی ان کو توجہ ملے۔ وہ کسی کی نظروں میں آئیں۔ وانگ لی ایسے الفاظ بولے تو کوئی نہیں چونکے گا۔ لیکن اگر کوئی غلام بولے تو بنداہارا ضرور چونکے گا۔ میرا باپ اس وقت ملاکہ میں ہر آدمی کی گردن کو دیکھ رہا ہے تاکہ وہ نشان ڈھونڈ سکے۔ اگر اس کو تمہاری کتاب میں دیوتا بنے شخص کی گردن پہ وہ نشان مل جائے تو وہ کیا حال کرے گا وان فاتح کا' احساس ہے تمہیں؟''
ایڈم بالکل چپ ہوگیا۔
''میں جو کر رہی ہوں' ہم تینوں کی بھلائی کے لیے کر رہی ہوں۔ تم غلاموں کی کہانی لکھنا چاہتے ہو' لکھو' مگر اس کو وانگ لی کے نام سے لکھو یا کسی اور نام سے۔ مگر فاتح کا نام تم اپنی کتاب میں نہیں لکھو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔'' وہ تحکم سے چبا چبا کے بولی۔
ایڈم نے اپنے سامنے کھڑی شہزادی کو نظر اٹھا کے دیکھا۔ اس کے عقب میں بنداہارا کا محل نظر آرہا تھا' اور وہ اس محل کی طرح اونچی' بارعب اور شاہانہ لگ رہی تھی۔
''میں اس حکم کو نہیں ماننا چاہتا۔ میں نے وان فاتح سے وعدہ کیا تھا کہ....''
''ایڈم بن محمد....'' وہ ایک دم غرائی تو وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ''تم یہاں.... میرے حکم پہ.... کھڑے ہو۔ تمہیں یہاں تک میں (سینے پہ انگلی رکھے) لائی ہوں۔ میں ملاکہ کے بنداہارا کی بیٹی شہزادی تاشہ بنت مراد ہوں۔ اس محل میں وہ ہوتا ہے جو میرا حکم ہوتا ہے۔ میرے سامنے اپنی توجیہات مت رکھو۔ تم وہی لکھو گے جو میں چاہوں گی ورنہ تم اس دنیا میں تاعمر بھٹکتے رہو گے۔ سنا تم نے!''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

محل دونوں کے درمیان آ گیا تھا۔ طاقت کا پلڑا بے قابو ہو گیا تھا۔ پیمانے اوپر نیچے ہونے لگے اور اپنی اپنی جگہ پہچاننے لگے۔

ایڈم کے کندھے ڈھیلے ہو کے گر سے گئے۔

اس نے سر جھکا دیا۔ ''جو حکم' شہزادی۔''

وہ ایک برہم نگاہ اس پہ ڈالتی' لباس دونوں پہلوؤں سے اٹھائے' تیز تیز آگے بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے اس اداس سے باغیچے میں کھڑا رہا۔

سامنے موجود محل نے کان میں سرگوشی کی۔

''طاقت میں بہت طاقت ہے' بے وقوف مؤرخ!''

☆☆☆

ملکہ کی خواب گاہ سرخ اور زرد رنگ کے پردوں اور قالینوں سے سجی تھی جن پہ مختلف طرح کے شیر اور اژدھوں کی شکلوں کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دیوار کے کھلے خانوں میں چینی کے برتن اور صراحیاں سجی تھیں۔ پلنگ کے اوپر سرخ جالی دار پردے گرتے نظر آتے تھے۔ غرض وہ ہر طرح سے ''شاہ چین کی دختر'' کا کمرہ لگتا تھا۔

ملکہ یان سوفو اندر داخل ہوئی تو دربار کے برعکس اس کے چہرے پر ناخوش گواری تھی۔ رنگت گلابی دہک رہی تھی' ماتھے پہ بل تھے اور وہ غصے میں تھی۔

اس کی خاص کنیز بھی پیچھے آئی اور دہلیز پار کر کے کونے میں کھڑی ہو گئی۔

یان سوفو آگے بڑھی..... سنگھار میز تک آئی اور کلائی سے چوڑیاں اتارنے لگی۔

''ملکہ..... ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ آقا شہزادی تاشہ کو اپنے حرم میں داخل نہیں کریں گے۔''

''پانچ سال کی تھی جب گھوڑے پہ چڑھنا سیکھا تھا میں نے۔'' وہ رگڑنے والے انداز میں چوڑیاں اتار اتار کر پھینک رہی تھی۔ آنکھیں شدت جذبات سے سرخ پڑ رہی تھیں۔

''نو سال کی ہوئی تو قیدیوں پہ مشقوں کے دوران ایک قیدی کی پیشانی میں پہلا تیر گھونپا تھا میں نے۔ شاہ چین کی بارہ بیٹیوں میں سے سب سے لاڈلی اور محبوب تھی میں۔''

''ملکہ.....'' کنیز نے غمگین نظروں سے اسے دیکھ کے کچھ کہنا چاہا مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔

''بائیس برس کی ہوئی تو اپنی ہر فن سے آراستہ بیٹی کو بابا نے سینکڑوں چینی اہلکاروں کے ساتھ اس ملک کی طرف روانہ کر دیا۔ اپنے آباؤ اجداد کا دین چھڑا کے مجھے مسلمان بنایا گیا۔ پھر ایک ایسے سلطان سے میری شادی کر دی جس کو میں جانتی تک نہ تھی مگر حکم تھا کہ یہی کرنا ہے۔ یہ دونوں ملکوں کے لیے خوش بختی لائے گا۔ یہ کیسی خوش بختی ہے جو چین کی شہزادی کے دل کو روند کے ملتی ہے؟'' اب وہ اپنی گردن سے زیور نوچ کے اتار رہی تھی۔ نظر اٹھا کے آئینے میں دیکھا تو آنکھیں بھیگ گئیں۔

''جس سلطان کو کھانا کھانے کی تمیز نہیں' جس کو اپنے دماغ سے سوچنا تک نہیں آتا۔ جس کو دوسرے چلاتے ہیں اور جس کو میں نے ہر قربانی دینے کے بعد سدھارنے کی کوشش کرنا چاہی۔ اپنے ملک کے لیے..... چین کے لیے۔ اپنے شاہ کے لیے۔ وہ سلطان آج کہتا ہے کہ وہ میرے مقابلے پہ ایک دوسری ملکہ لے آئے گا۔'' آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے اس نے تاج اتارا اور دیوار پہ دے مارا۔

کنیز سہم کے پیچھے ہوئی۔

یان سوفو نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔

''وہ شاہ چین کی بیٹی کے مقابلے پہ دوسری عورت لائے گا؟ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟''

''ملکہ' ضرور شہزادی تاشہ نے آقا کو اپنے جال میں پھنسایا ہو گا ورنہ آپ کی خوبصورتی کے سامنے تو.....''

یان سوفو نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا۔

''شہزادی تاشہ!'' پھر چہرہ اٹھایا اور آئینے میں عکس دیکھا تو کاجل آنسوؤں کے باعث مٹا مٹا سا تھا اور جوڑے سے لٹیں نکل کے ادھر ادھر بکھری تھیں۔

''شہزادی تاشہ کے چہرے پہ تیزاب پھینک سکتی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوں میں....اسے زنداں میں ڈال سکتی ہوں۔اس کی جان لے سکتی ہوں۔مگر....." اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آنکھوں پہ رکھیں اوران کو رگڑنے لگی پھر انگلیاں ہٹا ئیں چہرہ اٹھایا اور گہری سانس لی۔

"مگر میں پانچ برس کی تھی تو گھوڑے پہ چڑھنا سیکھا تھا۔ اتھرے جانور کو قابو کرنا مجھے تب سے آتا ہے۔" آنسو ہتھیلی کی پشت سے رگڑے۔

نو سال کی تھی تو قیدی کے سر پہ رکھے سیب کی جگہ پیشانی میں تیر گھونپا تھا۔ کیونکہ کان میں بابا نے کہا تھا کہ مشق تو ناٹک ہے اصل مقصد اس قیدی کو مارنا ہے۔تب سے محل کے رازوں اور سازشوں کا استعمال کرنا آتا ہے۔" اس نے غازے سے اٹا رومال اٹھایا اور اس سے چہرے کو تھپتھپایا۔ رنگت میں سفیدی اور گلابی گھل گئی۔

"شاہ چین کی بارہ بیٹیوں میں سے سب سے لاڈلی اس لیے تھی کیونکہ بابا کو معلوم تھا' میں انسانوں کو پڑھ بھی سکتی ہوں اور ان سے نپٹ بھی سکتی ہوں۔" لالی اٹھائی اور لبوں پہ لگائی۔

"بائیس برس کی تھی تو اس لیے مجھے تنہا شاہی دستے کے ساتھ غیر ملک میں روانہ کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے' یان سوفو تنہا مقابلہ کرنا بھی جانتی ہے۔ دونوں ملکوں کو خوش بختی ملے گی' مگر یان سوفو کا دل اب مزید نہیں روندا جائے گا۔" اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور جیسے الجھی لٹوں کو سنوارا۔ پھر سنگھار میز پہ رکھا دوسرا تاج اٹھا کے سر پہ رکھا۔

"میں اب صرف شاہ چین کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں ملاکہ سلطنت کی ملکہ بھی ہوں اور مجھے مرادراجہ اور شہزادی تاشہ سے زیادہ چالیں چلنا آتی ہیں۔" پھر اس نے گردن موڑی اور کنیز کو دیکھا تو اب قدرے پُرسکون اور سپاٹ نظر آتی تھی۔

"شہزادی تاشہ کو کل محل میں بلاؤ۔ ہم ظہرانہ ایک ساتھ کھائیں گے۔"

کنیز نے الجھ کے اسے دیکھا مگر سر تسلیم خم کر لیا۔"جو حکم'ملکہ!" اور الٹے قدموں پیچھے ہٹتی گئی۔

☆☆☆

"جیا" پہ مغرب کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔اندر قندیلیں روشن کر دی گئی تھیں اور بڑا ہال کھچا کھچ بھرا نظر آ رہا تھا۔ پسماندہ' زبوں حال سے نوجوان اور ادھیڑ عمر مرد میزوں پہ بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف نظر آتے تھے۔بعض عجلت میں کھا رہے تھے جیسے ان کو واپس پہنچنے کی جلدی ہو۔

ہال کا ایک دروازہ رسوئی میں کھلتا تھا جہاں چولہے رکھے تھے اور چھت کھلی تھی۔ دھواں فضا میں اُڑتا جا رہا تھا اور دیگچوں میں پکوان پکتے نظر آ رہے تھے۔ ایک چولہے کے قریب فاتح بن رامزل پنجوں کے بل بیٹھا لکڑیوں کو چولہے کے اندر دھکیل رہا تھا۔

دھواں اٹھا تو اس نے جھک کے پھونک ماری۔ ایک دم شعلہ سا جل اٹھا اور دھواں چھٹتا گیا۔اس نے آنکھیں مسلیں اور پھر ادھر ادھر دیکھا۔

وہ رسوئی میں اکیلا بیٹھا تھا۔ دوسرے غلام کاموں کے سلسلے میں آ جا رہے تھے۔ وہ ان غلاموں کا نگران بنا دیا گیا تھا اور اس پہ اب روک ٹوک نہیں کی جاتی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں' ڈیڈ؟" وہ آواز پہ چونکا۔ لکڑیوں کے ساتھ آریانہ آ بیٹھی تھی اور چہرہ ہتھیلیوں پہ گرائے' یاسیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ٹیالے کرتے پاجامے میں پنجوں کے بل بیٹھا فاتح ذرا سا مسکرایا۔"یہ سوچ رہا ہوں کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

"آپ کے پاس تو ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔"

"اب بھی ہے۔مگر یہ لوگ...." گردن موڑ کے اس دروازے کو دیکھا جو اندرونی ہال میں کھلتا تھا۔

"یہ شہر کے غلام'محکوم لوگ..... یہ کیسے اپنے لیے کچھ کریں گے؟" اس کے انداز میں افسوس تھا۔

"کسی کو تو ان کے لیے لڑنا ہوگا' ڈیڈ! وانگ لی تو وہ ہیرو نہیں نکلا جو آپ اس کو سمجھتے تھے۔ صبح دربار میں اپنی تعریف سن کے وہ خوش تو ہوگیا مگر اس نے تب سے لے کر اب تک آپ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ وہ کوئی عظیم کارنامہ سرانجام نہیں دے گا۔"

"غلط۔ اس کے بارے میں تاریخ میں لکھے

تمام واقعات درست تھے سوائے اس ایک کے۔ وہ جنگی فتوحات' وہ بحری سفر' وہ سفارت کاری' وہ سب کارنامے وہ انجام دے چکا ہے...''

''اس نے جو بھی کیا' ڈیڈ' وہ چین کے لیے کیا۔ اب بھی ملاکہ کو قرض کی غلامی میں ڈال کے وہ اپنے ملک سے حب الوطنی کا ہی ثبوت دے رہا ہے۔ وہ ہیرو ہے مگر چینی قوم کا۔ آپ کو اپنی قوم کا مسیحا خود بننا ہوگا۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔'' اس نے ہاتھ جھاڑے اور سوچتی نظروں سے ہال کے دروازے کو دیکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''تقدیر صرف ان قوموں کی بدلتی ہے جو اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کرتی ہیں۔''

وہ ہال کے اندر آیا اور ایک غلام سے طشت لے لیا۔ پھر ایک میز تک آیا جو وسط میں تھی۔ اس پہ دو آدمی کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فاتح نے ان کے سامنے چاول اور ترکاری کے کٹورے رکھے تو وہ جلدی جلدی کھانے پہ ٹوٹ پڑے۔ وہ طشت اٹھائے کھڑا غور سے ان کو دیکھے گیا۔

''آرام سے کھاؤ' اتنی جلدی بھی کیا ہے۔''

''تم میرے آقا کو نہیں جانتے۔ جلد واپس نہ گیا تو وہ میرا برا حال کر دے گا۔'' وہ انگلیوں سے چاول منہ میں رکھتے ہوئے بولا تو فاتح نے افسوس سے سر جھٹکا۔

''تمہاری مجبوری صرف جسمانی غلامی تھی۔ ذہنی غلام کیوں بن گئے ہو؟'' وہ ذرا اونچا بولا تو قریب میں چند گردنیں مڑیں۔

''ذہنی غلامی؟ وہ کیا ہوتی ہے؟'' غلام کے ہاتھ چاول میں رہ گئے۔ ہونقوں کی طرح چہرہ اٹھا کے اس کو دیکھنے لگا۔

فاتح نے کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھا' پھر بولا تو آواز بلند تھی۔

''کسی انسان سے اتنا ڈرنا یا اس سے اتنی محبت کرنا کہ اپنے ہر کام' ہر فیصلے کو کرنے سے پہلے اس کا متوقع ردِعمل سوچنا... یہ غلامی ہے میرے دوست! اور یہ تم سب....'' انگلی سے اطراف میں اشارہ کیا۔'' کی عادت ہے۔ تم سب ذہنی غلام ہو۔''

''تو کیا کریں؟'' غلام نے خفگی سے چاول پلیٹ میں پھینکے۔ ''آقا کے غلام ہیں۔ حکم نہ مانیں تو ڈر لگتا ہے کہ سزا ملے گی۔''

''مسلمان ہو کیا تم' ہاں؟'' وہ برہمی سے بولا تو سارے میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ گردنیں موڑ موڑ کے اسے دیکھنے لگے تھے۔ ''پھر کیوں بھول جاتے ہو کہ مسلمان کسی سے نہیں ڈرتا کیونکہ وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔''

''اللہ سے ہم بھی ڈرتے ہیں' مگر ہمارا مالک....''

''میرے بھائی' صرف اللہ سے ڈرنے کی عادت ڈالو۔ تمہارا مالک کیا' دنیا کا کوئی انسان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اگر تم اللہ سے مدد مانگو تو۔'' اس نے لہجہ قدرے نرم کیا اور انداز میں جیسے منت سی بھر لی۔ ''جسمانی غلامی تمہاری مجبوری ہے' مگر خدارا ذہن کو تو آزاد رکھو۔ ہمارے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں آزاد انسان بننا سکھایا تھا۔ ہم کیوں وہ سب بھول گئے ہیں۔''

کسی نے جواب نہیں دیا۔ لوگ کھانا روک کے ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

''میں جانتا ہوں تم لوگ پریشان ہو' اکیلے ہو' تمہیں اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے اور غلام بنایا گیا ہے مگر تمہیں اس حالت میں ڈالنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی انسان کو اکیلا کرتا ہے۔ سارے رشتے' دوست' مددگار' ایسے حالات بنا دیتا ہے کہ سب چھوڑ جاتے ہیں اور وہ سب سے انسان کو کاٹ کے کسی تنہا جزیرے پہ لے جاتا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟''

کوئی جواب نہ آیا۔ بس خالی چہرے ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہے تھے۔

''کیونکہ محبت کرنے والے جب تک ہمارے اردگرد ہوتے ہیں' ان کی محبتوں کا شور ہمیں اپنے اندر نہیں جھانکنے دیتا۔ کبھی کبھی اس شور کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ زبردستی' جبراً۔ یہ تمہارا اور میرا اللہ ہے جو انسان کو اکیلا کر کے اس کو اس کے اندر جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ تم اپنے

مالک سے کیوں ڈرتے ہو؟ وہ تمہارا خدا نہیں ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا خدا نہیں ہوتا۔ خدا صرف ایک ہے۔" انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔ نظریں ایک سے دوسرے تک جا رہی تھیں۔

"اس اللہ سے ڈرنا سیکھو۔ اس اللہ کو پہچاننا سیکھو۔ وہی ہماری زندگیوں کے سارے فیصلے ہم سے کرواتا ہے۔ وہی ہمیں خوشی دیتا ہے' وہی غم دیتا ہے۔ وہی ہنساتا ہے' وہی رلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ہمارے دل کو آرام نہیں پہنچا سکتا۔"

غلام نے پلیٹ اپنی طرف کھینچی اور پھر سے کھانا کھانا شروع کیا۔ مگر فاتح نے ہمت نہیں ہاری۔

"ہمارے رسول اللہ ﷺ کسی انسان سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہر انسان کو برابری کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ اللہ نے ان کے سارے خوف دور کر دیے تھے۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ تم لوگ بھی اپنے خوف دور کر سکتے ہو۔ تم سب اچھے گھروں کے لوگ ہو جو اغوا کر کے جبراً ابوالخیر یا اس جیسے لوگوں کے غلام بنائے گئے ہو۔ اپنے مالکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا سیکھو۔

ملاکہ کے لوگو! اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ نہیں پسند جو مظلوم بن کے ظلم کے سامنے پستے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگ پسند ہیں جو بھلے امیر ہوں یا غریب' خوبصورت ہوں یا بدصورت' مگر وہ صرف اللہ سے ڈریں اور درست چیز کے لیے کوشش کرتے رہیں۔ اللہ کو کوشش کرنے والے پسند ہیں۔ کیا تم لوگ اپنے لیے کوشش کرنے والے نہیں بننا چاہتے؟"

غلام اب تیز تیز لقمے لے رہا تھا۔ گردنیں واپس مڑتی گئیں۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد پھر سے بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ سب کی توجہ کھانے کی طرف مبذول ہوتی گئی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک میز سے دوسری میز تک امید بھری نظریں دوڑائیں مگر اس کی نگاہ خالی پلٹ آئی۔ کسی نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے تو کسی نے خشمگیں نگاہوں سے اس کو گھور کے منہ موڑ لیا تھا۔ سب واپس مصروف ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ تو مارے خوف کے باہر نکل گئے تھے۔

فاتح نے گہری سانس لی اور اداسی سے ان لوگوں کو دیکھا جو جلدی جلدی کھانا ختم کر رہے تھے۔ مالک کا خوف ہر شے پہ حاوی تھا۔

☆☆☆

'سلطنت محل' لکڑی کا بنا خوب صورت محل تھا جس کے مغربی کونے میں بڑا سا کتب خانہ بنا تھا۔ اس شاہی کتب خانے کے اندر وسیع و عریض ہال سا بنا تھا جس میں قطار در قطار ریک رکھے تھے اور ان کے اندر کتابیں سجی تھیں۔

ایڈم ایک ریک کے سامنے کھڑا کتاب اٹھا کے اسے کھولتا نظر آ رہا تھا۔ دو کتابیں بغل میں دبی تھیں۔ سلطنت محل کا کتب خانہ بنداہارا مراد کے محل سے کہیں زیادہ وسیع اور علمی خزانے سے مالا مال تھا۔ (سلطنت محل وہ محل تھا جس میں سلطان مرسل اور ملکہ یان سوفو رہائش پذیر تھے۔ مراد اور تالیہ کا محل اس سے دور سمندر کنارے اونچے پہاڑ پہ واقع تھا۔)

ایڈم نے کتاب بند کر کے ریک میں رکھی تو چونکا۔ اوپری خانے کے کونے میں قطار میں چار کتابیں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک ہی سیریز کی کتابوں کی چار جلدیں تھیں۔ جلد اول' جلد دوم' جلد سوم' جلد پنجم۔ اس نے چاروں کے سرورق پڑھے۔ جلد چہارم نہیں تھی۔ درمیان کی جگہ بھی خالی تھی۔ جلد چہارم کس نے اٹھائی اور کہاں گئی؟

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پہرے دار اس طرف نہیں تھے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ جلد اول نکالی اور اسے کھولا۔ اندرونی سرورق دیکھ کے وہ ٹھٹکا۔

وہ ملاکہ کے مختلف نامور جزیروں کے نقشوں' جغرافیہ اور وہاں کے سفرنامے کی کتاب تھی۔ بنیادی طور پہ وہ دس برس پہلے جانے والا ایک سفرنامہ لکھا تھا۔ جلد اول کے پہلے صفحے پہ فہرست تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر جلد میں کون کون سے مضامین شامل ہیں۔ وہ انگلی صفحے پہ پھیرتا نیچے آیا۔

جلد چہارم۔ "تین چاند والے جزیرے کا

دلچسپ احوال۔"

جو جلد غائب تھی' اس میں تین چاند والے جزیرے کا احوال لکھا تھا؟ یا خدا!

ایڈم نے جلدی سے کتاب بند کی اور واپس رکھی۔ اس کے ماتھے پہ پسینے کے قطرے تھے۔ وہ تیزی سے آگے آیا اور متلاشی نظروں سے ایک کے بعد ایک ریک دیکھنے لگا۔ وہ جامنی رنگ کے سرورق والی کتابیں تھیں' یہ رنگ خاصا نمایاں نظر آتا تھا۔

اور پھر اسے وہ رنگ نظر آ گیا۔

کونے میں رکھی شیشے کے پٹ والی قدیم الماری میں "جلد چہارم" رکھی تھی.... ایڈم کے اندر جوش سا بھر گیا۔ فوراً الماری کا دروازہ کھینچا مگر وہ بند رہا۔ اس نے چونک کے دیکھا۔ کنڈے پہ یہ بڑا سا تالا چڑھا تھا۔

"تم کیا کر رہے ہو یہاں؟" پیچھے سے پہرے دار غراتا ہوا آیا تو وہ چونک کے مڑا۔

"میں.... یہ کتابیں نکالنا چاہ رہا تھا اور....."

"ہر کتاب پڑھنے کے لائق نہیں ہوتی۔" وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ اس کے سر پہ پہنچ گیا۔ میان میں چمکتی تلوار اور جسم پہ پہنا آہنی لباس.... وہ تیم تحیم سا پہرے دار خاصا خوفناک تھا۔

"مگر میں مورخ ہوں اور مجھے...."

"یہ بندا ہارا کا محل نہیں ہے' یہ سلطنت محل ہے۔ یہاں تمہاری شہزادی کا حکم نہیں چلتا۔ یہاں سلطنت کے قوانین نافذ ہیں۔ یہ ممنوعہ کتب ہیں۔ شکل گم کرو اپنی ورنہ....." تلوار پہ ہاتھ رکھا تو ایڈم نے جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ بغل میں دبی کتابیں نیچے جا گریں۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ممنوعہ کتابیں ہیں۔ وہ کیا ہے کہ نظر کمزور ہے میری۔" کہتے ہوئے جھکا اور جلدی جلدی کتابیں سمیٹنے لگا۔ "اور تھوڑا سا دماغ بھی کمزور ہے۔ بات دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ خیر تم میری شکایت نہ کرنا۔" کتابیں سنبھالتا ہوا اٹھا اور زبردستی مسکرا کے اسے دیکھا جو ہنوز شعلہ بار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"جا رہا ہوں۔ جا رہا ہوں۔" معصومیت سے مسکرا کے آگے بڑھ گیا۔ مگر کن اکھیوں سے اس نے الماری کے اندر رکھی دوسری کتابوں کے سرورق پہ نظر ضرور ڈالی تھی۔

پمبورو.... شکار باز.... تین چار کتابوں کی جلدوں پہ یہ لفظ اسے واضح لکھا دکھائی دیا تھا۔

ان کتابوں کو یقیناً مراد راجہ کے حکم پہ عام عوام کی پہنچ سے دور رکھا گیا تھا۔ اب وہ کیا کرے؟

☆☆☆

شہزادی تاشہ کے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے ہٹے تھے اور سورج کی تازہ کرنیں اندر سارے کو روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی' آئینے میں خود کو دیکھتی' گالوں پہ گلابی سا غازہ ہلکا ہلکا مل رہی تھی جو کھلی ڈبی میں سامنے رکھا تھا۔ پھر اسی کو ہونٹوں پہ لگا کے ہونٹ آپس میں مس کیے۔

لباس زمرد رنگ کا تھا۔ لمبی قمیص اور نیچے لہنگا سا۔ (اسے باجو کرنگ کہتے تھے۔) تاج میز پہ رکھا تھا' اور بال گھونگھریالے کر رکھے تھے۔ سنگھار سے مطمئن ہو کے اس نے چوڑیاں اٹھائی ہی تھیں کہ دروازے کھلے۔ دربان نے صدا لگائی۔

"مراد راجہ تشریف لا رہے ہیں۔"

وہ چوڑیاں اٹھائے تیزی سے کھڑی ہوئی۔ اسی اثناء میں مراد اندر داخل ہوا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے' ماتھے پہ سرخ پٹی' اور اپنی لمبی شاہی قبا پہنے ہوئے تھا۔ سینے پہ لوہے کی زرہ بھی پہن رکھی تھی۔ غالباً شکار پہ جا رہا تھا یا واپس آ رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی اسے ابرو کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"راجہ.... آپ نے مجھے بلوا لیا ہوتا۔" وہ احتیاط سے بولی۔ وہ ایسے کھڑی تھی کہ آئینے کی طرف اس کی کمر تھی۔ اور راجہ کھڑکی میں سورج کی روشنی کے سامنے کھڑا تھا۔ روشنی کا راستہ رک گیا تھا۔

"ملاکہ سلطنت کا بندا ہارا شاہی شادی کا نگران ہوتا ہے' تم جانتی ہو۔" آنکھیں چندھیا کے باہر دیکھتے ہوئے سپاٹ انداز میں بولا۔ "سلطان مرسل کی شادی میں نے ہی کروائی تھی۔"

"جی' راجہ۔ تب آپ اور ملکہ ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ پمبو روشکار بازوں کا سارا گاؤں تباہ کیا تھا آپ لوگوں نے اور مجھے اس اَن دیکھی چینی شہزادی سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ اب آپ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور میں ملکہ یان سوفو کے ساتھ ہوں۔ شاید اسی کو سیاست کہتے ہیں۔" وہ چوڑیاں کلائی میں ڈالنے لگی۔ ایک۔ دو۔

"سلطان مرسل تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

تالیہ نے زور سے چوڑی کلائی پہ آگے کو دھکیلی تو وہ جلد کے ساتھ رگڑتی گئی۔ اس کا سانس تھم گیا۔

"بنداہارا کی بیٹی اور ملاکہ سلطنت کے سلطان کا ملاپ ہمارے ملک کا پرانا رواج ہے۔ اکثر سلاطین کی شادیاں بنداہارا کی بیٹیوں سے ہوئی ہیں۔ حیرت ہے مجھے یہ خیال خود کیوں نہیں آیا۔ وقت کا شکریہ جس نے تمہیں بہت جلد ایک مکمل شہزادی کے روپ میں مجھے واپس کر دیا۔" وہ سادہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ چھوٹی عقابی نظریں تالیہ کے چہرے پہ جمی تھیں جو سفید پڑنے لگا تھا۔

"تم واپس جانے کا ہر خیال ذہن سے نکال دو۔ قسمت تم پہ مہربان ہو رہی ہے تاشہ۔ اگر تم سمجھداری سے کام لو تو ہم اس چینی عورت کو ملاکہ سے نکال دیں گے۔ تم ملکہ ہو گی اور میں بنداہارا۔ مرسل شاہ صرف ایک کٹھ پتلی ہو گا۔ میں اس نئے بندھن پہ بہت خوش ہوں۔ اور تمہیں نصیحت کرنے آیا ہوں کہ تم بھی خوش رہنا۔ کیونکہ....." انگلی اٹھا کے تنبیہہ کی تو لہجے اور آنکھوں دونوں میں سختی در آئی۔

"میں.....کوئی گڑبڑ..... برداشت نہیں کروں گا۔ اب یہ میری اور میری قوم کی عزت کا سوال ہے۔"

وہ یک ٹک کھڑی اسے دیکھے گئی۔ ہاتھ بے جان سے ہو کے پہلو میں جا گرے تو چوڑیاں کھنک اٹھیں۔ مراد راجہ جو کھڑکی سے آتی روشنی کے ہالے میں کھڑا تھا' ایک بے تاثر نظر اس پہ ڈالتا' باہر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے گم صم نگاہیں موڑ کے سنگھار میز پہ رکھے سنہری تاج کو دیکھا جس میں جڑے ہیرے دمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

کون کہتا ہے کہ شہزادی ہونا آسان ہے؟

☆☆☆

سلطنت محل کا باغ میلوں دور تک پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ درمیان میں سفید روش بنی تھی جس پہ شہزادی تاشہ چلتی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ عقب میں کنیزوں کا مجمع تھا۔ خود وہ پھیکی پھیکی سی لگتی تھی۔ گم صم سی۔ جیسے ہوا میں قدم رکھ رہی ہو۔ سامنے سے ایڈم آ رہا تھا۔ کتابیں بغل میں دبا رکھی تھیں۔ اسے دیکھ کے رفتار آہستہ کی اور سر جھکا لیا۔ اس روز کی تلخی ابھی تک یاد تھی۔

تالیہ نے کنیزوں کو اشارہ کیا تو وہ وہیں رک گئیں۔ وہ خود بے جان سے قدم اٹھاتی اس کے قریب آ رکی۔

"تم یہاں کیسے؟"

"آقا نے کہا تھا کہ مجھے شاہی کتب خانے سے فیض اٹھانا چاہیے۔ اس لیے یہاں آیا تھا۔" ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ "میرے لائق کوئی خدمت' شہزادی؟"

"میں صرف تمہاری شہزادی نہیں ہوں' ایڈم۔ یہ مت سمجھو کہ مجھ میں تاج اور تخت کا غرور پیدا ہو گیا ہے۔"

"واقعی یہ نہ سمجھوں؟" اس نے شکایتی نظروں سے شہزادی کو دیکھا۔

"ہاں' طاقت اپنا اثر دکھاتی ہے لیکن میں اور تم ایک برابر ہیں' ایڈم۔ ہم دونوں ہی یہاں قیدی ہیں۔ مجھ پہ بھروسا کرو اور حکم مان لیا کرو۔" کہہ کے وہ آگے بڑھ گئی۔ ایڈم کی ساری کلفت اور ناراضی جیسے دور سی ہو گئی۔ فوراً اس کے پیچھے لپکا۔

"اچھا سنیے۔ اس محل کے کتب خانے میں کچھ کتابیں تالے میں رکھی گئی ہیں۔ مجھے وہ چاہئیں۔ ان میں تین چاند والے جزیرے کا راز چھپا ہے۔"

"میں ملکہ سے ملنے آئی ہوں' مجھے تنگ مت کرو ابھی۔" وہ کسی قسم کی تلخی کے بغیر تکان سے بولی اور سامنے دیکھتے ہوئے قدم بڑھاتی گئی۔ ایڈم نے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

قدرے اچھنبے سے اسے دیکھا۔ وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔

''اس سے اچھے تو ہم کے ایل میں تھے' چے تالیہ! وہاں ہم برابر تھے۔ یہاں نہیں۔ بلکہ خیر... برابر تو وہاں بھی نہیں تھے۔ میں ٹھہرا ایک شریف' قانون کی پاس داری کرنے والا آدمی۔ اور آپ ٹھہریں ایک لالچی خاتون جن کی زندگی کے سارے فیصلے خزانے کی کھوج کے گرد گھومتے تھے۔''

وہ ایک دم رکی اور اس کی طرف گھومی۔ ایڈم کی زبان کو بریک لگا۔ ذرا سا گڑبڑایا۔ رعب حسن اور شاہزادیوں والی جاہ۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں دوبارہ اس روز کی طرح.....

''بالکل.... واقعی!'' وہ چونک کے بولی۔ ''یہی تو ہوں میں۔ ایک لالچی عورت جس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خزانے کی کھوج تھا۔ ویری گڈ!'' اور دوبارہ سے چلنے لگی۔ ایڈم کے ابرو حیرت سے سکڑے۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔

''طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟ میرے دائیں ہاتھ کو آج بری نظر سے نہیں دیکھا آپ نے۔''

''مراد راجہ میری سلطان سے شادی کی تیاری کر رہا ہے۔ اس وقت میرا موڈ اچھا نہیں ہے' ایڈم۔''

''اوہ۔'' وہ چپ ہو گیا۔ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایڈم نے اسے امید دلانے کی کوشش کی۔

اگر آپ مجھے وہ کتابیں نکلوا کے دے دیں تو میں یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈتا ہوں۔ میں کسی صورت آپ کو ان رسم و رواج کے اوپر قربان نہیں ہونے دوں گا۔''

ایڈم ذرا جذباتی ہو گیا تو تالیہ نے گردن موڑ کے ایک نظر ایڈم کو دیکھا۔ کرتے پاجامے اور واسکٹ میں ملبوس' سر پہ ٹوپی پہنے' وہ اچھا لگ رہا تھا۔ تالیہ اداسی سے مسکرائی۔

''تمہاری تو خواہش تھی نا مجھے پولیس سے گرفتار کروا کے قید میں ڈلوانے کی۔ تو اس قید پہ خفا کیوں ہوتے ہو؟''

''وہ نیک کام تو میں اپنے ہاتھوں سے سرانجام دوں گا' مگر یہاں کسی صورت بھی میں آپ کو اس سب کا حصہ نہیں بننے دوں گا۔'' وہ واقعی دبے دبے غصے میں نظر آتا تھا۔

''تھینک یو ایڈم!''

''ظاہر ہے چے تالیہ! مانا کہ آپ انتہائی فراڈ اور بے وفا انسان ہیں' سوائے دولت کے آپ کسی کے ساتھ وفاداری نہیں نبھاتیں' مگر ہم سب یہاں ساتھ ہی آئے تھے اور ساتھ ہی جائیں گے۔''

''ایڈم!'' وہ برا مانے بنا چونک کے بولی۔ ''میں بتانا ہی بھول گئی... میں نے اس روز خواب دیکھا کہ.... میں کے ایل میں ہوں۔ ایک آفس میں۔ نئے دور میں۔''

''اس میں کیا بڑی بات ہے؟ میں روز خواب دیکھتا ہوں کہ میں کے ایل میں ہوں اور میری شادی ہو رہی ہے۔''

''نہیں ایڈم۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کے سرخ یاقوت والی انگوٹھی دکھائی۔ ''یہ انگوٹھی میں نے اس خواب میں پہن رکھی تھی۔ یہ انگوٹھی! اور اس کا مطلب ہے.... وہ خواب آنے والے وقت کا ہے۔ یعنی کہ ہم واپس جائیں گے' ایڈم!'' وہ پہلی دفعہ دل سے مسکرائی۔ ایڈم کے لب بھی خوشگوار مسکراہٹ میں ڈھلے۔

''ہم؟ کیا اس خواب میں' میں بھی تھا؟ اور وان فاتح بھی؟''

تالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ مسکراہٹ غائب ہوئی۔

''کتابیں... تمہیں مقفل الماری کی کتابیں چاہئیں' ہیں نا' میں کچھ کرتی ہوں' اچھا۔'' اور مڑ کے کنیزوں کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً سے اس طرف لپکیں۔ تالیہ اس سے نظر ملائے بغیر آگے بڑھ گئی۔ وہ بنا پلک جھپکے اس کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

''کیا ہم اس خواب میں نہیں تھے' چے تالیہ؟

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

کیا ہم واپس نہیں جائیں گے؟'' اس نے زیر لب کہا مگر وہ اَن سنی کر کے آگے بڑھ گئی۔ وہ بالکل گم صم سا ہوگیا۔

ملکہ یان سوفو سبزہ زار پہ بنی اس اونچی بارہ دری میں بیٹھی تھی۔ اس کے اوپر چھتری نما کینوپی بنی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' وہ گال تلے انگلی رکھے بیٹھی' گردن موڑ کے سبزے کو دیکھ رہی تھی۔ نیچے سبز ٹیلوں پہ گھاس اور پھول اگے دکھائی دے رہے تھے۔ درمیان میں ایک مصنوعی صاف پانی کا نالہ بھی بہہ رہا تھا۔

دفعتاً اس نالے کے ساتھ گھاس پہ شہزادی تاشہ چلتی دکھائی دی۔ اس کی رنگت قدرے بجھی بجھی سی لگتی تھی۔ کنیزوں کو اس نے وہیں چھوڑ دیا اور خود کینوپی کی طرف آئی۔ لکڑی کے زینے چڑھے اور اوپر ملکہ کے سامنے آ کے سر جھکایا۔

''ملکہ عالیہ! آپ نے یاد فرمایا تھا۔'' پھر سیدھی ہوئی۔

''شہزادی تاشہ!'' یان سوفو نے سر کو خم دیا اور مسکرا کے ابرو سے سامنے اشارہ کیا۔ ''بیٹھیے۔''

تالیہ سامنے لکڑی کے بینچ پہ بیٹھ گئی۔ زمردی لباس اردگرد پھول کی طرح پھیلتا گیا۔ گود میں رکھی انگلیاں باہم پھنسا رکھی تھیں۔

''تجویز کیسی لگی؟''

''کون سی تجویز؟'' وہ چونکی۔

''قرضے کی۔ اتنی جلدی بھول گئیں آپ؟''

ملکہ نے مسکرا کے غور سے اسے دیکھا تو اس کے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''سچ کہوں تو پریشان ہوں کہ ملاکہ یہ قرضہ کیسے اتار پائے گا۔'' وہ فکرمندی سے کہنے لگی۔ ''قرضہ ہر سال بڑھتا جائے گا۔ جب تک امیر لوگ خراج اور محصول نہیں ادا کریں گے' ہم اس قرض کو اتار نہیں سکیں گے اور....''

''سلطان کی بیوی بننے کے بارے میں آپ نے مجھے کب بتانا تھا' شہزادی صاحبہ؟'' وہ مسکراتے ہوئے ایک دم سے بولی تو تالیہ کے الفاظ ٹوٹ گئے۔

لمحے بھر کو وہ چپ ہوئی۔

''مجھے خود مراد راجہ نے ابھی یہاں آتے وقت اطلاع دی ہے' ملکہ۔ میں بھی اتنی ہی پریشان ہوں جتنی کہ آپ۔''

''کس نے کہا کہ میں پریشان ہوں۔'' مسکراتے ہوئے یان سوفو نے سر جھٹکا۔ ''آقا نے جلد یا بدیر کسی خاتون کو اپنے نکاح میں لینا ہی تھا۔ یہ تو ازل سے طے تھا۔''

تالیہ نے سر جھکا لیا اور گھونگھریالی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔ ''میں جلد از جلد یہاں سے جانے کی کوشش کرتی ہوں' تاکہ.....''

''اور اگر نہ جا سکیں' تو؟ سلطان کو کیسے روک پاؤ گی؟'' ملکہ کہنی کرسی کے ہتھے پہ جمائے' انگلی گال تلے رکھے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ تالیہ نے شکوہ کناں نظر اٹھائی۔

''کوئی حل نکال ہی لوں گی۔ تال (رک کے تصحیح کی) تاشہ کے پاس ہمیشہ منصوبہ ہوتا ہے۔''

''وہ آدمی کہاں ہے؟ وہ جو اپنے شہر میں تمہارا محبوب تھا؟''

جھرنے کے اندر جیسے کسی نے زور سے پتھر پھینکا تھا۔ سوال بے حد غیر متوقع تھا۔ اس کی دھڑکن بے ترتیب سی ہوئی۔ ''وہ.....!''

''اسی شہر میں ہے کیا؟ اکٹھے آئے تھے تم دونوں یا تمہارے پیچھے آیا ہے؟ وانگ لی کا کہنا ہے کہ اس کے ایک غلام سے ملنے تم اور تمہارا مؤرخ اس کے قہوہ خانے میں گئے تھے۔ ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔ کیا وہی ہے وہ شخص؟''

''آپ تو بہت کچھ جانتی ہیں' ملکہ۔'' آواز دھیمی رکھی۔

''بہت خوب۔'' ملکہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور باوقار انداز میں اپنی قبا کو جھٹکا۔ ''مجھے ملوا سکتی ہو اس سے آج ہی؟''

تالیہ مراد کے لب بے یقینی سے کھل گئے۔

''جی؟'' وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

☆☆☆

سن باؤ تائی ژان کی سرخ حویلی پہ اندھیرا چھا رہا تھا۔ مغرب ڈھل چکی تھی اور کھلے صحن سے آسمان پہ دمکتے تارے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ برآمدے میں قندیلیں جلی تھیں اور آرام کرسی پہ بیٹھا فربہ سا وانگ لی' ٹانگوں پہ کمبل ڈالے کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔

سامنے صحن چاندنی کی روشنی میں نہایا ہوا تھا اور کنویں پہ جھکا فاتح دکھائی دے رہا تھا۔ کرتے پاجامے میں ملبوس' ماتھے پہ سبز پٹی باندھے' وہ جھک کے ڈول اوپر کھینچ رہا تھا جب دروازہ بجا۔

وانگ لی نے کتاب بند کر کے اچنبھے سے دروازے کو دیکھا۔ "اس وقت کون آ گیا؟"

"میں دیکھتا ہوں' مالک۔" فاتح نے ڈول اوپر نکالا اور زمین پہ رکھا تو پانی چھلک کے اس کے پیروں پہ گرا۔ ہاتھ بھی گیلے ہو گئے۔ وہ کرتے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے برآمدے میں آیا اور راہداری میں چلتا گیا۔ سن باؤ کی حویلی کا دروازہ کمروں کے اس طرف سے کھلتا تھا' نہ کہ صحن سے۔

فاتح نے سرخ لکڑی کا دروازہ کھولا تو دیکھا۔ سامنے کچی زمین پہ ایک بگھی کھڑی تھی جس کے ساتھ صرف تین سپاہی تھے مگر وہ شاہی سپاہی تھے۔ وہ چونکا۔

دفعتاً بگھی کا دروازہ کھلا اور نسوانی پیر نیچے زمین پہ اترا۔ پھر وہ پوری باہر نکلی۔ بھورے چغے میں ملبوس' زیور اور سنگھار سے پاک چہرہ لیے وہ سیدھی سامنے کھڑی ہوئی تو فاتح کا سر ذرا جھک گیا۔

"ملکہ عالیہ!"

مگر ملکہ اکیلی نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد سن باؤ کے برآمدے میں جلتی قندیلوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ دیوار کے ساتھ جہاں قالین بچھا تھا اور تکیے لگے تھے' وہاں فرشی میز کے گرد ایک طرف یان سوفو اور تالیہ بیٹھی تھی' دوسری طرف وانگ لی مؤدب سا بیٹھا تھا۔ کونے میں کھڑا فاتح دیوار پہ لگی مشعل جلا رہا تھا۔

"میرے غریب خانے کو آپ نے رونق بخشی' ملکہ۔"

"سنا ہے اپنے قہوہ خانے میں ملاکہ کے رؤسا سے بڑی جرأت مندانہ باتیں کہنے لگ گئے ہو' وانگ لی!" چغے کی ٹوپی کے ہالے میں ملکہ کا چہرہ دمک رہا تھا۔ تالیہ جو کن انکھیوں سے مشعل جلاتے غلام کو دیکھ رہی تھی' فوراً چونکی۔

"وہ وانگ لی کے الفاظ نہیں تھے۔ وہ ان کے غلام کے الفاظ تھے۔ غلام کو مرادراجہ کے عتاب سے بچانے کے لیے میں نے کتاب میں تبدیلی کروائی تھی۔"

وانگ لی جو شکریہ کہنے ہی والا تھا' قدرے کھسیانا ہو گیا۔

ملکہ نے نظروں کا رخ موڑا۔ وہ مشعل جلا کے اب سنجیدگی سے رسوئی کی طرف جا رہا تھا۔

"میں تمہارے اس غلام سے ملنے آئی ہوں' وانگ لی۔"

وان فاتح کے قدم زنجیر ہوئے۔ چونک کے مڑا۔

"تم میرے سامنے بیٹھو اور وانگ لی... تم میرے لیے چینی قہوہ تیار کرو گے۔ ملاکہ کے کڑوے قہوے پی پی کے اللہ کی قسم میرا گلا اندر تک چھل گیا ہے۔" نخوت سے بولی تو وانگ لی نے جھٹ سر جھکایا۔

"جو حکم' ملکہ!"

وہ شاہ چلین کا وفادار غلام تھا۔ فوراً اٹھ گیا۔

فاتح سامنے آ کے خاموشی سے بیٹھا تو ملکہ یان سوفو ذرا سا مسکرائی۔ (تالیہ مضطرب سی باری باری دونوں کو دیکھتی تھی۔)

"مجھے یہاں دیکھ کے حیران ہو رہے ہو' وانگ لی کے غلام!"

میز کے دوسری طرف زمین پہ وہ دو زانو بیٹھا تھا۔ ہاتھ گود میں اور چہرہ سپاٹ تھا۔ نگاہ نہیں جھکائی۔ ملکہ کو دیکھتے ہوئے سادگی سے بولا۔ "میرا نام' وانگ

www.urdusoftbooks.com

لی کا غلام' نہیں ہے۔ وہ میرا مقام ہے۔ نام 'فاتح بن رامزل' ہے۔ ہر انسان کا حق ہوتا ہے کہ اسے اس کے نام سے پکارا جائے۔"

"مگر میری نظر میں تو تم صرف ایک غلام ہو!"

"پھر آپ کو اپنی نظر پہ نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے ملکہ! کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو عزت بخشی ہے۔ ہر انسان مکرم ہوتا ہے اور اس کی عزت کرنے کے لیے یہی وجہ کافی ہے کہ وہ آدم کی اولاد ہے۔"

"تو اے غلام فاتح بن رامزل...." وہ کہنیاں چھوٹی میز پہ رکھے آگے ہوئی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اس بات سے واقف تو ہو گے کہ "تمہاری" شہزادی تاشہ کی شادی سلطان مرسل سے کی جا رہی ہے۔"

تالیہ نے نظریں جھکا لیں۔ صورتِ حال عجیب سی ہو گئی تھی۔

"جی ملکہ! واقف ہوں۔" اس نے تالیہ کو دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تو تاشہ کو اس مصیبت سے نکالنے کے لیے کیا کیا ہے تم نے؟ میری اطلاع کے مطابق تم تاشہ کے گاؤں سے ہو اور اس کے ساتھ آئے ہو۔"

فاتح نے اب کے تالیہ کو دیکھا۔ اس نے بھی نظریں اٹھائیں۔ وہ جیسے سمجھنا چاہ رہا تھا کہ ملکہ کیا جانتی ہے اور کیا نہیں۔

"میں اس بات کی نوبت ہی نہیں آنے دوں گا۔ میں شہزادی کو جلد واپس لے جاؤں گا۔ واپس لے جانے کا وعدہ میں نے عرصے سے ان سے لے رکھا ہے۔"

"اور اگر...." ملکہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آگے کو جھکی۔ "اگر تم کبھی واپس نہ جا سکے تو' اس شادی کو کیسے روکو گے۔"

"ہم واپس جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔"

"اور اگر نہ جا سکو' غلام فاتح؟ بولو۔ جواب دو۔" وہ ایک دم پھنکاری۔ وہ خاموش ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑ کے نظریں ملکہ پہ جمائے رکھیں۔

"شہزادی تاشہ اپنے بابا کو انکار کر دیں گی اور اس کام کی نوبت نہیں آئے گی۔"

"شہزادیوں کا انکار کوئی نہیں سنتا' غلام فاتح۔" وہ تلخی سے بولی۔ نظریں فاتح پہ جمی تھیں۔ "بنداہارا اس رشتے سے خوش ہے۔ وہ جبراً یہ شادی کروا دے گا اور سلطان مرسل.... وہ انکار کی صورت میں بنداہارا کے محل پہ چڑھائی کرا دے گا۔ عورت کے نام پہ پہلے بھی بہت سی جنگیں ہو چکی ہیں۔ ایک اور سہی۔"

"ملکہ... اگر آپ خود یہاں آئی ہیں تو یقیناً اس مسئلے کا کوئی حل بھی سوچ کے آئی ہوں گی۔"

ملکہ نے گہری سانس لی اور پیچھے کو ہو کے مسکرائی۔ "جانتے ہو ملاکہ کے سلطان سے شادی کرنے والی عورتوں میں کون سی قدر مشترک ہونی چاہیے؟ چاہے وہ امیر ہوں یا غریب' بدصورت ہوں یا حسین' شاہ چین کی بیٹی ہو یا ایک جنگی قیدی کنیز۔ ان سب کا ایک شرط پہ اترنا لازم ہے!"

تالیہ گم صم سی اسے دیکھے گئی۔

"اور وہ کیا ہے' ملکہ؟" وہ سمجھ رہا تھا۔

"سلطان کی دلہن غیر شادی شدہ ہونی چاہیے۔ نہ وہ پہلے کسی کی کنیز رہی ہو نہ بیوی۔"

لمحے بھر کو سرخ حویلی میں سناٹا چھا گیا پھر صحن میں اُگے بوڑھے درخت کے پتے ہوا سے جھنجھنائے اور قندیلوں کے شعلے پھڑ پھڑائے۔ عجیب پر اسرار سا ماحول بن گیا تھا۔

فاتح ملکہ کی آنکھوں میں دیکھتا آگے کو جھکا اور ہاتھ باہم پھنسا کے میز پہ رکھے۔

"تو آپ چاہتی ہیں کہ میں شہزادی تاشہ سے شادی کر لوں؟"

الفاظ تھے یا کیا.... تالیہ کا سانس تھم گیا۔ ناخن ہتھیلی میں پیوست کر لیے۔

ملکہ بھی اسی کے انداز میں آگے کو جھکی۔ وہ دونوں بس ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"کیا سلطان مرسل سے تاشہ کو بچانے کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

لیے تم اس سے شادی کرو گے؟"

"ملکہ عالیہ!" وہ ذرا سا مسکرایا۔ "میں اس شہر میں ایک غلام ہوں' جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں۔ مگر اپنے شہر میں ..... میں حاکموں میں سے ایک تھا۔ اور میرے جیسے لوگ بدلے میں کچھ مانگے بغیر فیصلے نہیں کیا کرتے۔"

تالیہ کی ہتھیلی ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بس ساکت سی اسے دیکھے گئی۔ نہ وہ حیران ہوا تھا' نہ چونکا تھا۔ وہ شاید تیار تھا۔ کیا اس کو معلوم تھا کہ آگے کیا ہونے جا رہا ہے؟

ملکہ کو البتہ اچنبھا سا ہوا۔ اسے اس ردعمل کی توقع نہ تھی۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں' تم تاشہ بنتِ مراد سے شادی کرو گے؟"

"اور میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے بدلے میں کیا ملے گا؟"

"میرے سوال کا جواب دو غلام۔ تم تاشہ سے نکاح کر کے قاضیٔ وقت کو گواہ بنا کر مراد اور سلطان کے سامنے جا کے یہ کہہ سکو گے کہ تم تاشہ کے شوہر ہو؟"

"ایک بحری جہاز' چند سپاہی اور وانگ لی کی غلامی سے آزادی۔ کیا یہ دیں گی آپ مجھے؟" وہ ابھی تک سرد سا مسکرا رہا تھا۔ ملکہ کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔

"میں غلاموں سے بھاؤ تاؤ نہیں کرتی!"

"بہت سی چیزیں پہلی دفعہ کرنی پڑتی ہیں ملکہ عالیہ! آپ کے اوپر سلطان صرف ایک سوکن نہیں لا رہا۔ وہ ملاکہ کی نئی ملکہ لا رہا ہے۔ ایک بحری جہاز' چند سپاہی اور وانگ لی کی غلامی سے آزادی دلوا دیں مجھے۔ میں تاشہ سے شادی کر کے آپ کے تخت و تاج کو بٹوارے سے بچا لوں گا۔ میرے علاوہ آپ کو ملاکہ میں کوئی مرد ایسا نہیں ملے گا جو سلطان سے منسوب لڑکی سے شادی کرنے کی جرأت کر سکے۔"

ملکہ لب بھینچے اسے دیکھے گئی۔ "کیا راجہ مراد کے سامنے اس کی بیٹی کو بیوی کہنے کی ہمت رکھتے ہو؟ کیا سلطان کو یہ بتا سکتے ہو کہ اس سے منسوب شہزادی شادی شدہ ہے؟"

وہ جواباً مزید آگے جھکا۔

"فاتح بن رامزل ....ایک آزاد انسان ہے.... اور وہ.... کسی سے .....نہیں ڈرتا!" چبا چبا کے بولا۔

وہ سب کچھ خاموشی سے سنے جا رہی تھی۔ صحن میں اُگے درخت کی ہلتی شاخیں اور برآمدے کی قندیلوں کے پھڑ پھڑاتے شعلے...اور وہ باتیں...اسے ہر چیز وحشت میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ اس سے زیادہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

"ملکہ!" وہ بولنے لگی...مگر ملکہ نے ہاتھ اٹھا کے اسے خاموش کروا دیا۔

"تم نے مجھ سے وفاداری کی قسم کھائی تھی' تاشہ! اس لیے خاموش رہو۔ ویسے بھی تمہیں اس آدمی سے شادی کرنی تھی نا' تم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو۔ تو وہ شادی میں کروائے دیتی ہوں۔ میں صبح اعلا عدالت کے ایک چینی قاضی کو بلوائی ہوں۔ ان کے سامنے تم اس غلام سے شادی کرو گی اور پھر یہ آزاد انسان بن جائے گا۔ اگر تم مجھ سے وفادار ہو اور واقعی ملکہ نہیں بننا چاہتیں تو تمہارے پاس دوسرا راستہ نہیں ہے۔" ملکہ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ وہ اس وقت متضاد کیفیات کے زیر اثر تھی۔

تالیہ کا حلق خشک ہو گیا۔ صحن کی تاریکی اور اوپر چمکتے تارے...ان سب کا سناٹا اس کے اندر اترنے لگا۔ وہ بار بار لب کھولتی مگر الفاظ جیسے ختم ہو گئے تھے۔ پھر اس نے سر جھکا دیا۔

"مجھے وعدے نبھانے آتے ہیں ملکہ! آپ ہماری واپس جانے میں مدد کریں گی۔ جواب میں' میں اور فاتح (اس کی طرف دیکھا بھی نہیں) وہی کریں گے جو آپ کہیں گی۔"

یان سو فو کا چہرہ ایک دم شانت ہو گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''وانگ لی صبح قاضی کو لے آئے گا' اور اس کے سامنے یہ نکاح ہو گا۔''

''صبح!'' فاتح نے اچنبھے سے ابرو اٹھائے۔ ''اتنی جلدی کیا ہے' ملکہ؟ ابھی تو شادی میں کئی دن پڑے ہیں۔''

''سنو فاتح بن رامزل!'' وہ تیز لہجے میں پھنکاری۔ ''میں شاہ چین کی بیٹی ہوں۔ قیافہ شناسی کے علوم سے آراستہ کر کے بھیجا تھا مجھے میرے بابا نے۔ چہرہ دیکھ کے سارا ماضی پڑھ لیتی ہوں اور بعض دفعہ مستقبل بھی۔''

''میرے چہرے پہ کیا نظر آتا ہے آپ کو' ملکہ؟''

یان سوفو استہزائیہ سا مسکرائی اور آگے کو جھکی۔

''سچے ہو اور ایماندار بھی۔ نڈر ہو اور بہادر بھی۔ مگر....'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ چبا چبا کے بولی۔ ''خود غرض ہو.... مفاد پرست اور سب سے بڑھ کے.... بے وفا مرد ہو تم۔ صرف خود سے محبت کرتے ہو اور طاقت کی خواہش رکھتے ہو۔ شہزادی کو تم سے سچی محبت ہے (تالیہ کی نظریں فوراً جھکیں) مگر تمہیں اس سے محبت نہیں ہے۔ اس لیے تمہارا اعتبار نہیں ہے مجھے۔ صبح سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتی میں۔''

وہ چغہ سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ دونوں بھی ساتھ ہی اٹھے۔ وہ اس کے الفاظ پہ ہلکا سا ہنس دیا۔

''آپ مجھے نہیں جانتیں' ملکہ۔ آپ نے میری زندگی نہیں گزاری۔''

ملکہ اس کو نظر انداز کیے تالیہ کی طرف گھومی جو بددل سی نظر آ رہی تھی۔

''تمہارا انتخاب اتنا متاثر کن نہیں ہے' تاشہ۔ عام حالات میں' میں تمہیں کبھی ایسے آدمی سے شادی کا مشورہ نہ دیتی جو صرف خود سے محبت کرتا ہو اور جسے وعدے نبھانے نہ آتے ہوں۔ یاد رکھنا' یہ آدمی کبھی وعدے پورے نہیں کر سکتا۔ مگر خیر....'' اس نے شانے جھٹکے۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شہزادیوں کی شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں۔''

وہ کہہ کے آگے بڑھی تو تالیہ تڑپ کے اس کی طرف گھومی۔ ''کیا آقا کو پسند آ جانے والی ہر لڑکی کی شادی کروا دیں گی آپ؟ کس کس کو آقا کے نکاح میں آنے سے روک پائیں گی آپ۔''

یان سوفو سکون سے اس کی طرف پلٹی اور گہری سانس لی۔ ''کیا تم بھول گئی ہو کہ میں وہ ملکہ ہوں جس نے تمہارا گاؤں الور سونگائی جلا کے راکھ کر دیا تھا۔ سارے شکار بازوں کو قید کروا لیا تھا۔ تمہیں اپنا وفادار سمجھتی ہوں اس لیے تمہارا نکاح کروا رہی ہوں۔ دوسری کوئی ہوتی تو اس کی گردن اتروا کے چوک میں لٹکا دیتی۔''

اور ایک نگاہ غلط ان دونوں پہ ڈال کے آگے بڑھ گئی۔

''قہوہ کل پیوں گی میں وانگ لی' ابھی میرے ساتھ باہر آؤ۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔'' بلند آواز سے رسوئی میں موجود وانگ لی کو کہا اور باہر نکل گئی۔ وہ بھی سب کام چھوڑ کے اس کے پیچھے لپکا۔

وہ دونوں چلے گئے تو سرخ حویلی کے سناٹے بڑھ گئے۔ وہ شکوہ کناں سی اس کی طرف گھومی۔

''اچھا بھاؤ تاؤ کر لیتے ہیں آپ۔'' اس کے کان سرخ دہک رہے تھے اور گلا رندھنے لگا تھا۔

''یہ تمہیں ملکہ کے سامنے اپنے اور میرے بارے میں کہانیاں گھڑنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' وہ تیزی سے بولا' پھر گہری سانس لی۔ ''مگر خیر.... یہ کہانی سچ بتانے سے بہتر تھی۔ سچ پہ وہ یقین نہ کرتی۔ شہزادی کے لیے بننے والے غلام پہ کر لیتی۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

تالیہ کے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بدقت اس نے حواس پہ قابو پایا۔ ''ظاہر ہے.... میں کہانیاں گھڑنے میں ہی تو اچھی ہوں۔ یہ تو نہیں بتا سکتی تھی کہ خزانے کی تلاش میں ہم چھ سو سال پیچھے آئے ہیں۔ اس لیے یہی کہہ دیا کہ آپ اور میں....'' سر جھکا۔ ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''تم نے ٹھیک کیا۔ تم یہی کرسکتی تھیں۔''

''ملکہ کے سامنے راضی ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ایسا چاہتی ہوں۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''ہم صبح ہونے سے پہلے یہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ الور سونگائی چلے جائیں گے یا کہیں اور لیکن...''

''تالیہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہمیں مراد راجہ سے وہ چابی حاصل کرنی ہے اور اس کے لیے ہمیں مراد کو اپنی بات ماننے پہ مجبور کرنا ہے۔ ہمیں وہی کرنا ہوگا جو ملکہ کہہ رہی ہے۔ اور سنو.... مجھ پہ بھروسہ کرو۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تم دونوں کو نکال کے لے جاؤں گا یہاں سے' تو مجھے اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے جو بھی کرنا پڑے گا' میں کروں گا۔ ملکہ میرے وعدوں سے واقف نہیں ہے۔''

''آپ شادی شدہ ہیں' تو انکو۔ آپ کے دو بچے ہیں۔ بیوی ہے۔ آپ اس دنیا میں غلام نہیں ہیں۔ آپ ملک کے اگلے وزیر اعظم ہیں۔ میں آپ سے کیسے شادی کرسکتی ہوں؟''

''شادی نہیں کرنی' لڑکی۔ صرف ایک کاغذ پہ دستخط کرنے ہیں جو ہمیں آزادی دلوا سکتا ہے۔ کس طرح۔ یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ابھی تم ملکہ کی بات مان لو تو میں واپس جاتے ہی تمہیں آزاد کردوں گا۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوگا۔''

تالیہ کا دل ایک دم خالی ہو گیا۔ سارے خدشات' واہمے' خوف سب دم توڑ گئے۔ وہ بس اس کو تعجب اور ملال سے دیکھے گئی۔

''تو یہ کوئی اصلی شادی نہیں ہوگی۔ صرف.... صرف ایک پیپر میرج ہوگی۔ جو واپس جاتے ہی ختم ہو جائے گی۔''

''بالکل۔ کیونکہ یہ اسی طرح ہونا ہے۔'' وہ اب دھیمے لہجے میں اس کو سمجھا رہا تھا۔ ''ہمیں ملکہ یا سلطان کا نہیں سوچنا۔ ہمیں صرف اپنا سوچنا ہے۔ ہمیں وہ کرنا ہے جو اس....اس وقت کی قید سے نکلنے میں ہماری مدد کرے۔''

''اور اس شادی سے ملکہ کے راستے سے میں ہٹ جاؤں گی لیکن ''ہمیں'' کون سا فائدہ ہوگا؟ مراد راجہ آپ کی جان لے لے گا' تو انکو۔''

''میں نے کہا نا' میرے پاس پلان ہے۔ بھروسہ رکھو۔ یہ اسی طرح ہونا تھا۔''

''تو آپ نے تاریخ کی کتابوں میں یہ پڑھ رکھا تھا۔'' اس کی سمجھ میں اب آیا تھا۔ ''اور پڑھا تو میں نے بھی تھا۔ شہزادی تاشہ کی شادی ایک غلام سے ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کیوں' مگر آپ جانتے ہیں۔ آپ صرف مجھے ایک سیاسی چال کے طور پہ استعمال کررہے ہیں۔ ہے نا؟''

اس کے اعصاب دھیرے دھیرے ڈھیلے پڑنے لگے۔ قسمت کے آگے بے بس....ان الفاظ کا مطلب آج سمجھ میں آیا تھا۔

''مجھے یہی کرنا آتا ہے تالیہ' اور جو ہمیں آتا ہے' وہ ہی ہماری جان بچائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ملکہ کی بات مان لیتی ہوں۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے مگر...'' وہ ایک دم سپاٹ سی ہو چلی۔ ''ایک لمحے کے لیے بھی یہ مت سوچیے گا کہ ملکہ کو بتائی گئی اس کہانی میں کوئی صداقت تھی۔ (تھوک نگلا)۔ میں چاہوں گی کہ جیسے ہی یہ مسئلہ ختم ہو' آپ مجھے فوراً آزاد کردیں اور عصرہ اور آپ کے بچوں کو کبھی علم نہ ہو کہ ایسا کچھ ہوا تھا۔''

''میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور....''

''مجھے آپ سے کیا' کسی سے شادی کرنے میں دلچسپی نہیں ہے۔ ایک تجربہ بہت تھا۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جن کو اپنی تکمیل کے لیے کسی مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے زندگی گزارنے کے لیے کسی جنگجو کا ساتھ نہیں چاہیے۔ میرے لیے میری اپنی تلوار ہی کافی ہے۔'' آخر میں اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ خود بخود ختم ہو گئی۔ عجیب غصہ سا آنے لگا تھا۔

وان فاتح نے کندھے اچکا دیے۔ ''ظاہر ہے۔

میں یہ سب سمجھتا ہوں۔"

"بہت بہتر!" وہ آگے بڑھی' پھر رکی۔ گردن موڑ کے چاندنی میں نہائے صحن کو دیکھا۔ نگاہ ٹھہری تو ٹھہری ہی گئی۔

وہی صحن۔ وہی کنواں۔ اور دوسرے کونے میں خالی جگہ۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ صحن میں قدم رکھا۔ ہوا سے چغے کی ٹوپی پیچھے گر گئی اور سنہری بال نظر آنے لگے۔

وانگ لی واپس آیا تو کھنکھار کے اسے مخاطب کیا۔

"ملکہ رخصت ہو گئیں۔ آپ کے لیے دوسری بگھی روک رکھی ہے۔ کیا آپ قہوہ لیں گی؟"

"نہیں شکریہ۔" اس کی بے خود نگاہیں اس صحن پہ جمی تھیں۔ عجیب سی پراسراریت تھی اس میں۔ جیسے سرخ اینٹوں تلے صدیوں پرانی داستانیں دفن ہوں۔

"سن باؤ۔" وہ اسی کیفیت میں بولی۔ "یہ کونا خالی کیوں ہے۔ آپ نے یہاں کچھ نہیں بنوایا۔"

"میں نے اس کو مجسمہ سازی کے لیے چھوڑ رکھا تھا' شہزادی۔" وہ ہاتھ باندھے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"مجسمہ کے لیے؟" وہ چونک کے اس کی طرف مڑی۔ "آپ اپنا مجسمہ بنوانا چاہتے ہیں۔"

"ایک زمانے میں بڑی خواہش تھی میری شہزادی۔ مگر پھر وقت نہیں مل سکا۔ کیا آپ کو بھی مجسمہ سازی سے شغف ہے۔"

"جی.... میں.... تصاویر اور مجسمے بنا لیتی ہوں۔ تھوڑا بہت یہ کام آتا ہے مجھے۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"کیا آپ...." وہ جوش سے کہنے لگا تو وہ فوراً بولی۔

"نہیں' سن باؤ۔ میں مجسمہ بنا سکتی ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کا مجسمہ بنانا چاہتی ہوں۔ میں تو یوں ہی ایک سوال پوچھ رہی تھی۔"

پھر فاتح کو دیکھا جو اس کے صاف انکار پہ ابرو اٹھا کے زیر لب بولا تھا۔ (سیر یسلی؟)

"اتنے حیران مت ہو' غلام فاتح!" وہ چبا چبا کے بولی۔ "مجھے وانگ لی کا مجسمہ تراشنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شاید تمہیں لگا ہو کہ شہزادی تاشہ وانگ لی کا مجسمہ بنائے گی۔ یقین کرو' تمہیں غلط لگا ہے۔ کیونکہ میں.... کوئی مجسمہ بنانے.... یہاں نہیں آنا چاہتی۔" پھر وانگ کو دیکھا اور مسکرائی۔ "شب بخیر' سن باؤ۔ صبح ملاقات ہو گی۔"

اور سپاٹ چہرے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

ایڈم بن محمد جس وقت شہزادی تاشہ کے کمرے سے ملحق بیٹھک میں داخل ہوا' وہ سن باؤ کے گھر سے رخصت ہونے والی پرسکون اور سپاٹ تالیہ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اڑی رنگت اور پریشان چہرے والی لڑکی لگ رہی تھی جو ادھر ادھر چکر کاٹ رہی تھی۔

"ایڈم!" اسے دیکھتے ہی تیزی سے اس کی طرف لپکی۔ ایڈم نے لاشعوری طور پہ اپنا' دایاں ہاتھ' پیچھے کر لیا۔

"دیکھیں شہزادی' آپ کے جو بھی ارادے ہیں' میں بتائے دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کو اس کے ہاتھ سے محروم کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور...."

"ملکہ چاہتی ہیں میں وان فاتح سے شادی کر لوں۔"

محل کے باہر ایک دم تیز ہوا چلی۔ کھڑکی میں رکھے چراغ کا شعلہ پھڑپھڑایا۔

ایڈم بالکل ساکت رہ گیا۔ ہاتھ ڈھیلا سا ہو کے پہلو میں آن گرا۔

"کیا مطلب؟" الفاظ حلق میں پھنس گئے۔

"مطلب میں ہی تو الجھی ہوں۔ اگر وان فاتح سے شادی نہ کی تو سلطان مرسل سے کرنی پڑے گی۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ اس سے پہلے مراد راجہ ہمیں چابی دے دے۔ اس لیے ملکہ نے...." وہ پھر سے دائیں بائیں ٹہلنے لگی اور سارا قصہ سنا ڈالا۔ آخر تک ایڈم سنبھل چکا تھا اور چہرے کے زاویے بگڑ چکے تھے۔

"بہت خوب۔ اور آپ کے خیال میں جب سلطان کو یہ معلوم ہو گا کہ آپ شادی شدہ ہیں تو وہ

مسکرا کے کہیں گے.... بہت معذرت' محترمہ' میں نے ایسے ہی آپ کو زحمت دی۔ آپ پیادیس سدھاریے' میں اپنے گھر کا راستہ ناپتا ہوں۔ جی نہیں چے تالیہ۔"
وہ غصے سے بولا تھا۔ پتا نہیں اسے غصہ کس بات پہ زیادہ آرہا تھا۔ "اس شادی پہ ایسی قیامت کھڑی ہوگی کہ الامان۔ راجہ مراد آپ کی اور فاتح صاحب دونوں کی جان لے لے گا۔"
"فاتح کا کہنا ہے کہ ان کے پاس پلان ہے۔ وہ راجہ کو قابو کر سکتے ہیں۔"
ایڈم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ پھر مٹھیاں بھینچ لیں۔ "ان کے وعدے سیاسی وعدے نکلے تو؟"
"وہ چاہتے ہیں میں ان پہ بھروسا کروں۔"
"اور آپ خود کیا چاہتی ہیں؟"
"میں....." وہ چونکی' پھر سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا اور مسہری پہ بیٹھ گئی۔ "میں رضامندی دے چکی ہوں' اب میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"
"فرق پڑتا ہے' چے تالیہ۔" وہ تیزی سے اس کے سامنے آ کے بیٹھا اور امید سے بولا۔ "اگر آپ ایسا نہیں چاہتیں تو مجھے بتائیں۔ ہم کوئی اور حل نکال لیں گے۔ یہ ملکہ تو بالکل اولڈ فیشن ہے۔ اس کے زمانے میں سوائے ممکنہ سوکن کو زہر دینے' الٹا ٹانگنے یا اس کو کسی اور کے ساتھ بھگا دینے کے کوئی حل نہیں ہوتا تھا۔ مگر ہم اسمارٹ زمانے کے اسمارٹ لوگ ہیں۔ بھلے آپ نے ملکہ کو جو بھی کہانی گھڑ کے سنائی ہو' اگر آپ....."
"وہ کہانی نہیں تھی' ایڈم!" اس نے تڑپ کے سر اٹھایا تو بکھرے بکھرے سنہرے بالوں کے ہالے میں زرد پڑتا چہرہ بے بس سا نظر آتا تھا۔ شاہی مورخ کے سارے الفاظ دم گھٹ کے مر گئے۔
وہ وقت کی طرح تھم گیا۔
"تو وہ سچ تھا؟" اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ "آپ ان کی محبت میں گرفتار ہیں؟ یہ فین گرل ہونے سے زیادہ شدید ہے۔ اوہ چے تالیہ!" اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔
تخت و تاج کے لیے جنگیں لڑنے والے....
محلوں میں رہنے والے... آخر میں کس مقام پہ آ کے روتے تھے؟ ایک دل تھا جو امیر غریب سب کا ایک ہی طرح سے دھڑکتا تھا۔ اوہ چے تالیہ!
تالیہ کی سیاہ آنکھوں کے کٹورے بھیگتے گئے۔
"یہ صرف ایک خواہش تھی جو میں کبھی پوری نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ شادی شدہ ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔"
وہ کافی دیر کچھ بول نہ سکا۔
"مگر وہ کہتے ہیں کہ ان کی بیوی کو علم بھی نہیں ہوگا اور وہ آپ کو فوراً چھوڑ دیں گے!" اب کے وہ بولا تو سنجیدہ اور سپاٹ سا تھا۔ بیٹھک میں مدھم بتیاں جل رہی تھیں اور ان کی زرد روشنی میں سامنے بیٹھی شہزادی ایک بے بس' اور مجبور لڑکی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آ رہی تھی۔
"اور یہی تو وہ نہیں جانتے کہ ایسا ادھورا ساتھ میرے لیے کتنا تکلیف دہ ہوگا۔ اگر کسی سے صرف پیپر میرج کرنی ہوتی اور بعد میں چھوڑ دینا ہوتا تو مجھے فرق بھی نہ پڑتا۔ ایک طلاق ہو چکی ہے میری۔ اور جو لڑکی طلاق کو سروائیو کر لیتی ہے وہ ہر چیز سروائیو کر سکتی ہے۔ مگر ایڈم.... اس کاغذی کھیل کو میں کیسے سروائیو کروں گی۔"
"چے تالیہ!" وہ ملال سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا آپ کے پاس سلطان مرسل سے نجات کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔"
"میرے پاس شاید بہت سے راستے نکل آتے مگر وان فاتح کو لگتا ہے کہ ان کے منصوبے کے لیے یہ حل بہترین ہے۔ تاریخ میں ایسا ہی لکھا ہے۔ تاشہ کی شہزادی ایک غلام سے ہی ہوتی ہے۔"
"اور آپ؟ آپ کو کیا لگتا ہے کہ وان فاتح پہ بھروسا کر کے آپ کوئی غلطی کریں گی یا عقل مندی؟"
"میں نفع نقصان دیکھے بغیر ان پہ بھروسہ کرنا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

چاہتی ہوں۔"

ایڈم نے گہری سانس لی اور آنکھیں مسلیں۔ پھر کچھ دیر سوچتا رہا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ یہ شادی کرلیں۔ ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور واپس جا کے وہ آپ کو آزاد کردیں گے یوں ان کا اپنا گھر بھی محفوظ رہے گا۔ کوئی ہرٹ نہیں ہوگا' کسی کا گھر نہیں ٹوٹے گا۔ آپ تو ان کے ساتھ رہنے کی خواہش کو کبھی بھی پورا نہیں کرنا چاہتی تھیں نا' تو پھر کیا ہوا جو وہ آپ کو چھوڑ دیں گے۔ جذباتیت کے بغیر اس کو ایک منصوبے کی طرح لیں۔ جیسے زندگی میں بہت سے کردار کیے ہیں آپ نے' ایسے ہی اس کردار میں بھی ڈھل جائیں۔ چند دن کا ایک اسکام جو ایک دن بلبلے کی طرح پھٹ جائے گا۔" وہ دھیمے لہجے میں سمجھا رہا تھا۔ تالیہ نے ملال بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"یعنی تالیہ کی شادی ہمیشہ ایک اسکام ہی ہو گی؟ اسکام کی طرح شروع.... اسکام کی طرح ختم۔ کیا ساری عمر جھوٹ بولنے کی یہی سزا ہوتی ہے؟ کہ جب زندگی کا سب سے بڑا سچ بولنا چاہو تو کوئی یقین ہی نہ کرے۔"

ایڈم نے نظریں جھکا لیں۔ لمحے شرمندہ شرمندہ سے پھسلتے رہے۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے نم آنکھیں رگڑیں اور گردن اٹھا کے ذرا ہمت سے بولی۔ "میں یہ شادی کر لوں گی اور وان فاتح پہ بھروسا کروں گی۔ ہم واپس جائیں گے۔ میرا خواب کہتا ہے کہ ہم نئے زمانے میں ہوں گے۔"

"مگر اس خواب میں' میں نہیں تھا۔ خیر!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نے وانگ لی کا مجسمہ بنانے سے انکار کیوں کردیا؟" اس نے سارے قصے میں تالیہ کی سنائی گئی دوسری اہم بات کا تذکرہ کیا۔ تالیہ نے بے رخی سے کندھے اچکائے۔

"مجھے کیا ملے گا وانگ لی کا مجسمہ بنا کے؟"

"آپ کو عصرہ بیگم نے بتایا تھا نا کہ وانگ لی کا مجسمہ شہزادی تاشہ نے بنایا تھا۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس کی وانگ لی سے دوستی تھی' وانگ لی نے خواہش کی کہ وہ اس کا مجسمہ بنائے اسی لیے شہزادی سرخ حویلی میں آیا کرتی تھی۔"

"اور میں نے خواب میں شہزادی کو پشت سے دیکھا تھا۔ وہ یقیناً 'میں' ہی تھی اور وہ مجسمہ بنا رہی تھی۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ مجسمہ بنانے نہیں دراصل بالائی منزل کے مکین سے ملنے جاتی تھی۔"

"اور ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ مکین کون ہے۔ سو مجسمہ بنالیں' شہزادی صاحبہ۔ اس کو آپ کے ہاتھوں سے ہی بننا ہے۔ وانگ لی کی دوستی میں نہ سہی' بالائی منزل کے مکین سے ملنے کے لیے ہی سہی۔"

"کیا ضروری ہے کہ ہم ہر کام وہی کریں جو اس کتاب میں لکھا ہے؟ ہونہہ۔ میں تاریخ کو بدلنا چاہتی ہوں۔ میں یہ نہیں کرنا چاہتی۔ بس۔" وہ ناگواری سے اٹھی اور لباس کی احتیاط کیے بغیر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ سادہ مگر لمبے گھیرے کے لہنگے کا کنارا میز کی کیل سے الجھا اور کپڑا پھٹنے کی آواز آئی۔ وہ رکی اور غصے سے کپڑا کھینچا۔ تین چار انچ کا چاک پڑ گیا۔ مگر کپڑا کیل سے علیحدہ ہوگیا۔

"احتیاط سے شہزادی!"

تالیہ نے مڑ کے دبے دبے غصے سے اسے دیکھا۔ "کون سے ہیرے جواہرات لگے ہیں اس لباس میں جو میں احتیاط کروں؟"

"یہ آپ کا لباس ہے' اس کے قیمتی ہونے کے لیے یہی کافی ہے۔ ویسے بھی شہزادیوں کے میلے اور پھٹے پرانے لباس بھی صدیوں بعد میوزیم میں رکھے جاتے ہیں' یہ تو پھر قیمتی ہے۔" وہ جو سر جھٹک کے آگے بڑھ رہی تھی' ایک دم ٹھہری سی گئی۔ جیسے منجمد ہوگئی ہو۔

سارا محل اور ساتھ بہتا ملاکہ کا سمندر.... سب برف بن گیا تھا اور وہ اس میں نیلا برف ہوا مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ دماغ میں جیسے کسی نے برف کی سل گھونپ دی تھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

چونک کے اس نے ایڈم کو دیکھا۔ وہ اب ادب سے رخصت لے رہا تھا۔ تالیہ سن کھڑی رہی۔
مگر اس ایک لمحے میں ہر چیز بدل گئی تھی۔

☆☆☆

صبح طلوع ہوئی اور شہزادی تاشہ کی خواب گاہ کی کھلی کھڑکیوں سے روشنی نے اندر جھانکا تو تالیہ مراد کو دروازے کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ شریفہ سامنے ہاتھ باندھے مؤدب کھڑی تھی اور تالیہ ہاتھوں میں پکڑا رقعہ پڑھ رہی تھی جو رازداری سے اس تک پہنچایا گیا تھا۔

"اشراق کے وقت تک آپ کو میری حویلی میں ہونا چاہیے' شہزادی تاشہ۔ باقی سب بھی موجود ہوں گے۔ سن باؤ۔"

اس نے رقعہ مٹھی میں مروڑ دیا اور بازو سے بندھا ایک دوسرا رقعہ نکال کے شریفہ کی طرف بڑھایا۔

"یہ سامان کی فہرست ہے۔ اسے میری بگھی میں رکھواؤ۔ میں تیار ہونے لگی ہوں۔ پھر مجھے سن باؤ کی طرف جانا ہے۔" دانستہ اونچی آواز میں بولی کیونکہ کھلے دروازے پہ اس نے مراد کو رکتے دیکھ لیا تھا۔

"سن باؤ وانگ لی کی طرف؟ خیریت؟" وہ کمر پہ ہاتھ باندھے' شاہی قبا میں ملبوس' سنجیدہ رعب سے سوال کرتا اندر داخل ہوا تو شریفہ جھٹ سامنے سے ہٹی اور تالیہ نے فوراً سر جھکایا۔ "راجہ! صبح بخیر!"
پھر سر اٹھا کے مسکرا کے بولی۔

"وانگ لی نے مجھ سے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس کا مجسمہ بناؤں۔ شادی تک خود کو مصروف رکھنے کا اس سے بہتر بہانہ مجھے کہاں ملے گا۔ اسی لیے مجسمہ سازی کا سامان لے کر آج وانگ لی کی طرف جانا ہے مجھے۔"

"ویسے......" مراد اس کو بغور دیکھنے لگا جیسے سوچ میں پڑ گیا ہو۔ "شہزادی کو ایک چینی غلام کا مجسمہ بنانا زیب نہیں دیتا۔"

"وہ چینی غلام نہیں سفارت کار ہے۔ ملاکہ کو قرضہ لا کے دے رہا ہے اور ملکہ یان سوفو کا وفادار ہے۔ ملکہ کے وفادار سے تعلقات اچھے رکھوں گی تو مجھے ہی آسانی ہو گی۔"

وہ مراد کے سامنے کھڑی' سادگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی' کہہ رہی تھی۔

"تو تم اب اس شادی کے لیے دلی طور پہ راضی ہو؟"

"طاقت میں بڑی کشش ہوتی ہے' راجہ! طاقت کسے بری لگتی ہے؟" پھر کان کے پیچھے بال اڑستے ہوئے مسکرائی۔ "امید کرتی ہوں' آپ مجھے بھاری زیورات دے کر اس محل سے رخصت کریں گے' راجہ۔ آخر آپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ آپ کے سارے لوٹے گئے سونے پہ مجھ سے زیادہ کس کا حق ہو گا۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "کون سا سونا؟ میں نے کچھ نہیں چرایا۔ ہاں' میری حلال کی کمائی بہت ہے میرے پاس۔ میں سنار کو بھجوا دوں گا۔ زیورات پسند کر لینا اور جو چاہو گی تمہیں ملے گا کیونکہ اس شادی کے بعد وہ ہو گا جو میں چاہوں گا۔"

"دیکھتے ہیں' راجہ!" اس نے سر جھکا کے کہا تھا۔

مراد کے جانے کے بعد وہ مسہری تک آئی جس کے ساتھ لوہے کی کھونٹی پہ لٹکا لباس نظر آ رہا تھا۔ ریشم کا بنا سادہ سفید لباس۔ لمبا اسکرٹ نما لہنگا اور گھٹنوں تک آتی قمیص اور ایک مفلر جیسا دوپٹا۔ تینوں چیزوں کا رنگ سفید تھا۔ نہ کام تھا' نہ زری نہ دبکا۔ ایک ستارہ تک نہ لگا تھا اس پہ۔

سفید ریشم کو ہاتھ سے مسلتے اسے وہ دن یاد آیا جب وہ پہلی دفعہ دلہن بنی تھی۔ سرخ کامدار لہنگا۔ سونے کے ملکے سے زیورات بھی پہنے تھے۔ ٹیکا بھی تھا اور گلوبند بھی۔ کنگن اور مہندی بھی۔

اس نے سر جھٹکا اور لباس اٹھا لیا۔ اسے تیار ہونا تھا۔

دل پہ جو گزر رہی تھی اس سب کو نظر انداز کر کے.... اسے بس تیار ہونا تھا۔

☆☆☆

اس صبح سرخ حویلی کے صحن میں وہ کنویں کے

ساتھ بے مقصد سا کھڑا تھا۔ درخت کی چھایا کے باعث تیز روشنی اس کو نہیں چھو رہی تھی۔ شیو ہلکی بڑھی تھی اور بازو سینے پہ لپیٹے پانی میں جھانکتا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

''تو تم شہزادی تاشہ کے ساتھ ان کے گاؤں سے آئے تھے؟'' آواز پہ وہ چونک کے پلٹا تو دیکھا' وانگ لی قہوے کی پیالی ہاتھ میں لیے' ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

فاتح نے ادب سے گردن جھکائی۔ ''مالک! میں شہزادی کے رازوں کا امین ہوں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو ملکہ نے فرمایا وہ درست ہے۔''

''میں جانتا تھا تم عام آدمی نہیں ہو۔ سونے کا ایک ڈھیر دے کر میں نے تمہیں خریدا تھا۔ جیا کے کاروبار کو تم نے اٹھا کے رکھ دیا۔ اور اب ملکہ تمہارے بدلے مجھے سونے کا وہی ڈھیر دینے کو تیار ہیں۔ تم شہزادی سے شادی کے بعد آزاد ہو گے' فاتح!'' وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے پچھتا رہا ہو۔

''آپ میرے لیے ہمیشہ محترم تھے اور رہیں گے۔ کچھ چیزیں نہیں بدل سکتیں' مالک۔''

''واپس جا کے خط لکھتے رہنا۔ مجھے اچھا لگے گا۔'' وہ مڑنے لگا تو فاتح تیزی سے بولا۔

''آپ ملاکہ کو قرض کی دلدل میں نہ دھکیلیں' مالک۔ آپ اس تجویز پہ عمل کرنے والوں میں سے نہ بنیں۔''

''خط لکھتے رہنا' فاتح۔ مجھے اچھا لگے گا۔'' چینی سفارت کار نے نرمی سے یاددہانی کروائی اور قہوے کی پیالی سے گھونٹ بھرتا آگے بڑھ گیا۔

باہر بگھیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ مہمان پہنچ چکے تھے۔

جس وقت قاضی کاغذات کا پلندہ لیے برآمدے میں داخل ہوا' سامنے سن باؤ وانگ لی' ایڈم اور فاتح کو فرشی نشست پہ بیٹھے پایا۔

ان کے مقابل وہ بیٹھی تھی۔ زمین پہ' سادہ ملے عورتوں کی طرح۔ سفید لباس میں ملبوس' سفید دوپٹا سر پہ اوڑھے۔ وہ بس نظریں جھکائے اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

قاضی نے کاغذات چھوٹی میز پہ رکھے اور دوزانو ہو کے بیٹھا۔ ایک مضطرب نظر وانگ لی پہ ڈالی۔

''سن باؤ.... یہ بہت خطرناک کام ہے۔ مجھے راجہ مراد کے سامنے گواہی دینا پڑے گی۔ کیا شہزادی تاشہ ان خطرات سے واقف ہیں؟''

''راجہ مراد کا اقتدار اب چند دن کا مہمان ہے۔ آپ کو ان سے نہیں' ان کو اب آپ سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ آپ اپنے کام کا آغاز کیجیے۔ باقی سب میں دیکھ لوں گا۔ آپ چینی سفارت کار ہیں۔ آپ کو ملاکہ کا کوئی عہدیدار نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

وانگ لی کا انداز سپاٹ تھا۔ قاضی نے گہری سانس لی اور کاغذات سامنے رکھے۔

''نکاح نامے کی چار نقول بنائی گئی ہیں۔ ایک میرے پاس رہے گی' تصدیق کے لیے.... باقی دونوں آپ کے پاس ہوں گی۔ چوتھی نقل میں وانگ لی کو دے دوں گا۔''

(یعنی ملکہ کو۔) گواہ کے طور پہ سامنے بیٹھے ایڈم نے سوچا تھا۔

وہ بس پژمردہ سا بیٹھا تھا۔ اس کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ صحن میں چڑیوں کے نغمے سنائی دے رہے تھے اور قاضی مقدس کلمات پڑھ رہا تھا مگر ایڈم کو صرف اس کے لب ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر چیز سلو موشن میں ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اس نے قاضی کو کلمات پڑھتے دیکھا۔

پھر مرد سے رضامندی لیتے دیکھا۔

مرد سپاٹ اور بے نیاز سا تھا۔ اس کے چہرے پہ ڈھیروں سکون تھا۔ وہ جیسے ذہن میں اگلا لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔

اس نے بلاتامل رضامندی دے ڈالی۔

پھر قاضی نے سفید لباس والی شہزادی سے پوچھا تو اس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ قاضی کو دیکھا اور بے خوف انداز میں اقرار کے بول بولے۔

پھر اس نے دعا کے لیے اٹھے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

اپنے ہلتے لبوں کو محسوس کیا۔

اتنی سی بات تھی اور ایڈم بن محمد کا دل خالی ہو گیا۔

دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔

قاضی چلا گیا۔ وانگ لی باہر نکل گیا اور وان فاتح اپنے دیگر کام نپٹانے اٹھ گیا۔ ایسے میں صرف صحن میں مجسمہ سازی کا سامان پڑا رہ گیا۔ شہزادی بھی جس خاموشی سے آئی تھی' اسی طرح اٹھ گئی۔ مرد اور شہزادی نے ایک دفعہ بھی نظر نہیں ملائی' نہ کسی نے کسی سے کوئی بات کی۔ ایسے لگتا تھا سب مشینی انداز میں ملکہ کا حکم ماننے کے لیے بیٹھے تھے۔ کام ختم ہوا تو وہ اپنی اپنی زندگیوں کی طرف واپس لوٹ گئے۔

تالیہ نے بگھی واپس بھجوا دی تھی اور خود پیدل چلتی وانگ لی کے گھر سے نکلی تھی۔ سامنے سبزہ زار تھا اور درختوں کی لمبی قطار۔ وہ ان درختوں کی طرف جانے لگی۔ سینے پہ بازو لپیٹے' وہ خاموشی سے متوازن قدم اٹھا رہی تھی۔

''کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟'' ایڈم اس سے آملا۔

''جیسے خواب ہو کوئی اور ٹوٹ گیا ہو۔ سُن۔ بے حس۔ سرد۔'' وہ سکون میں لگتی تھی' جیسے کچھ ہوا بھی نہ ہو۔ دونوں ساتھ ساتھ گھاس پہ قدم اٹھانے لگے۔

''یہ صحن میں مجسمہ سازی کا سامان کیسا ہے؟ رات تک تو ڈٹی ہوئی تھیں کہ مجسمہ نہیں بنائیں گی۔''

وہ رکی اور اس کی طرف گھومی۔ ایڈم بھی ٹھہر گیا۔ دونوں اب درختوں کے بیچ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ قریب میں گھوڑے چرتے دکھائی دے رہے تھے۔

''تم نے کہا تھا صرف اپنا سوچوں۔ سو میں صرف اپنا سوچ رہی ہوں اب۔ تم نے کہا تھا کہ میں ایک لالچی عورت ہوں جس کی زندگی کے سارے بڑے فیصلے خزانے کی کھوج کے گرد گھومتے ہیں۔ میں نے اس بات کو کھلے دل سے قبول کر لیا ہے' ایڈم۔''

''میرا وہ مطلب نہیں......''

''میں واقعی ایک خزانے کی پیچھے بھاگنے والی لڑکی ہوں' ایڈم! اور مجھے خزانہ مل گیا ہے۔'' وہ کھلے دل سے مسکرائی۔ ایک دم وہ کے ایل والی تالیہ لگنے لگی تھی۔ غلام سے نکاح اور شہزادی کا رتبہ' وہ سب جیسے ہوا ہی نہیں تھا۔

''خزانہ نہیں ہے' چچا تالیہ۔''

''بالکل۔ خزانہ نہیں ہے' ایڈم! خزانے ہیں۔''

وہ مسکرا کے بولی تو ایڈم کے ابرو حیرت سے بھنچے۔

''خزانے؟''

''سن باؤ کا گھر اور سن باؤ کا مطلب ہوتا ہے 'تین خزانے'۔''

''وہ تو صرف وانگ لی کا لقب ہے اور....''

''چھ سو سال تک وہ گھر 'تین خزانوں والا گھر' کہلاتا رہے گا۔'' وہ زور دے کر بولی۔ ''اس گھر میں تین خزانے ہیں' ایڈم!''

''تین خزانے؟''

''ہاں۔ پہلا خزانہ 'وقت کا خزانہ' تھا۔ جس کا قفل ہم نے کھول لیا۔ تیسرا خزانہ میں نہیں جانتی کیا ہوگا مگر دوسرا خزانہ وہ ہے جو میرے خواب میں' میں اور تم ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ خزانہ جو ہمیں واپس جا کے بے تحاشا امیر کر دے گا۔''

''وانگ لی کے گھر میں خزانہ دفن ہے؟'' وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''عصرہ نے کہا تھا' شہزادی تاشہ' وانگ لی کی دوستی کے باعث اس گھر میں آتی تھی۔ مجھے اپنے خواب سے لگا تھا کہ وہ بالائی منزل کے مکین سے ملنے آتی تھی۔ لیکن یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔'' اس کی مسکراہٹ میں اب شرارت در آئی تھی۔ ''میں وہ مجسمہ بنانے روز جاؤں گی وانگ لی کے گھر.... لیکن اس کی ایک تیسری وجہ ہے!'' وہ مسکرا کے بتا رہی تھی اور وہ دنگ سا کھڑا تھا۔

''میں وہاں 'دوسرے خزانے' کے لیے جاؤں گی۔''

''کیا وہاں خزانہ دفن ہے جس کو ہم نے کھودنا ہے؟''

''نہیں ایڈم! ہم نے خزانہ دبانا ہے۔ چھ سو سال بعد ہم واپس جا کے اس خزانے کو اسی گھر سے نکالیں گے۔'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ایڈم کا منہ کھل گیا۔

''آپ سن باؤ کے گھر میں زیورات وغیرہ دبانا چاہتی ہیں؟'' وہ اب بھی نہیں سمجھا تھا۔

''زیورات نہیں۔ میں کتنا ہی سونا چاندی اکٹھا کرلوں' وہ بیچ بیچ کے ختم ہو جائے گا۔ کے ایل میں' میں ایک سوشلائیٹ ہوں' اور ایک چور۔ تم ایک باڈی مین ہو۔ بھگوڑے فوجی۔ ہم دونوں حقیقتاً امیر نہیں ہیں اور ہم دونوں کو امیر ہونے کے لیے خزانہ چاہیے۔ اصلی خزانہ۔ ہمیں کچھ اور دبانا ہے۔''

سبزہ زار پہ ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ایڈم ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

''آپ کو اگر واپس جانے کا اتنا یقین ہے تو آپ تھیلے میں سب ساتھ لے جائیں۔ دفن کرنا کیوں ضروری ہے۔''

''میرے پاس زیور بہت کم ہے' ایڈم۔ اور مجھے کروڑوں ڈالرز کا خزانہ چاہیے۔ اگر زیور ساتھ لے گئے تو وہ وقت کا سفر طے کر کے ہمارے ساتھ نئے زمانے میں چلا جائے گا۔ وہ نیا ہی رہے گا۔ وہ قدیم نہیں ہوگا۔ جیسے میرے خواب میں یہ انگوٹھی (ہاتھ اٹھا کے انگوٹھی دکھائی) میری انگلی میں بالکل نئی لگ رہی تھی۔''

''تو آپ زیور کو یہاں دفن کرنا چاہتی ہیں؟''

''نہیں۔ میرے پاس اتنا زیادہ زیور ہے ہی نہیں اور زیورات کی 2016 میں کوئی اہمیت نہیں ہے ایڈم! مگر جانتے ہو کس چیز کی ہے؟''

''کس کی؟'' وہ تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''شہزادیوں کے استعمال شدہ پھٹے پرانے کپڑوں کی' تم نے ہی تو مجھے کل بتایا تھا۔ قدیم زمانے کے عام سے برتن' کتابیں' خطوط اور دوسری چیزیں نئے زمانے میں اینٹیک (نوادرات) بن جاتے ہیں جو کروڑوں ڈالرز کے بکتے ہیں' جن کی نیلامی لگتی ہے۔ جو میوزیم میں سجائے جاتے ہیں۔''

''اوہ۔'' بات بالآخر سمجھ میں آنے لگی تھی۔

تالیہ جوش سے بتا رہی تھی۔ ''ہم شہزادی تاشہ' سلطان مرسل' ملکہ یان سوفو اور راجہ مراد کے زیرِ استعمال عام سی چیزیں اکٹھی کریں گے اور ان کو سن باؤ کے مجسمے تلے زمین میں دبا دیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ چھ سو سال بعد بھی وہ مجسمہ وہیں موجود رہے گا۔ اسے آنچ تک نہیں آئے گی۔ ہم ان چیزوں کو اپنے ساتھ وقت کے دروازے میں سے نہیں لے جاسکتے ورنہ وہ میری انگوٹھی کی طرح نئے رہیں گے۔ وہ بریسلیٹ اور چابی کی طرح زمانہ نہیں بدلیں گے۔''

''اور اینٹیک بننے کے لیے ان کا ایج کرنا ضروری ہے۔ ان کی عمر گزرنا ضروری ہے۔'' اب وہ سمجھ رہا تھا۔

''ہاں۔ اور یہ خزانہ ''چوری شدہ'' نہیں ہوگا۔ یہ ہم نے اپنی محنت سے کمایا ہوگا۔ فاتح بن رامزل مجھے وہاں جاتے ہی چھوڑ دیں گے۔ ان کی زندگی میں میری کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ پھر میرا کیا ہوگا؟ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اب کوئی غلط کام نہیں کروں گی۔ مجھے اپنے خواب پانے کے لیے یہ خزانہ چاہیے ایڈم۔ یہ ہماری زندگیاں بدل دے گا۔ اور یہ.... ''جائز'' ہوگا۔''

وہ دم بخود کھڑا تھا۔ ''آپ کا دماغ.... کیسے کام کرتا ہے' چے تالیہ؟ یہ اتنے شیطانی منصوبے کہاں سے آتے ہیں آپ کے دماغ میں؟''

تالیہ نے ابرو خفگی سے بھینچے۔

''بکومت۔ یہ بتاؤ' کیا میرا ساتھ دو گے؟ کیا چند بے کار چیزوں کو چھ سو سال کے لیے دفن کرنے میں میری مدد کرو گے؟''

''پانچ سو ستاون سال!''

''زیادہ میرے استاد نہ بنا کرو۔ شکر ادا کرو کہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تمہارے ساتھ میں تھی۔ میرے پلانز تھے۔"
"آپ شکر کریں کہ آپ کو میرے جیسا مفت کا غلام ملا ہوا ہے۔" وہ دونوں اب آگے بڑھ رہے تھے اور ان کی آواز دور ہوتی سنائی دے رہی تھی۔
"مفت کا کیوں؟ خزانے میں سے بیس فیصد حصہ دوں گی تمہیں۔"
"ایک منٹ ایک منٹ۔ بیس فیصد کس خوشی میں؟ ہم ففٹی ففٹی کریں گے۔"
"ففٹی فیصد دماغ تو ہے نہیں تمہارا ہونہہ۔ سارا پلان میرا' ساری محنت میری۔ تمہیں صرف مورل سپورٹ کے لیے رکھا ہے۔ اور زیادہ سودے بازی نہ کرو میرے ساتھ' ورنہ شہزادی کے جلال سے واقف نہیں ہو تم۔"
ایڈم نے چلتے چلتے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔
"تو شہزادی نہ وان فاتح کی محبت میں اس گھر میں آتی تھی' اور نہ ہی وانگ لی کی دوستی میں۔ وہ صرف خزانہ دفن کرنے آتی تھی۔ آپ ناویسے بالکل نہیں بدلیں گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب آپ مجھ سے "بنگارا ملایو" میں یہی لکھوائیں گی کہ شہزادی وانگ لی کی دوستی میں اس گھر میں آتی تھی۔ اے مکرم فرشتے!" اپنے بائیں کندھے کو دیکھ کے بولا۔
"میرے اعمال نامے میں سے بنگارا ملایو نکال دو' خدا کے لیے۔ اس کے سارے جھوٹوں میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"
"ویسے ایک بات ہے.... وہ نظم جو سن باؤ کے گھر کی دیوار پہ لکھی تھی... شہزادی تاشہ والی... وہ یہاں نہیں لکھی۔ وہ بھی یقیناً میں ہی لکھوں گی۔ مگر کیوں؟"
وہ پوچھ رہی تھی۔ ایڈم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
وہ دونوں اب درختوں کے درمیان میں اوجھل ہو رہے تھے۔
دور سن یاؤ کی حویلی کی بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑے فاتح نے مسکرا کے ان کو دور جاتے دیکھا تھا۔ وہ ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا' مگر اس کو ڈھیروں اطمینان میسر تھا۔
جھک کے اس نے پانی کے پیالے میں رومال ڈبویا اور گردن کے پیچھے لیپ شدہ غازہ رگڑ کے صاف کیا۔ وقت کی مہر واضح دکھائی دینے لگی۔
اس کو ظاہر کرنے کا وقت آ گیا تھا۔
ہر شے پلان کے مطابق ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اس صبح قدیم ملاکہ میں زور کی بارش ہوئی تھی مگر دوپہر تک مطلع صاف ہو گیا اور سورج نکل آیا تو سارے میں دھوپ چھاؤں جیسا موسم ہو گیا۔ ایسا آنکھ مچولی والا موسم تھا کہ الاماں۔
"جیا" کی رسوئی میں فاتح زمین پہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ گود میں بہت سے پتے رکھے تھے جن کو وہ ٹہنیوں سے علیحدہ کر کے ایک ٹوکری میں ڈال رہا تھا۔ ہاتھ تیز تیز چل رہے تھے اور پوروں میں پتوں کی مہک رچ بس گئی تھی۔
"یہ آپ کیا کر رہے ہیں' ڈیڈ!" اداس سی آریانہ اس کے ساتھ آ بیٹھی تو اس نے نظر اٹھائی۔ سفید ہیئر بینڈ لگائے' وہ چہرہ ہتھیلیوں میں گرائے' چوکڑی مارے بیٹھی اسے یاسیت سے دیکھ رہی تھی۔
"کہتے ہیں قدیم چینی بادشاہ شین نانگ ایک دفعہ سفر پہ نکلا تو ایک جگہ پڑاؤ کے دوران اس کے غلام عادتاً اس کے لیے لکڑیاں جلا کے پانی ابالنے لگے۔ ہوا چلی اور درخت سے ایک پتا ٹوٹ کے پانی میں جا گرا۔ کسی کو علم تک نہ ہوا اور معمول کے مطابق غلاموں نے بادشاہ کو کڑھا ہوا پانی پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اسے پیا تو ذائقہ بے حد مختلف تھا۔ اس کڑھے پانی نے اسے تازہ دم کر دیا۔ اس نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ ایک پتا پانی میں گرا تھا۔ کہتے ہیں بادشاہ شین نانگ وہ پہلا انسان تھا جس نے پتے ابال کے پہلی 'چائے' بنانے کی روایت ڈالی۔ تب سے لوگ پتوں کو ابال کے قہوہ' چائے اور "جیا" بنانے لگے۔ میں بھی اس وقت چائے کے پتے علیحدہ کر رہا ہوں۔"
"میں اس کی بات نہیں کر رہی۔ میں پوچھ رہی

ہوں کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" وہ دل برداشتہ سی بولی۔
"میری ماما کا کیا ہوگا' ڈیڈ؟ آپ کیسے کسی اور سے شادی کر سکتے ہیں؟"
"یہ صرف ایک کاغذی معاہدہ ہے اور یہ ہمیں یہاں سے آزادی دلائے گا۔" وہ سر جھکائے پتے توڑ رہا تھا۔
"مگر کیسے؟"
"قدیم کہاوتیں کبھی غلط نہیں ہوتیں' آریانہ۔ اور ایسی ہی ایک کہاوت کہتی ہے کہ سچ تمہیں آزاد کر دے گا مگر....
"مگر پہلے وہ تمہیں غصہ دلائے گا۔" اس نے جھٹ فقرہ مکمل کیا۔
"تو صرف سچ ہے جو ہمیں آزاد کرے گا۔" وہ ٹوکری رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا' کپڑے جھاڑے اور جوتے پہنے۔ آج کل وہ خود سے باتیں کم کرتا تھا۔ اس کے پاس سارے جواب موجود ہوتے تھے۔ سادہ کرتے' پاجامے میں' کمر کے گرد کپڑا باندھے' وہ پہلے سے زیادہ پر امید لگ رہا تھا۔
"جو اس دنیا میں ہوگا' وہ اس دنیا میں ہی رہ جائے گا۔ میں کوئی نیا رشتہ ساتھ نہیں لے کر جاؤں گا۔ مجھے کسی رشتے کو بنانے میں دلچسپی نہیں ہے' آریانہ! مجھے صرف آزادی چاہیے۔" اور پھر وہ مڑ گیا۔ آریانہ اس کی گردن کے پیچھے ثبت مہر دیکھ سکتی تھی۔

ہال کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میزیں لگی تھیں اور لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کمرے کے آغاز میں ایک چبوترہ سا بنا تھا۔ وہ اس پہ کھڑا ہوا اور بلند آواز میں بولا۔
"مجھے پرسوں کسی نے 'غلام فاتح بن رامزل' کہہ کے پکارا تھا۔" اس کی آواز کی گرج اور بھاری پن سے کئی ہاتھ رکے۔ کئی گردنیں مڑیں۔ وہ کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑا' کمرے کے ایک کونے سے دوسرے تک سب کو باری باری دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا۔
"اور میں نے اس سے کہا کہ میرا نام غلام نہیں ہے اور مجھے میرے نام سے پکارا جانا چاہیے۔ جانتے ہو کیوں؟"
جیا کے نیم تاریک ہال میں خاموشی چھانے لگی لوگ اس کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ لقمے چبانے لگے۔ برتنوں کی کھٹر پٹر کم ہوگئی۔
"کیونکہ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ اس نے بنی آدم کو عزت بخشی۔ ان کو 'اکرام' سے نوازا۔ ملاکہ کے لوگو.... آدم علیہ السلام کی اولاد کا ہر شخص خواہ وہ نیک ہو یا بد' امیر ہو یا غریب' کالا ہو یا گورا' مسلمان ہو یا غیر مسلم' ہر انسان.... عزت کے.... قابل ہوتا ہے۔" وہ ہاتھ اٹھا کے زور دے کر بول رہا تھا۔ لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ لب ہل رہے تھے۔ گھونٹ بھرے جا رہے تھے مگر آواز نہیں آتی تھی۔
"چاہے ہمیں کوئی انسان برا لگتا ہو.... چاہے ہمیں کسی سے نفرت ہو.... مگر ہم سب پہ لازم ہے کہ ہم ہر انسان کی عزت کریں کیونکہ اللہ نے سب کو عزت سے نوازا ہے۔ جانور صرف کھانے اور سائبان کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ انسان نہیں۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے 'عزت' بھی چاہیے ہوتی ہے۔"
وہ بلند آواز میں قدرے خفگی سے کہہ رہا تھا اور لوگ سن رہے تھے۔
"کیوں بے عزت ہونے کے بعد لوگ شہر چھوڑ دیتے ہیں' خودکشی کر لیتے ہیں' یہاں تک کہ غم سے مر بھی جاتے ہیں؟ کیونکہ انسان نہیں رہ سکتا عزت کے بغیر۔ تم کیسے لوگ ہو؟ تمہیں تمہارے گھروں سے اغوا کر کے یہاں غلام بنا لیا گیا ہے اور تم اپنے مالکوں کی جھڑکیاں سنتے ہو مگر اپنے لیے کھڑے نہیں ہوتے؟"
اسے جیسے ان لوگوں پہ بے حد غصہ آ رہا تھا۔ مگر وہ چپ چاپ سنے گئے۔
"یاد رکھو' اگر کسی انسان کی محبت یا خوف تمہیں اتنا بے بس یا بے حس بنا دے کہ وہ تمہاری بے توقیری کیے جا رہا ہے اور تم چپ چاپ برداشت کر رہے ہو تو تم جانوروں سے بھی بدتر ہو۔ انسان کو کسی بھی رشتے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں اپنی عزّت قربان نہیں کرنا چاہیے۔ تم اچھے ہو یا بُرے تم معزز ہو۔ تمہارے معزز ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ تم آدم علیہ السلام کی اولاد ہو۔"

کچھ لوگ خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

کچھ خاموشی سے کھا رہے تھے۔

"میں یہاں تم لوگوں کو مفت میں اگر کھانا دلواتا ہوں تو عزّت کے ساتھ۔ تاکہ تم اپنی عزّت خود کرنے لگو۔ خدا کے لیے اپنی قدر کرنا سیکھو۔ جانوروں کی طرح دوسروں کی ناجائز باتیں مت برداشت کرو۔ اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ اکٹھے ہو جاؤ اور احتجاج کرو۔ سلطان کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ تمہارے اوپر ظلم ہو رہا ہے۔ اسے بتاؤ کہ تمہیں کسی منڈی میں نہیں خریدا گیا۔ تمہیں ناجائز طور پہ غلام بنا کے بیچا گیا ہے۔ میں تمہارے لیے سلطان کے پاس جانے کو تیار ہوں' ملاکہ کے لوگو.... لیکن کیا تم لوگ اپنے لیے میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟"

کچھ نے ایک دوسرے کو دیکھا مگر وہاں ہر چہرے پہ تھکن تھی۔ گردنیں واپس پلٹ گئیں۔ برتنوں کی آواز آنے لگی۔ کھانا دوبارہ سے کھایا جانے لگا۔

فاتح نے گہری سانس بھری سر جھٹکا اور چبوترے سے اتر آیا۔ پھر کونے میں دیکھا تو آریانہ سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی تھی۔

اسے متوجہ پا کے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ (یہ لوگ بہت بزدل ہیں' ڈیڈ۔)

"ایک دن آئے گا جب یہ لوگ اپنے لیے کھڑے ہوں گے' آریانہ! کیونکہ یہ تاریخ میں لکھا ہے۔ یہ قسمت میں لکھا ہے۔ بس تم انتظار کرو۔" وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوتا رسوئی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے چہرے پہ کوئی اضطراب' مایوسی کچھ نہ تھا۔

کونے کی ایک میز پہ بیٹھے چغہ پوش آدمی نے غور سے اسے جاتے دیکھا۔ مدھم رشنیوں کے باوجود اسے 'جیا' کے اس نمایاں' خوش شکل اور تنومند سے غلام کی گردن کی پشت پہ ایک جلنے کا داغ سا نظر آیا تھا۔

آدمی نے جیب سے رقعہ نکالا اور کھول کے دیکھا۔ اس پہ بنا خاکہ ہوبہو ویسا تھا۔ وہ بالآخر مسکرایا۔ پھر چپ چاپ اٹھا اور قہوہ خانے سے باہر نکل گیا۔

اسے بنداہارا کا مطلوبہ شخص مل گیا تھا۔

اب اس کا رخ مرادراجہ کے محل کی جانب تھا۔

☆☆☆

رات کا سیاہ آسمان تھا.... چاند چمک رہا تھا.... اونچے ٹیلوں کا راستہ پیدل چلنے والوں کے لیے دشوار گزار اور پتھریلا تھا' مگر وہ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے.... تالیہ آگے تھی.... ایڈم پیچھے تھا۔ ان کا لباس اندھیرے کے باعث ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا تھا.... بس تاریکی میں گویا دو ہیولے تھے جو اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔

سامنے سبزہ زار دکھائی دیا اور چاندنی میں نہائے درخت تو وہ سانس لینے کو رکی۔ جب سے مجسمہ بنانا شروع کیا تھا' ہر رات وہ دونوں یہاں آ کے درختوں میں کچھ چیزیں چھپا جاتے تھے۔ دوپہر میں جب وہ شاہی بگھی میں حویلی آ کے مجسمے کا کام شروع کرتی تو ایڈم ان کو درختوں کی کھوہ سے نکالتا اور لباس میں چھپائے اندر لے آتا۔ کسی سپاہی کو علم تک نہ ہوتا کہ وہ دونوں مجسمے کی بنیاد میں کیا بھر رہے ہیں۔

آج وہ درخت میں چند برتن چھپانے کے بعد پلٹی نہیں۔ بلکہ سن باؤ کے گھر کی طرف آ گئی۔ سن باؤ آج کسی تقریب میں گیا تھا اور گھر پہ نہیں تھا۔ حویلی خاموش پڑی تھی۔ اکادکا غلام جو یہاں ہوتے تھے' وہ بھی غالباً جا چکے تھے۔

حویلی کا دروازہ کھلا تھا۔ اس زمانے میں لوگ اپنے گھروں کے دروازے مقفل نہیں کرتے تھے۔ وہ چغے کی ٹوپی سر پہ جمائے تیزی سے اندر داخل ہو گئی تو ایڈم کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔

"چے تالیہ...." وہ پیچھے سے ہانپتا ہوا آیا تو تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا ایڈم!" وہ راہداری میں آگے بڑھتی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گئی اور صحن میں آ گئی۔

"آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟" وہ زچ ہو گیا۔

"میں ہم دونوں کو بہت امیر کرنے جا رہی ہوں ایڈم!" وہ آخری دیوار تک آئی اور اندھیرے میں اسے ٹٹولنے لگی۔

وہ چلتے چلتے بیچ صحن تک آیا اور رک کے اسے دیکھنے لگا۔

"کیسے؟"

وہ پلٹی اور چمکتی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تاشہ کے خزانے سے جسے ہم دونوں کھود کے نکالیں گے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے مگر ابھی آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"میں اپنے لیے نشانی چھوڑ رہی ہوں۔" وہ دیوار کے اس کونے تک آئی جہاں اس نے خواب میں ایک نظم لکھی دیکھی تھی۔

"کیا؟" وہ حیران رہ گیا۔

"کیا تم اب بھی نہیں سمجھے ایڈم کہ تاشہ نے اس دیوار پہ وہ نظم کیوں لکھی تھی؟" وہ مسکرائی۔

"کیوں؟"

"تاکہ ایڈم اور تالیہ اس دیوار تک جائیں اور وہاں دفن خزانے کے راز کو کھود نکالیں لیکن ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ مجسمے سے کتنی اینٹوں کے فاصلے پہ ہم نے خزانہ دبایا تھا؟ وہ نظم جس مقام پہ لکھی جائے گی اس کی سیدھ میں خزانہ ہو گا۔ ایک دفعہ ہم خزانہ نکال لیں تو ہم دنیا کے سب سے طاقتور لوگ بن جائیں گے ایڈم۔" وہ ایک اینٹ پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ یہ اس جگہ کی سیدھ میں تھی۔ اس نے وہاں چاقو سے نشانی لگائی۔ صبح وہ ادھر نظم لکھ دے گی۔

"اور وان فاتح؟ ان کا کیا؟" ایڈم نے یاد دلایا۔ وہ دونوں اب خاموشی سے گھر سے باہر آ گئے تھے اور درختوں کی طرف جا رہے تھے۔

"وہ زر اور زمین سے بے نیاز انسان ہیں۔ ان کو خزانے کی خبر تک نہیں ہو گی۔ یہ صرف میرا اور تمہارا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب ہم نئے زمانے میں جا کر اس جگہ کو کھودیں گے تو خزانہ وہاں موجود ہو گا۔ ہم نے خاص حفاظتی طریقے سے بنیادوں میں اسے بھرا ہے۔"

"ویسے نئے زمانے میں اس سب کی قیمت کیا ہو گی؟" اس کو بھی دلچسپی ہوئی۔

"بنداہارا کی نوکرانی شریفہ کے خطوط سے لے کر سلطان کے زیر استعمال مہر شدہ جام تک' یہ ساری پھینکی ہوئی چیزیں جب ہم نکال کے ماہرین کے پاس ٹیسٹ کے لیے لے کر جائیں گے تو یہ چیزیں ہر ٹیسٹ پاس کر جائیں گی۔ ہم ان کی عرب اور یورپی ممالک میں نیلامی کروائیں گے اور ایک ایک چیز کروڑوں ڈالر میں بکے گی۔ تم اور میں بہت امیر ہونے جا رہے ہیں ایڈم!"

پھر ایک دم وہ مسکرائی اور اوپر سیاہ آسمان کو دیکھا۔

"یہی منظر تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ مجھے لگا تھا اس میں ہم خزانہ ڈھونڈنے کی بات کر رہے ہیں مگر نہیں۔ ہم اس میں خزانہ دبانے کے بعد کھود کے نکالنے کی بات کر رہے تھے۔ سارے چکر وقت کے تھے ورنہ ہر بات سمجھ میں آ سکتی تھی۔"

وہ دونوں اب سبزہ زار سے نیچے اتر رہے تھے جہاں ان کے گھوڑے منتظر کھڑے تھے۔ پہلی دفعہ ایڈم کو اس کی باتوں سے امید ہونے لگی تھی کہ واپس جا کے.... وہ بھی امیر ہو جائے گا۔ واہ!

☆☆☆

مجسمے کو بناتے بناتے چھٹا دن آ پہنچا تھا۔ اس دوپہر وہ سن باؤ کے صحن میں موجود تھی اور کام کر رہی تھی۔ سنہرے بالوں کا جوڑا بنائے' شفاف چہرہ لیے وہ مخملیں چغے میں ملبوس تھی۔ زیور پہنے ہاتھوں پہ گارا ابھی تک لگا تھا۔ بنیادیں بھری جا چکی تھیں اور مجسمے کی ٹانگیں بن چکی تھیں۔ تالیہ پیچھے ہٹی اور توصیفی انداز میں مجسمے کو دیکھا۔

"میرے آرٹ کو مانتے ہو یا نہیں؟" ساتھ کھڑے ایڈم سے ستائش طلب کی۔ اس نے گہری

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سانس لی۔

"قیامت کے دن اس میں جان ڈالنی پڑے گی آپ کو محترمہ! میرے اعمال نامے کو ان سیاہ کاریوں سے دور رکھیے۔"

تالیہ نے تنک کے اسے دیکھا۔ "چوری کرنے سے تو یہ بہتر کام ہے نا! اور پھر ایک دن میں اس کو خود ہی گرا دوں گی۔ جب.... ہم وہ خزانہ نکالیں گے۔" دبے الفاظ میں یاد کروایا۔

"چلیں، مان لیا۔ اچھا اگر آپ کو مجسمے سے فرصت مل جائے تو مجھے ان کتابوں کا بتائیے گا' شہزادی صاحبہ! وہ ہمیں بنداہارا کے خزانے تک لے جاسکتی ہیں۔" اس نے بھی آواز دھیمی کی۔

"تم محل واپس جاؤ' ایڈم! ملکہ نے وہ کتابیں تمہارے کمرے میں اب تک بھجوادی ہوں گی۔"

ایڈم کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ "اور آپ مجھے اب بتا رہی ہیں؟ جانتی ہیں' تین چاند والے جزیرے پہ چھپی دولت ملاکہ کے لوگوں کی امانت ہے اور اس کا ڈھونڈنا بہت ضروری تھا۔"

"مگر میں ٹھہری لالچی، خودغرض، چور عورت۔ میرے لیے میرا خزانہ (مجسمے کے قدموں کی طرف اشارہ کیا) زیادہ ضروری تھا۔ اب جاؤ تمہارا کام یہاں ختم ہے۔"

شان بے نیازی سے ہاتھ جھٹکا تو وہ فوراً (سلام آداب بھول کے) باہر کو بھاگا۔

تالیہ واپس اپنا کام کرنے لگی۔ اسی اثناء میں سن باؤ اپنے کمرے سے نکلا اور اس کی طرف آیا۔ ادب سے سلام کیا۔

"معذرت' شہزادی۔ میں آپ کو تنہا چھوڑ کے کام کرنے چلا گیا۔ چند اہم خطوط شاہ چین کی طرف ارسال کرنے تھے اور ابھی ابھی قاصد نے اطلاع دی ہے کہ ملکہ نے مجھے بلوایا ہے۔"

"آپ آرام سے اپنے کام کیجیے' وانگ لی۔ میں یہ مجسمہ آپ کی طرف دیکھے بغیر بھی مکمل کر سکتی ہوں۔ کل تک یہ تیار ہوگا۔" وہ جھکی اور گارے کو ہاتھوں میں بھرے اٹھی۔ وانگ لی کی طرف پشت تھی۔ وانگ لی ممنونیت سے مسکرایا۔

"آپ کا شکریہ شہزادی۔ میری پرانی خواہش پوری کرنے کے لیے۔"

شہزادی نے جواب نہیں دیا۔ برآمدے کی طرف پشت کیے وہ مجسمے کے اوپر مٹی لیپتی رہی۔ کتنی دیر گزری اسے علم نہ ہوسکا۔ وانگ لی کام سے چلا گیا اور وہ مجسمہ بناتی رہی۔ آوازیں البتہ سنائی دی تھیں۔ کوئی باہر سے آیا تھا اور برآمدے کی طرف آنے کی بجائے راہداری سے سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ زینے چڑھنے کی آواز آئی.....

پھر تالیہ کو محسوس ہوا کہ کوئی بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی میں آکھڑا ہوا ہے۔

کوئی ہیولہ سا.... جیسے کوئی دراز قد' توانا مرد ہو.... اور وہ نیچے دیکھ رہا ہو.....

جہاں صحن کے کونے میں وہ کھڑی تھی.... مخملیں چغہ پہنے.... جو شاہزادیاں سفر میں پہنا کرتی تھیں.... اس کی کھڑکی کی طرف پشت تھی.... بالوں پہ ریشمی اوڑھنی لے رکھی تھی اور سر پہ سجے تاج کی پشت دکھائی دے رہی تھی.....

چغے کی آستینوں سے نکلتی سپید بانہوں میں سونے اور ہیرے کے کنگن تھے.... خوب صورت ہاتھوں میں زمرد اور یاقوت جڑی انگوٹھیاں تھیں.... اور وہ ہاتھ مہارت سے مٹی اور گارے سے چبوترے پہ مجسمہ بنا رہے تھے۔

شاہزادی.... مجسمہ بناتے ہوئے بار بار رکتی تھی۔ گردن ذرا سی موڑتی تھی.... شکل ابھی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی.... بس ماتھے کے اوپر تاج کا کونا کنپٹی سے جھلکتا تھا۔

بار بار گردن موڑنے کی خواہش کے باوجود وہ واپس چہرہ پھیر جاتی تھی.... جیسے واقف تھی کہ اوپر کھڑکی میں کوئی اسے دیکھ رہا ہے.... پھر دفعتاً وہ سر جھکا کے ہلکا سا ہنسی.... اور گردن موڑی.... بالائی منزل کی کھڑکی میں کھڑا مرد تعجب سے اسے دیکھ رہا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھا۔ چہرہ تکان سے لبریز تھا اور بال الجھے بکھرے سے تھے۔

اسے خود کو دیکھتے پا کے وہ مسکرایا اور پھر واپس پلٹ گیا۔ زینے اترنے کی آواز آئی۔

تالیہ پلٹ کے اپنا کام کرنے لگ گئی۔

دفعتاً اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکا مگر اطمینان سے مسکراتے ہوئے مجسمہ بناتی رہی۔

"شہزادی!" ادب سے کہا گیا تو وہ اس نے بے نیازی سے چہرہ موڑا۔ "توانکو!"

وہ دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے خوش گوار حیرت سے مجسمے کے قریب آیا اور چاروں طرف سے اسے گھوم پھر کے دیکھا۔

"میں چھ دن سے جیا میں تھا۔ وانگ لی نے گھر آنے سے منع کر رکھا تھا۔ یقیناً تم نے منع کیا ہوگا۔" وہ ستائش سے مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ "پہلے تو کہہ رہی تھیں کہ مجسمہ بنانے نہیں آؤ گی۔"

"میں صرف یہ کہہ رہی تھی کہ بالائی منزل کے مکین سے ملنے نہیں آؤں گی۔"

"تو میری بیوی درست تھی۔ شہزادی تاشہ یہاں صرف وانگ لی کی دوستی میں آتی تھی۔" وہ گردن جھکا کے مجسمے کا جائزہ لے رہا تھا۔

تالیہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ایک دم سرخ اینٹوں والے صحن میں کوئی عجیب مردنی سی چھانے لگی تھی۔

"آپ کی بیوی درست ہے۔" ایک چور نظر مجسمے تلے زمین پہ ڈالی جواب برابر کر دی گئی تھی اور جس کے اندر بہت کچھ دفن تھا۔ "اور آپ کو مجھے میرا مقام یاد دلانے کے لیے عصرہ بیگم کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے وہ فیصلہ صرف آپ کے اوپر بھروسا کر کے کیا تھا۔" آواز میں درشتی گھل گئی۔

"ٹھیک کیا تھا۔" وہ ابھی تک مجسمے کو دیکھ رہا تھا۔ انداز بے نیاز سا تھا۔ اس کے لیے صرف آزادی اہم تھی۔ کوئی رشتہ، کسی کے احساسات، اس سب کے نتائج، سب ثانوی تھا۔

"اگر آپ نے میرے کام کو سراہ لیا ہو تو پلیز ہٹ جایئے۔ مجھے میرا کام کرنے دیں۔" وہ سپاٹ سے انداز میں بولی تو فاتح نے بس مسکرا کے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ تالیہ کی طرف پشت ہوئی تو اس کی گردن کا نشان اس کی نظروں میں چبھا۔

تالیہ کا سانس تھم گیا۔ "توانکو! آپ نے وہ غازہ اتار دیا؟"

اس نے مڑ کے تالیہ کو دیکھا اور کندھے اچکائے۔ "تمہیں لگتا ہے وان فاتح کسی سے ڈرتا ہے؟" مسکرا کے سر جھٹکا اور برآمدے کی جانب چلا گیا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

ان کے درمیان کچھ بھی نہ بدلا تھا اور جیسے سب بدل گیا تھا۔

"میں اگلے تین دن مجسمہ بنانے کے لیے روز آؤں گی۔ کوشش کیجیے گا کہ آپ وہ وقت جیا میں ہی گزاریں تاکہ میں آرام سے اپنا کام کر سکوں۔" قدرے خفگی سے اسے پکارا مگر وہ ان سنی کر کے اندر جا چکا تھا۔

"ہونہہ۔ گستاخ۔" وہ سر جھٹک کے واپس مجسمے کی طرف متوجہ ہوئی۔

☆☆☆

یہ تیسرے روز کی بات ہے جب وہ سن باؤ کے گھر سے تھکی ہاری واپس اپنے محل آئی اور اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو ایڈم بن محمد بے چین سا وہاں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میز پہ چند کاغذ رکھے تھے۔ اسے دیکھ کے فوراً اٹھا۔

"مجسمہ مکمل ہو گیا؟"

"اپنے سارے رازوں کے ساتھ وہ مکمل ہو گیا۔" وہ مسکراتے ہوئے اندر آئی۔ دروازے بند کر دیے اور ایک قندیل بجھا دی۔ روشنی ہلکی ہو گئی اور کمرے کا ماحول اسراریت میں ڈوب سا گیا۔

"تھک گئیں کیا؟" وہ جو کچھ اور کہنے لگا تھا اس کا تکان زدہ چہرہ دیکھ کے بات روک لی۔

وہ سنگھار میز تک آئی اور ننھے صندوق سے خوشبودار گیلا رومال نکالا' پھر اس سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں نے ان معمولی چیزوں میں سے کوئی بھی چیز چرائی نہیں تھی' ایڈم ۔ میں نے وہ خود حاصل کی تھی۔ جائز طریقے سے۔ سوائے شریفہ کے خطوط کے۔ ان کے لیے بھی آج ایک بھاری رقم اسے ادا کر دی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں ان خطوط کو چھ سو سال بعد بیچنا چاہتی ہوں مگر وہ خوش ہے اور میں بھی خوش ہوں کیونکہ یہ خزانہ جو ہمیں بہت امیر کرے گا' میری جائز کمائی کا ہوگا۔" پھر رومال رکھا اور مسکرا کے سنگھار میز کے کنارے پہ ٹک گئی۔ ایڈم واپس بیٹھا اور کاغذ سامنے پھیلائے۔

"تین چاند والا جزیرہ ملاکہ سے مغرب کی سمت ڈیڑھ دن کی مسافت پہ ہے۔ ہمیں جلد از جلد وہاں جانا ہوگا۔ کچھ نقشے اس کتاب میں تھے' اور کچھ میں نے شہر کے کتب خانوں سے اکٹھے کیے ہیں۔"

پھر وہ جوش سے کاغذ پہ مختلف مقامات پہ انگلی رکھ کے اسے راستہ سمجھانے لگا۔ دفعتاً اسے ایک خیال آیا۔

"مگر آپ کیسے جاسکیں گی؟ کم از کم تین دن تو آنے جانے میں لگ جائیں گے۔"

"اس کی فکر مت کرو۔ شہزادیاں رواج کے مطابق شادی سے قبل چند دن شاہی آداب کی تربیت حاصل کرنے جنوبی محل کی طرف چلی جاتی ہیں۔ راجہ مراد نے مجھے بھی وہاں جانے کو کہا ہے۔ انکار کروں گی تو راجہ کو شک ہوگا۔ یوں کرتی ہوں کل وہیں چلی جاتی ہوں۔ تم میرے ساتھ آنا ۔ وہاں سے ہم سمندری سفر پہ نکل جائیں گے۔"

ایڈم کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ "اگر ہم ملاکہ کے لوگوں کی لوٹی دولت واپس لا سکیں تو ملاکہ کو چین سے قرضہ لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم تاریخ بنانے جا رہے ہیں چے تالیہ۔" وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ تالیہ بھی مسکرا دی۔

"تم تیاری کرو۔ ہم علی الصباح روانہ ہوں گے۔"

وہ پرعزم تھی۔ ایک تھکا دینے والے دن کے بعد ایک مشکل صبح کا آغاز ہونے والا تھا۔

اپنے کمرے میں کرسی میز پہ براجمان مراد راجہ لکڑی کی ننھی کشتی میں کیل ٹھونکتا دکھائی دے رہا تھا۔ میز پہ چند آلات اور لکڑی کے باریک ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور وہ مہارت سے اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ سامنے ہاتھ باندھے مؤدب سا عارف کھڑا اگلے حکم کا منتظر تھا۔

"شہزادی تاشہ جلد جنوبی محل روانہ ہو جائے گی۔" وہ نظریں کشتی پہ جمائے سرد آواز میں بولا۔ "اس کے جاتے ہی تم وانگ لی کے اس غلام کو گرفتار کر کے یہاں لے آؤ گے جس کے گردن پہ تمہارے آدمی کو چند دن پہلے وہ نشان نظر آیا تھا۔ ابھی تک میں صرف شہزادی کی وجہ سے خاموش تھا۔ اس کے جاتے ہی یہ کام ہو جانا چاہیے۔"

"جو حکم عالی جاہ!" عارف نے فوراً سر جھکایا۔

مراد راجہ اب مہارت سے کشتی کے اوپر ننھا سا بادبان لگا رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر گہری مہیب رات اتر رہی تھی۔ خاموشی سے۔ چپ چاپ۔

☆☆☆

اس صبح سرخ حویلی کے صحن میں وہ مجسمہ اپنے پورے قد سے کھڑا تھا۔ کنویں سے پانی کا ڈول نکالتے وقت وان فاتح نے گردن موڑ کے اسے دیکھا اور مسکرایا۔ عجیب لڑکی تھی۔ کبھی کہتی تھی مجسمہ نہیں بنائے گی اور اب.... چند دن میں یہ اونچا سا بت تراش کے چلی گئی۔ اسے صنم تراشی' پینٹنگز اور ایسی چیزوں میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر یہ مجسمہ.... وہ اس کو ہمیشہ وہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک حصہ اس مجسمے کو دیکھتے گزرا تھا۔

پانی کا ڈول اس نے برآمدے میں رکھا ہی تھا کہ دروازہ بج اٹھا۔ دستک ایسی گرج دار اور خوف ناک تھی کہ وہ چونکا۔ پھر تیزی سے راہداری میں آیا اور دروازہ کھولا۔

سامنے اسلحے سے لیس شاہی سپاہی کھڑے

تھے۔ ان کی تلواریں میان سے باہر تھیں۔
"فاتح بن رامزل! تمہیں بنداہارا مراد راجہ کے حکم پہ گرفتار کیا جاتا ہے۔" ایک سپاہی نے گرج دار آواز میں حکم سنایا' باقی دو اس پہ جھپٹے اور اسے بازوؤں سے پکڑ کے گھٹنوں کے بل زمین پہ بٹھایا۔ سختی سے اس کے ہاتھ کمر پہ لے جاکے رسی سے باندھے۔
شورسن کے وانگ لی بستر سے نکل کے فوراً باہر آیا تھا۔
"اس کو کیوں لے جارہے ہو؟ کیا قصور ہے اس کا؟" وہ چلایا تھا۔
گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھے فاتح نے چہرہ اٹھایا اور ایک نظر وانگ لی کو دیکھا۔ "آپ آرام فرمائیے' مالک۔ مجھے اپنے سارے قصور معلوم ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ جانے دیجیے۔" وہ ضبط سے کہتا پرسکون نظر آرہا تھا۔ انہوں نے اس کے کندھوں پہ زور دے کے اسے گھٹنوں کے بل بٹھا رکھا تھا۔ ایک آدمی اس کے ہاتھوں کو رسی میں جکڑے جارہا تھا۔
"مگر...." وانگ لی نے پریشانی سے ان سپاہیوں کی فوج کو دیکھا اور پھر سیاہ گھوڑا گاڑیوں کو جو سامنے کھڑی تھیں۔ قیدی کو لے جانے کے لیے تیار!
"مالک!" اس نے مسکرا کے وانگ لی کو مخاطب کیا۔ سپاہیوں نے اسے جبراً اٹھایا اور گاڑی کی طرف لے جانے لگے۔
"جب میں نے کہا تھا کہ میں بادشاہوں اور رئیسوں کے ساتھ بھی گھوما ہوں اور محلوں میں بھی رہا ہوں تو میں نے درست کہا تھا۔ وان فاتح نہ کسی سے متاثر ہوتا ہے' نہ کسی بنداہارا سے ملنے سے ڈرتا ہے۔ آپ فکر مت کیجیے۔ مراد راجہ کو ابھی معلوم نہیں ہے کہ یہ ملاقات میری مرضی اور خواہش سے ہورہی ہے۔"
وہ اسے گاڑی کی طرف لے جارہے تھے اور وہ ان کے ساتھ چلتا' گردن موڑے اپنے مالک کو مسکرا کے تسلی دے رہا تھا۔ فربہ چینی سفارت کار بس سر پہ ہاتھ رکھے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اس کا غلام آج اسے پہلی دفعہ آزاد لگا تھا۔

☆☆☆

سنہری دھوپ نیلے سمندر کی سطح پہ چمک رہی تھی۔ تاحدِ نگاہ پانی پھیلا تھا جو پرسکون اور شانت تھا' اور بڑے وقار سے اپنے سینے پہ ایک وسیع و عریض کشتی کو اٹھائے ہوئے تھا۔
کشتی کا بادبان ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ کوئی عام کشتی نہ تھی۔ خوب اونچی اور چوڑی کشتی جس کے تہہ خانے میں کمرے بنے تھے اور وہاں شریفہ سامان جوڑتی دکھائی دے رہی تھی۔
زینے چڑھ کے اوپر آؤ تو کشتی کا یہ کھلا عرشہ تھا جس کے دونوں کونوں میں تیر کمان اور اسلحے سے لیس سپاہی چوکنے کھڑے سمندر کو نگاہوں میں رکھے ہوئے تھے کہ ابھی پانی میں کوئی ہلچل مچے تو ان کے تیر مدافعت کے لیے تیار تھے۔
عرشے کے وسط میں لکڑی کے بنچ لگے تھے۔ تالیہ وہاں بیٹھی تھی۔ اس نے شہزادیوں کے لباس کے برعکس سیاہ پاجامہ قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے اوپر سیاہ چغہ تھا جو ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سرد ہوا سے چغے کی ٹوپی بار بار پیچھے گرجاتی اور کانوں پہ ہوا لگنے لگتی۔
"یہ تمام سپاہی آپ کے اعتبار کے ہیں نا؟" ایڈم سامنے والے بنچ پہ بیٹھتے ہوئے بولا تو وہ جو دور تک پھیلے سمندر کو دیکھ رہی تھی' چونک کے مڑی۔
ایڈم کافی مطمئن نظر آرہا تھا۔ کرتے پاجامے کے اوپر سیاہ چغہ پہنے' اس نے سردی سے بچنے کے لیے مفلر بھی کانوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔
"ہاں.... میں نے ان کی وفاداری فی الحال تو خریدی ہوئی ہے۔ ہم ان کے بغیر سفر نہیں کرسکتے تھے۔ مراد راجہ نے اس جزیرے پہ اپنا سونا یوں ہی تو نہیں چھوڑا ہوگا۔ پوری فوج تعینات کر رکھی ہوگی۔ ہمیں ان کے مقابلے کے لیے ان سب کی ضرورت ہے۔" پھر اس نے کھوجتی نگاہوں سے سمندر کو دیکھا۔
"کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟"
"بس اب ہم قریب ہیں۔" ایڈم نے افق کو

دیکھتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تو وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔

"یہ کہاں سے سیکھا تم نے؟"

"کیا؟"

"یہ نقشے پڑھنا.... سمندر میں راستے تلاش کرنا...."

"آپ بھول رہی ہیں' میں فوج میں تھا اور وہاں یہ سب سکھاتے ہیں۔"

وہ جواب میں کچھ تیکھا کہنے لگی مگر پھر ارادہ بدل دیا اور دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"تم واپس جا کے کیا کرو گے؟"

ایڈم دھیما سا مسکرایا۔ "آپ کو واپس جانے کا جتنا یقین ہے اتنا مجھے نہیں ہے' چے تالیہ! لیکن اگر میں واپس گیا تو...." اس نے سوچنے والے انداز میں سانس اندر کھینچی۔ "تو میں کسی سیکیورٹی کمپنی میں اپلائی کروں گا اور کہیں گارڈ بھرتی ہو جاؤں گا۔ اس سے بہتر جاب مجھے نہیں ملے گی کیونکہ نہ میرے پاس تعلیم ہے نہ تجربہ۔"

"تجربہ تو یہاں تم نے بہت حاصل کیا ہے۔"

"مگر یہ تجربہ وہاں میرے کس کام آئے گا؟ وہ دوسری دنیا ہے' چے تالیہ۔" اس نے یاد دلایا۔ پھر قدرے ٹھہر کے بولا۔ "اور آپ؟ آپ کیا کریں گی؟"

"میں!" وہ پُرجوش انداز میں مسکرائی۔ "میں سب سے پہلے اس خزانے کو کھود کے نکالوں گی' پھر تھوڑا سا بیچوں گی اور ایک گھر خریدوں گی۔"

"جزیرے پہ محل؟ جو آپ کا خواب تھا؟"

تالیہ کا منہ بن گیا۔ "ہرگز نہیں۔ بہت دیکھ لیے جزیرے اور بہت دیکھ لیے محل۔ اب مجھے کسی پُررونق ہجوم والی جگہ پہ گھر لینا ہے۔ جہاں مارکیٹ' ریسٹورنٹس اور ٹریفک کا شور ہنگامہ ہو۔"

"کے ایل کے بالکل وسط میں ایک علاقہ ہے جہاں...."

"کے ایل نہیں' ایڈم۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "میں کہیں دور چلی جاؤں گی۔ کسی دوسرے ملک اور نئی زندگی شروع کروں گی۔"

وہ بس اسے دیکھ کے رہ گیا۔ "یعنی آپ یہ طے کر چکی ہیں کہ وان فاتح واپس جاتے ہی آپ کو چھوڑ دیں گے؟"

"انہوں نے مجھے اپنایا ہی کب ہے؟ اور ظاہر ہے وہ چھوڑ دیں گے۔ ویسے بھی میں اتنی باوقار ہوں کہ کسی کے بس نام کے سہارے پہ زندگی نہیں گزاروں گی۔" نخرے سے سر جھٹکا۔

"لیکن ہو سکتا ہے وہ آپ کو نہ چھوڑیں۔ ان کو آپ سے محبت ہو جائے۔ ساری تلخیاں' سارے خواب' سب بھول جائیں وہ اور ایک دنیا سے ٹکر لے کر آپ کو اپنا لیں۔"

"میں چور تھی' جھوٹی تھی' لوگوں کو لوٹتی تھی مگر گھر توڑنے والوں میں سے نہیں تھی' ایڈم۔ میں ان کے بیوی بچوں کی زندگی کبھی خراب نہیں کروں گی۔" اسے جیسے اس بات پہ دکھ ہوا تھا۔ "اور یہ شادی.... یہ میری مرضی سے نہیں ہوئی۔ یہ ان کی ایماء پہ ہوئی ہے۔ داتن ہوتی تو کتنا ہنستی۔" بڑے دن بعد آج وہ یاد آئی تھی۔ مگر پھر اس نے یاد کو جھٹک دیا۔

"اچھا ٹھیک۔ فرض کیا انہوں نے آپ کو جاتے ساتھ ہی تنسیخ نکاح کے کاغذات پکڑا دیے ہیں' اس کے بعد کیا کریں گی آپ؟"

لہروں کے شور کو سنتے چند لمحے کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔

"تعلیم تو میری بھی خاص نہیں ہے مگر تجربہ بہت ہے۔ میں پینٹ کروں گی اور آرٹ ورکس بناؤں گی۔ اس خزانے سے امیر بھی ہو جاؤں گی' دنیا گھوموں گی' نئے دوست بناؤں گی۔"

"اور پرانے دوستوں سے بہت دور جانا چاہتی ہیں آپ!" وہ اداسی سے مسکرایا۔

"پرانے دوست بھی تو اپنی زندگیوں میں مگن ہو جائیں گے۔ تم سیکیورٹی گارڈ بن جاؤ گے' میں آرٹسٹ اور وان فاتح...."

"وہ تو وزیراعظم بنیں گے۔" دونوں ایک ساتھ بولے اور پھر ہنس دیے۔ نیلا سمندر بھی ان کے

ساتھ ہنستا تھا۔

"کیا آپ ملاکہ کو مِس کریں گی، چے تالیہ؟"

تھوڑی دیر بعد وہ سمندر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ چاروں طرف گویا نیلی چادر سی بچھی تھی جس پہ وہ تیر رہے تھے۔

"یہاں ہے ہی کیا جسے میں مِس کروں گی؟"

"یہاں ہے ہی کیا؟ محترمہ! یہاں آپ شہزادی ہیں، حکم چلاتی ہیں، بے پناہ طاقت کی مالک ہیں۔ اور وہاں آپ لوگوں کی جیبیں کاٹتی پھرتی تھیں۔ روپ دھار دھار کے نوکریاں کرتی تھیں۔"

تالیہ نے برہمی سے اسے دیکھا۔ "زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میری خوش اخلاقی ایکسپائر ہو جائے گی۔"

ایڈم کے چہرے کے زاویے فوراً سیدھے ہوئے۔ تالیہ تفاخر سے مسکرائی، مگر بجائے تعظیم پیش کرنے کے وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ تالیہ نے چونک کے گردن موڑی۔

سامنے سبز سی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ دور کوئی جزیرہ سا تھا۔

"یہی ہے.... یہی ہے تین چاند والا جزیرہ۔" وہ جوش سے کھڑا سپاہیوں کو ہدایت دینے لگا۔ "کشتی کو اس طرف لے جاؤ۔"

وہ بے چینی سے اٹھی اور آسمان کو دیکھا۔ "شام ڈھلنے کے قریب ہے۔ ہمیں چاند نکلنے کے وقت تک اس جگہ پہ پہنچ جانا چاہیے۔" پھر چغہ سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی اور سپاہیوں کے سر پہ جا رکی۔

"جزیرے پہ ضرور کوئی نہ کوئی ہمارا منتظر ہو گا۔" وہ بلند آواز میں بولی اور سب رک کے اسے سننے لگے۔ "سپاہی، فوج، مقامی لوگ۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر تم لوگ.... تم پوری جانفشانی سے لڑو گے۔ یاد رکھو ہم نے زندہ واپس جانا ہے وہ سب لے کر جس کے لیے ہم آئے ہیں۔ واپس پہنچ کے نہ صرف میں تم میں سے ہر ایک کو انعام و اکرام سے نوازوں گی بلکہ تمہیں آزاد بھی کر دوں گی۔" وہ پورے قد سے کھڑی ان سے مخاطب تھی۔ ہوا سے چغہ پھڑپھڑا رہا تھا اور ٹوپی پیچھے کو ڈھلک گئی تھی۔

"لیکن اس سے پہلے.... تم لوگوں کو لڑنا ہو گا۔ اس جزیرے اور اس کے آسیبوں سے.... تمہیں لڑنا ہو گا، اپنی شہزادی کے لیے لڑو گے نا؟"

"آپ ہمیں ہر امتحان میں پورا پائیں گی، شہزادی۔" ایک سپاہی جوش سے بولا تو وہ مسکرائی اور گردن موڑ کے ایڈم کو دیکھا۔

"سارے خزانے، ساری جابز، تعلیم، ایوارڈز انسان جو کچھ بھی حاصل کر لے، ہر چیز ایک طرف۔ اور "طاقت اور حاکمیت" ایک طرف ہے، ایڈم۔ ہاں، شاید اس چیز کو میں مِس کروں گی!"

ایڈم بس مسکرا دیا۔

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ کشتی تیزی سے تیرتی ہوئی جزیرے کے قریب جا رہی تھی۔ تالیہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہاں کیا ان کا منتظر ہو گا؟

کوئی آسیب.... کوئی فوج؟

☆☆☆

سلطنت محل پہ شام اترتی دکھائی دے رہی تھی اور اونچی دیواروں پہ لگی قندیلیں جلنے لگی تھیں۔ غلام اور کنیزیں نظم و ضبط سے سارے کام نپٹاتے پھر رہے تھے۔ ایسے میں محل کی ایک اونچی بالکونی میں ملکہ یان سو فو کھڑی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے، وہ تاج اور زیورات سے لدی پھندی، مسکرا کے نیچے دیکھ رہی تھی۔ بڑے دن بعد وہ اتنی پرسکون نظر آتی تھی۔

"اتنے پریشان کیوں ہو، وانگ لی؟" اس کا مخاطب چینی سفارت کار عقب میں کھڑا تھا۔ چہرہ بے چین اور اداس لگتا تھا۔

"ملکہ عالیہ! مراد راجہ نے میرے غلام کو گرفتار کر لیا ہے۔ مجھے یہ سوچ کے خوف آ رہا ہے کہ اب کیا ہو گا؟"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

منہا کی دادی اکثر علی الاعلان یہ کہتی پائی جاتیں کہ "کسی سے رشتہ جوڑتے وقت لڑکی سے پہلے اس کی ماں کو دیکھ لو کیونکہ لڑکیاں ماں کا عکس ہوتی ہیں اور لڑکے باپ کا پرتو۔" لیکن دادی اپنے اس فرمان سے یوں مکر جائیں گی، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کیونکہ خاندانی تاریخ گواہ تھی کہ دادی نے اپنی زندگی میں جو بات کہی اور چھوٹے

بڑے جتنے بھی فیصلے کیے، ان پر ڈنکے کی چوٹ پر قائم رہیں۔

شاکرہ پھپھو کے جانے کے بعد "دادی کا یہ کہنا کہ "لازمی نہیں ہے بیٹا "باپ جیسا ہی ہو۔" اسے اچھنبے میں مبتلا کر گیا۔ اپنے بی اے کے امتحانات میں بری طرح مصروف ہونے کے باوجود وہ نوٹ کیے بنا نہ رہ سکی کہ دادی کی سرگرمیاں کچھ "مشکوک" قسم کی ہوتی جارہی ہیں۔ شاکرہ پھپھو کی ایک ہی ہفتے میں دوبار ہنگامی آمد ہوئی اور آتے کے ساتھ ہی وہ دادی کے کمرے میں گھس گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ دہلیز پر کھڑی پکار رہی تھیں۔

"بھابھی جی! ذرا یہاں آئیں۔" اور بھابھی جی اتنی فرماں بردار کہ نند کی ایک ہی پکار پر کفگیر ہاتھ میں تھامے دوڑی چلی آئیں۔ دروازہ اندر سے بند کرلیا گیا۔

شام کو ابا گھر آئے تو انہیں ہاتھ منہ دھونے کی مہلت دیے بنا فوراً دادی کے کمرے میں طلب کرلیا گیا۔ نجانے کون سا ایسا مسئلہ تھا جو حل ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ کبھی آواز دب جاتی تو کبھی ایک دم بلند ہوجاتی۔

چائے کی ٹرے لے کر دادی کے کمرے کی جانب سے آتی نغمہ بھابھی ایک بھرپور معنی خیز نگاہ اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ اس کی چھٹی حس الارم پر الارم بجا رہی تھی۔ منہا کان لپیٹ کر اپنے سامنے کھلی کتاب پر جھک گئی۔ وہ جانتی تھی، ان کے گھر کی بلی زیادہ دیر تک تھیلے میں بند رہنا پسند نہیں کرتی۔ جو بھی بات ہوئی جلد کھل کر سامنے آجائے

☆☆☆

ادھر اس کے امتحان ختم ہوئے، ادھر دادی نے جھٹ تھیلے سے بلی باہر نکال دی۔ بلکہ بلی کیا، اتنا بڑا بلا۔

دادی کی دختر نیک اختر اپنے ہونہار سپوت کے لیے منہا کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ شاکرہ پھپھو کا اس کے لیے رشتہ مانگنا اتنی حیرت کی بات نہیں تھی جتنی حیرت اسے یہ جان کر ہوئی کہ ابا سمیت سب نے اس رشتے کو قبول بھی کرلیا ہے بلکہ شادی کی تاریخ بھی طے کر ڈالی۔ اس نے پاؤں پٹخے، سر جھٹکا، ہاتھ جوڑے، بھوک ہڑتال، رونا دھونا سب کیا لیکن نتیجہ وہی۔

"آخر سب جانتے بوجھتے میرے ساتھ ایسا کیسے کرسکتے ہیں۔"

یہی سوال اس نے بہت دل گرفتہ انداز میں دادی کے سامنے جا کر کیا۔ انہوں نے اسے محبت سے اپنے پاس بٹھالینا چاہا لیکن وہ یونہی اینٹھی کھڑی رہی۔ خفا اور اکڑی۔

"شاکرہ جان چھڑکتی ہے تم پر، اگر اس نے تمہیں مانگ کر اپنے بھائی کے ساتھ رشتہ اور مضبوط کرنے کا سوچا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟"

دادی یقیناً اپنی زبان سے کسی اور کی بولی بول رہی تھیں۔

"مضائقہ یہ ہے دادی کہ جس شخص نے آپ کی بیٹی کو زندگی بھر خوش رہنے نہیں دیا اس کا بیٹا مجھے کون سا پھولوں کی سیج پر بٹھائے گا؟"

"لازمی ہے وہاج اپنے باپ جیسا ہو۔"

"اللہ اللہ!!" منہا مارے صدمے کے بے ہوش ہونے کو ہوگئی۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ کیسے اتنی آسانی سے اپنے فرمان سے مکر گئیں۔

"مطلب، جانتے بوجھتے مجھے اس جہنم میں دھکیلنا چاہتی ہیں جس میں آپ کی بیٹی سالوں سے جل رہی ہے۔"

"اگر وہ جہنم ہے تو تمہارا وجود اس کے لیے جنت کی طرف سے کھلنے والی کسی کھڑکی سے کم نہیں ہوگا۔"

سخت خفگی کے عالم، میں ان کے کمرے سے نکل کر اس نے ــــ ٹاک شو دیکھتے ابا کے سامنے جا کر پاؤں پٹخے۔

"ابا!"

اس دہائی میں سب کچھ تھا۔ اماں نے اس کھلی بدتمیزی پر اسے تادیبی نگاہوں سے گھورا لیکن اس نے مطلق پروانہ کی۔ یہاں سوال زندگی بھر کا تھا۔

"بیٹا! ہم نے بہت سوچ بچار کے بعد شاکرہ کو ہاں کی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے تم بہت خوش گوار زندگی گزارو گی وہاج کے ساتھ۔" ابا نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا وہ جذباتی بلیک میلنگ سے کام چلانے والوں میں سے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ اسے اس رشتے کے حق میں چاکلیٹ فلیور والی آئس کریم جیسے دلائل دیتے وہ نروٹھے پن سے وہاں سے بھی اٹھ گئی۔

"منہا! اپنا چائے کا کپ لے جاؤ۔" کچن سے نغمہ بھابی پکار رہی تھیں۔ اس نے خاموشی سے جا کر اپنا کپ اٹھالیا۔

"لڑکیاں اپنی شادی بیاہ کے معاملے میں یوں باپ بھائی کے سامنے سوال جواب کرتی اچھی نہیں لگتیں۔" اماں نے اپنی اس وقت در خور اعتنانہ جاننے والی گھوری کو اب بزبان دہرایا تھا۔ قبل اس کہ وہ کچھ بولتی، اس سے پہلے ہی بھابی بول پڑیں۔

"آپ چھوڑیں امی! یہ بتائیں خریداری کب سے شروع کریں۔ بہت تھوڑے دن ہیں، میرا خیال ہے کہ......"

"اف اف! کیا کوئی ایسی دیوار ہے جہاں جا کر میں اپنا سر پھوڑوں؟" کپ پٹختی وہ باہر نکل گئی۔

☆☆☆

تو ہوا وہی جو ان سب نے چاہا اور تقدیر کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پھپھو حقیقتاً اس پر جان وارتی تھیں لیکن اصل مسئلہ "صابر پھپھا" تھے۔

پھپھا انتہائی بد اخلاق، بدزبان اور بدمزاج واقع ہوئے تھے۔ جس کی جو بات مزاج پر گراں گزرتی بلا دھڑک اس کو جھاڑ کر رکھ دیتے۔

زندگی بھر انہوں نے پھپھو کو سکھ کا سانس لینے نہیں دیا تھا۔ بقول پھپھو زندگی بھر "ڈکٹیٹر" بنے ان کے سر پر سوار رہے۔ پھپھو ان کے اصولوں سے عاجز تھیں تو وہ بھی ان کے نظریات کے منکر تھے۔ چنانچہ چھوٹی موٹی باتوں سے شروع ہونے والا تنازعہ ہمیشہ زوردار جھڑپ پر ہی اختتام پذیر ہوتا۔

بچپن میں منہا نے جب جب ان کے گھر میں قدم رکھا اسے جنگ عظیم سوئم چھڑنے کے آثار دکھائی دیے۔

پھپھو سر پکڑے رو رہی ہوتیں اور پھپھا غصے سے فوں فاں کرتے باہر نکل جاتے۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اس نے ان کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے کی ہمت نہیں کی۔

وہاج پڑھا لکھا، خوبرو، برسر روزگار ہونے کے باوجود تھا تو ان ہی کا بیٹا۔ باپ کا پرتو......

اور اسی سوچ نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ دلہناپے کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہونے کے باوجود کسی خوش کن لطیف جذبے نے اس کے اندر انگڑائی تک نہ لی۔ بلکہ سارا وقت صابر پھپھا ہی حواسوں پر سوار رہے۔

☆☆☆

گو کہ وہ اس شادی پر دل سے راضی نہیں تھی۔

لیکن تھی تو ایک لڑکی نا۔ نرم گداز جذبات رکھنے والی۔ وہاج سے کزنوں والی بے تکلفی نہ ہونے کے باوجود اب اس کو اپنے شوہر نامدار کے روپ میں اتنے قریب بیٹھا دیکھ کر اس کی کا دل نئی تال پر دھڑک اٹھا تھا۔

"وہاج بیٹا! جلدی باہر آؤ، وہ کمینہ پھر گھس آیا ہے۔" ابھی تو اس نے پور پور سجی دلہن کو نظر بھر کو دیکھا بھی نہیں تھا کہ باہر سے صابر پھپھا کے چلّانے کی آواز پر مخملی کیس اس کی جھولی میں اچھالتا وہ باہر

بھاگا۔

"الٰہی خیر!! کون گھس آیا ہے؟ کوئی چور اُچکا یا ڈاکو......" مارے خوف کے وہ بیڈ سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ باہر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آرہی تھیں۔ صابر پھپا مسلسل کسی کو للکار رہے تھے اور پھپھو کے واویلے الگ۔

مزید صبر کرنا اس سے دوبھر ہوگیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھول کر اس نے باہر جھانکا اور سامنے کا منظر دیکھ کر بھونچکا رہ گئی۔ کچن کا سارا سامان برآمدے میں پڑا تھا اور تینوں افراد جھاڑو ڈنڈے اٹھائے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے گو یا نگی کا ناچ، ناچ رہے تھے۔ منہا نے آنکھیں جھپکیں اس کی سمجھ میں نہیں آیا کون کس کو مارنے کس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

تب ہی پھپا نے زوردار نعرہ بلند کیا۔

"پکڑا گیا کمینہ"

اور کمینہ ان کے پاؤں کے نیچے دبا دوسری چیں بھی نہ کرسکا۔ اس سے زیادہ دیکھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ دھپ سے بیڈ پر آبیٹھی، مقتول کو ٹھکانے لگانے کے بعد وہاج بھی ہاتھ جھاڑتا اس کے قریب آگرا۔

"سوری یار! چوہا گھس آیا تھا کچن میں۔ تم نہیں جانتیں، اماں اور ابا دونوں چوہوں سے کتنے الرجک ہیں۔ یہ تو شکر ہے جلد مارا گیا ورنہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ میں ساری رات گزر سکتی تھی۔ تھا تو بے چارہ مریل سا لیکن اچھی خاصی دوڑ لگوادی ہماری خیر وہ میں کیا کہہ رہا تھا۔" لہجہ بدل کر وہ تھوڑا رومینٹک ہوا۔

"کچھ نہیں، کسی چوہے کا ذکر خیر ہو رہا تھا۔" منہا جل کر بولی۔ شادی کی پہلی رات شوہر نامدار کے منہ سے "چوہانامہ" سن کر انوکھی نے پردھڑکنے والے دل کے نہاں خانوں میں اب بلیاں ناچنے لگی تھیں۔ چوہا...... بلی...... اف۔"

"نہیں اس سے پہلے" وہ بھی وہاج تھا، اپنے نام کا ایک منہا نے شرما کر سر جھکالیا۔

☆☆☆

فیروزی کامدار سوٹ پہنے وہ سج سج قدم اٹھاتی ناشتے کے لیے آئی تھی۔ بہت اچھے اور خوش گوار ماحول میں ابھی ناشتہ شروع کیا ہی تھا کہ شاکرہ بیگم نے پھر سے "چوہانامہ" چھیڑ دیا۔

"ہماری ہر احتیاطی تدبیر کو مٹی میں ملا کر نگوڑے اپنا مٹر گشت کرنے کا شغل پورا کرہی لیتے ہیں۔"

"تمہیں کہا تو ہے گھر کے سوراخ وغیرہ اچھی طرح بند کرکے رکھا کرو، ان ہی سوراخوں سے ہی تو اندر باہران کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔"

صابر پھپا کے کہنے پر پھپھو نے چائے کا کپ پٹخا۔ "تو آپ کا کیا مطلب ہے، ان سوراخوں میں دبے شاپر نکال کر چوہوں کو آمد و رفت کے راستے میں فراہم کررہی ہوں؟"

"اوہو! ویسے ہی ایک بات کہہ رہا تھا۔"

"خوب جانتی ہوں میں آپ کی ایسی باتوں کا مطلب۔ شادی کا گھر ہے، نکال دیا ہوگا کسی بچے نے سوراخ سے شاپر، لیکن آپ کو تو عادت ہے ہر غلطی کا الزام میرے سر دھرنے کی۔" پھپھو کا طیش لاتا، لہجہ طیش لیے ہوئے تھا۔ پھپا کی بھی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"تو اسی لیے میں سادگی سے شادی کرنے پر زور دے رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر شرارتی بچے شتر بے مہار ہوئے دوسروں کے گھر کا حشر کرکے رکھ دیتے ہیں۔ تمہیں ہی شوق چڑھا تھا گھر میں موج میلے لگانے کا۔"

"مجھے موج میلہ لگانے کا شوق نہیں ہے صابر صاحب! اکلوتے بیٹے کی شادی پر کسی کو نہ بلاتی تو ساری برادری ناراض ہوجاتی۔"

"تو اب کون سا برادری راضی ہوگئی ہے؟"

"اچھا، صبح صبح میرا دماغ مت کھائیں۔ ایک

چوہا کیا مار لیا، خود کو تیس مار خان ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔"

منہا ٹکر ٹکر کبھی غصے سے بل کھاتے صابر صاحب کو دیکھتی تو کبھی آتش فشاں بنی شاکرہ بیگم کو۔ وہاج نے بھی بدمزہ ہو کر چائے کا کپ ادھورا چھوڑ دیا۔

بات بڑھ گئی تھی اور وہی ہوا، پھپھا غصے سے تن فن کرتے باہر نکل گئے۔ پھپھو منہ پر دوپٹا ڈالے رونے لگ گئیں۔

"بس کریں اماں پلیز! آپ کو پتا تو ہے ابا کی عادتوں کا۔ پھر کیوں دل پر لے لیتی ہیں۔ چھوڑیں دفع کریں"۔ وہاج وہ کہہ رہا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"چھتیس سال ہو گئے مجھے اس آدمی کو برداشت کرتے کرتے، مجال ہے جو ایک دن سکون سے گزارنے دیا ہو۔ اب تو بہو بھی آگئی ہے۔ اسی کا ہی کچھ لحاظ کر لیتا۔"

"اگر وہ سدھرنے والوں میں سے ہوتے تو اب تک سدھر نہ چکے ہوتے۔ آپ خود کو ہلکان کرنا چھوڑ دیں بس۔" ماں کو کندھوں سے تھامے وہاج مسلسل ان کو پچکارے جا رہا تھا۔

"خود تو اس جہنم میں جل ہی رہی تھی لیکن اپنی خود غرض محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس معصوم کو بھی گھسیٹ لائی ہوں۔ تم بھی کیا سوچتیں ہو گی بیٹا! ناشتہ کیوں چھوڑ دیا؟ چلو شاباش، ختم کرو اسے۔" سرخ ناک رگڑتی وہ اب منہا کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

"بس پھپھو کر لیا ہے۔" وہ بہت الجھی الجھی وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

شام کو عجیب بات ہوئی۔

موسم بہت دل فریب ہو رہا تھا۔ منہا یوں ہی چہل قدمی کرتی پودوں کے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر پھپھا کسی پودے کی کیاری کی گوڈی کر رہے تھے۔ تب ہی وہاج وہاں سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ پھپھا نے اسے پکارا۔ پکار اتنی بلند تو ضرور تھی کہ منہا نے بھی سن لی۔ جبکہ وہاج بنا رکے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ پھپھا سر جھٹک کے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ منہا اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"وہاج پھپھا نے تمہیں آواز دی تھی شاید تم نے سنی نہیں۔"

"سن لی تھی۔" بیڈ پر نیم دراز وہ پاؤں ہلانے لگا۔

"تو رکے کیوں نہیں؟"

"کس لیے رکتا؟"

منہا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ "انہیں غالباً کوئی بات کرنی تھی تم سے تب ہی آواز دی۔"

"ہونہہ...... وہ اور ان کی باتیں۔ دیکھا نہیں تھا صبح کیسے معمولی سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا انہوں نے تم ابھی نہیں جانتیں ہمارے ابا کی فطرت، جب تک وہ اماں کو رلا نہ دیں انہیں چین نہیں ملتا۔"

وہاج کے لہجے میں باپ کے لیے اتنی تلخی اور بے زاری تھی کہ منہا سُن رہ گئی۔ پھر قدرے نرم آواز میں بولی۔

"وہاج! بات بے شک پھپھا نے شروع کی تھی لیکن بڑھانے کے بجائے ختم بھی تو کی جا سکتی تھی۔"

وہاج نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر موضوع بدل دیا۔

☆☆☆

اگلے روز وہ میکے چلی آئی۔

اماں تو اس کا سجا سنورا کھلا کھلا روپ دیکھ کر ہی مطمئن ہو گئیں۔ جبکہ دادی نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ اس کی صرف دادی نہیں تھیں۔ جو سوال ماں بہنیں یا دوست پوچھتی ہیں، وہ اس سے دادی پوچھ رہی تھیں۔

"وہاج خیال رکھتا ہے تمہارا؟ تم خوش تو ہونا؟ اور وہ صابر، اس نے کوئی اونچ نیچ تو نہیں کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

تمہارے ساتھ؟"
وہ ہنس ہنس کر ان کی تسلی کرواتی رہی۔ "سب ٹھیک ہے دادی" "دیکھا میں نہ کہتی تھی میرا وہاج باپ جیسا نہیں ہے۔" دادی کے۔ جھریوں بھرے چہرے پر نرم مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس کی طرف جھک کر قدرے رازداری سے بولیں۔
"اسے زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیوی کو تو پاؤں کے نیچے دبا ہی رکھا ہے تم زیادہ جی حضوری کرو گی تو تمہارے بھی سر پر چڑھ جائے گا۔"
منہا دادی کو دیکھ کر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

☆☆☆

"بیگم! میرا اصافہ نہیں مل رہا۔ ڈھونڈ کر رکھ دینا۔ آج عشاء کی نماز کے بعد مسجد میں اجتماع ہے، وہاں جانا ہے۔"
"مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دیا۔ بہو سے پوچھتی ہوں، شاید اس نے کہیں رکھا ہو۔"
"اچھا چھوڑو۔ ابھی رہنے دو بعد میں پوچھ لینا۔ کون سا ابھی ضرورت ہے؟"
انہوں نے وہاج کے کمرے کا دروازہ کھولتی بیگم کو فی الفور روکا۔ وہ بری طرح بگڑیں۔
"افوہ، ابھی اندر جانے میں کیا حرج ہے؟"
"بھئی بیگم! لحاظ بھی کوئی چیز ہوتی ہے، کہہ تو رہا ہوں، بعد میں پوچھ لینا۔"
"اوہو! میں کون سا کسی غیر کے کمرے میں گھسی جا رہی ہوں۔ میرے اپنے بیٹے کا کمرہ ہے۔ کیا یہاں جانے کے لیے بھی مجھے پہلے سوچ بچار کرنا پڑے گی۔"
"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔"
"ہاں تو کس نے کہا ہے بات کرنے کو۔"
منہا استری شدہ کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی۔ وہاج اپنے موبائل پر مصروف تھا۔ وہ دونوں یقیناً ان کے کمرے کے سامنے برآمدے میں کھڑے بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ صابر پھپھا ہمیشہ کی طرح واک آؤٹ کر گئے۔ جبکہ پھپھو دھاڑ سے دروازہ کھولتی اندر آئی تھیں۔
"کیا کہہ رہے تھے والد محترم!" وہاج نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔ پھپھو نے برہمی سے سر جھٹکا۔
"ان صاحب کی تو ہر بات نرالی ہے۔ اب بھلا بیٹے کے کمرے میں جانے کے لیے کیسا لحاظ، کیسی سوچ بچار۔"
منہا ساری بات سن چکی تھی۔ ایسے صابر صاحب سے قدر مہذب سوچ کی امید نہیں تھی۔
ماں کی رنجیدگی محسوس کر کے وہاج باپ سے ناراض ہوا۔ منہا کچھ سوچ کر دانستہ چپ رہی۔

☆☆☆

شام کو صابر صاحب نے اس کے کھانے کی دل کھول کر تعریف کی۔
انہیں تیزابیت کا مسئلہ تھا۔ منہا نے ان کی خاطر سالن وغیرہ میں مسالے کم ڈالنے شروع کر دیے تھے، کھانا سادہ لیکن لذیذ ہوتا۔ وہ ایک ایک نوالے پر گویا سر دھنتے رہے۔ اگلے روز منہا مٹر قیمہ پکا رہی تھی۔ تب ہی پھپھو کچن میں چلی آئیں۔
"اتنے کم مسالے کیوں ڈال رہی ہو۔ کھانے کا سواد ہی نہیں آتا۔"
"تیز مرچ مسالوں والے سالن کھانے سے پھپھا کہہ رہے تھے، ان کا سینہ جلنے لگتا ہے تو اس لیے"
"لو بھلا ان کی خاطر اب ہم کیا روز ایسے پھیکے کھانے کھائیں گے؟" کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے سالن میں اپنی مرضی سے مسالے ڈالے۔
"پھپھا بہت ناراض ہوں گے پھپھو!"
"تو پہلے کون سا راضی رہتے ہیں، تم چھوڑو ان کی تو ویسے ــــ عادت ہے۔ خوامخواہ شور مچانے کی۔"
منہا نے بے چارگی سے گہری سانس کھینچی، اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

کھانے کی میز پر ایسا گھمسان کا رن پڑا کہ منہا کو لگا جنگ عظیم سوئم اب ۔ چھڑی کہ اب ۔"

پھپھو بھی گویا پہلے سے تیار بیٹھی تھیں کہ ادھر پھپھا کچھ کہیں اور ادھر وہ ان کے اعتراض کو چٹکیوں میں اڑا دیں۔ گویا ان کی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ پھپھا مزید سیخ پا ہوتے گئے۔ برا یہ ہوا کہ اس بار وہاج بھی بیچ میں کود پڑا۔

"ابا! وجہ چاہے کچھ بھی آپ کو تو عادت ہے تماشا کھڑا کرنے کی نہ خود سکون سے رہتے ہیں نہ کسی اور کو رہنے دیتے ہیں۔ آپ کی وجہ سے گھر کا سارا ماحول ڈسٹرب ہو کر رہ جاتا ہے۔ خدا کے لیے کبھی تو سکھ کا سانس لینے دیا کریں ہمیں......"

منہا اسے منع کرتی رہ گئی لیکن وہ بری طرح صابر پھپھا پر بگڑا۔

"اولاد کو کبھی بھی ماں باپ کے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹے اور باپ کے درمیان رعب اور لحاظ کا پردہ اس رشتے کی خوب صورتی بڑھا دیتا ہے۔ اور اگر جوان بیٹے یوں باپ کے سامنے آنے لگیں اور شہ دینے والی بھی ماں ہو تو......"

منہا بہت برے دل سے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

اس بار وہ میکے آئی تو بہت الجھی الجھی سی تھی۔ بظاہر سب سے ہنسنے بولنے کے باوجود دادی کی جہاں دیدہ نگاہوں نے اس کے اندر کی پژمردگی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ دادی کو شام کی چائے دینے آئی تو انہوں نے اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔

"اس کملائے ہوئے پھول جیسے چہرے کے پیچھے باغبان کی کون سی غفلت چھپی ہے؟ مجھے بتاؤ تاکہ میں جاکر اس کے کان مروڑوں؟"

اس نے سر جھکالیا۔

"کسی نے کچھ کہا ہے؟" اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"تو کیا وہاج اچھا نہیں ہے تمہارے ساتھ؟"

"وہ اچھا ہے دادی۔"

"تو پھر یقیناً صابر میاں نے ہی گل کھلانے شروع کر دیے ہوں گے۔ یہ تو میں جانتی ہوں، میرا وہاج بہت اچھا ہے۔ اپنے باپ جیسا نہیں اس لیے

"کاش دادی وہ اپنے باپ جیسا ہی ہوتا۔"

دادی نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

☆☆☆

اگلا پورا ہفتہ اس نے اپنی بے اختیاری پر خود کو کوستے گزارا، کیا ضرورت تھی دادی کے سامنے ایسا کچھ کہنے کی۔ لیکن بات کمان سے تیر کی مانند اس کے منہ سے نکل چکی تھی۔ اس سے اگلے ہفتے اسے بخار نے آلیا۔

"پورے چودہ دن ......" دادی نے انگلی کی پوروں پر گنے۔ اس سے زیادہ انتظار کی سکت ان میں نہیں تھی۔

"اے نغمہ! ذرا فون ملا کر دو وہاج میاں کو اس سے کہتی ہوں واپسی پر مجھے اپنے گھر لیتا جائے گا۔"

دادی نے یوں آناً فاناً تیاری کرلی کہ کسی کو زیادہ سوال جواب کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ البتہ سب کی آنکھوں میں تیرتی حیرت وہ نظر انداز نہ کرسکیں۔ برسوں گزر گئے تھے انہوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ سب کا حیران ہونا بنتا تھا۔

"افوہ بھئی، میری ایک نہیں دو، دو بیٹیاں رہتی ہیں اس گھر میں کیا، وہاں جانے کے لیے مجھے کسی وجہ کی ضرورت ہے؟"

حیرت تو شاکرہ بیگم کو بھی خوب ہوئی تھی یوں انہیں اچانک اپنے سامنے پاکر، اس سے پہلے کہ وہ اپنی حیرت پر قابو پاکر ان سے ملتیں۔ منہا بھاگتی ہوئی ان کے سینے سے آلگی تھی۔ پھر انہیں کندھوں سے تھام کر اندر لے گئی۔

"ارے واہ خالہ اماں آئی ہیں۔ آج تو گھر میں رونق ہی آگئی۔" صابر صاحب نے خوش گوار سا قہقہہ لگایا تھا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

www.urdusoftbooks.com

شاکرہ بیگم نے انہیں ناگواری سے دیکھا۔

☆☆☆

اور پھر جو کچھ دادی نے دیکھا، ان کی فہم وفراست پر پڑے صدیوں پرانے غلط فہمی کے جالے ایک ایک کرکے اترتے چلے گئے۔

منہا کی ادھوری بات کا پورا مفہوم وہ دو دنوں میں ہی جان گئی تھیں۔ شاکرہ بیگم محض نام کی ہی شاکرہ تھیں۔ دنیا کی ہر نعمت میسر ہونے کے باوجود انہوں نے شکر کا کلمہ کبھی نہیں پڑھا تھا۔ کیا سسرالی عزیز کیا، میکے کے رشتہ دار سب کے سامنے وہ اپنے شوہر کی تنک مزاجی کا رونا روتی رہتیں کہ کس طرح ان کا بدمزاج میاں انہیں زندگی بھر ذلیل کرتا رہا ہے۔ خاندان بھر کی ہمدردی ان کے ساتھ تھی جو ایسے بداخلاق شوہر کو خندہ پیشانی سے جھیلتی آرہی تھیں۔ جبکہ تصویر کا دوسرا رخ کچھ اور تھا۔ جو صرف منہا ہی دیکھ پائی اور اب دادی۔

شام کی چائے پر صابر صاحب کے کچھ دوست آرہے تھے۔ انہوں نے منہا کو چائے پر اہتمام کرنے کو کہا۔ کباب، رول، نگٹس وغیرہ، منہا سعادت مندی سے سر ہلاتی ہوئی کچن میں مصروف ہوگئی۔ لیکن شاکرہ بیگم نے حسب عادت اپنی ٹانگ اڑانا ضروری سمجھا۔ مینیو دیکھ کر تو ان کا پارہ چڑھ گیا۔

”کوئی ضرورت نہیں اتنا کچھ بنانے کی خواہ مخواہ گھر کا بجٹ خراب ہوگا۔ چائے کے ساتھ نمکو، بسکٹ رکھ دینا بس۔“

”لیکن پھپھو! عرصے بعد تو پھپھا کے کوئی مہمان آرہے ہیں۔ وہ سخت ناراض ہوں گے۔“

”ارے ہوتے ہیں ناراض تو ہونے دو، اب ان کے خواہ مخواہ کے چونچلوں کی خاطر میں اپنا مہینے بھر کا بجٹ تو ڈانوڈول نہیں کرسکتی بس جو کہا ہے وہ کرو۔“

منہا محض حکم کی تکمیل کے لیے تھی۔ گھر کے کل اختیارات شاکرہ بیگم کے ہاتھ میں ہی تھے۔

صابر صاحب کے اندر اگر صبر کا تھوڑا بہت مادہ موجود تھا بھی تو وہ آج ختم ہوا، ان کے بہت خاص الخاص مہمان تھے جنہیں بے حد اصرار سے انہوں نے چائے پر مدعو کیا تھا۔ اور چائے کے ساتھ محض نمکو اور بسکٹ؟

مہمانوں کے جانے کے بعد انہوں نے خوب غصہ نکالا۔ شاکرہ بیگم دوبدو جواب دیتیں ان کے غصے کو مزید ہوا دیتی گئیں۔ آوازیں تھم گئیں۔ فضا میں دم گھوٹتی تلخی سی پھیل گئی۔

سرمئی شام سارے بھید سمیٹ کر رات کی گود میں سر رکھنے کو بے تاب ہوئی۔ منہا تیل کی کٹوری لے کر دادی کی ٹانگوں پر نرمی سے مالش کرنے لگی۔ انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ جیسے وہ جانتی ہوں عارضی سکون اس تنی چادر میں جلد ہی چھید پڑنے لگیں گے۔

تب ہی شاکرہ بیگم دھاڑ سے دروازہ کھول کر روتی دھوتی اندر آئیں۔

”جینا حرام کرکے رکھ دیا ہے اس شخص نے میرا۔“ سر دونوں ہاتھوں میں تھامے دادی کے قریب بیٹھ کر وہ رونے لگ گئیں۔

دادی نے آہستگی سے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

”اللہ نے میری ہی قسمت اس شخص کے ساتھ پھوڑنی تھی۔ چھتیس سال گزر گئے لیکن ابھی تک بات بے بات مجھے بے عزت کرنے سے باز نہیں آتا۔“

دادی چپ رہیں۔ ہمیشہ کی طرح نہ تو روتی رلاتی بیٹی کو بانہوں میں بھرا نہ داماد کو کوسنے دیے۔ شاکرہ بیگم کو خود ہی کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو چہرے سے ہاتھ ہٹا کر ماں کا جھریوں زدہ دکھی چہرہ دیکھا۔ پھر قدرے شرمسار لہجے میں بولیں۔

”میں آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی اماں لیکن......“

”دکھ تو تم مجھے دے چکی ہو بیٹا!“ ان کا لہجہ بہت تھکا تھکا سا تھا۔ شاکرہ بیگم ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگیں جو آزردگی سے کہہ رہی تھیں۔ ”لیکن افسوس مجھے خود پر ہے۔ اپنی تربیت اپنے تجربے پر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے۔"

ان کے اس قدر ٹوٹے انداز پر شاکرہ بیگم ساکت سی رہ گئیں۔

"اماں!" ان کے لب پھڑپھڑائے۔

"مجھے اس خیال نے کبھی سکون سے سونے نہیں دیا کہ میری بیٹی جہنم میں جل رہی ہے۔ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ یہ جہنم دہکائی ہوئی کس کی ہے؟ یہ کیوں نہ جان سکی کہ غلطی پر تم بھی ہو سکتی ہو۔ قصوروار محض صابر ہی کیوں؟ اس نے غصہ کیا، غلط کیا لیکن اس کے غصے کو بڑھاوا تم نے دیا۔ محض اپنی حاکمیت پسند فطرت اور خود سرانا کو بلند رکھنے کے لیے بجٹ کا رونا رویا حالانکہ اس قسم کی دس چیزیں تمہاری مرضی سے پک رہی ہوتی ہیں۔ تب تمہیں اپنا بجٹ ڈانواڈول ہونے کی فکر کیوں نہیں ہوتی؟

کتنی سبکی اٹھانی پڑی ہوگی اسے اپنے دوستوں کے سامنے اگر تم سب کچھ اس کی مرضی اور پسند سے بن جانے دیتیں تو کیا وہ یہ سارا فساد کھڑا کرتا، نہیں نا۔

تو بیٹا جانوروں کی طرح اندھا دھند بھاگتے چلے جانے کو زندگی گزارنا نہیں کہتے۔ کسی مقام پر لحظہ بھر کے لیے ہی سہی، ٹھہر کر سوچنا ضرور چاہیے کہ ہم جس سمت میں آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں آیا وہ صحیح ہے بھی یا نہیں۔

چھتیس سال تم اسے برداشت کرنے کا رونا روتی رہیں تو کیا اس نے تمہیں تمہاری خامیوں، خوبیوں سمیت برداشت نہ کیا ہوگا۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے لیکن تم محض ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنے شوہر کی خامیاں اچھالتی اسے دوسروں کے سامنے برہنہ کرتی رہیں۔

مزید ستم پر کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی باپ کے خلاف متنفر کر دیا۔"

یہ کیسا آئینہ رکھ دیا تھا ان کی ماں نے ان کے سامنے کہ وہ اس میں ابھرتا اپنا عکس دیکھ کر ششدرہ گئیں۔ اور ماں کی دل جوئی کے لیے اندر آتا وہاج دہلیز پر ہی جم گیا۔ وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں الٹے قدموں پلٹا اور باہر نکل گیا۔ ابا یقیناً ابھی زیادہ "دور" نہیں گئے ہوں گے۔

شاکرہ بیگم کا دل چاہا، ساری دنیا سے نظریں چرا کر گھٹنوں میں سر دیے کر ڈھیر سارا رو دیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا، ضمیر کے آئینے پر پڑی سالوں پرانی گرد مٹنے لگی تھی۔

"عمر کی نقدی جب تک باقی ہے جس مقام پر اپنی غلطی کا احساس ہو جائے، اپنی سمت درست کر لینا چاہیے۔"

ان کے جھکے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتیں وہ امید کا نیا سرا ان کے ہاتھ میں تھما رہی تھیں۔

منہا ہلکی پھلکی ہو کر نم آنکھوں سے بہت دل سے مسکرائی تھی۔

☆

ایک صورت ہے کہ ہر آن نئی رہتی ہے
اپنی نمناک نگاہوں میں وہی رہتی ہے

خود سے ناراض ہے، تھوڑی سی خفا ہے مجھ سے
ویسے لوگوں میں تو وہ اچھی بھلی رہتی ہے

یہ جو سب یار بتلاتے ہیں کسی دل کا پتا
اُس خرابے میں بھی سُنتے ہیں کوئی رہتی ہے

یہ بھی اُس آنکھ کی افسانہ طرازی ہو گی
جل گئے میں بھی کوئی خواب بنی رہتی ہے

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
کچھ بھی ہو جائے، اسے اپنی پڑی رہتی ہے

یہ تمنّا کی پری بھی ہے عجب لال پری
نہیں رہتی ہے کبھی دل میں، کبھی رہتی ہے

اُس کی آنکھوں میں بہت صاف لکھا ہے کامی
دل کے حساس علاقوں میں نمی رہتی ہے

سید کامی شاہ

مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی پریشان تھا بہت
جس کی نظر میں کام یہ آسان تھا بہت

سوچا تو بے خلوص تھیں سب اس کی قربتیں
جس کے بغیر گھر مرا ویران تھا بہت

بے خواب سُرخ آنکھوں نے سب کچھ بتا دیا
کل رات دل میں درد کا طوفان تھا بہت

یہ کیا کیا کہ پیار کا اظہار کر دیا
میں اپنی اس شکست پہ حیران تھا بہت

وحشت میں کیوں کسی کے گریباں کو دیکھتا
میرے لیے تو اپنا گریبان تھا بہت

اب تو کوئی تمنّا ہی باقی نہیں رہی
یہ شہرِ آرزو کبھی گنجان تھا بہت

باقی احمد پوری

ہجر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رستہ دیکھنے والی آنکھوں کے انہونے خواب
پیاس میں بھی دریاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے ہیں
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے بیر
پاگل دیے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رنگ سے خوشبوؤں کا ناتا ٹوٹتا جاتا ہے
پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

افتخار عارف

زومنگ

دیکھوں جو آسماں سے تو اتنی بڑی زمیں
اتنی بڑی زمین پہ چھوٹا سا ایک شہر
چھوٹے سے ایک شہر میں سڑکوں کا ایک جال
سڑکوں کے ایک جال میں ویران سی گلی
ویراں گلی کے موڑ پہ تنہا سا اک شجر
تنہا شجر کے سائے میں چھوٹا سا اک مکاں
چھوٹے سے اک مکاں میں کچی زمیں کا صحن
کچی زمیں کے صحن میں کھلتا ہوا گلاب
کھلتے ہوئے گلاب میں مہکا ہوا بدن
مہکے ہوئے بدن میں سمندر سا ایک دل
اس دل کی وسعتوں میں کہیں کھو گیا ہوں میں
یوں ہے کہ اس زمیں سے بڑا ہو گیا ہوں میں

اشفاق حسین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک آدمی نے کہا" اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔"
تو اللہ عزوجل نے فرمایا "کون ہے جو مجھ پر اس بات کی قسم کھاتا ہے کہ فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا۔ بے شک میں نے اس کو بخش دیا۔ اور تیرے عمل میں نے برباد کر دیے۔"

فضیلت،

اسلام میں داخل ہونے کے بعد اگر کوئی یہ دعوا کرے کہ وہ دوسرے مسلمانوں پر فوقیت رکھتا ہے تو اسے غلط سمجھیں۔ اپنی فضیلت کو فضیلت کے طور پر بیان کرنا ہی فضیلت کی نفی ہے۔ انسان کی کم ظرفی ہے، جہالت ہے۔ اصل فضیلت تو دوسروں کو فضیلت دینے میں ہے۔

(واصف علی واصف)

کنیز فاطمہ۔ جڑانوالہ

سودا،

پرنام سنگھ نے بہت محنت کر کے ایک کروڑپتی کی بیٹی کو پھانسا۔ اسے شادی پر آمادہ کیا۔ اس کے ماں باپ کو منانے کے لیے سو پاپڑ بیلنے پڑے۔ بالآخر کروڑپتی پرنام سنگھ کو داماد بنانے پر راضی ہو گیا۔
بات پکی ہو گئی تو کروڑپتی سسر نے اپنے کنگلے داماد کو بلایا اور کہنے لگا۔
"پتر جی! تسی میرے داماد بن رہے ہو، اس لیے میں تمہیں اپنی فیکٹری میں آدھا حصے دار بنا رہا ہوں۔"
پرنام سنگھ کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے مگر چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے بولا۔
"جیسے آپ کی خوشی۔"
سسر بولا۔ "پتر جی! کل سے تم فیکٹری جاؤ اور مال کی تیاری کا کام سنبھالو۔"
پرنام سنگھ بولا۔ "چاچا جی! فیکٹری کے مزدوروں کے ساتھ مغزماری کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ کام مجھ سے نہیں ہو گا۔"
سسر کہنے لگا۔ "اچھا پتر جی! تسی فیکٹری نئیں چلا سکتے تو دفتر سنبھالو۔"
پرنام سنگھ نے جواب دیا۔ "چاچا جی! آٹھ گھنٹے میز کرسی پر بیٹھنا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔"
اس پر سسر کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگا۔ "پرنام سنگھ! فیکٹری تو نہیں چلا سکتا۔ دفتر میں تو نہیں بیٹھ سکتا۔ میں نے تو تجھے مفت میں آدھے حصے کا مالک بنایا ہے۔ آخر تو چاہتا کیا ہے؟"
پرنام سنگھ منہ لٹکا کر کے بولا۔ "چاچا جی! میں کہنا چاہتا ہوں، آپ میرا آدھا حصہ خرید لیں اور مجھے فارغ کر دیں۔"

مطلب یہ ہے،

شوہر مطالعے میں مصروف تھا۔ اطالوی بیوی آئی اور آتے ہی کہنے لگی۔
"غضب ہو گیا۔ ایک شخص نے میری کار کے ساتھ ٹکر مار دی اور کار کا کچومر نکال کر رکھ دیا۔"

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"لیکن ایسا سخت حادثہ کیسے ہوا؟ کیا دونوں کاریں بہت تیز تھیں؟"
"میری کار تو اس وقت ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار پر تھی۔" بیوی نے کہا۔
"پھر دوسری کار بہت تیز رفتاری سے آ رہی ہو گی؟"
"اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔" بیوی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیوں کہ جب ٹکر ہوئی تو اس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ جس کا مطلب یہ ہی ہے کہ کار کھڑی تھی۔"

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

پھلوں سے علاج،

- خون کی کمی:۔ پالک، سیب اور کیلا مفید ہے۔
- دماغ کی کمزوری:۔ سیب، انناس، انار اور انگور کھائیے۔
- پیٹ کا درد:۔ سونف، گڑ، لیموں، اجوائن دیسی اور روغن زیتون فائدہ مند ہیں۔
- نمونیہ:۔ دار چینی اور شہد کا استعمال آمد ہے۔
- دل کی دھڑکن:۔ آملہ، کدو، لیموں، انناس، انار اور سیب بہترین ہیں۔
- سر درد:۔ دار چینی، دھنیا، سنگترہ اور انگور مفید ہیں۔
- کھانسی:۔ سیاہ انگور اور شہتوت کھائیے۔
- کیل مہاسے:۔ لیموں منہ پر ملیے۔
- ہیضہ:۔ قہوہ، لیموں اور پیاز استعمال کیجیے۔
- موچ:۔ کیلے سے بہتر کوئی چیز نہیں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

مولانا جلال الدین رومی کہتے ہیں،

- اپنی آواز کے بجائے اپنے دلائل کو بلند کیجیے، پھول بادلوں کے گرجنے سے نہیں، برسنے سے اگتے ہیں۔
- اگر میرا علم مجھے انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا تو ایک جاہل مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

- تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے۔ باقی تو صرف ہڈیاں اور خالی گوشت ہے۔

سعدیہ وحید سعدی۔ اسلام آباد

پُر سکون زندگی،

پُر سکون زندگی بسر کرنے کے دو ہی آسان قابل عمل اصول سمجھ میں آگئے۔

1۔ جس پر من ٹھٹکے اس پر مکمل یقین، اعتماد اور ایمان رکھو، اس کے ظاہری قول و فعل کا موازنہ مت کرو کہ بہت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
2۔ جو من نہ بھائے، آنکھوں میں نہ سمائے اس پر کبھی یقین اور بھروسا نہ کرو، اس سے کوئی خوشی نہ ملے گی نہ برکت و بہتری۔

(جلال الدین رومی)

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

فرمان،

عدالت میں وکیل صاحب کافی دیر سے مقدمہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ جج صاحب کو آنے میں دیر ہو گئی تو وکیل صاحب جج کی کرسی پر گئے اور دھڑا دھڑ فیصلے کرنے لگے۔ ساتھیوں کے اعتراض پر بولے۔
"میں تو چیف جسٹس کے اس فرمان پر عمل کر رہا ہوں کہ جب دوسرے کام نہ کریں تو ہمیں کرنا پڑتا ہے۔"

اقصیٰ ناصر۔ گلستان جوہر

چاندما

ہمارے استاد ریاض مجید صاحب کے پاس ایک لڑکا اپنی غزل دکھانے کو لایا تو انہوں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے اردو شاعری میں نیا اضافہ قرار دیا۔ اس لڑکے نے وہ غزل حلقہ ارباب ذوق کے تنقیدی اجلاس میں پیش کردی۔

پھر اس غزل کی جو دھجیاں بکھریں کہ الاماں والحفیظ۔
وہ منہ بسورے ریاض صاحب کے پاس آیا کہ سر آپ نے تو کہا تھا کہ بڑی اچھی غزل ہے۔
ریاض صاحب نے تاریخی جملہ کہا۔ فرمایا۔
"بیٹا! اگر ماں لاڈ پیار میں چاند کہہ دے تو مقابلہ حسن میں نہیں چلے جایا کرتے۔"
عذرا ناہید راشد۔ کراچی

محبت،

باباجی سے پوچھا گیا: "آپ پچانوے سال کی عمر میں بھی اپنی بانوے سالہ اہلیہ کو ڈارلنگ، سوئیٹ ہارٹ، ہنی کہہ کر بلاتے ہیں۔ ان سے اتنی محبت کرتے ہیں؟"
باباجی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور گویا ہوئے۔
"بیٹا! میں دس سال پہلے اس کا نام بھول گیا تھا۔ پوچھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اس لیے کبھی نام پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔"
نادیہ یاسر۔ گوجرہ

مختصر مختصر،

٭ چچا جان بہت ہی احتیاط پسند واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے گھر میں ورزش کی سائیکل پر بھی عقب نما شیشہ لگوا رکھا ہے۔
٭ میرے دادا آزادی کی تلاش میں ایک سو سال پہلے امریکہ آئے تھے لیکن ان کی جدوجہد لاحاصل رہی۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسری کشتی میں دادی جان بھی پہنچ گئیں۔
٭ مبارک باد کا کارڈ چھاپنے والی ایک کمپنی نے اپنے کارڈ پر اندر کی طرف یہ پیغام چھاپا ہوا تھا۔ آپ یہاں جو لکھنا چاہیں، اپنی مرضی سے لکھ دیجیے۔ دس روپے کی خاطر ہم آپ کے آپس کے معاملات میں ملوث ہونا نہیں چاہتے۔
فوال افضل گھمن۔ کراچی

آج کے منصف،

ایک روز قاضی ابوحازم شہر سے گزر رہے تھے۔ راستے میں انہیں ایک شخص ملا اور یوں مخاطب ہوا۔
"قاضی صاحب! آپ نے ہمارے شہر میں جو منصف مقرر کیا ہے، وہ بہت دیانت دار ہے۔"
یہ سنا تھا کہ قاضی ابوحازم برافروختہ ہوگئے۔
"اے شخص! تو کیسی بات کررہا ہے، کسی پولیس افسر کے متعلق تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دیانت دار ہے یا نہیں ہے لیکن ایک منصف ان باتوں سے بالا ہوتا ہے۔"
راستے میں ابوحازم کے ایک ساتھی نے ان سے پوچھا۔ "حضرت! آپ اس شخص پر خفا کیوں ہوگئے تھے؟"
ابوحازم بولے۔
"منصف کے منصب کی یہ توہین ناقابل برداشت ہے۔ بدقسمتی دیکھو، آج کل ایسے اشخاص بھی اس منصب پر مامور ہورہے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں دیانت دار سمجھیں اور ان کی تعریف کریں۔ اس سے پہلے کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ فلاں منصف دیانت دار ہے اور فلاں منصف بددیانت۔"
مسرت الطاف احمد۔ کراچی

بے خودی،

شوہر: "یہ کیسی دال بنائی ہے۔ نہ نمک ہے نہ مرچ۔ تم نا سارا دن موبائل میں لگی رہتی ہو۔ کچھ پتا نہیں چلتا، ہنڈیا میں کیا ڈالنا ہے کیا نہیں۔"
بیوی: (بیلن دکھاتے ہوئے)
"پہلے تم موبائل ایک طرف رکھ کر کھانا کھاؤ۔ کب سے دیکھ رہی ہوں، پانی میں ڈبو ڈبو کر روٹی کھا رہے ہو۔"
آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

سیدہ جویریہ شوکت ——— گاؤں ٹھٹہ سیداں
یوں ہی مٹا دیا ہے جس کو تو نے
وہ قصہ ایسا مختصر نہیں تھا

اشملا طالب ——— گوجرانوالہ
تو نے تو پھر بھی زمانے کے چلن سیکھ لیے
میں تو کچھ بھی نہیں کر پایا محبت کے سوا

اقرأ عزیز ——— گاؤں دریا خان جلبانی
پڑے ہیں ایک گوشے میں گماں کے
بھلا ہم کیا؛ ہماری زندگی کیا

حمدہ خان ——— کراچی
اب اپنا اختیار ہے چاہے جہاں چلیں
راہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہم

آنسہ سلیم ——— کمن بھٹہ صادق آباد
بھلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تیری زندگی رہا ہوں
وہ اجنبی بن کے اب ملے بھی تو کیا ہے محسن
یہ ناز کم ہے کہ میں بھی اس کا کبھی رہا ہوں

ہما فاروق ——— گوجرانوالہ
نہ کھول میرے مکان کے اداس دروازے
ہوا کا شور میری الجھنیں بڑھا دے گا
میں خوب واقف ہوں اس کی فطرت سے فراز
درد دے گا تو اتنا کہ بس رلا دے گا

شبانہ افضل ——— ٹوبہ ٹیک سنگھ
اسی ایک پل کی تلاش ہے جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
تیری رہگزر میں بکھر گئیں میری عمر بھر کی مسافتیں

میمونہ رحمت ——— شرق پور شریف
اگر دل ہار بیٹھے ہو میرے ہمدم محبت میں
فنا کیسی، بقا کیسی، سزا کیسی، جزا کیسی

سدرہ بتول ——— ملتان
کیا ہم ہی سدا اس کے وفادار رہیں گے
کیا صرف ہمارے ہی نوالوں میں نمک تھا

خدیجہ مسکان ہراج ——— داؤد والا تلمبہ
ہم نے دیکھا تھا فقط شوق نظر کی خاطر
یہ نہ سوچا تھا کہ تم دل میں اتر جاؤ گے

فائزہ بھٹی ——— پتوکی
یہاں ہر ایک سے ہجر و وصال کرتے ہو
کیوں اپنا گھر میں جینا محال کرتے ہو
یہ آشنائی اسے یاد ہی نہ ہو شاید
وہ جس کے نام سب ہی ماہ و سال کرتے ہو

فریحہ عزیز شیخ ——— کنڈیارو
مشغلہ اس نے عجب سونپ دیا ہے یارو
عمر بھر سوچتے رہے کہ وہ کیسا ہو گا
جانے کس رنگ سے روٹھے گی طبیعت اس کی
جانے کس ڈھنگ سے اب اس کو منانا ہو گا

نادیہ اشرف ——— راولپنڈی
یہ خاموشی جواب کہ گفتگو کے بیچ ٹھہری ہے
یہی اک بات ساری گفتگو میں سب سے گہری ہے

نخبہ اکرم ——— گاؤں گوبیکی
کٹ گیا درخت، مگر تعلق کی بات تھی
بیٹھے رہے زمین پر پرندے تمام رات

فاکہہ سہیل ——— کراچی
شاخ سے جو گر جائیں ہم وہ پتے نہیں
آندھیوں سے کہہ دو اپنی اوقات میں رہیں

ثمرہ، اقرا، آمنی کی ڈائری سے

غلام محمد قاصر کی یہ غزل ہمیں بہت پسند ہے
آپ سب کی نذر۔

کتاب آرزو کے گم شدہ کچھ باب رکھے ہیں
تیرے تکیے کے نیچے بھی ہمارے خواب رکھے ہیں

کناروں پر پہنچ کر تیرتے لگتی ہیں تصویریں
سمندر نے سفینے تو پس گرداب رکھے ہیں

ہمارے گھر کی بنیادوں کے پتھر کیا ہوئے آخر
کہیں طوفاں کے ٹکڑے، کہیں سیلاب رکھے ہیں

تیرے آنے سے پہلے جن کو مرجانے کی جلدی تھی
وہی پتے ہوائے ہجر نے شاداب رکھے ہیں

فوزیہ غریب کی ڈائری سے

شہروں کی نئی زندگی میں جہاں پرانی قدریں مٹ رہی ہیں، ایک لاحاصل زندگی کا سفر درپیش ہے۔ انور فیروز نے خالص شعری لہجے میں انسانی قدروں میں پڑنے والی دراڑوں کا ذکر کیا ہے۔ اس غزل میں اس سے پیدا ہونے والے دکھ کا اظہار ہے

تجھے سوچتے زمانے ہو گئے ہیں
خطا اپنے نشانے ہو گئے ہیں

کہاں کی دوستی اور کیسے ناتے
یہ قصے اب پرانے ہو گئے ہیں

خیالوں میں بھی تو آتا نہیں ہے
تجھے دیکھے زمانے ہو گئے ہیں

کوئی صورت نہیں حیلہ گری کی
پرانے سب بہلنے ہو گئے ہیں

ہمیں آتا ہے بچنے کا طریقہ
خطا اس کے نشانے ہو گئے ہیں

شرافت آئنہ تھی کیسے دن تھے
مگر اب وہ فسانے ہو گئے ہیں

عجب انوار حالت ہے ہماری
کہ گھر بھی کارخانے ہو گئے ہیں

اقرا عزیز جیلانی کی ڈائری سے

محبت میں ایک احساس تکمیل کا بھی ہوتا ہے جس کے بغیر محبت کی کہانی ادھوری لگتی ہے۔ ناہید قمر نے اس بات کو بہت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

پرانی بات،

محبت کی کہانی میں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کوئی کردار قصے کو اچانک درمیان سے چھوڑ کر
رستہ بدل کر
ممکنہ انجام سے پہلے کہانی کا سرا ہی موڑ دیتا ہے
تو پھر امید کے موسم میں ناامید ہونے کی صلیبوں

پر لگتا دوسرا کردار
قصے میں کئی صفحات خالی چھوڑ دیتا ہے
اگرچہ اس کے بعد بھی کہانی چلتی رہتی ہے
مگر اس کی عبارت سننے والوں کو بعید از فہم لگتی ہے
سمجھ میں آئے بھی کیسے
شاید
وہاں وصل کا اک باب آنا تھا
کسی کو منتظر رہنا، کسی کو لوٹ آنا تھا

رضوانہ شکیل راؤ کی ڈائری سے

تیرگی کو روشنی میں بدلنے کی خواہش، روشن خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کی کوشش، ایک آس، ایک امید کہ سب کچھ بدل جائے گا۔ لیکن کبھی کبھی

بے صبری اور مایوسی کی کیفیت میں انسان کہہ اٹھتا ہے۔ انعام الحق جاوید کی یہ غزل قارئین کی نذر۔

تم کہتے ہو سب کچھ ہوگا
میں کہتا ہوں کب کچھ ہوگا

بس اس آس پہ عمر گزاری
اب کچھ ہوگا، اب کچھ ہوگا

کچھ بھی نہ ہونے پر یہ عالم
کیا کچھ ہوگا، جب کچھ ہوگا

لیکن اب تو یوں لگتا ہے
مر جائیں گے تب کچھ ہوگا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

اگر کوئی خامی محسوس ہو تو بھی ضرور لکھا کریں۔

سحر تبسم سحری...... مغل پورہ

کتنے پیار سے میں نے سالگرہ نمبر پر اپنی قیمتی رائے دی تھی لیکن بادشاہ بندوں نے ہمارا خط نمک مرچ لگا کر اپنی لاڈ دلاری ردی کی ٹوکری کو پیش کر دیا۔ اس ماہ کا شمارہ 12 کو ملا۔ تو بہ اتنا لیٹ؟ سرورق پہ ماڈل بہت پاکیزہ سی لگ رہی تھی "کہنی سنئی" میں سروے کے سوال دیکھے تو سوچا کہ میں بھی شامل ہو جاؤ (اگر آپ چاہو) کرن کرن روشنی اتنا پیارا سلسلہ ہے کہ بس۔ "حالم" پلیز نمرہ احمد زیادہ سے زیادہ لکھا کریں، تالیہ از مائی فیورٹ۔ دشت جنوں بورنگ...... مکمل ناول "ٹیولپ" سمیرا حمید اتنا منفرد اچھا اور سادہ کیسے لکھ لیتی ہیں؟ پلیز ان سے سلسلہ وار لکھوائیں۔ "محبت ہوگئی ہے" معذرت کے ساتھ کہ مجھے ذرا پسند نہیں آئی۔ ناولٹ دونوں اچھے تھے۔ افسانے عفت سحر کا میرے خیال میں پچھلے سال بھی ناولٹ تھا اسی نام سے، کرداروں کے نام بھی یہ ہی تھے، کیا عفت سحر کچھ اور نہیں لکھ سکتیں؟ "ایک چراغ" بہت اچھی اور سبق آموز تحریر۔ تشنہ دل جانے رائٹر کیا لکھنا چاہتی تھی؟ شروع سے کچھ اور اینڈ سے کچھ تھا۔ جسے دل کہیں اور بڑی پی اچھی تحاریر تھی۔

☆ پیاری سحر! ہم کہاں کے بادشاہ بندے ہو سکتے ہیں۔ بادشاہ بندے تو وہ ہیں جو بیک جنبش قلم وزیر اعظم کو برطرف کر دیتے ہیں اور ردی کی ٹوکری تو بے چاری ویسے ہی بدنام ہے۔ اس میں اتنی وسعت کہاں کہ آپ سب کی تحریریں ناول، ناولٹ، افسانے اور خط سما سکیں۔ آپ کی تعریف اور تنقید دونوں متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

ہما ظہیر...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

میں آپ کے رسائل کی کافی پرانی خاموش قاری ہوں (مجھے کوئی بھی بوڑھی سی خاتون نہ سمجھے گا) تو میں ینگ سی ہوں گریجویشن فائنل ائیر کی طالبہ ہوں۔ پانچ دن بعد لاسٹ سمسٹر کے پیپرز ہیں' اس بات سے اندازہ لگائیں ہمارے شوق کا، پڑھنے کے بجائے خط لکھ رہی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی شمارہ اے دن تھا، خاموشی توڑنے کی وجہ ون اینڈ اونلی سمیرا حمید! ویل ڈن سمیرا جی

سمیہ...... سکھر

ٹائٹل گرل رمضان کے مطابق تھی۔ نائلہ جعفری کا انٹرویو پڑھا، بہت اچھا لگا ان کے بارے میں پڑھ کر، پھر سیدھے "دشت جنوں" پر پہنچے تو آئے کت کی آگے کی کہانی ملاحظہ کی، بہت مزا آ رہا ہے، پڑھ کر اس کی اینڈنگ اچھی کیجیے گا۔ "حالم" بھی بہت اچھی چل رہی ہے۔ مکمل ناول میں "محبت ہوگئی ہے" پڑھی، بڑی زبردست کہانی لکھی، افشین نعیم انٹرٹین کیا بہت...... عثمان اور نغمہ کی جوڑی زیادہ اچھی تھی۔ "ایک چراغ روشن" پڑھی بہت اچھی کہانی تھی۔ "بیوٹی بکس" کے مشورے اچھے لگے، "نفسیاتی ازدواجی الجھنیں" میرا پسندیدہ سلسلہ ہے سب سے پہلے رسالہ ہاتھ لگتے ہی میں یہ سلسلہ پڑھتی ہوں۔

☆ پیاری سمیہ! یہ بھی اچھا لگا، وہ بھی اچھا لگا...... صرف تعریف ہی تعریف۔ سے ہمیں خوشی تو ہوتی ہے لیکن

اتنے حساس موضوع پر اتنا زبردست پڑھنے کو ملا۔ افشین نعیم کی ہلکی پھلکی تحریر پڑھ کر بہت مزا آیا، باقی تمام ناولز بھی ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے۔ افسانوں میں نیر فہیم بازی لے گئیں، اتنا اچھا درس دیا۔ عفت سحر کی روبحا سے مل کر بہت اچھا لگا، باقی افسانے پڑھ کر بھی مزا آگیا۔ یہاں میں آپ سے ایک بات شیئر کرنا چاہوں گی اگر کسی پتا چلے کہ میں رسالے شوق سے پڑھتی ہوں تو گھور کے پوچھتے ہیں۔ اچھا آپ رسالے پڑھتی ہیں اور یہی لوگ ان ہی ناولز پر بنے ڈرامے بہت شوق سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں، آخر میں میری نئی بھابھی عاتکہ کو ہمارے گھر میں پہلی عید کی بہت مبارک باد۔

☆ پیاری ہما! دراصل ہمارے معاشرے میں مطالعے کا رجحان بہت کم ہے۔ خواتین ڈرامے تو بہت ذوق وشوق سے دیکھتی ہیں لیکن لکھنے پڑھنے کا شوق بالکل نہیں ہوتا، انہیں پتا ہی نہیں کہ ان ڈائجسٹوں میں کیا لکھا ہے، ادھر اُدھر سے سنی سنائی باتیں دہرا دیتی ہیں۔ کسی سے سن لیا ہوگا کہ ڈائجسٹ میں خراب باتیں ہوتی ہیں۔
ایسی باتوں کو مسکرا کر ٹال دیا کریں۔ خوب دل لگا کر پڑھائی کریں اور بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں، آمین۔

ناہید اسماعیل......کراچی

سالگرہ نمبر 2 سرورق سے پس ورق تک لاجواب تھا۔ "حالم" ہمیشہ کی طرح بہترین' اک اک سطر پر دل دھڑک رہا ہوتا ہے کہ اگلے سین میں کیا ہونے والا ہے۔ ایڈم کی باتیں بڑی مزے دار لگتی ہیں۔ اب تو ہم تالیہ کی صلاحیتوں پر حیران ہونا چھوڑ چکے ہیں۔ "دشت جنوں" کی ان دو قسطوں کا نام تو ہم نے رکھ دیا "آیئے کت کی عیاریاں" جو مکار ہی نہیں قاتل بھی نکلی۔ آمنہ ریاض نے ایک مختلف سے موضوع پر بہت دلچسپ لکھا ہے۔ شاہ میر اور ماہ نور کا کیا ہوا اس کا انتظار ہے۔ سمیرا حمید کا قلم ہو اور کچھ عام سا لکھ جائے، یہ تو ہو نہیں سکتا۔ ایک اچھوتا خیال، ایک اور بہت خوب صورت تحریر "ٹیولپ" کی صورت ان کے قلم سے نکلی اور ہمارے دل میں جا سمائی۔ افشین نعیم کی تحریر ٹھیک ہی تھی، دونوں کپلز کے آخری سین میں مکالمے زیادہ ہی ذومعنی اور رومانٹک ہوگئے تھے۔ ثریا انجم کی تحریر کا عنوان "ٹین کی چھت" تو تھا ہی متوجہ کرنے والا، انداز تحریر اور کہانی بھی بہت متاثر کن تھے۔ مرد کی فطرت کا ایک اور رخ کھلا۔ ثریا نئی رائٹر ہیں پھر تو بہت خوب لکھا، لگتا ہے ایک اور اچھی رائٹر ہمیں مل گئیں۔ "آئینہ ہوں" نے خاص متاثر نہیں کیا۔ ایک جگہ عطو کہہ رہی ہے کہ تین سال پہلے وہ خود کو ملی جب احمد گود میں آیا جبکہ احمد کی عمر چار سال بتا رہی ہے پھر دوسری جگہ کہتی ہے کہ بہت کچھ ہوا ان بیس سالوں میں اور کسی جگہ پانچ سال کا ذکر ہے۔ اب یا تو ہم ہی نہ سمجھ سکے یا پھر رائٹر نے ہی ایسا لکھا، اتنے سنگین مسئلے پر لکھی تحریر میں ان باتوں کا خیال رکھنا تو بنتا ہے ناں۔ افسانوں میں "اک چراغ روشن ہے" میں نیر فہیم نے ایک شرعی مسئلے کو کتنے آسان لفظوں میں واضح کردیا اور طریقہ بھی بتادیا۔ احتل العزیز کی تحریر بھی پسند آئی، شکر ہے حکمہ کی ماں نے درست فیصلہ کیا۔ تمثیلہ زاہد نے اپنی تحریر میں دلوں کی تشنگی دور کرنے کا ایسا نسخہ بتایا جو دنیا وآخرت دونوں میں کارآمد ہے۔ ایمل رضا نے ہمیشہ کی طرح زبردست لکھا، انسانی نفسیات پر بڑی گہری نظر ہے ان کی اور رہیں عفت سحر طاہر تو جناب سنجیدہ ہو یا مزاح، باکمال لکھتی ہیں۔ اتنے عرصے بعد "دھنک کے رنگ" لے کر آئیں اور چھا گئیں۔ قاری بہنوں کے خطوط نے بھی ہنسایا جیسے نائلہ ہڈالی اور امامہ ملک اور اس پر آپ کے جوابات سونے پر سہاگہ۔ نائلہ جعفری کا انٹرویو ان کے حوصلے اور ہمت کی داد دیتے ہوئے پڑھا۔ ندا فاضلی اور غزالہ نگار کی شاعری بہت اچھی لگی، غزالہ نگار اور کرنزئی کی نظم نے ان کی تحریروں کی یاد دلا دی، کیا خوب لکھتی تھیں۔ نفسیاتی الجھنیں میں ہیں "الف، فیصل آباد" کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہورہا ہے، ان کے رشتے داروں جیسے لوگوں کے لیے ہی کہا گیا ہے کہ......

ضمیر نہیں کانپتے یہاں
زمین کانپ جاتی ہے......

☆ پیاری ناہید! پورا پرچا پڑھ کر ہر تحریر پر جامع اور صحیح تبصرہ آپ کا کمال ہے۔ آپ کا خط شائع ہو یا نہ ہو لیکن ہم اسے خاص طور پر سب سے پہلے پڑھتے ہیں۔

ثریا انجم کافی عرصہ پہلے لکھتی رہی ہیں، درمیان میں وقفہ آ گیا۔ اب انہوں نے عرصہ بعد یہ ناولٹ لکھا، ان کا انداز سادہ لیکن کہانی کا موضوع ہمیشہ خاص ہوتا ہے، خصوصیت یہی تو ہے کہ وہ عام روش سے ہٹ کر چلتی ہیں اور جملے تو ان کے ہمیشہ ہی لاجواب ہوتے ہیں۔

غزالہ ابراہیم......حسن ابدال

مجھے بہن کوثر خالد بہت اچھی لگتی ہیں، میں ان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ کیا میں ڈائجسٹ کی معرفت انہیں خط لکھ سکتی ہوں، دراصل میرا کوئی مخلص دوست نہیں، مجھ سے تو بات کرتے ہوئے لوگوں کو کوفت ہوتی ہے (میری سماعت کمزور ہے) ایک ماں، سلائی مشین اور رسالے میری زندگی کا محور و مرکز ہیں۔ کوثر خالد جڑانوالہ مجھے بہت اپنی اپنی سی لگتی ہیں، بالکل کسی بڑی بہن یا ماں جیسی۔ میں 90 سے آپ کے رسالے پڑھ رہی ہوں، رفعت سراج کے بعد مجھے سائرہ رضا نے بہت متاثر کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات اور ڈائیلاگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مزاح میں مجھے ام طیفور اور ثمینہ عظمت بہت پسند ہیں۔ ان کی تحریریں ہر ماہ شائع کیا کریں اور پلیز ان دونوں سے کوئی مزاحیہ سا سلسلے وار ناول لکھوائیں۔ سائرہ رضا نے اب تک کوئی سلسلے وار ناول نہیں لکھا، ان سے طویل سا ناول لکھوائیں جو کم از کم پچاس اقساط کا ہونا چاہیے۔

☆ پیاری غزالہ! سماعت کی کمزوری اتنا بڑا مسئلہ نہیں، اب تو بہت اچھے آلے بازار میں دستیاب ہیں جن کی مدد سے آپ سن سکتی ہیں۔ سائرہ رضا سے ناول ضرور لکھوائیں گے بس تھوڑا انتظار کر لیں۔ کوثر خالد کے لیے خط لکھ کر آپ ہمیں بھجوا دیں، ہم ان تک پہنچا دیں گے۔

شازیہ ستار......ڈی جی خان

میرے بچے 7 تاریخ سے نیوز ایجنسیوں کے چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ اتنا جوش ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے، مگر اتنا لیٹ جب رسالہ آئے پھر اپنا نام نہ دیکھ کر دل کو تکلیف ہوئی۔ اوپر سے بیوٹی بکس میں اپنے مسئلے کے اوپر غلط نام دیکھ کر افسوس ہوا، جواب شازیہ کے نام سے مخاطب تھا۔ باجی آپ اندازہ تو کریں ہم اتنا جلدی کیسے سب کچھ پڑھ کر ٹائم پر بھیج سکتے ہیں، جب رسالہ ملتا ہی اتنا تاخیر سے ہے۔ بہرحال "حالم" ہمیشہ کی طرح زبردست۔ "دشت جنوں" آہستہ آہستہ کلائمکس کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ "ٹین کی چھت" ناولٹ نے بہت متاثر کیا۔ حقیقی کی عکاسی کی گئی عورتوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ امت العزیز شہزاد کا افسانہ بہترین واقعی لیکچر دینا آسان اور اس پر عمل کرنا دل گردے کا کام ہے۔ ایمل رضا کا "بڑی بی" میں "بڑا" سبق تھا۔ ان کے لیے جو سمجھتی ہیں کہ ان کے بغیر لوگ شاید جی نہیں سکتے۔ رابعہ افتخار شیخ کا افسانہ ٹاپ پر رہا، امید نہیں تھی کہ ایک کزن بھی ایسا کر سکتی ہے، گھناؤنا کھیل کھیل سکتی ہے۔ عطیہ کا صبر کام آ ہی گیا بالآخر۔ نائلہ جعفری کا حوصلہ دیکھ کر رشک آیا۔ بیماری سے لڑ کر، اللہ تعالیٰ انہیں شفا دے، آمین۔

☆ پیاری شازیہ! پرچا لیٹ ملنے کے باوجود آپ نے پورا پرچا پڑھ کر ہمیں خط لکھا اور ہر کہانی پر بالکل درست تبصرہ کیا۔ اس لیے تاخیر سے ملنے کے باوجود آپ کا خط شامل کر رہے ہیں، خوش رہیں۔ رابعہ افتخار کے ناولٹ میں کزن نہیں دوست تھی۔

فریدہ گوہر......ملتان

سرورق کی تصویر بہت اچھی تھی۔ حسب معمول کرن کرن روشنی بہت اچھا تھا۔ ابن انشاء کی تحریریں کتنی شگفتہ ہوتی ہیں، ہر جملہ پھلجڑی ہوتا ہے۔ سمیرا حمید کا محمود ریاض صاحب کے لیے لکھا مضمون "آئینہ صفت" بہت پسند آیا اور ان کا ناول "ٹیولپ" ان کے قلم کی مخصوص خوشبو لیے ہوئے تھا۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ان کی طرح افسانے لکھوں لیکن لکھتی ہوں تو ان کے ناولوں کی طرح بوباس نہیں ہوتی اور میں انہیں پھاڑ دیتی ہوں۔ سمیرا حمید صاحبہ! آپ اتنا پیارا کیسے لکھ لیتی ہیں؟: پڑھنا شروع کرو۔ کہانی کے بہاؤ کے ساتھ یوں بہتی چلی جاتی ہوں کہ ہیرو ہیروئن اداس ہوتے ہیں تو میں بھی اداس ہو جاتی ہوں۔ وہ روتے ہیں تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ وہ خوش ہوتے ہیں تو میں بھی خوش ہو جاتی ہوں، وقت پر لگا کر اڑ جاتا ہے اور ناول ختم ہو جاتا ہے۔ کافی دیر ایک سرشاری رہتی ہے اور کچھ اور

پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔

☆ پیاری فریدہ! ہر انسان کوشش کر کے پڑھ تو سکتا ہے مگر لکھ نہیں سکتا کیوں کہ یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک اچھے لکھاری کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ قاری کا ہاتھ پکڑ کر اسی دنیا میں لے جاتا ہے جو اس نے تراشی ہے۔ بلاشبہ سمیرا کو اللہ پاک نے اس خوبی سے نوازا ہے، ہماری دعا ہے۔ سمیرا مزید ترقی کرے اور یوں ہی آپ لوگوں کا دل خوش کرتی رہے۔

آپ سمیرا حمید کی طرح لکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ فریدہ گوہر کی طرح لکھیں، یقیناً اچھا لکھیں گی۔

سیمی خان......بنوں

ہم خواتین وشعاع کے وہ خاموش قاری ہیں جو سخت گرمیوں میں لحاف میں اور سخت سردیوں میں باتھ روم میں چھپ کر اسے اس وقت تک پڑھتے جب تک مکمل نہ پڑھ لیتے۔ لیکن اب لحاف میں اور کم روشنی میں نہیں پڑھ سکتی کیوں کہ آئی سائٹ بہت ویک ہوگئی ہے، عینک لگ گئی ہے۔ چونکہ "اماں" تو ہے نہیں اس لیے اماں کی جگہ ڈائجسٹ کی وجہ سے نانی، خالائیں اور پھوپھیاں خوب ڈانٹ اور دھمکیوں سے نوازتی ہیں لیکن اب ایسی باتیں ہم پہ اثر نہیں کرتیں کیونکہ یہ سب بچپن سے سن رہے ہیں۔ اب آتے ہیں میری کہانیوں کی طرف جو میں نے دسمبر 2017ء کو بمع خط کے ارسال کی تھیں۔ اگر ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے ابو نے دیکھ لیا تو ڈائجسٹ کے ساتھ ہمیں بھی جلا ڈالیں گے، اس لیے خود سوچیں اگر پڑھنے پر ایسا ردعمل ہوسکتا ہے تو لکھنے اور بھیجنے پر کیا کیا نہ ہوگا، رائٹر بننے کی میں نے اپنی دوستوں سے شرط لگائی ہے کہ میری معمولی اور ادنیٰ سی کہانی اگر خواتین وشعاع جیسے بڑے ڈائجسٹوں میں لگی تو میں اسی دن کالج جانا چھوڑ دوں گی، وہ دن کالج میں میرا آخری دن ہوگا۔ نمرہ کے سب ناول ان سب کو بیس بار پڑھ چکی ہوں مگر ایگزام کے بعد پھر پڑھنے کا ارادہ ہے، نجانے کیوں نمرہ کی کوئی کہانی پڑھتے ہوئے آنکھیں بار بار بھر آتی ہیں۔ پلیز حالم میں تالیہ کو فاتح اور موٹی واتن سے جدا نہ کریں کیونکہ ہمارے نازک دل بار بار دوستوں سے بچھڑنے کا دکھ برداشت نہیں کر سکتے جیسے ڈی جے کا کیا تھا۔ دوسری اسٹوری "وحشت جنوں" آمنہ صاحبہ آپ کو کیا پتا ہم آیو شمتی کی وجہ سے کتنی مشکل سے واش روم میں جاتے ہیں، کتنی دفعہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے ہیں، وضو کے دوران۔ بہت زیادہ فنٹاسٹک، لولی سی ہنسانے والی اسٹوری اب پلیز خوشی کو اور مت تھکائیں، کچھ تو نام کا اثر رہنے دیں۔ سمیرا حمید، سائرہ رضا، ایمل رضا، عفت جی، راشدہ، آسیہ جی، فرزانہ کھرل یہ سب نام مجھے ایسے لگتے ہیں جیسے میں ان سب کے ساتھ کافی عرصہ رہ چکی ہوں۔ کاش میں سمیرا حمید کی بہن ہوتی، انسان کے پاس کچھ اور ہو نہ ہو، اپنی ذات کا اعتماد ہونا چاہیے۔ یہ میں نے سمیرا جی سے سیکھا ہے۔ کاش میں آپ کے قریب رہ کر آپ سے جینے کا سلیقہ سیکھ سکتی۔ اگر خطوط میں کوثر خالد، ثمینہ اکرام، فوزیہ ثمر، ثریا شاہ کے خط نہ ہوں تو مزا نہیں آتا۔ کوثر خالد پلیز آپ ہر ماہ شرکت ضرور کریں، آپ کا خط پڑھ کے یوں لگتا ہے جیسے بہت پیارے دیرینہ دوست سے سالوں بعد مل رہی ہوں۔ پچھلے ماہ زینب کے خط اور حالات نے اتنا دکھی اور پریشان کیا تھا کہ حد نہیں۔ زینب میری دوست کے ساتھ آپ سے بھی زیادہ برا ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھیں وہ یقیناً آپ کے لیے کوئی محفوظ راستہ نکالے گا۔ ہم پٹھان "میں" کی جگہ "ہم" کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔

☆ پیاری سیمی! واہ!......سب سے پیاری بات سب سے آخر میں لکھی ہے۔ بہت مزا آیا۔ مخلصانہ مشورہ ہے کہ فی الحال صرف اور صرف پڑھائی پر توجہ دیں۔ ذات کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اچھی کتابیں پڑھیں۔ اچھے اچھے لوگوں سے دوستی کریں، خالہ اور پھوپھیوں کو اپنا خیر خواہ جانیں اور آیو شمتی جیسے مخلوق سے ہرگز نہ ڈریں۔

ایک راز کی بات بتائیں تمہیں، ہم پٹھان نہیں ہیں تب بھی میں کے لیے ہم کا ہی صیغہ استعمال کرتے ہیں اور پشتو ہماری سگی زبان تو نہیں مگر ہمیں سگی زبان ہی کی طرح محبوب ہے۔

کہانی چھپنے کا کالج جانے سے کیا تعلق ہے، کہانی چھپے یا نہ چھپے آپ تعلیم جاری رکھیں، یہ بہت ضروری ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شبانہ طارق...... برج چیمہ، ڈسکہ
اس مہینے رمضان کی وجہ سے آپ نے شعاع اور خواتین دونوں کے سرورق پر دوپٹے والی ماڈل کی تصویر دی ہے، میرا اعتراض یہ ہے کہ دوپٹا سر پر لینا صرف رمضان میں ہی تو فرض نہیں بلکہ مسلمان ہونے کے ناتے ویسے بھی دوپٹا لینا چاہیے۔ اب آتی ہوں شمارے کی طرف تو بہت معذرت کے ساتھ، اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ یقین کریں میرے پاس جو پرانے رسالے پڑے ہیں، وہ میں نجانے کتنی بار پڑھ چکی ہوں لیکن اب ایک دفعہ پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھنے کو دل ہی نہیں کرتا لیکن پھر بھی ہم شعاع اور خواتین پڑھنا نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ محبوب کی صرف خوبیاں ہی اچھی نہیں لگتیں بلکہ خامیوں سے بھی پیار ہوتا ہے۔ باقی رسالہ تو حسب معمول ہی تھا لیکن سمیرا حمید نے اس دفعہ پتا نہیں کیا لکھا ہے، سر کے اوپر سے گزر گیا۔ اور پلیز جبیں سسٹرز سے بھی کچھ لکھوائیں، جب سے انہوں نے لکھنا چھوڑا ہے نہ تو ساون منانے کا مزا آیا ہے اور نہ ہی سردیوں کی دھند بھری صبحیں بھاتی ہیں۔ پلیز انہیں واپس بلوائیں اور سماء براق نے جس ناول کے بارے میں پوچھا ہے وہ سائرہ رضا کا ''دل ونظر کے سلسلے'' ہے اور یہ اپریل 2012ء میں شائع ہوا تھا۔ مجھے بھی ایک ناول کا پوچھنا تھا اس کا نام تھا ''سرسوں کا پھول'' یہ کس مہینے اور سال میں شائع ہوا تھا۔

☆ پیاری شبانہ! وقت کے ساتھ ہر چیز میں تبدیلی آتی ہے۔ کچھ لوگ اس تبدیلی کو پسند کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کو قبول نہیں کر پاتے۔

یہ سچ ہے کہ اب کہانیوں میں جو تبدیلی آئی ہے حالات کے تقاضوں کے تحت ان میں حقیقت پسندی کا عنصر غالب ہوتا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ تبدیلی آپ میں بھی آئی ہے۔ عمر کے ایک خاص دور میں ہمارے اندر جوش، امنگ اور زندگی ہوتی ہے، ہمیں ہر چیز بہت اچھی لگتی ہے ہر ذمہ داری سے آزاد ہوتے ہیں۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں تبدیلی آتی ہیں تو ہمارا چیزوں کو دیکھنے، سمجھنے، محسوس کرنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ ہماری کچھ مصنفین جواب ٹی وی کو پیاری ہوگئی ہیں، واقعی بہت اچھا لکھتی تھیں، ان کی کمی ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے لیکن آج بھی اگر آپ غور کریں تو بہت سی مصنفین بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

آپ کا اعتراض درست ہے، دوپٹا سر پر لینا رمضان میں ہی فرض نہیں ہے لیکن یہ تو اچھی بات ہے نا کہ انہوں نے رمضان کا احترام کیا۔

مدیحہ رخسار...... پشاور
پشاور کا نام سنتے ہی لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم پٹھان ہیں لیکن پشاور میں خالص شہری ہندکو اسپیکنگ لوگ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ جن میں سے میں ایک ہوں، خواتین اور شعاع ڈائجسٹ سے تعلق چھ سال پرانا ہے۔ میٹرک کے امتحانوں کے بعد میری بہن نے مجھے زبردستی ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے دیے۔ اب تو یہ جنون بن چکا ہے، نئے پرانے تمام ڈائجسٹ خرید کر ہم دونوں بہنیں پڑھتے ہیں۔ میری پسندیدہ رائٹرز تمام ہی ہیں۔ سب کے ناولز، افسانے، ناولٹ پڑھتی ہوں لیکن نبیلہ عزیز، نایاب جیلانی، فائزہ افتخار، آسیہ رزاقی اور فرحت اشتیاق بہت ہی پسند ہیں۔

☆ پیاری مدیحہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہمارے پرچے اتنے شوق سے پڑھتی ہیں۔ مطالعہ جاری رکھیں، ان شاءاللہ ایک دن ضرور اچھا لکھیں گی فی الحال معذرت۔

صفیہ مہر...... کوٹلی مراد
آنکھ کھولی تو آپ کا ادب گھر میں دیکھا۔ دس سال کی عمر میں بھاگ کر آپی کے پاس آتے اور کہتے۔ آپی! مائی (ٹائٹل گرل) دیکھنے دیں۔ آپی اکثر ڈانٹ کر بھگا دیتیں، ہم چھپ کر خوب صورت مائی دیکھ آتے۔ آپی کی شادی ہوئی اتنے عرصے میں ہم سمجھ داری کے سنگھاسن پر براجمان ہوگئے۔ اماں نے گھر کے کاموں کے لیے اسکول سے گھر بٹھا دیا۔ آپی ازدواجی ذمہ داریوں میں گھن چکر بن گئیں، تو ہم نے یہ گدی سنبھال لی، بھائی میری تنہائی کے خیال سے آپ کے یہ دونوں رسالے خوشی خوشی لا دیتے۔ 2008ء سے باقاعدہ پڑھنا شروع کیا۔ نمرہ نے حالم لکھ کر تو گویا ہم پر احسان کر دیا۔ یہ سوچوں کو مثبت

کردیتی ہیں، بہت نیک کام کررہی ہیں نمرہ۔ سلسلے سارے دل کو لگتے ہیں، ہمارے نام کے سب ہی کے خط شوق سے پڑھتی ہوں لیکن فوزیہ ثمر بٹ کا تو خاص کر، انٹرویوز پر اک نظر ڈال کر عدنان کی الجھنیں۔

☆ پیاری صفیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

یاسمین کنول......پسرور

سر پر دوپٹا اوڑھے سادہ مزاج ماڈل سادگی میں بڑی پیاری لگی۔ مئی رمضان کا اور جون عید کا مہینہ ہوگا۔ سرورق اس حوالے سے بہترین لگا۔ کرن کرن روشنی رمضان کے حوالے سے تحفہ خاص ہے۔ نائلہ جعفری سے ملاقات پسند آئی۔ وہ بڑی ہمت سے کینسر جیسے خطرناک مرض کا مقابلہ کررہی ہیں۔ مدیحہ اقبال کا باورچی خانہ اچھا لگا۔ نظمیں غزلیں پسند آئیں۔ افسانوں میں تمثیلہ زاہد کا تشنہ دل اور اک چراغ روشن اچھے لگے۔ محبت ہوگئی ہے تم سے ایک اچھا معیاری دلچسپ ناول ہے، افشین مبارک کی مستحق ہیں۔

☆ پیاری یاسمین! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

اقرا جٹ......منچن آباد

مئی کے شمارے کا ٹائٹل واہ واہ کیا کہنے، یونیک کہنی سنی۔ کرن کرن روشنی (زبردست سلسلہ ہے) انشاء جی، آئینہ صفت، سمیرا حمید (ماشاء اللہ بہت اچھا) روشنی کا سفر عطیہ خالد (زبردست)۔ نائلہ جعفری سے ملاقات اچھی لگی، فیضان شیخ کی باتیں سنیں۔ "دشت جنوں" کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار۔ بائی فیورٹ ناول نمرہ احمد کا "حالم" ویری اسٹرانگ اینڈ انٹرسٹنگ۔ "ٹیولپ" سمیرا حمید واؤ، کیا تحریر تھی کیا انداز بیاں تھا، ونڈرفل اسٹوری آپ کو تو اس پر ایوارڈ ملنا چاہیے۔ "محبت ہوگئی ہے" افشین نعیم زبردست۔ "ٹین کی چھت" ثریا انجم ایک اچھا سبق۔ "آئینہ ہوں" رابعہ افتخار دوستی کبھی کبھی لے ڈوبتی ہے، افسانے تمام ہی اے ون تھے۔ رنگا رنگ پھول (بہت زبردست سلسلہ) میری بیاض سے سب کے اشعار زبردست تھے، خاتون کی ڈائری سب کے انتخاب اعلا تھے۔ سب کے تبصرے شان دار تھے اور آنی نے جواب بھی سب کو بہت اچھے دیے ہوئے تھے۔

☆ پیاری اقراء! بہت شکریہ۔ آپ کو پرچا پسند آجاتا ہے، تو ہماری محنت وصول ہوجاتی ہے۔

صبا آصف......کراچی

آپ کے رسالے کی کیا تعریف کروں، تعریف ایسے ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ اس شمارے میں ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر سمیرا حمید نے "آئینہ صفت" میں محمود ریاض صاحب کی شخصیت کی عکاسی کی ہے، حق ادا کردیا اور عطیہ خالد نے "روشنی کا سفر" میں۔ ریاض صاحب میری بھی پسندیدہ شخصیت تھے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلا مقام عطا فرمائے اور روشنی کا یہ سفر ہمیشہ جاری و ساری رہے۔ اس شمارے میں ثریا انجم کے ناولٹ "ٹین کی چھت" اور رابعہ افتخار کے ناولٹ نے میلہ لوٹ لیا۔ "دلاور" کا کردار بہت زبردست کرنے والا اور محبت نبھانے والا۔ سمیرا حمید کا "ٹیولپ" بہت زبردست دوسروں کے لیے کچھ کر دکھانے کی کہانی۔ ٹیولپ کا بہت اچھا پیغام "کوئی کمال کر ہی دکھایا ہے تو......" چپ رہو اور بھول جاؤ، بہت خوب صورت جملہ اور بہت اچھا پیغام احسان جتانے والوں کے لیے۔ ابوبکر اور اس کی والدہ کا کوشش کرنا اور پُرامید رہنا ابوبکر کی کامیابی کی وجہ بنا اچھا، اب اجازت چاہتی ہوں۔

☆ پیاری صبا! آپ کی تعریف سمیرا حمید اور عطیہ خالد تک پہنچا رہے ہیں، یاد آوری کا شکریہ۔

سمیرا ایپک سے ملاقات

شاہین رشید

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا وقت ہر انسان کی زندگی میں آتا ہے۔ بس اس آزمائش سے گزرنے کا فن آنا چاہیے..... زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے جب پوری فیملی کرائسس کا شکار ہو جاتی ہے اور عموماً ایسا اس وقت ہوتا ہے جب گھر کا سربراہ یا تو زندگی میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے یا زندگی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ تب تعلیم اور ہنر کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ لڑکے تو گھر سے ''اینٹ گارے'' اٹھا کے بھی کچھ نہ کچھ کما لیتے ہیں۔ مشکلات تو گھر میں رہنے والی خواتین کو ہوتی ہے۔ جو ہنر اور تعلیم سے ناآشنا ہوتی ہیں۔

آج آپ کی ملاقات ایک ایسی خاتون سے کروائیں گے جو پانچ سال کی عمر میں ہو والد کی شفقت سے محروم ہو گئی تھیں۔ والدہ کے ساتھ کس طرح وقت گزارا اور انہوں نے کب یہ جانا کہ میری ماں کو میری ضرورت ہے۔

''کیا حال ہے سمیرا؟''

''جی الحمدللہ۔''

''اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟''

''جی میرا اصلی نام عائشہ خالد ہے اور سمیرا کے نام سے فیس بک پہ ہوں اور اپنے بنائے ہوئے ڈریسز سیل کرتی ہوں۔ چونکہ ہم لوگ بلوچ ہیں تو اس لیے اصلی نام سے کام نہیں کرتی ..... میں جب پانچ سال کی تھی تو میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور ساری ذمہ داری میری امی پہ آ گئی۔ میری امی سلائی بھی کرتی تھیں اور ایپلک ورک بھی مگر بہت ہی کم ریٹ پہ.....اور میں بھی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے امی کی تھوڑی مدد کرتی تھی۔ مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی شعور آتا گیا، میں امی کے ساتھ بھرپور طریقے سے کام کرنے لگی ......اور اس کرائسس کے باوجود میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہوں جس نے سوشیالوجی میں ماسٹرز کیا ہے...... امی کے ساتھ تو مدد کرتی ہی تھی لیکن ساتھ ساتھ گھر میں ہی بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی، مگر اس سے خاطر خواہ

آمدنی نہیں ہوتی تھی...... ڈگری تعلیم کے ساتھ ساتھ میں نے کمپیوٹر بھی سیکھنا شروع کیا کیونکہ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ آج کا دور سوشل میڈیا کا دور ہے اور اس پہ "ان" ہو کے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے چنانچہ اپنا کام سوشل میڈیا پہ لے کر آئی اور آج اللہ کا شکر ہے کہ نہ صرف ملک کے اندر بلکہ ملک سے باہر بھی میرے ڈریسز جاتے ہیں اور اب میرے ساتھ میرے "دو سو ورکرز" بھی ہیں۔

"تعلق کہاں سے ہے آپ کا؟ بہن بھائی اور والدین کے بارے میں بھی بتایئے؟"

"میرپور خاص سے تعلق ہے، بلوچ ہیں ہم لوگ۔ والد صاحب بینک میں تھے اور والدہ ہاؤس وائف۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں یعنی ہم چار بہنیں ہیں اور 2 بھائی ہیں...... میں نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ ایک زمین دار گھرانہ تھا اور ہم اچھی خاصی زمینوں کے مالک تھے یعنی لینڈ لارڈ تھے...... بہن بھائیوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔ امی نے شادی کے تقریباً دس سال ابو کے ساتھ گزارے...... بہت کم عمری میں والد صاحب کا انتقال ہوا اور والدہ ۔ چھوٹی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ والد کے انتقال سے دو سال قبل دادا کا انتقال ہوا، ہم لوگ جوائنٹ فیملی میں رہا کرتے تھے، جوائنٹ فیملی سسٹم میں ایک پھوپھو ساتھ رہتی تھیں، میرے تایا تھے جن کی دو بیویاں تھیں، میری دو دادیاں تھیں، ہمارے خاندان میں زیادہ تر لوگوں نے دو دو شادیاں کی ہوئی تھیں، ابو کو اللہ نے زندگی نہیں دی اس لیے صرف امی ہی کے ساتھ دس سال گزارے۔"

"آپ لوگ تو سب بہت چھوٹے چھوٹے تھے...... یاد تو کچھ نہیں ہو گا؟"

"جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا امتحان لینا ہوتا ہے تو پھر انہیں عقل و شعور بھی عطا کر دیتا ہے۔ پانچ سال میری عمر تھی گو کہ بہت ہی چھوٹی تھی پھر بھی کئی باتیں یاد ہیں...... ابو کے انتقال کے بعد پتا چلا کہ ہم کیا ہیں اور ہماری اوقات کیا ہے۔ اس گھر میں ہماری حیثیت کیا ہے......

مجھے یہ تک یاد ہے کہ جب ابو کا جنازہ لے جانے لگے تو میری دادی نے کہا کہ آخری بار آ کر دیکھ لو تو اس وقت میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیا فائدہ ہو گا دیکھ کر کیا کروں...... حالانکہ اس عمر میں کوئی شعور نہیں ہوتا......

ہماری فیملی میں تعلیم حاصل کرنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا...... ہمارے بلوچوں میں تعلیم کو بہت غلط سمجھا جاتا ہے خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کو...... جب میں سات آٹھ سال کی ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس گھر میں جس طرح تایا کے بچوں کے ساتھ اور پھوپھو کے بچوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے ہمارے ساتھ نہیں کیا جاتا......

ہماری تائی گھر کی بڑی تھیں...... تو گھر میں جو کھانا بنتا تھا وہ جب بچ جاتا تھا تو اس میں ایکسٹرا پانی ڈال کر ہمیں دے دیتی تھیں۔ تو بڑا عجیب لگتا تھا، مگر کیا کر سکتے تھے۔ بُرے دن تھے گزر ہی گئے......

ابو کی بینک میں جاب تھی اور ہمارا ایک گھر تھا جو ابو نے اتفاق سے امی کے نام کر دیا تھا اور جو کچھ تھا وہ بھی امی کے نام کر دیا تھا، مگر چونکہ امی پڑھی لکھی نہیں تھیں تو میرے تایا نے بہت سارے کاغذات پہ امی کے انگوٹھے لگوا کے جو بینک سے ملتا تھا اپنے نام کروا لیا اور چونکہ گھر امی کے نام کر گئے تھے تو اس پہ ہاتھ صاف نہیں کر سکے۔ باقی جو زمینیں تھیں اور جو گھر تھا مشترکہ ان سب کو بیچ کر سب کچھ خود رکھ لیا اور ہمیں کچھ بھی نہیں دیا...... اتنے کرائسس میں امی کو تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوا اور انہوں نے سوچا کہ اگر بچے انگریزی اسکول میں پڑھیں گے تو بہت کچھ آسان ہو جائے گا۔ تو خیر جب اتنے نقصانات کے بعد امی کو تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے مخالفت کے باوجود ہمیں انگریزی اسکولوں میں داخل کرا دیا اور گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر دادی تائی اور دیگر لوگوں کے سلائی کڑھائی اور اس طرح کے کام کر کے جو پیسے

کماتی تھیں وہ ہماری تعلیم پہ لگا دیتی تھیں۔"

"گھر کے حالات کب بدلنے شروع ہوئے اور آپ اپنی ماں کے ساتھ کب آئیں کہ مل کر کام کرتے ہیں؟"

"جب میں آٹھویں کلاس میں تھی غالباً 1994ء یا 1995ء میں تو میں نے گلی محلے کے بچوں کو پڑھانا شروع کردیا اور فی بچہ میں 25 روپے لیا کرتی تھی اور ٹیوشن سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ سب امی کے ہاتھ میں رکھ دیا کرتی تھی......

ہماری تعلیم دیکھ کر محلے کے اور خاندان کے لوگ کہتے تھے کہ اتنی تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ یہ لڑکیاں تو ایک دن گھر سے بھاگ جائیں گی، مگر الحمدللہ ایسا کچھ نہیں ہوا، میری بڑی بہن نے انٹر تک تعلیم حاصل کی اور اس کی شادی ہوگئی کیونکہ اس کی منگنی بچپن میں ہی ہوگئی تھی...... جبکہ میں نے سختی سے منع کردیا کہ میں نے ابھی شادی نہیں کرنی اور پڑھنا بھی ہے اور کچھ بن کے دکھانا ہے۔ میں نے اسکول میں بھی جاب شروع کردی اور ٹیوشن تو میں پڑھاتی ہی تھی، مگر آمدنی کچھ خاص نہیں تھی جس سے بہت مایوسی ہوتی تھی......

پھر میں نے کمپیوٹر سینٹر میں داخلہ لیا...... اور جب مجھے کمپیوٹر آنا شروع ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ یہاں بہت کچھ ہے۔ میں نے نیٹ پہ بہت سے لوگوں کو بہت سی چیزیں سیل کرتے ہوئے دیکھا امی کپڑوں کے ٹکڑے جوڑ کر جو "رلی" بناتی تھیں (چادر ٹائپ) اسے میں نے زیادہ اچھے طریقے سے بنانا شروع کیا۔ یہ سب مہارت میں نے اپنی امی سے ہی سیکھی تھی......

اب اسے نیٹ پہ لانا تھا...... مگر نیٹ پہ لانے کے لیے بہت سرمائے کی ضرورت تھی...... گو کہ گھر کے حالات پہلے سے بہت بہتر ہوگئے تھے مگر میں انہیں میں کچھ اور بہتر کرنا چاہتی تھی...... میں نے کچھ بچت کررکھی تھی...... پلاننگ چل رہی تھی کہ میرے لیے ایک بلوچ فیملی سے رشتہ آیا...... ہمارے یہاں برادری سے باہر رشتہ کرنے کی اجازت نہیں تھی...... تو جن کا رشتہ میرے لیے آیا وہ لڑکا بھی پڑھا لکھا تھا اور یہاں بھی میری امی نے اسٹینڈ لیا اور میری شادی ایک پڑھے لکھے گھرانے میں کردی۔"

"شادی کے بعد دوبارہ کام اسٹارٹ کرنے میں مشکل ہوئی ہوگی؟"

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ کام کو بڑے پیمانے پہ جاری کرنے کے لیے ہمارے پاس سرمایہ نہیں تھا...... اور ایک دن بڑی جرأت کرکے میں نے اپنے شوہر سے بات کی تو انہوں نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور مجھے کہا کہ آپ کام اسٹارٹ کریں اللہ کا نام لے کر ان شاءاللہ آپ بہت آگے جاؤ گی، انہوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا...... میں نے 2012ء میں باقاعدہ اس کی لاؤنچنگ کی اور ایف بی پہ لگانا شروع کیا۔ ڈیزائننگ کے ساتھ......

شروع میں لوگوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی کہ کہیں فراڈ نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ ہمیں ڈریسز نہ ملیں۔ مگر پھر آہستہ آہستہ لوگوں کا انٹرسٹ ڈیولپڈ ہونا شروع ہوا اور کام نے رینگنا شروع کیا۔"

"گڈ...... کام کے لیے ورکر کہاں سے لائی تھیں؟"

"ہمارا پورا بچپن یتیمی اور کسمپرسی میں گزرا، تو مجھے اس چیز کا بہت احساس رہتا تھا تو جو بھی خواتین ہماری طرح کی زندگی گزار رہی ہوتی تھیں انہیں میں بہ حیثیت ورکر کے جگہ دیتی تھی اور اس کے لیے میں بہت سرچ کرتی تھی اور شروع میں چونکہ ورکر رکھنے کی گنجائش نہیں تھی تو خود ہی بہت کام کرتی تھی...... اور جب کام بڑھا تو ایسی خواتین کو لائی جو واقعی مستحق تھیں......

پھر ہوا یہ کہ کام اچھا چل پڑا تو ورکر خود میرے پاس آنے لگیں...... اور اب تو یہ صورت حال ہے کہ ورکر آتی ہیں اور مجھ سے کام لے کر چلی جاتی ہیں...... پہلے میں ورکرز کو ڈھونڈتی تھی۔ اب ورکرز مجھے ڈھونڈتی ہوئی آجاتی ہیں۔ اس کام میں اللہ تعالیٰ
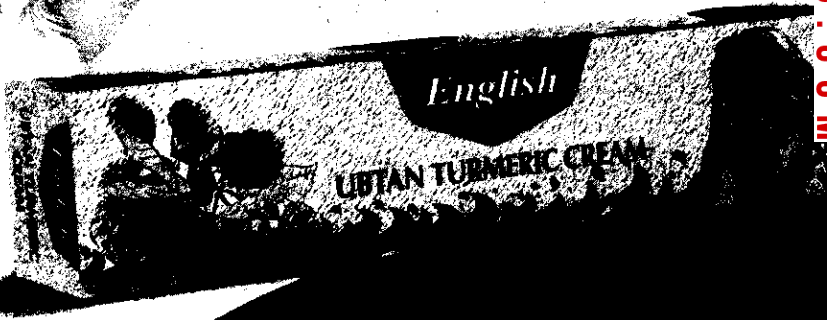
ایک مثال بنا ہوا ہے۔"

"اور دادا کی فیملی نے جو آپ کے ساتھ، آپ کی والدہ کے ساتھ برا سلوک کیا، کیا وہ اب شرمندہ ہوتے ہیں؟"

"انہیں ہمارے حالات نے تو شرمندہ کیا ہی ہوگا، مگر اللہ نے بھی انہیں دکھایا کہ یتیموں کا حق مارنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ دنیا میں ہی اللہ نے انہیں سزا دی ...... ہمارے دادا دادی، ہمارے تایا ہماری پھوپھیاں اور ان کے بچے، ان کے حالات زندگی آہستہ آہستہ خراب ہوتے چلے گئے...... جائیدادیں بھی انہوں نے اسی دور میں فروخت کر دیں اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا اور انہی کی فیملی کی دو چار لڑکیاں میری ورکر ہیں......

اور ان میں کافی لوگوں کو میں سپورٹ کرتی ہوں مالی طور پر بھی اور کام کے لیے بھی، ہم نے جو برا وقت گزارا میں نہیں چاہتی کہ کوئی بھی ایسا وقت گزارے...... میں آج اگر اس مقام پر ہوں تو اس میں میری محنت اور لگن شامل ہے اور یہ عزم شامل ہے کہ مجھے کچھ بن کے دکھانا ہے اور سب کو بتانا ہے کہ برا وقت کبھی بھی آ سکتا ہے اس لیے کبھی ہمت نہ ہاریں تعلیم اور ہنر کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں ہیں......اور تعلیم کی وجہ سے ہی میں اتنا آگے بڑھ سکی......

لوگ کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم حاصل کر کے کیا کرنا ہے۔ انہوں نے کون سی نوکری کرنی ہے تو یہ بات بالکل غلط ہے، ضروری نہیں کہ نوکریاں کریں اپنی تعلیم کی بدولت وہ گھر بیٹھ کر بھی بہت کما سکتی ہیں۔"

"ملک سے باہر سے جو آرڈر آتے ہیں اس کے لیے کچھ مشکلات ہوتی ہیں؟"

"باہر آرڈر بھیجنے میں میرے بھائی مجھے بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ کپڑا لانے کی ساری ذمہ داری میری ہوتی ہے، ورکرز تو گھر پر ہی ہوتی ہیں۔ مارکیٹ میں مردوں سے ڈیلنگ میں خود کرتی ہوں اور اس میں

اور اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا پورا گھرانہ سب کے لیے

نے اتنی برکت ڈالی کہ میں نے اپنے بھائیوں کی شادیاں کیں......اب ایک بہن کی شادی ہونا باقی ہے۔"

"بھائیوں نے قدر کی تمہاری ...... اور بہنوں نے ساتھ دیا؟"

"جی بہت زیادہ......سب سے زیادہ سپورٹ تو میرے شوہر نے کیا، میرے بڑے بھائی سارے میرے باہر کے کام کرتے ہیں.....آرڈر لے کر آنا آرڈر پہنچانا ......سب میرے دونوں بھائی کرتے ہیں۔ اس طرح میری بھابیاں بھی بہت اچھی ہیں اور وہ بھی میرے کام میں میری بہت مدد کرتی ہیں ......

اگرچہ مشکلات پیش آتی ہیں اور برے تجربات سے بھی گزرنا پڑا...... تو میری کوشش ہوتی ہے کہ خواتین سے ہی ڈیلنگ کروں۔"

"اب خوش ہیں اپنی زندگی سے؟ اور برے وقت میں سب اپنوں نے ساتھ چھوڑا...... غیروں میں کوئی کام آیا؟"

"برے وقت میں سب نے ساتھ چھوڑا، بہت کم لوگ تھے جنہوں نے ساتھ دیا، ان ہی میں میری ایک دوست یاسمین تھی۔ بی اے کے بعد مجھے نہیں پتا تھا کہ ایم اے کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے تو اسی نے میری مدد کی، مجھے یونیورسٹی لے کر گئی اور میرا ایڈمیشن کروایا اور میں کبھی نہیں بھولوں گی کہ ایم اے سوشیالوجی میں نے اس کی وجہ سے کیا...... اور الحمدللہ اب میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔"

"گزرے دن یاد آتے ہیں؟...... کبھی اپنے حالات زندگی ڈائری میں لکھیے؟"

"گزرے دن یاد آتے ہیں تو خیالات کو جھٹک دیتی ہوں اور ڈائری بھی نہیں لکھتی کہ مجھے بہت ڈیپریشن ہونے لگتا ہے...... آپ کو بتاؤں کہ تعلیمی اخراجات کے لیے بھی مجھے بہت مشکل وقت دیکھنا پڑا...... میرے سارے اخراجات امی اٹھاتی تھیں......

اور آج جب میں کسی بھی بچے کو خاص طور پر یتیم بچے کو مجبور دیکھتی ہوں تب بھی میں یتیم بچوں کے لیے اپنی بساط کے مطابق مدد کرتی تھی، کہ جو احساس کمتری میرے اندر تھی بچپن میں ان کے اندر نہ ہو...... اور جیسا بچپن میں نے گزارا...... میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ کوئی میرے جیسا بچپن گزارے محرومیوں سے بھرا ہوا۔ اور اس کے باوجود میرا ہاتھ ہمیشہ دینے والا رہا لینے والا نہیں۔"

"شادی دیر سے کی وجہ؟"

"اس لیے کہ میں اپنے بہنوں بھائیوں کو سپورٹ کر رہی تھی۔ مجھ سے بڑی بہن کی شادی تو انٹر

میں ہوگئی۔ میرے بعد والی کی میٹرک کے بعد ہوئی اور بھائی کی بھی میٹرک کے دوران ہوگئی...... میری شادی 28 سال کی عمر میں ہوئی اور اب میں 34، 35 کی ہوں اور آج اللہ کا شکر ہے کہ میرے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے...... بس اللہ مجھے اولاد کی نعمت سے بھی نواز دے۔"

"مزاج کی کیسی رہیں آپ؟ تیز، نرم یا حساس؟"

"بچپن میں بہت حساس اور ہر بات کو محسوس کرنے والی ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ فقیر دروازے پر آجاتا تو میں اپنے حصے کا کھانا تک اسے دے دیتی تھی...... مجھے یاد ہے کہ ابو کے انتقال کے بعد میری دادی نے مجھے بلا کر عیدی دی اور دوسروں کے لیے کہا کہ تمہارے دوسرے بہن بھائیوں کے لیے میرے پاس نہیں ہے تو میں نے وہ عیدی انہیں واپس کردی کہ آپ انصاف سے کام لیں۔ اگر ان کے لیے آپ کے پاس پیسے نہیں ہے تو میں بھی نہیں لوں گی۔ حساس بہت ہوں مگر طبیعت کی تیز نہیں ہوں۔ غصہ بہت کم آتا ہے اور میں بہت صبر والی ہوں......اور میری امی کی اچھی تربیت ان کی سپورٹ اور شوہر کی سپورٹ نے مجھے یہ مقام دیا۔"

"ڈائجسٹ وغیرہ پڑھے فارغ اوقات اور ڈرامے دیکھے، کبھی......؟"

"ڈائجسٹوں اور ڈراموں سے بہت لگاؤ رہا۔ خواتین ڈائجسٹ عمیرہ احمد کی وجہ سے لیتی تھی اور ڈراموں میں "زندگی گلزار ہے" بہت پسند آیا تھا کیونکہ اس کی کہانی تقریباً میری زندگی کی کہانی تھی۔"

"امور خانہ داری سے لگاؤ ہے؟"

"نہ میں کھانا کھانے کی زیادہ شوقین ہوں اور نہ ہی کھانا پکانے کی، لیکن پھر بھی میں بہت اچھا سب کچھ پکا لیتی ہوں۔ بریانی اور توری زیادہ اچھی بنا لیتی ہوں۔ "توری" میری پسندیدہ ڈش ہے۔"

"کبھی ٹی وی والوں نے بلایا آپ کو؟"

"جی...... جی...... "سماء" ٹی وی والوں نے بلایا تھا اور سندھی چینلز والوں نے اور سندھی چینلز پہ تو باقاعدہ ماڈلز نے ہمارے بنے ہوئے کپڑے پہنے تھے اور یہ پروگرام کافی پسند کیا گیا تھا۔"

"منافع کا مارجن کیا ہوتا ہے؟"

"زیادہ نہیں رکھتی، کیونکہ کم منافع کی وجہ سے زیادہ لوگ آتے ہیں اور گاہک بنتے ہیں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ اب مجھے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی، لوگ خود مجھے تلاش کرتے ہوئے آتے ہیں۔ شروع میں بہت مشکلات پیش آتی تھیں۔"

"خواتین کے لیے کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"یہی کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے اور کام کی لگن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بہت زیادہ ہمت اور بہت زیادہ لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ وقت دینا پڑتا ہے اس کام کے لیے ......اور لگن ہی آپ کو آگے تک لے کر جاتی ہے...... کبھی محنت سے دل نہ چرائیں۔"

"اور کوئی دعا جو آپ کے لبوں پہ رہتی ہو؟"

"کہ مجھے بہت ترقی دے۔ میرے جیسی تکالیف کسی کو نہ دینا اور یہ کہ میرا بچپن کبھی لوٹ کر نہ آئے۔" (آمین)

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سمیرا سے اجازت چاہی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
www.urdusoftbooks.com

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

(آرڈر آرڈر، آرڈر) میں انڈسٹری میں اتنے عرصے سے ہوں کہ میں یہ بات سمجھ چکی ہوں کہ کام کس طرح کیا جاتا ہے (یعنی حاصل کیا جاتا ہے، یعنی پی آر...... ناں) میں سچ سے نہیں بھاگوں گی (اور جھوٹ سے......؟) میرا قانونی نظام پر پورا اعتماد ہے۔ (اچھا جی وہ جو ہے، وہ نظام...... اس پر......؟) اور مجھے انصاف ملے گا۔ (آہم آہم...... ہم بولیں گے تو......؟)

پسند

میرا کا نام آتے ہی ایک متضاد شخصیت کا خاکہ ذہن میں آتا ہے۔ اب ذرا میرا کی باتیں سنیں تو آپ حیران رہ جائیں گے۔ میرا نے کہا ہے کہ زندگی میں تلخیاں تو ساتھ ساتھ چلتی ہی رہتی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ بندہ ان مشکلات کا ہمت سے مقابلہ کرے اور ان سے سیکھے (کیا...... بھئی سیکھے) میں لائف کو انجوائے ضرور کرتی ہوں لیکن میں نے یہ بات سمجھ لی

یقین

پاکستان میں آج کل ہر معاملے میں عدالتوں کا اتنا اثر ہے کہ اس سے پاکستانی فنکار بھی نہیں بچ سکے۔ نوجوان ماڈل واداکارہ اقرا عزیز کو بھی ایک مقدمے کا سامنا ہے۔ یہ مقدمہ ان پر ان کی اس ایجنسی نے لگایا ہے جس کے ذریعے وہ کام کر رہی تھیں۔ اب انہیں ایک بڑے موبائل برانڈ کے ساتھ بطور ایمبیسڈر کام کرنے کا موقع کسی اور ایجنسی کے ذریعے ملا ہے۔ جس پر ان کی پرانی ایجنسی نے انہیں قانونی نوٹس بھیج دیا کہ انہوں نے اس ایجنسی کے ساتھ سات برس کا معاہدہ کیا ہوا ہے اور وہ ان کی مرضی کے بغیر معاہدہ ختم ہونے تک کسی اور ایجنسی کے ساتھ کام نہیں کر سکتیں (کیوں جی کیوں؟)

اقراء کا اس بارے میں کہنا ہے کہ "میں اس کمپنی کے لگائے گئے تمام الزام مسترد کرتی ہوں۔

ہے کہ "دنیا عارضی پڑاؤ ہے" (ہیں......جی......؟)
میرا آج کل امریکہ میں رہائش پذیر ہیں۔ اس بارے میں میرا کا کہنا ہے کہ امریکی معاشرے میں سب سے اچھی چیز سادگی کو پایا ہے۔ یہاں سب محنت کرتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کوئی کسی پر بوجھ نہیں بنتا (سو تو ہے)۔ میرا نے کہا کہ امریکہ میں اپنا ناشتا وہ خود بناتی ہیں، اپنے برتن دھوتی ہیں اور ٹرین میں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ مزے سے جاتی ہیں۔ یہاں نہ ڈرائیور رکھنے کا رواج ہے نہ ملازمہ۔ میں اپنے سب کام یہاں خود کرتی ہوں اور مجھے اپنی یہ آزادی پسند ہے۔

گزارش

پاکستان ومن کرکٹ ٹیم کی سابق کپتان ثناء میر نے ماہرہ خان کے فیئرنس کریم کے فٹ بال کھیلتے اشتہار اور اسی طرح جن اشتہارات میں خواتین کھلاڑیوں کو رنگ گورا کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے، سخت آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "وہ تمام نوجوان لڑکیاں جو کسی بھی کھیل کا حصہ بنی ہیں، انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ کھیل کے میدان میں مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہے، نرم ہاتھوں کی نہیں۔ ہم کارپوریٹ، اسپانسرز اور فنکار ہمیشہ مختلف پیشہ وارانہ حالات میں خواتین کو نمائشی چیز بنا کر پیش کرنے کی بات کرتے ہیں۔
دنیا میں ایسی خواتین ہیں جو اپنی صلاحیتوں اور سخت محنت سے کامیاب ہوتی ہیں۔ وہ اپنی رنگت یا جلد کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوئیں۔ اپنے بارہ برس کے کیریئر میں میں نے ہمیشہ بیوٹی پروڈکٹس کے اشتہارات میں کام کرنے سے انکار کیا ہے۔ کیوں کہ میں چاہتی ہوں کہ نوجوان لڑکیاں یہ بات سمجھیں کہ محنت اور مشق، آرام دہ جوتے، کپڑے، پانی کی بوتل اور سر پر ٹوپی ہو تو آپ اپنی لگن سے اسپورٹس میں کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔ میں تمام اسپانسرز اور فنکاروں سے گزارش کروں گی کہ نوجوان لڑکیوں کو ایسی راہ دکھائیں جس سے ان میں اعتماد پیدا ہو۔ ان میں احساس کمتری نہ ہو۔

کچھ ادھر اُدھر سے

★ یہ دنیا عارضی اور اس کی چکا چوند اور شہرت دم بھر کی ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کچھ حرج نہیں پر اس کی ہمیشگی پر یقین رکھنے والے پرلے درجے کے احمق ہوتے ہیں۔
(کارواں سرائے ...... مستنصر حسین تارڑ)

☆ جنرل یحیٰی خان نے 1970ء کے الیکشن اس لیے کرائے کہ انہیں بتایا گیا تھا کہ ان انتخابات میں کوئی جماعت واضح اکثریت نہیں لے سکے گی اور ان کا اقتدار جاری رہے گا لیکن مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں بھٹو نے میدان مار لیا اور یحیٰی خان کہیں کے نہ رہے۔
(سابق سربراہ آئی ایس آئی اسد درانی کا انکشاف)

☆ بھارت کے لیے ڈکٹیٹرز میں مشرف بہترین تھا۔ پسندیدہ رہنما بے نظیر بھٹو تھیں۔ ایک جنرل، آرمی چیف اور صدر کے طور پر پرویز مشرف کو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا امریکی کہتے ہیں کہ وہ ایک وہسکی پینے والا، انگریزی میں بات کرتا ہے۔ اس کے ساتھ معاملات طے کیے جا سکتے ہیں۔
(را کے سابق سربراہ امر سنگھ دولت کا انکشاف)

☆ 99ء کے مارشل لاء کے بعد پرویز مشرف نے شاہد خاقان عباسی کو ان کے فوجی پس منظر کا حوالہ دے کر نواز شریف سے توڑنا چاہا لیکن شاہد خاقان عباسی اپنی پارٹی کے رہنما رہے اور جیل جانا گوارا کیا۔
(را کے سابق سربراہ امر سنگھ دولت کا اظہار خیال)

عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

کھجور کا حلوہ

اجزاء:

کھجور............آدھا کلو

اخروٹ............ایک پیالی

مارجرین............چار کھانے کے چمچے

ناریل............ایک پیالی

میری بسکٹ............ایک پیکٹ

کریم............ایک پیالی

ترکیب: گٹھلی نکال کر کھجور کا گودے بنالیں۔ اخروٹ باریک کوٹ کر رکھ لیں ایک ہتھیلی میں

مارجرین یا مکھن کو ہلکا سا گرم کر کے اس میں کھجور کا گودا ڈال کر بھونیں پھر اس میں پسا ہوا ناریل اور بسکٹ کا چورا شامل کر کے بھونیں۔ ساتھ ہی کٹے ہوئے اخروٹ بھی ڈال کر اچھی طرح ملالیں اب ایک تھالی یا ٹرے میں ہلکی سی چکنائی لگائیں اور حلوہ اس کے اوپر پھیلادیں۔ کریم کو اچھی طرح پھینٹیں کہ وہ گاڑھی ہوجائے اب کریم کو حلوہ پر پھیلادیں اور اوپر سے اخروٹ چھڑک دیں۔ اب اس کے حسب پسند ٹکڑے کاٹ لیں۔

میٹھی کچوری

اجزاء:

میدہ............ایک پاؤ

گھی............دو کھانے کے چمچے

چینی............ایک پاؤ

بادام............حسب ضرورت

پستے............حسب ضرورت

کیوڑا............ایک چمچہ

دودھ............حسب ضرورت

گھی............تلنے کے لیے

ترکیب: میدے میں دو چمچے گھی گرم کر کے ملالیں ذرا سا نمک ملا کر دودھ سے گوندھ لیں۔ یہاں تک کہ ملائم ہوجائے۔ آدھے گھنٹہ کے لیے رکھ دیں۔ اب میدے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر اسے چوکور بیل لیں۔ چینی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گاڑھا شیرا بنا کر اور کیوڑا ملادیں۔ بیلے ہوئے چار ٹکڑے ایک کے اوپر ایک رکھ کر انہیں چاروں طرف سے دبا کر بند کردیں اس طرح باقی بھی تیار کرلیں۔ کڑاہی یا کسی برتن میں گھی گرم کر کے ہلکی آنچ پر ان کو تل لیں۔ سرخ ہونے پر نکال کر شیرے میں ڈال دیں ایک گھنٹے بعد نکال کر بادام پستے سے سجائیں۔ مزے دار میٹھی کچوری تیار ہے۔

آئس کریم کرنچ قلفہ

اجزاء:

دودھ............ایک کلو

چینی............ایک کپ

چاکلیٹ چپ............حسب پسند

بادام............حسب ضرورت

کارن فلور............ایک کھانے کا چمچہ

کھویا............آدھا کپ

فریش کریم............ایک کپ

ترکیب: ایک کلو دودھ کو اتنا پکائیں کہ وہ آدھا رہ جائے آدھا کپ چینی کو فرائی پین میں ڈال کر پگھلا لیں۔ کرنچ بن جائے گا۔ اب پکے ہوئے دودھ میں کارن فلور اور چینی ملا کر دودھ کو ٹھنڈا کرلیں اور اس میں فریش کریم اور کھویا ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں

پھر اس کو فریزر میں رکھ دیں۔ تھوڑی دیر میں نکال کر پھر پھینٹیں اور اس میں کرنچ اور چاکلیٹ چپ بھی شامل کر کے اس میں موٹا موٹا کوٹا ہوا بادام بھی ڈال کر اسے فریزر میں جمنے کے لیے رکھ دیں۔ جمنے پر نکال کر اوپر سے بادام اور کرنچ سجا کر کھانے کے لیے پیش کریں مزے دار کرنچ قلفہ آئس کریم تیار ہے۔

سوئٹ بیسن بالز

ضروری اشیاء:

بیسن........2 کپ
گھی........3/4 کپ
سبز الائچی........4 عدد
چینی (پسی ہوئی)........1 1/2 کپ
زعفران........1 چٹکی
بادام، پستے........حسب پسند

ترکیب:

پتیلی میں گھی گرم کریں۔ اس میں الائچی ڈال کر کڑکڑائیں، بیسن ڈال کر بھونیں خوشبو آنے لگے تو اس میں زعفران، بادام اور پستے ڈال کر چولہے سے پتیلی کو اتار لیں اور اس میں چینی ڈال کر مکس کریں۔ بیسن تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو اس کے گول لڈو بنا لیں مزے دار بیسن کے لڈو تیار ہیں چاندی کے ورق میں سجا کر بیسن بالز کو پیش کریں۔

ڈرم اسٹک بریانی

ضروری اشیاء:

چکن ڈرم اسٹک........چھ سے سات عدد
چاول........آدھا کلو
پیاز........دو عدد
لہسن ادرک........ایک چائے کا چمچہ
دہی........آدھا کپ
آلو بخارہ........چھ عدد
ٹماٹر........دو عدد (گول سلائس کاٹ لیں)
لیموں........دو عدد (گول سلائس کاٹ لیں)
زرد رنگ........حسب ضرورت
کیوڑہ........چند قطرے
ہری مرچیں........چار چھ عدد
لال مرچ پاؤڈر........دو کھانے کے چمچے
نمک........حسب ذائقہ
تیل........حسب ضرورت
یخنی........آدھا کپ

ترکیب:

چاول ابال کر الگ رکھ لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کر کے آدھی پیاز نکال کر الگ رکھ لیں۔ باقی پیاز میں چکن، لہسن ادرک پیسٹ، دہی، آلو بخارہ، ہری مرچیں، نمک اور لال مرچ پاؤڈر ڈال کر بھونیں اور ڈھکن ڈھک کر درمیانی آنچ پر چکن گلالیں۔ جب چکن گل جائے اور تیل اوپر آجائے تو اچھی طرح بھون کر چولہے سے اتار لیں، علیحدہ دیگچی میں پہلے گول ٹماٹر اور گول لیموں کی تہہ لگائیں ابلے چاول کی لیئر لگائیں چکن ڈالیں اس کے بعد دوبارہ چاول کی تہہ دے کر آخر میں اوپر سے الگ کی ہوئی پیاز، زرد رنگ، کیوڑہ اور یخنی چھڑک کر پانچ سات منٹ دم پر رکھ دیں۔ اچھی طرح مکس کر کے سرونگ ڈش میں نکال کر رائتہ اور سلاد کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل -------- فرینہ اعجاز
میک اپ -------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی -------- موسیٰ رضا

ہوش سنبھالا تو امی اور ابا کو آپس میں لڑتے دیکھا۔ امی ابو کو برا بھلا کہتیں، ابو انہیں گالیاں دیتے، کبھی کبھی ہاتھ بھی اٹھا لیتے۔ تھوڑی سمجھ آئی تو پتا چلا کہ سارا جھگڑا امی کے ماموں زاد کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دراصل پہلے امی کی منگنی ان کے ساتھ ہوئی تھی۔ کسی وجہ سے منگنی ٹوٹ گئی۔ امی کی شادی ابو کے ساتھ ہوگئی، ابو امی پر الزام لگاتے کہ وہ اب بھی اپنے سابقہ منگیتر سے تعلق رکھے ہوئے ہیں جبکہ امی کہتی تھیں کہ ابو شکی مزاج ہیں۔ معاملہ کیا تھا، اللہ بہتر جانتا ہے لیکن کسی تقریب میں امی کی ملاقات ان سے ہو جاتی تو امی ہنس ہنس کر باتیں کرتیں۔ کئی بار وہ ہمارے گھر بھی آئے، جب بھی آتے ڈھیر سارا فروٹ اور مٹھائی لے کر آتے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ بھائی ہم دونوں بہنوں سے چھوٹا ہے۔ چار سال پہلے جھگڑا اتنا بڑھا کہ امی گھر چھوڑ کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں (ان کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے)۔

میں اس وقت میٹرک میں تھی، امی کے جانے کے بعد گھر کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی اور سب سے بڑھ کر لوگوں کی باتیں۔ امی نے یہاں سے جانے کے بعد اپنے سابقہ منگیتر سے تعلق مزید استوار کر لیا ہے حالانکہ وہ بھی شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی، امی اور ہم بہنوں پر طرح طرح کی باتیں کرتی ہے اور الزام لگاتی ہے۔ ہم دونوں بہنیں امی کے پاس جاتی ہیں، ان سے گھر آنے کے لیے کہتی ہیں لیکن وہ کسی صورت تیار نہیں حالانکہ ابو انہیں واپس لانے کے لیے تیار ہیں، ان سب جھگڑوں اور باتوں کا بھائی پر بہت برا اثر پڑا اور وہ آٹھویں میں فیل ہو گیا۔ انٹر کے بعد میری پڑھائی بھی چھوٹ گئی ہے کیونکہ ذہنی پریشانیوں کی وجہ سے ابو ہارٹ پیشنٹ ہو گئے، وہ کام نہیں کر پاتے ہیں۔ میں نے ایک پرائیوٹ اسکول میں نوکری کر لی ہے لیکن وہاں سے صرف تین ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے کم پیسوں میں گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔

اچھی بہن! مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں شریعت کو، اللہ تعالیٰ کے احکام کو روایات کی نذر کر دیا گیا ہے۔ شادی میں لڑکی کی رضامندی ضروری ہے لیکن اسی فیصد گھرانوں میں اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ آپ کی والدہ اپنے منگیتر کی طرف مائل تھیں تو ان کو آپ کے والد سے شادی نہیں کرنا چاہیے تھی، اگر شادی کر لی تھی تو اسے نباہنے کا حوصلہ بھی رکھتیں۔ آپ کے والد ان کے منگیتر کے بارے میں جانتے تھے تو شادی کے بعد انہیں اپنی بیوی پر شک کرنے کے بجائے پیار محبت سے بیوی کے دل میں جگہ بنانا چاہیے تھی لیکن انہوں نے آپ کی والدہ پر شک کیا جس کے نتیجے میں وہ ضد میں آ گئیں اور معاملہ الجھتا گیا اب نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ انہوں نے گھر ہی چھوڑ دیا۔ قصور دونوں کا ہے لیکن سزا آپ لوگوں کو بھگتنا پڑ رہی ہے۔

اس کا حل یہ ہی ہو سکتا ہے کہ آپ کے والد آپ کے ماموں کے پاس جائیں اور ان سے بات کریں۔ ممکن ہے آپ کے ماموں کے سمجھانے سے آپ کی والدہ مان جائیں۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ ماموں کے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔

آپ بڑی ہیں، اپنی بہن اور بھائی کو سمجھائیں۔ ابو سے کہیں، وہ بھائی پر توجہ دیں تاکہ وہ آگے تعلیم جاری رکھ سکے۔

حجاب فاطمہ...... سکھر

س: مجھے اپنی بڑی بہن سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کی چار بیٹیاں ہیں، جس روز میرا نکاح تھا عین اس روز میری بہن کی حالت شدید خراب ہوگئی۔ اسے ہسپتال لے گئے اور نکاح ملتوی ہو گیا۔ کچھ روز بیمار رہ کر میری بہن دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اس کی بیٹیاں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ گھر والے چاہتے ہیں کہ میں اپنے بہنوئی سے شادی کر لوں

...کہ وہ کیسی ماں ثابت ہوگی۔ جبکہ مجھے اپنے منگیتر سے بے انتہا محبت ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا ... کے لیے سوہان روح ہے، انتہائی ذہنی اذیت کا شکار ہوں۔ مجھے بچیوں سے محبت تو ہے مگر میرا دل اس قربانی پر آمادہ نہیں۔

ج: حجاب بہن! ہمارے معاشرے میں شادی ایک دو دن کی بات نہیں، عمر بھر کا سودا ہوتی ہے۔ اس کو اس طرح صرف ہمدردی کے جذبات کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔ بچیاں آج چھوٹی ہیں، کل بڑی ہو جائیں گی۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوگا کہ ان کے لیے آپ نے کتنی بڑی قربانی دی ہے اور آپ ساری زندگی غیر مطمئن رہیں گی۔

آپ اپنے منگیتر سے محبت کرتی ہیں تو شادی بھی اسی سے کریں۔ ضروری نہیں کہ خالہ ہی اچھی ماں ثابت ہو۔ دنیا میں اچھے، نرم دل، حساس لوگوں کی کمی نہیں جو دوسروں کے لیے دل میں پیار کا جذبہ رکھتے ہیں۔ آپ کے بہنوئی کو کوئی اور اچھی لڑکی مل سکتی ہے جو اُن کے گھر اور بچوں کو سنبھال سکے لیکن یہ آپ کے ساتھ ہی نہیں، آپ کے بہنوئی اور منگیتر کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی کہ دل پر جبر کرکے مجبوری کے بندھن باندھے جائیں اور عمر بھر انہیں رو رو کر نبھایا جائے۔ آپ صاف انکار کردیں، اگر گھر والے نہ مانیں تو اپنے بہنوئی سے خود بات کریں، انہیں بتادیں کہ آپ اپنے منگیتر سے ہی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ عافیت اسی میں ہے کہ آپ اس وقت خود کو مضبوط کریں ورنہ ساری زندگی ایک کسک اور خلش کے ساتھ گزرے گی۔

نفیسہ صدیقی......حیدر آباد

س: میرے والد نے میری والدہ سے بیٹے کی آرزو میں شادی کی تھی مگر انہوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور سات بیٹیوں کے باپ ہیں۔ میری پیدائش پر انہوں نے میری والدہ کو طلاق دے دی۔ اب والدہ نے دوسری شادی کرلی ہے، ان کے دوسرے شوہر کو مجھ سے سخت نفرت ہے۔ میں کبھی کبھار اپنے سگے والد کے گھر چلی جاتی ہوں، جہاں سوتیلی بہنیں جان عذاب میں ڈالے رکھتی ہیں۔ پھر اسی جہنم میں آجاتی ہوں۔ میں نے نرسنگ کا کورس کیا ہوا ہے، میری خواہش ہے کہ ملازمت کی غرض سے کسی خلیجی ملک چلی جاؤں اور کبھی پاکستان واپس نہ آؤں۔ مجھے اپنے والدین سے سخت نفرت ہے جن کے گھر اور دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ مجھے شادی کا مشورہ مت دیجیے گا۔

ج: نفیسہ بہن! سوتیلے باپ کے دل میں آپ کی جگہ نہیں اور سگے باپ کے گھر میں گنجائش نہیں، جہاں پہلے ہی سات بیٹیاں موجود ہیں وہاں آٹھویں کی گنجائش کیسے نکلے گی۔ پتا نہیں لوگوں نے یہ کیسے تصور کرلیا ہے دوسری شادی کرلی جائے تو بیٹے پیدا ہوں گے۔ جبکہ بیٹے یا بیٹی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے اور اس کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ بہرحال آپ نے اتنا وقت سوتیلے باپ کی نفرت کے ساتھ گزار لیا ہے، تعلیم بھی حاصل کرلی ہے، نرسنگ کی جاب آپ کو یہاں ملک کے اندر بھی مل سکتی ہے۔ آپ باہر جانا چاہتی ہیں تو اس کے لیے کوشش کرتی رہیں فی الحال موجودہ حالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کسی ایسے اسپتال میں جاب کرلیں جہاں رہائش کی سہولت بھی مل سکے۔ والدین سے نفرت کرکے آپ کو کیا ملے گا بلکہ کسی سے بھی نفرت کرکے کچھ نہیں ملتا۔ صرف اپنا نقصان ہوتا ہے، منفی جذبات انسان کی جسمانی صحت کو ہی نقصان نہیں پہنچاتے، اسے ذہنی مریض بھی بنادیتے ہیں۔

آپ کی والدہ مجبور تھیں۔ طلاق کے بعد وہ زندگی کس کے سہارے گزارتیں، انہیں دوسری شادی کرنا ہی تھی۔ سوتیلے والد کی کم ظرفی تھی کہ وہ آپ کا وجود برداشت نہیں کرپائے۔ سگے والد صاحب کی پہلے ہی سات بیٹیاں تھیں، بیٹے کی خاطر دوسری شادی کی جو سراسر احمقانہ حرکت تھی۔ آٹھویں بیٹی کے لیے وہ شاید گنجائش نکال لیتے لیکن سوتیلی ماں کیسے برداشت کرتی۔

بہرحال آپ سب کو بھول کر اپنی زندگی پر توجہ دیں، ابھی بہت زندگی پڑی ہے۔ اسے منفی جذبات کی نذر نہ کریں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بیوٹی بکس

امت الصبور

ثمر خان .... ٹنڈو محمد خان

س: گرمی میں میرا چہرہ سنولا جاتا ہے۔ جلد بھی جھلسی ہوئی سی لگتی ہے مجھے روز گھر سے نکلنا ہوتا ہے۔ ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ تیز دھوپ سے بچوں لیکن پھر اس کے باوجود جب سے گرمی آئی ہے میرا رنگ ہی خراب نہیں ہوا بلکہ چہرے پر کیل مہاسے بھی نکل آئے ہیں۔ کوئی آسان اور سستا نسخہ بتائیے گا۔ میں مہنگی چیزیں نہیں لے سکتی۔

ج: ایلو ویرا جسے گھیکوار بھی کہا جاتا ہے۔ نہایت سستا اور ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہے۔ اس سے آپ اپنے چہرے کی جلد کو تروتازہ اور شاداب رکھ سکتی ہیں۔

سخت گرمی میں جلد کو روشن، چمکدار اور نرم و ملائم رکھنے کے لیے بادام کا تیل، زیتون کا تیل، دودھ کی بالائی اور ایلو ویرا جیل ایک ایک چمچہ لے کر اچھی طرح ملا کر پیسٹ بنالیں۔ رات کو چہرے پر لگائیں۔ صبح منہ دھولیں۔ آپ کو اپنے چہرے کے رنگ اور شگفتگی میں نمایاں فرق محسوس ہوگا۔

کیل مہاسوں کے لیے آپ چند ہفتوں تک ایلو ویرا کا گودا نکال کر کھائیں۔ ایلو ویرا کڑوا ہوتا ہے لیکن جی کڑا کر کے کھالیں تو کچھ ہی عرصے میں کیل مہاسے سے غائب ہوجائیں گے اور جلد صاف شفاف ہوجائے گی۔

شاہدہ جاوید ...... ڈوگر

س: میری عمر تیس سال ہے لیکن دیکھنے میں چالیس سال کی نظر آتی ہوں۔ چہرے پر جھریاں پڑنے لگی ہیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے ہیں۔

سب سے پہلے تو آپ اپنی خوراک پر توجہ دیں۔ سبزیاں، پھل زیادہ استعمال کریں۔ دودھ دہی کا استعمال بڑھادیں۔ بہت جلد آپ محسوس کریں گی کہ آپ کے چہرے پر چمک آگئی ہے۔ اور جلد شاداب ہوگئی ہے۔ اس سے آپ کی صحت بھی بہتر ہوگی۔ درحقیقت اچھی صحت ہی سب سے بڑی ، ایک اور چیز جو ہے۔ وہ ہے چینی ..... چینی نظر آنے اور تروتازہ جلد کی خو، آپ اسے اپنے جلد پر لگائیں۔ ہوں گے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ چینی کھانے سے انسان زیادہ عمر کا نظر آتا ہے لیکن اسے جلد پر لگایا جائے تو کم عمر نظر آتا ہے۔

چینی کو جلد پر لگایا جائے تو یہ جلد کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس میں مرطوب عناصر پائے جاتے ہیں جو ہمارے خلیوں کے اندر موجود نمی کو خشک کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

دو چمچ چینی کو گرائنڈر میں باریک پیس لیں پھر اس میں آدھا چمچہ زیتون کا تیل اور آدھا چمچہ شہد ملا کر پیسٹ بنالیں اور چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ جھریاں دور ہوجائیں گی اور چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھے گا۔

سمیرا چوہدری ...... مالاکنڈ

س: میری شادی کو دو سال ہوئے ہیں۔ ایک بچہ ہے۔ میرا وزن تو مناسب ہے لیکن بچہ ہونے کے بعد پیٹ بہت بڑھ گیا۔ کوئی سادہ اور آسان سی ترکیب بتائیں جو میں گھر میں کرسکوں کیونکہ ہمارے ہاں عورتوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔

ج: ایک بہت آسان سی ورزش ہے جو آپ گھر میں کرسکتی ہیں۔ ایک دو ماہ باقاعدگی سے عمل کریں گی تو پیٹ کم ہوجائے گا۔

صبح کے وقت زمین پر بیٹھ جائیں اور ٹانگیں آگے کی جانب سیدھی پھیلالیں۔ اب پیروں کے دونوں انگوٹھے پکڑ کر آہستہ آہستہ سر زمین کی طرف لے جائیں۔ اس طرح پہلے روز پانچ بار کریں پھر اس کو بڑھا کر بیس مرتبہ تک لے جائیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ آپ کا سر زمین تک لگنے لگا۔

دوپہر میں یا رات میں پیٹ کے نیچے تکیہ رکھ کر پندرہ منٹ زمین پر اوندھی لیٹیں۔